دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
مئی 2018
PDF
نگران اعلیٰ
معراج رسول
MAY 2018

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشاالله آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تاکہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براوزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آ سکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

جاسوسی ڈائجسٹ

APNS CPNE

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ جمال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 48 • شمارہ 05 • مئی 2018 • زرسالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

THE SMART SCHOOL

- Holistic development
- Project based learning
- Investigative processes, technology, interactive resources
- Early Years Education through fun and play
- Exam focused Student Resource Material for Matric
- Child Educational Insurance

Head Office:
31- Gurumangat Road, Industrial Area,
Gulberg III, Lahore
U.A.N: +92 42 111 444 123
Phone:+92 42 35773069-77
E-mail: info@thesmartschools.edu.pk

Southern Region:
The Smart Tower Plot-C-10/2,
Off Sharah-e-Faisal, Lines Area,
Sector 8, Opp Gora Qabristan, Karachi
Phone:+92 21 32790125-8
E-mail: rm-sr@thesmartschools.edu.pk

Northern Region:
House 875 Block-F Satellite Town,
Near Holy Family Hospital,
Rawalpindi
Phone:+92 306 8886011-7
E-mail: gm-sr@thesmartschools.edu.pk

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

اپریل کا مہینا اپنی رفتار سے اختتام پر ہے۔ مئی کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ صرف دو ہفتوں کی بات ہے پھر رمضان کے مبارک مہینے کا آغاز ہو جائے گا۔ ہر شخص پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب کی بارگاہ سے رحمتیں سمیٹنے میں معروف نظر آئے گا لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس مقدس مہینے میں بھی دنیاوی منفعتوں کے پیچھے بھاگ رہے ہوں گے۔ زرپرست تاجروں اور نفع اندوزوں کا تو کہنا ہی کیا، قومی سطح پر بھی کہیں کہیں یہ رجحان نظر آتا ہے۔ بجلی کیوں بند ہے۔ جواب ملتا ہے کہ ذخائر میں پانی کی کمی ہے، گیس پوری نہیں مل رہی۔ آبی وسائل کی مجبوری اپنی جگہ، خوفِ خدا ہو تو گیس کی جگہ فرنس آئل اور کوئلے سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن وہ مہنگا ہوگا۔ صارفین سے فیول ایڈجسٹمنٹ چارجز لینے کے باوجود نفع کم ہو جائے گا۔ پانی کے بارے میں عشروں سے ایک شور ہے۔ نئے ذخائرِ آب کی تعمیر ہماری اولین ضرورت ہے لیکن سیاسی نعرے بازیوں میں اسے پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ کالا باغ ڈیم کے مخالفین سے کوئی سنجیدہ مکالمہ نہیں ہو رہا۔ محفلیں ہوتی ہیں۔ نشستند و گفتند و خوردند و برخاستند سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ نمائشی منصوبے تگ و دو کر کے مکمل کر لیے جاتے ہیں، ناموں کی پختہ تختیاں نصب کر دی جاتی ہیں لیکن عام آدمی اور مجموعی طور پر قوم کی فلاح اور بہتر مستقبل کے لیے کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔ ملک میں بڑے یا چین کی طرز پر معقول تعداد میں چھوٹے ذخائرِ آب موجود ہوں تو پہاڑوں اور دریاؤں سے آنے والا میٹھا پانی سمندر برد ہونے کے بجائے فصلوں کی آبیاری اور سستی بجلی کی پیداوار کے کام آسکتا ہے۔ ملک کے بالائی علاقوں میں پہاڑی ندی نالوں پر متعدد چھوٹے بجلی گھر چل رہے ہیں جو مقامی ضروریات بخوبی پوری کرتے ہیں۔ کاش ہمارے رہنما صحیح سمت میں سوچنے اور درست فیصلے کرنے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ اس روشن امید کے ساتھ چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں سرکش اور سعادت مند قارئین اپنے سندیسوں کے ساتھ موجود ہیں۔

کراچی سے سعدیہ قادری کی انہونی دعا ”پہلے تو میں ٹائٹل سرسری دیکھا کرتی تھی لیکن جب سے تبصرہ لکھنا شروع کیا ہے تب سے تھوڑا غور سے دیکھنے لگی ہوں۔ اس ماہ کی ٹائٹل گرل کو دیکھ کر کافی حیرت ہوئی کیونکہ اس کی آنکھ ناک کان کچھ بھی متوازن نہیں تھا پھر میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ شاید رنگوں میں سے کسی رنگ کی ہیروئن کو لقوہ کا مرض ہو لیکن رنگ پڑھنے کے بعد یہ سوچ بھی غلط ثابت ہوئی، پلیز ذرا سرورق کا معیار بہتر کریں یا پھر بیس پچیس سال پرانے سرورق ریپیٹ کر لیا کریں۔ اداریے پر بس یہ کہوں گی کہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی، نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت آپ بدلنے کا۔ نکتہ چینی میں بابر عباس شکوک و شبہات کا اظہار کرتے نظر آئے، آپ کو ایسا کیوں لگا کہ یہ زویا کی تحریر نہیں۔ زویا ایک خاتون ہیں اس لیے؟ ویسے اگر آپ کو پتا چل جائے کہ زویا کہاں سے اپنی کہانیاں لکھواتی ہیں تو مجھے ضرور بتایئے گا، میں بھی دو چار کہانیاں اپنے نام سے لکھوا کر رائٹر بننے کا اعزاز حاصل کر لوں گی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ بچے امتحانات سے فارغ ہو کر نانی کے گھر گئے تو میں نے قفس شکن پڑھنا شروع کی، زویا نے ہر بار کی طرح کمال کر دیا، ایک ہی کہانی میں دیارِ غیر کی کشش، ملکی سیاست میں غیر ملکی حسیناؤں کی مداخلت، کم عمر خواتین اساتذہ جیسے موضوعات کو مصنفہ نے خوبی سے پیش کیا۔ امید ہے آپ ایسے ہی متنوع موضوعات کے ساتھ لکھتی رہیں گی۔ اس ماہ انگارے بھی اپنے دامن میں کافی ہنگامے سمیٹے ہوئے تھی۔ انگارے کی صرف ایک ہی بات مجھے ناپسند ہے وہ یہ کہ بہت جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس اپنے مخصوص انداز میں ترجمہ شدہ کہانی لے کر آئے، سسپنس سے بھرپور قدم قدم پر ایک نیا موڑ لیتا، اس سال کا اب تک کا بہترین ترجمہ شدہ ناول ثابت ہوا۔ جمال دستی کی اعتراف میں دیر آید درست آید کی طرح اسکٹ نے بالآخر اپنی محبوبہ کو پا لیا۔ سراغ میں نوے فیصد انگلش کہانیوں کی طرح مجرم اپنی معمولی سی غلطی اور سراغ رساں کی حاضر دماغی کی وجہ سے پکڑے گئے۔ اس کے برعکس رقیب روسیاہ میں شیراز احمد آسانی سے بچ نکلا۔ ایک طرف تو ڈی این اے ٹیسٹ کروائے گئے جبکہ دوسری جانب کسی نے کمرے اور گلدان پر سے فنگر پرنٹ تک نہ اٹھائے۔ اور ماں تو اپنی اولاد کو اس کی خوشبو سے ہی پہچان جاتی ہے اس کو بھی شیراز اور سرفراز میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ منظر امام نے ایک اور معاشرتی برائی کو کہانی کے میں ظاہر کیا، یہ ہمارے معاشرے کی حقیقت ہے کہ ہم خود تو کوئی اچھا کام کرتے نہیں اور کوئی دوسرا وہ کام کرے تو اس کی راہ میں روڑے اٹکانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ رضا کا رمقتول میں جاسوسہ کی ساری جاسوسی دھری رہ گئی۔ شکار، اعتزاز کی اب تک کی بہترین تحریر ثابت ہوئی، اگر اس کی طوالت کو تھوڑا بڑھا دیا جاتا تو یہ سرورق کے رنگ کے لیے اچھی رہتی۔ سیاہ رات میں سمیع ماضی کے راز سے پردہ اٹھانے میں کامیاب رہا۔ ہار کی گواہی کو نظر انداز کرتی آگے بڑھی تو تمکین رضا کے انتخاب پر نظر جا رکی جس کا انجام غیر متوقع چونکا دینے والا رہا۔ محمد فاروق انجم نے نگہت کے عشق کو زین اور رمشا کے لیے وبال بنا دیا۔ روبینہ رشید کی آہنی فریب میرے پسندیدہ موضوع جدید ٹیکنالوجی کو لیے ہوئے تھی، تیمور کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ کاش وہ زندہ رہ کر اپنے کام کو آگے بڑھتا دیکھ سکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر ایجادات اپنے موجد کے دنیا سے گزر جانے کے بعد ہی زیادہ اہمیت پاتی ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ ملک میں اس سال لوڈشیڈنگ بالکل بھی نہ ہو۔“

کوئٹہ سے سیف خان کی کھلی باتیں ”اپریل کے شمارے کا سلمی اور بیکار سا سرورق دیکھ کر دل سے آہ نکل گئی۔ (معذرت۔ ذاکر حسین کی علالت کے سبب ایمرجنسی میں متبادل پر انحصار کرنا پڑا) فہرست میں البتہ امجد رئیس کا نام ابتدائی صفحات پر نظر آیا تو ڈوبتے دل کو کچھ قرار آنے لگا۔ رنگوں میں روبینہ رشید کو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دیکھ کر طبیعت مزید سنبھلنے لگی۔ وکٹری اسٹینڈ پر اس مرتبہ (انگارے کے) سجاول ڈاکو بیٹھے مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے۔ جی بیٹا، جگت تو جگت ہوتی ہے۔ ٹھنڈی ہو یا گرم۔ عائشہ مرزا، آپ شاعر نہیں ہیں ناں۔ ورنہ ان ہواؤں کے تذکرے یوں سر سے نہ گزرتے۔ ماہ رخ ارباب اور سعدیہ قادری کے دبیز تبصرے پڑھ کے توطبیعت کچھ فلسفیانہ سی ہوگئی لیکن عبدالودود عامر نے نسوار کا ذکر کر کے سارا موڈ اَتھل پتھل کردیا۔ لاہور سے ثانو مہر الدین (ثانیہ مہر) اور اشفاق شاہین مل کر مسکین تاجور کو کوس رہے تھے جس پر بہ آواز بلند آمین کہا اور جتوئی کی راہ لی جہاں سے اکرم مہپال دانت دکھا دکھا کر تبصرہ فگن تھے۔ پہلے تبصرے پر مبارکباد اور محفل میں خوش آمدید۔ احمد اقبال صاحب کو ضرور لکھنا چاہیے۔ بے ایمانے زارا شاہ...... ٹنڈو الہ یار کا راز کھوجنے کی ہماری اپنی بھی کوششیں جاری ہیں۔ کہانیوں کی باری آئی تو سب سے پہلے آخری رنگ آہنی فریب کے ورق گھمائے۔ کہانی کے آغاز میں ہی مصنوعی ذہانت کا پڑھ کر کان کھڑے ہوگئے۔ روبینہ صاحبہ نے روایتی موضوعات چھوڑ کر ایک نئے ٹاپک پر تیز رفتار کہانی پیش کی۔ پل پل بدلتی صورتِ حال نے توجہ بھٹکنے نہ دی اور کہانی ایک ہی نشست میں ختم ہوگئی۔ ویلڈن۔ اس کے بعد ابتدائی صفحات کا طویل ناول کرچ کرلیا۔ یہ جاسوسی کی دوسری تحریر تھی جو ایک ہی نشست میں ٹک گئی۔ امجد صاحب نے توقع کے عین مطابق شاہکار ناول جمایا تھا۔ ابتدائی سین سے غائب ہوکر آخری سین میں سائمن نے کیا جذباتی انٹری ماری، پڑھ کر مزہ آگیا۔ نمک اور سارا کی کیمسٹری بھی کہانی پر چھائی رہی۔ بھاگ دوڑ۔ تیزی سے بدلتے...... حالات۔ اعتبار و بے اعتباری کی فضا کہانی کو جاسوسی کا مخصوص ٹچ دے رہی تھی۔ اوور آل یادگار ناول ثابت ہوا۔ شکار میں اعتزاز سلیم وصلی نے نقاب پوش قاتل کے روپ میں چکرائے رکھا۔ کہانی آخری پیراگراف اور اس سے ذرا پہلے کھلنے لگی تھی۔ ویلڈن برادر۔ شکار کو میں آپ کی پچھلی تمام تحریروں سے زیادہ نمبر دوں گا۔ مختصر تحریروں میں عمران قریشی صاحب کی رقیب روسیاہ پسند آئی۔ شیراز کو اپنے ہی بھائی کی صورت آستین کے سانپ سے واسطہ پڑا۔ اپنے ہی نشیمن پر گراتے ہیں بجلیاں۔ تاہم جوابی کارروائی نے سانپ بھی مار دیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔“

لاہور سے اشفاق شاہین کی پسند ناپسند ”سرورق اس مرتبہ مختلف سا اور اویں سا ہی لگا۔ چھوٹی سی چھلانگ کے بعد سیدھے چینی نکتہ چینی کی طرف لپکے جہاں سجاول داؤد خیلوی ابتدائی تبصرے پر متمکن نظر آئے۔ عائشہ مرزا گرمی کی آمد نہیں، آچکی ہے۔ ہمارے علاقے سے ملی آتش کی آمد خوشگوار لگی ویلکم بیک۔ بابر عباس حسنین عباس، صحیح کہا ایڈیٹر صاحب نے آپ کو تعریف کی کیا ضرورت آپ کا نام ہی کافی ہے۔ آپ کے بغیر محفل سونی سونی لگتی۔ طلعت مسعود ماہ رخ ارباب عبدالودود عامر اور ایمانے سید بہترین تبصروں کے ساتھ رونقِ محفل رہے۔ اکرم مہپالؔ ایمانے شاہ، ثانیہ مہر کی آمد محفل میں چار چاند لگا گئی۔ محمد اقبال، عجب گل، ادریس خان مختصر ناموں کے ساتھ شاملِ بزم تھے تو بلقیس خان عائشہ خان اور سعدیہ قادری کے نامے بھی محفل کی جان ٹھہرے۔ چلتے ہیں انگارے کی جانب۔ انیق کی یار ماری تو کنفرم ہوئی لیکن اس کی تلاش میں ناکامی اور سجاول کے دارج کو زخمی کرنے کے بعد حسبِ توقع شہزی پھر سے ایم ایم اے کے فائٹر کے روپ میں لوٹ آیا۔ رضوان کی آمد سے ہوسکتا ہے وائس وائے کی باریابی آسان ہوجائے البتہ تاجور کا ذکر اس بار مختصر رہا۔ آوارہ گرد کے ساتھ دو چار ہاتھ کیے۔ کاسپا کو اسٹاف سے نمٹے ہی تھے کہ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے وہاں پولیس کا پاکستانی روپ سامنے آیا۔ یاسمین اور روڈلف کے کردار بھی الجھن میں ڈال رہے تھے۔ رانسے بھی انجام کو پہنچا لیکن جانے اب کون سامنے آیا ہے نجات دہندہ یا پھر وہی کاسپا کو۔ سرورق کی پہلی کہانی وبالِ عشق فاروق انجم نے خوب لکھی۔ نکہت حیات کا کردار ایک جنونی کا سا تھا، انجام بھی عمدہ رہا۔ دوسری کہانی آہنی فریب عام موضوع سے ہٹ کر روبینہ رشید کی اچھی تحریر تھی۔ عالیہ کا کردار غالب رہا۔ اچھے بُرے لوگ ہر جگہ ہیں‘ تیمور اور شجاعت کے کردار بھی اپنی جگہ اہم تھے، کہانی پسند آئی۔ اولین صفحات کی کہانی سفینہ مرگ میں مجھے تو کوئی دلچسپی نظر نہیں آئی۔ (حیرت ہے!) رقیب روسیاہ مختصر مگر پُراثر اور دلچسپ گڈ عمران قریشی صاحب۔ اعتزاز وصلی کی شکار بہترین۔ آہستہ آہستہ وصلی کے قلم میں نکھار آتا جارہا ہے۔ ویلڈن اعتزاز بھائی۔“

چشمہ بیراج سے ساگر تلوکر کی تیراکی ’جاسوسی بروقت مل گیا۔ ٹائٹل سوہنا تھا۔ من کو بھا گیا، کیوں یہ کہانی پھر سہی۔ اداریے میں سیاست دانوں پر لکھا گیا مگر یہ نہیں سدھرتے۔ محفل میں سجاول دھمال ڈال رہے تھے بہت جچتی لگی۔ بلقیس خانم اللہ آپ کو صحت اور صبر دے۔ طاہرہ گلزار جو کہ باقاعدگی سے لکھتی تھیں غیر حاضر ہیں خیریت تو ہے۔ سفینہ مرگ امجد رئیس کے ترجے کی تعریف کرنا سورج کو موبائل لائٹ دکھانے کے مترادف ہے۔ انگارے شاہ زیب پاکستان چھوڑ کر پنگوں والی لائف میں لوٹ گیا۔ یہاں بھی پنگے وہاں بھی پنگے تبدیل تو نہ ہوا ناں۔ تاجور اور انیق کی کردار کشی کبھی، ہمیں امریکا کی سازش لگتی ہے۔ رضوان ٹی کی انٹری اچھی لگی۔ میرا فیورٹ کردار پہلوان ہے پلیز اسے اِن رکھا کریں۔ اس کے بغیر کہانی پھیکی پھیکی سی لگتی ہے۔ شعلہ زن کیا زبردست سبق آموز کہانی تھی۔ منظر امام ہمیشہ چونکا دینے والا اختتام کرتے ہیں۔ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ رقیب روسیاہ میں بھائی بھائی کا دشمن بن گیا۔ محض ایک گوگی عورت کے لیے۔ عورت کیا ہے سمجھ نہیں آتی۔ اس کی خاطر اتنے جھگڑے کیوں ہوتے ہیں، سمجھ نہیں آتی۔ انتخاب نکی سی کہانی تجسس سے بھرپور تھی پسند آئی۔ رضا کار مقتول میں کیا بے داغ منصوبہ بنایا مزہ آگیا۔ سرورق کی پہلی کہانی زبردست تھی۔ نکہت تو کوئی نفسیاتی مریض تھی۔ کتنی آسانی اور سفاکی سے محبوب کو پکڑ کا ڈالا۔ زین اور رمشا کو اذیت میں رکھا۔ زین اور رمشا کی محبت لائقِ تحسین لگی۔ سرورق کی دوسری کہانی آہنی فریب جدیدازم لیے ہوئے تھی۔ سیدھے رستے پر تکلیف تو ملتی ہے۔ عالیہ نے تکالیف سہہ کر کامیابی حاصل کرلی۔“

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کا شکوہ ”مارچ میں ہمیں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب کردیا گیا۔ پھر بھی ہم ڈھیٹوں کی طرح گھستے چلے آرہے ہیں۔ (بالکل صحیح کیا!) ٹھیک ہی کہا گیا ہے محبت اندھا کردیتی ہے۔ اپریل کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سرورق کا پوسٹ مارٹم کرنے کی ٹھانی...... خوبصورت گردن کے لیے راج ہنس کہا جاتا ہے لیکن اپریل کے شمارے والی گردن تو کسی بانس کے ٹکڑے سے مشابہ لگ رہی ہے۔ باہر کو نکلے دانتوں کے لیے کسی دندان ساز سے رابطہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ دائیں جانب تو سرورق پر یقیناً پرویز احمد لانگا کی 1980ء کی نادر تصویر معلوم ہورہی ہے بالوں کی مقدار سے جواب پت جھڑ کی طرح خالی ہوچکے ہیں۔ ان کے گھورنے سے خوف زدہ ہوکر جلدی سے نکتہ چینی میں صوفے پر بیٹھنے کے لیے نظر دوڑائی۔ سجاول خان

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے پہلی نشست پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ شاندار تبصرہ تھا آپ کا۔ مبارکباد......! اس کے بعد عائشہ مرزا کا کھٹا میٹھا تبصرہ پڑھا۔ طلعت ٹھیک کہا آپ نے آج کل سب کچھ مشینی ہوتا جا رہا ہے...... لیکن انہی مشینوں کے مرہونِ منت آپ دبئی سے ہمارے ساتھ پہنچ جاتے ہیں۔ ماہ رخ ارباب آپ دوستوں کی لفاظی پر محوِ حیرت ہیں اور ہم تو آپ کی اردو دانی پر آنکھیں پٹپٹا رہے ہیں۔ عائشہ خان ایک سوال کے لیے اتنی تمہید؟ سیدھا سوال کا باؤنسر مارنا تھا نا۔ سعدیہ آپ کا تبصرہ بہت اچھا ہے لیکن تاجور والی بات پر کہنا چاہوں گی۔ اگر اتنا ہی عزت کا مان ہوتا ہے تو پہلے گھر سے آئی کیوں تھی؟ عامر وودو، ثانیہ مہر و اشفاق شاہین کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ روبینہ رشید کا رنگ آہنی فریب جینئیس مائنڈز، سادہ اور منفرد رنگ لیے ہوئے تھا۔ لیکن مستقبل قریب میں یہ دور دور تک ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمارے دماغ کی ایجاد کمپیوٹر ہم پر کیسے سبقت لے جا سکتی ہے۔ انگارے نے اس بار دل جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ انیق کی یہ الٹی حرکتیں سمجھ سے باہر ہو گئی ہیں لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق داؤد بھائی کی بات نے ہماری امیدوں کو پھر سے کچھ زندہ کر دیا ہے...... داراب کو لنگڑا کر کے سجاول نے دل خوش کر دیا ہے۔ شاباش شاباش...... لیکن شاہ زیب کو کیا سوجھی آنا فانا رائے کے پیچھے سب چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا۔ رضوان کی انٹری بھی حیران کن ثابت ہوئی، اچھی قسط رہی۔ دیکھتے ہیں تیل اور تیل کی دھار کس سمت بہتی ہے۔ اعتزاز وصلی کی کہانیوں میں اب پختگی آتی جا رہی ہے۔ آخری شکار میں تو کمال ہی کر دیا ہے۔ ویلڈن...... لیکن تعریف کے ساتھ ایک پوائنٹ کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گی۔ کسی بھی ایٹمی پروگرام کے متعلق راز گھر میں نہیں رکھے جاتے اس میں بہت منظم طریقہ استعمال ہوتا ہے۔ ایسے پروگراموں پر کام کرنے والی ٹیم سے باقاعدہ حلف لیا جاتا ہے اگر ان کے لائف پارٹنرز بھی کسی اور ملک کے شہری ہوں تو ان سے بھی پوشیدہ رکھا جائے...... اشعلہ زن میں منظر امام نے ہمارے معاشرے کی ذہنی پستی کو خوب صورتی سے چند الفاظ میں عیاں کر دیا۔ رقیب روسیاہ بھی ٹھیک رہی لیکن کچھ تحقیقات تو بتانی چاہیے تھیں۔ وبالِ عشق کی عاشق کو عاشق کہوں یا نفسیاتی مریض۔ جو بھی تھی اسے چاہیے تھا پہلے کوئی ایکشن و سسپنس موی دیکھتی پھر رمشا کو اغوا کر کے بلیک میل کرتی۔ بے چاری کو پلاننگ نام کی نہیں آتی تھی اور کرنے چلی تھی قتل وہ بھی ایک بندے کے سہارے پر...... پہلے کیے گئے اناڑی قتل سے ہی کچھ سیکھ لیتی۔ ایسی کہانیاں ہی جاسوسی کے معیار پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اس کہانی کی جگہ سیاہ رات مختصر ہونے کے باوجود عمدہ تھی۔ آخر میں ایک معصوم سا سوال......'' (نہیں)

جدہ سے پرویز لانگاہ کی ماضی و حال کی باتیں ''دیکھیں جی میں بڑا ماضی پرست ہوں اور ماضی میں جو جاسوسی کے سرورق ہوتے تھے دیکھتے ہی لگتا تھا کہ اندر کی کہانیاں بھی لاجواب ہوں گی۔ مگر اب جس حساب سے سرورق بن رہے ہیں دل ہی نہیں کرتا کہ سرورق پڑھا جائے۔ سرورق کی دونوں تصویروں کو دیکھے بغیر اپنی محفلِ یاراں پہنچے جہاں مدیر پاکستان کے حالات اور سیاستدانوں کو لے کر پریشان نظر آئیں۔ ان شاء اللہ ایک دن ہمارے ملک کے دن بدلیں گے۔ خطوط میں ہمارے پیارے دوست سجاول خان براجمان تھے، بہت بہت مبارک ہو بھائی۔ بھائی سے شکوہ ہے کہ سجاول نام کا ہی بھرم رکھ دیتے کہاں انگارے کا سجاول کہاں آپ۔ دوسرے تبصرے میں عائشہ خان معصومیت کی ہر حد پار کرتی آئیں۔ کے جی کلاس کی اسٹوڈنٹ نہ ہو تو۔ ایمانے زارا شاہ خود کو للیاسین سمجھتے ہوئے ٹرینڈ سیٹر ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا تھیں۔ ایمانے بیٹا، میری ہونے والی بہو ہے، ہوش میں آؤ۔ عبدالودود عامر کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ دبئی سے ہمارے غنچے طلعت مسعود ہم کو ایک آنکھ بند کرانے پر تلے تھے مگر میرے لاڈلے ڈر اس دن سے جب مجھ سے سامنا ہوگا۔ کراچی والوں کا میں بڑا فین ہوں، ان کے تبصرے بڑے جاندار ہوتے ہیں۔ ماہ رخ ارباب اور سعدیہ قادری کے تبصرے بہت اچھے تھے البتہ لاہور سے ثانیہ عرف غفور بھائی کی بہت دنوں بعد آمد اچھی لگی۔ اس لڑکی کا دماغ اندر سے بالکل خالی ہے تبصرہ ہی دیکھ لیں۔ (اچھا!) باقی تبصروں میں علی رضا، اکرم میال، اشفاق شاہین اور مرزا صاحب کے تبصرے اچھے تھے۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی اور یہ قسط پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ کہانی کا جو ٹمپو چل رہا تھا، اس کو بالکل ٹھنڈا کر دیا گیا ہے۔ انیق کا یہ روپ بہت دھماکے دار ہے، سوچا کہ اس قسط میں اس کے ساتھ زبردست معرکہ ہوگا مگر عمران خان کی طرح یہاں یوٹرن لیا گیا۔ انگارے کے ایک کروڑ قارئین کا مطالبہ ہے کہ تاجور کا رام نام ستے کرایا جائے اور قسطینا کو ان ایکشن لایا جائے۔ شاہ زیب کا یوں پاکستان چھوڑ کر واپس وائے کی طرف جانا لگ رہا ہے جیسے مغل صاحب کہانی کو جلدی سمیٹنے کے چکر میں ہیں۔ پلیز ابھی ختم نہ کریں کہ یہی تو جاسوسی کی جان ہے۔ اعتزاز وصلی کی شکار میں کافی کچھ اوٹ پٹانگ سا تھا۔ ایک اتنی بڑی تنظیم والی لڑکی کو فیس بک پر لڑکا پھنسا کر پاکستان اپنے مشن پر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اوور آل مزہ نہیں آیا، شکار آخری شکار سے بہتر نہیں تھی۔ سیاہ رات بہت بچکانہ لگی، کہانی لکھنے والے نے اپنا مذاق خود بنا لیا کہ اتفاق کی بھرمار کرا ڈالی۔ ہار کی گواہی اور اعتراف نے دل جیت لیا جبکہ رقیب روسیاہ اور رضا کار مقتول گزارے لائق ہی رہیں۔ مختصر کہانیوں میں منظر امام کی شعلہ زن کا انجام بڑا ہی دردناک تھا اور گہرا صدمہ پہنچا۔ بہت ہی فنٹاسٹک لکھتے ہیں امام صاحب۔ رنگوں میں وبالِ عشق پڑھ کر خوب قہقہے لگائے، عجیب فضول بھاگ دوڑ تھی۔ اتنی تو میں گاڑی نہیں چلاتا جتنا اغوا کار نے چلا لی۔ فاروق انجم لگتا ہے آج کل سوتے میں کہانی لکھ دیتے ہیں۔ روبینہ رشید کی آہنی فریب شمارے کی یادگار تحریر ثابت ہوئی۔ جدید ماحول، سنسنی اور ایکشن نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ روبینہ رشید میری فیورٹ بن گئی ہیں۔ امجد رئیس جب بھی آتے ہیں، چھا جاتے ہیں۔ ان کا نام ہی اعلیٰ کہانی کی نشانی ہوتی ہے اس لیے پورا ڈائجسٹ ختم کرنے کے بعد ان کی کہانی بچا کے رکھ لی ہے تاکہ بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو سکوں۔''

عبدالودود عامر کی کلر سیداں سے تبصرہ نگاری ''اپریل کا شمارہ اس بار خلاف توقع پہلی تاریخ کو مل گیا۔ شمارہ ملتے ہی سب سے پہلے سرورق کا ایکسرے کیا پس منظر میں آدھا ادھورا مکان تھوڑا سا سبزہ اور ایک بڑی سی خاتون نما مخلوق کے ساتھ نیچے غالباً کسی ڈاکیے کی تصویر تھی۔ یہ سرورق کیا ڈاکر انکل نے بنانے چھوڑ دیے ہیں؟ جاسوسی ملک کا ایک بڑا شمارہ ہے اور اس کے سرورق کا معیار بھی کم از کم اسی لیول کا ہونا چاہیے۔ (یقیناً) اس حوالے سے ادارے کو مزید بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد چٹپٹی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ ویسے تو اب حالات ایسے ہیں کہ نکتہ ہٹا کر چینی ہی چینی لکھ دیا جائے تو بھی چلے گا۔ اداریے میں ملکی حالات کا تجزیہ کیا گیا تھا اور سینیٹ کے انتخابات میں جو خرید و فروخت کا بازار گرم ہوا، اس کا ذکر کیا گیا تھا۔ بلاشبہ ہمیں سوچنا چاہیے ہم کیسے لوگوں کو اپنا راہنما بناتے ہیں۔ ابتدائی تبصرے پر محمد سجاول خان براجمان تھے۔ سجاول خان مبارک ہو بہت اچھا تبصرہ تھا آپ کا۔ ایمانے زارا شاہ کی بے

ایمانیاں بھی کمال تھیں اور ایمانے ایہ لیں آپ کا ذکر کر دیا خوش ہو جائیں۔ عائشہ مرزا کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین اور لاجواب رہا۔ بلقیس خان اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ اور یہ عباس برادران کیا تینوں مل کر ایک تبصرہ لکھتے ہیں؟ جب بھی ان کا تصور کرتا ہوں پتا نہیں کیوں انڈیا کے عباس مستان عرف وائٹ برادران ذہن میں آجاتے ہیں۔ طلعت مسعود کی سعادت مندی اچھی لگی۔ ماہ رخ ارباب کی التجا تھی یا استدعا بہرحال ان کا تبصرہ بالخصوص قابلِ تعریف ہے۔ عائشہ خان کوئی ٹیچر ہیں جو سوالات کا پلندہ لے کر آتی ہیں خیر انگارے کے حوالے سے آپ سے متفق ہوں۔ سعدیہ قادری صاحبہ کا تبصرہ کسی تعریف کا محتاج نہیں اور اکرم میال صاحب بھی اس بار قسم توڑ بیٹھے اور زبردست تبصرہ کھڑکا دیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے کا رخ کیا۔ انگارے سے لاکھ شکایتیں ہی سہی لیکن اس کا نشہ اپنی جگہ ہے۔ کمبخت چھوٹتی نہیں منہ کو لگی ہوئی۔ اس بار شاہ زیب کو دوبارہ ایکشن میں دیکھ کر خوشی ہوئی اور دوسری طرف سجاول کی کارستانی دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تاجی شاید شاہ زیب کو مل ہی جائے داراجیوں کے پاس جائے بغیر۔ آوارہ گرد میں شہزی اس بار ادھر اُدھر کے معاملات میں الجھا رہا۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس سفینہ مرگ کے ساتھ مغربی رنگ لے کر آئے تھے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلے رنگ کے ساتھ فاروق انجم وبالِ عشق لے کر آئے ہوئے تھے۔ زین کا مضبوط کردار پوری کہانی میں چھایا رہا اور نگہت کے کردار نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ عورت ضد پر آجائے تو کس حد تک جاسکتی ہے اور یہ عشق تھا بھی نہیں ٹوٹلی ضد تھی۔ دوسرے رنگ کے ساتھ روبینہ رشید آہنی فریب لیے موجود تھیں۔ یقیناً جہاں ٹیکنالوجی کے بہت سارے فوائد ہیں وہاں اس کا غلط استعمال اور اگر یہ غلط ہاتھوں میں چلی جائے تو دنیا جہنم بن جائے۔ روبینہ رشید اپنے مخصوص انداز میں ایک مضبوط ہیروئن لے کر آئی تھیں۔ ایک طرف عالیہ کی جدوجہد نے کہانی کو مضبوط پلاٹ فراہم کیا تو دوسری جانب تیمور کے کردار نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ مختصر کہانیوں میں اعتزاز سلیم وصلی کی شکار سب سے پہلے پڑھی۔ ویلڈن اعتزاز! بہت اچھا لکھا بس کہانی کے اینڈ میں نعیم کی موت کا دکھ بھی ہوا۔ اگر اسے مارا نہ بھی جاتا تو کہانی اچھی ہی تھی بہرحال مجموعی طور پر کہانی کا تاثر اچھا رہا۔ اس کے علاوہ وسیم بن اشرف کی رضا کار مقتول اور منظر امام کی شعلہ زن بھی پسند آئیں۔“

صوابی سے کوثر اسلام کے سوال در سوال ”مدت دراز کے بعد بزمِ یاراں یعنی چٹنی نکتہ چینی میں حاضری کی جسارت کر رہا ہوں۔ سرورق دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا۔ کسی بھی قسم کی منظر کشی، جاذبیت اور دلکشی سے عاری سرورق تو کبھی جاسوسی کے نہ تھے۔ اداریہ حسبِ معمول فکر انگیز تھا۔ محمد سجاول متمکن تھے۔ بہت مبارک ہو سجاول بھائی۔ امید ہے اسی طرح لکھتے رہیں گے۔ اکرم میال نے قسم توڑ دی اب کفارے کے طور پر ہر ماہ تبصرہ لکھتے رہیں۔ محفل کے بارے میں اسا اور شاہ سے متفق ہوں پہلے جیسی نوک جھوک اب نظر نہیں آرہی۔ ایمانے زارا شاہ بہت جلدی میں دکھائی دیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ان کا قلم زبان سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ماہ رخ ارباب، عبدالودود، عامر، تانیہ مہر اور طلعت مسعود کے تبصرے کافی دلچسپ تھے۔ سفینۂ مرگ امجد رئیس کی بہت عمدہ تحریر تھی۔ امجد رئیس کو تراجم میں یدِطولیٰ حاصل ہے تجسس تحیر اور سسپنس آخر تک برقرار رہا۔ منظر نگاری بہت کمال کی تھی۔ کردار آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے محسوس ہوئے۔ جس وقت نک اور سارا کا تعاقب ہو رہا تھا دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جینے کی خواہش سارا جیسی لڑکی کو بھی بہادر اور نڈر بنا دیتی ہے۔ کچھ باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔ برلن کے ہوٹل میں جب آتشزدگی ہوئی۔ تو ڈی این اے اور ڈینٹل ٹیسٹ کے بغیر محض انگوٹھی کی وجہ سے لاش سائمن کی قرار دی گئی۔ سی آئی اے سے تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ بھیس بدلنے کے باوجود نک کو کیسے پہچانا گیا۔ ایتھنا کے کمزور تار کے ذریعے سارا اور برونی کیسے اوپر چڑھ گئے۔ مائس بہت دور سارا ایوی وغیرہ تک پہنچ سکتا ہے لیکن ایمسٹرڈیم میں موجود سائمن سے بے خبر ہے۔ آخر میں سائمن اور سارا کے عدم ملاپ کا افسوس ہوا۔ اعتراف کے ذریعے جمال دتی نے بہت اچھی کوشش کی۔ لگن جذبہ اور مسلسل محنت کے ذریعے کامیابی یقینی بن جاتی ہے جیسے کیرولین تیس سال پہلے ماضی کی گرد میں دبے ہوئے رازوں سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہوا۔ سراغ تنویر ریاض کی بہت عمدہ کہانی تھی۔ رقیب روسیاہ نے کچھ دیر تک شاک کی سی کیفیت میں مبتلا کیا۔ سرفراز کو بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اس میں سعدیہ بھی کم قصوروار نہیں تھی۔ کہانی نے کئی سوال اٹھائے جو تشنہ رہے۔ شعلہ زن کا ابتدائی حصہ غیر متاثر کن اور بعید از حقیقت لگا۔ ماریہ کا باپ بدمعاشوں سے مار کھا کر آیا اور اس کی بیٹی نے ان کی پٹائی کر دی۔ ماریہ کی لڑائی کو دیکھتے ہوئے اسے مارشل آرٹس سکھانا چاہیے تھا نہ کہ باکسنگ۔ امجد کو بلاوجہ کہانی میں داخل کیا گیا۔ کہانی میں اس کا کوئی کردار نہیں۔ آخر میں بم دھماکے نے اداس کر دیا۔ (کہانی بننے اور آگے بڑھانے کے لیے) رضا کار مقتول وسیم بن اشرف کی بہت عمدہ کہانی تھی۔ سسپنس آخر تک برقرار رہا۔ کالکن نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر مسز زیروس کو پکڑا اور نہ اس کا منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل اور بے داغ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اعتزاز سلیم کی تحریر میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ شکار میں جہاں فیس بک کی دوستی کی حقیقت بیان کی گئی وہاں پولیس سسٹم کی خامی بھی دکھائی گئی۔ پیسے کا لالچ تھا تو حب الوطنی بھی تھی۔ ذیشان کی پولیس کو شکایت سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ قاتل وہی ہے۔ ذیشان جیسے ہزاروں کردار ہمارے معاشرے میں ہیں جو پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آخر میں جب ذیشان کمرے میں داخل ہوا تو شعیب اور نجم کے بجائے بے ہوش پڑے نعیم کو کیوں گولی ماردی۔ سیاہ رات بچکانا سی کہانی تھی۔ اتفاقات کی بھرمار تھی جو بچوں کی کہانیوں میں ہوتے ہیں۔ تہ خانے کا ملنا۔ دروازے کے ساتھ دو تین بار ہاتھ مار کر جانے کا راستہ۔ ڈھانچوں کے ساتھ رسی۔ تمام دوستوں کا ایک گھر میں آنا عجیب اتفاقات تھے۔ احسن سمیع کے کندھوں پر بیٹھ کر 12 فٹ بلند تہ خانے کی چھت تک کیسے پہنچ گیا۔ ابتدا سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈائری تہ خانے میں لکھی گئی ہے جب کہ انسپکٹر ظہور کے مطابق اس نے حسنین کو مار کر اس کے دو ساتھیوں کے ہاتھ پیر کاٹے اور تہ خانے میں پھینک دیا۔ پھر ڈائری کے واقعات کب لکھے گئے۔ ہار کی گواہی اچھی کہانی تھی۔ امینڈا اگر پولیس اسٹیشن جانے کے بجائے پولیس کو کال کرتی تو اچھا ہوتا جیسے اس نے آخر میں خطرے کے وقت کیا۔ فیونا کا کردار ہمارے معاشرے میں عام ہے بلکہ اکثر عورتیں بات ہضم ہی نہیں کر سکتیں۔ جب تک سنی گئی بات کے ساتھ دو تین باتیں ملا کر آگے نہیں پہنچا تیں انہیں آرام نہیں آتا۔ تمکین رضا کا مختصر انتخاب بہت زبردست تھا۔ شروع میں منظر کشی قبر کی سی معلوم ہوئی۔ مصنف نے آخر میں چونکا دیا۔ زین کی بھاگ دوڑ اور نگہت کی چالاکیوں سے بھرپور سرورق کی پہلی کہانی بہت عمدہ تھی۔ نگہت کا جنون انتہا کا تھا تو زین کی استقامت بھی قابلِ دید تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی آہنی فریب ایک لاجواب کہانی تھی۔ کہانی جاسوسی کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ ایسی کہانیاں بہت کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔“

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

یو اے ای سے طلعت مسعود کی انتظار کی گھڑیاں ”جاسوسی کے ٹائٹل پر جیسے ہی نظر پڑی پہلے تو چیخ ہی نکل گئی۔ ایک دو دفعہ ڈائجسٹ الٹا سیدھا کرنے اور غور سے دیکھنے پر یہ معلوم ہوا کہ ٹائٹل پر ہے تو ایک خاتون ہی لیکن شاید اس نے گردن نئی لگوائی ہے یا پھر چہرہ تبدیل کروالیا ہے کیونکہ اس کی گردن اور چہرے میں کوئی تعلق دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ ویسے بھی آجکل منہ، ناک بدلنے کا فیشن بھی چل رہا ہے تو شاید ٹائٹل بھی متاثرین میں شامل ہو گیا۔ لیکن یہ ٹائٹل جب سے جاسوسی پڑھنا شروع کیا ان میں سے شاید سب سے بُرا لگا۔ (آپ سے متفق ہیں) کبھی کبھی تو ٹائٹل اتنے دل موہ لینے والے ہوتے تھے کہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اب دوبارہ سے اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ محفل چینی نکتہ چینی کے ابتدائی صفحات پر سجاول خان صاحب تقریر کر رہے تھے۔ مبارک باد جناب۔ تبصرہ متوازن اور جاندار رہا۔ آگے بڑھے تو عائشہ مرزا صاحبہ سب کی سرگرمیاں نوٹ کر رہی تھیں جبکہ علی رضا آتش صاحب طویل عرصے بعد آئے اور طبیعت طبیعت کرتے چلے بھی گئے۔ بلقیس صاحبہ کا تبصرہ عمدہ رہا خاص کر تاجور کے بارے ان کی رائے بڑی پسند آئی۔ ماہ رخ ارباب صاحبہ کا خوب صورت لفاظی کے ساتھ پُر مغز تبصرہ بہترین رہا۔ ماہ رخ صاحبہ آپ تو چھپی رستم نکلیں! اسی طرح آتی رہیں۔ عائشہ خان صاحبہ پرانی الجھنوں کو سلجھا کر نئی الجھنیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ ویسے آپ کی کافی الجھنیں تاجور نے دور کر دی ہیں۔ سعدیہ قادری صاحبہ کا تبصرہ ہمیشہ عمدہ بھرپور جاندار ہوتا ہے۔ مس ہاہاہا اسا اور شاہ صاحبہ پچھلے صدی کی باتیں کر کے چلی گئیں۔ اب امید ہے اگلی دفعہ موجودہ دور پر بھی کچھ رائے دیں گی۔ عبدالودود عامر اور ثانیہ مہر کے تبصرے بھی عمدہ رہے جبکہ چھوٹے انکل اکرم سیال کی پہلی حاضری متاثر کن رہی۔ انگارے میں شاہ زیب کو تاجور کا دکھ کچھ زیادہ ہی لگ گیا حالانکہ لگنا تو نہیں چاہیے تھا جو پاکستان کے معاملات کو ادھر ہی ادھورا چھوڑ کر بینکاک پہنچ گیا۔ اب بینکاک میدانِ جنگ بنتا ہے یا پھر ڈنمارک کی طرف پرواز ہوتی ہے اس کا انتظار ہے۔ انگارے کے بعد رخ کیا رنگوں کی جانب۔ پہلے رنگ نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ایسا طوفانی عشق جو اچانک شروع ہوا اور ایک دم سے انتہا تک پہنچ گیا۔ دوسرا رنگ اس ماہ کا بہترین رہا۔ جدید ٹیکنالوجی کے استعمال اور مصنوعی ذہانت کے تڑکے کے ساتھ ایکشن اور تھرل سے بھرپور کہانی نے جہاں انجوائے کرایا وہاں تیمور خالد کے انجام پر افسوس ہوا۔ شعلہ زن از منظر امام کا انجام بہت دکھی رہا۔ ہمارا معاشرہ تو اپنے حق کے لیے لڑنے والی کسی بھی ماریہ کے ساتھ کم کھڑا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اگر کوئی ماریہ حالات کا مقابلہ کر کے ایک مقام پر پہنچے تو پھر کچھ خود ساختہ ٹھیکیدار ان کی جان بھی لے لیتے ہیں۔ اعتزاز سلیم وصلی کی تحریروں میں وقت کے ساتھ ساتھ پختگی آتی جا رہی ہے۔ شکار اچھی رہی۔ کہانی کا پلاٹ اور تحریر کی روانی دونوں عمدہ رہے بس کچھ جگہوں پر رومانس ایکسٹرا اور بے محل محسوس ہوا خاص کر انتہائی اہم مشن پر جانے سے پہلے کرن اور نعیم کا رومانس بے محل لگا۔ امید ہے وقت کے ساتھ اعتزاز مزید اچھی اچھی تحریریں دیتے رہیں گے۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس کی تحریروں کا انتظار رہتا ہے اور اس بار بھی امجد رئیس سفینۂ مرگ کی صورت ایک ایکشن، تھرل سے بھرپور کہانی کے ساتھ موجود تھے۔ کہانی کے تیز رفتار واقعات کے ساتھ امجد صاحب نے رومانوی جذبوں کی لفاظی جس خوب صورت انداز میں اور جملوں میں کی، اس نے کہانی کا مزہ دوبالا کر دیا۔ اس ماہ کی اس بہترین کہانی کے بعد ابھی مزید کہانیوں مطالعے کے انتظار میں ہی ہیں۔ اسی لیے ہمیں بھی فی الحال یہیں تک اجازت۔“

ہری پور سے شاہد ذوالفقار کی تصحیح ”ہر ماہ کوشش ہوتی ہے کہ تبصرہ لکھوں مگر کل پر چھوڑتے چھوڑتے تاریخ ہی نکل جاتی ہے۔ اس بار سرورق بالکل پسند نہیں آیا، اس میں جاسوسی کے سرورق والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ سرورق کی حسینہ کی گردن بہت پتلی تھی اور کندھے بھی بہت چھوٹے اور چہرے سے ہٹ کر تھے۔ اس لیے سرورق کی حسینہ حسین نظر آنے کے بجائے عجیب نظر آرہی تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی کہ پچھلی قسط بہت سنسنی خیز جگہ پر ختم ہوئی تھی۔ امید تو تھی کہ اس قسط میں انیق کے رویّے کے متعلق وضاحت کی جائے گی مگر یہ قسط پڑھ کے ایسا لگا کہ مغل صاحب کو سمجھ ہی نہیں آرہی کہ کہانی کو کس سمت میں بڑھایا جائے۔ اس لیے انہوں نے زور زبردستی سے شاہ زیب کو تھائی لینڈ بھیج دیا۔ وہاں پر بھی پتا نہیں کیوں اتنا مزہ نہیں آیا، شاہ زیب کے ساتھ اتفاقات بہت زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بوریت ہو جاتی ہے۔ آوارہ گرد کی پچھلی قسطیں پڑھ رہا تھا۔ شروع میں اچھی لگ رہی تھی لیکن آگے جا کے کافی بور لگنے لگی کہ اس میں بھی اتفاقات کی بھرمار ہو گئی تھی۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ وبالِ عشق فاروق انجم نے لکھا۔ بس ٹھیک ہی لگا۔ زیادہ مزہ نہیں آیا۔ نگہت محبوب کی لاش کو باہر بھجواتی ہے پھر منگواتی ہے پھر بھجوا دیتی ہے۔ بس اسی طرح کر کے کہانی کے صفحے پورے کیے گئے۔ دوسرا رنگ آہنی فریب روبینہ رشید نے بہت اچھا لکھا۔ کچھ چیزیں سر کے اوپر سے گزر گئیں کہ کمپیوٹر کے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، اس کے باوجود یہ رنگ پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ اعتزاز سلیم کی شکار دلچسپ تحریر تھی۔ بس یہ سمجھ نہیں آیا کہ انجم وہ کاغذات ہر وقت پاس کیوں رکھتا تھا اور اتنے سال سے اس نے وہ کاغذات کسی کے حوالے کیوں نہیں کیے تھے اور اسے کیسے پتا تھا کہ اس بار قتل نہیں ہوگا، اس سے خواہ مخواہ شک انجم پر ڈالا گیا۔ ذیشان اگر ویب سائٹ پر ویڈیوز ڈالنے کے لیے قتل کرتا تھا تو ہر سال ایک مخصوص تاریخ کو مخصوص کمرے میں قتل کرنے کی کیا تُک تھی؟ اس کی وجہ بھی سمجھ نہیں آئی۔ یہ چند خامیاں نہ ہوتیں تو یہ تحریر بہت زبردست ہوتی۔ آپ نے پچھلی بار میری درخواست کو درخورِ اعتنا قرار دے کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اس ماہ پھر ابتدائی صفحات پر انگلش کہانی دے دی۔ اس بار پوری کوشش کی کہانی پڑھنے کی مگر دس بارہ صفحات دو گھنٹے لگا کر پڑھنے کے باوجود کچھ پلّے نہ پڑا۔ عجیب سے غیر جذباتی مکالمے اور کردار ہوتے ہیں انگلش کہانیوں کے اوپر سے اتنے مشکل مشکل نام۔ بس الجھن ہی الجھن ہوتی ہے مزہ ذرا نہیں آتا۔ (حیرت ہے۔ سب سے زیادہ پسند کی جانے والی کہانی، آپ کو پسند نہیں آئی!) منظر امام کی شعلہ زن ناقابلِ فراموش تحریر رہی جس کا اینڈ بہت دکھی کر گیا۔ ہمارے لوگ بھی عجیب ہیں جن کو مارنا ہو وہاں تماشا دیکھتے رہتے ہیں اور اس وجہ سے لڑکیوں کو مار دیا گیا کہ وہ مردوں کے سامنے کھیلیں گی۔ یہ بڑی برائی ہے۔ عمران قریشی کی رقیب روسیاہ نے بھی آخر میں دلچسپ موڑ لیا، مزے کی تحریر رہی۔ تبصروں میں سجاول خان کا شاید پہلا تبصرہ تھا اور پہلی بار ہی پہلے نمبر پر آ گیا۔ مبارک ہو بھائی۔ اکرم سیال، اسا اور شاہ اور ماہ رخ ارباب کو پہلی انٹری پر خوش آمدید۔ یہ سب ہاشمی بھائی کی کرامات ہیں جو گروپ میں سب کو تبصروں کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ ہاشمی بھائی سے درخواست ہے کہ جلدی سے سرورق کا رنگ لکھیں۔ کبیر بھائی کی کہانی کا بھی انتظار ہے۔ ایمانے زارا، عبدالودود اور طلعت مسعود کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ ایک چیز کی سب کو یاد کرا دوں کہ ذوالفقار میرے ابو کا نام تھا جو فوت ہو چکے ہیں۔ پچھلی بار پتا نہیں کیوں سب نے میرا نام شاہد کے بجائے صرف ذوالفقار لکھا تھا۔“

قصور سے علی آتش کی زمیاں ”سرورق کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ میں جب سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں، پہلی دفعہ اتنا بُرا سرورق دیکھا ہے۔ اسے ناپسند کرتے ہوئے محبتوں چاہتوں سے بھری محفل میں پہنچے۔ سب سے پہلے اپنا تبصرہ دیکھا۔ اس کے بعد باقی تبصرے پڑھے۔ محمد سجاول کا تبصرہ واقعی صدارت کا حق دار تھا۔ تبصرے سارے اچھے ہوتے ہیں چند تبصرے زیادہ اچھے لگے جن میں عباس برادران، طلعت مسعود، اسا اورشاہ، ایمانے زارا شاہ، عائشہ خان، ماہ رخ ارباب شامل تھے۔ اس کے بعد انگارے پر پہنچے کیوں کہ آتش اور انگارے چیز تو ایک ہی ہے اب لگتا ہے انگارے کا اینڈ نزدیک ہے اب شاہ زیب ہمیں دیس بدیس کی سیر کروائے گا۔ ڈ۔تھ اسکواڈ کو نا کوں چنے چبوائے گا۔ ہمارا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ اس کے بعد سرورق کے دوسرے رنگ روبینہ رشید کے آہنی فریب پر پہنچے۔ بہت باکمال تحریر تھی۔ ایسی ایک موٗی بھی دیکھ رکھی ہے لیکن تحریر کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے ایسی اسٹوریز متواتر آتی رہنی چاہئیں۔ اس کے بعد وبالِ عشق پڑھی۔ ہوس کو عشق کا نام دے کر جدوجہد کرنے والے مجھے بہت برے لگتے ہیں۔ اسٹوری اچھی ہونے کے باوجود پسند نہیں آئی۔ اس کے بعد سب سے پہلی اسٹوری سفینۂ مرگ پڑھنی شروع کی لیکن مغربی تلخیص ہونے کی وجہ سے کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ اس کے بعد چھوٹی اسٹوریز کی باری آئی تو سب سے پہلے منظر امام کی تحریر شعلہ زن پڑھی۔ منظر امام جانے کہاں کہاں سے اتنی تلخ کہانیاں ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ اس کے بعد انتخاب بہترین اسٹوری لگی۔ سوچا کچھ، نکلا کچھ۔ پھر شکار کی باری آئی۔ تحریر سسپنس سے بھرپور تھی۔ اس ماہ تمام چھوٹی کہانیاں اچھی لگیں۔“ (ذرہ نوازی ہے)

بہاولپور سے مومنہ کشف کی رائے ”سب سے پہلے تو میں سوری کرتی ہوں کہ اتنے اچھے اچھے ٹائٹلز کی برائی کرتی تھی، اب کی بار کا بہت برا ٹائٹل دیکھ کر احساس ہوا کہ پہلے والے تو بہت اچھے ہوتے تھے۔ پہلے نمبر والا تبصرہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا کیونکہ میرا نام ہی نہیں لیا تھا۔ ٹنڈوالہ یار کے عجب گل خان کو دیکھ کر کوئٹہ کے سیف خان کی یاد آ گئی جن کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے۔ عائشہ مرزا آپ خود کیوٹ ہیں اس لیے میری دھمکی بھی آپ کو کیوٹ لگی۔ بابر عباس بابا جی کی باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں، کوئی ان سے بات بھی نہیں کرتا پھر بھی پنگے لیتے رہتے ہیں۔ میں تو بزرگ سمجھ کر ان کو اگنور کر دیتی ہوں۔ ماہ رخ آپی آپ کتنی اچھی ہیں، میں تو دل کی بات کرتی ہوں شاید اس لیے آپ کو اپنے جیسی لگتی ہوں۔ طلعت مسعود اور عبدالودود کے تبصرے بہت پسند آئے۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس کو دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی کیونکہ یہ میرے پسندیدہ رائٹر ہیں اور ہمیشہ ایک سے بڑھ کر ایک اچھی کہانی لے کر آتے ہیں۔ سفینۂ مرگ بھی بہت اچھی تھی اور مجھے نام پڑھ کر اپنی دوست سفینہ یاد آ گئی۔ منظر امام کی شعلہ زن بھی بہت اچھی تھی۔ سب چھوٹی کہانیوں میں مجھے انتخاب، سراغ اور اعتراف بھی بہت پسند آئیں۔ ہار کی گواہی بھی اچھی تھی۔ شکار کی سمجھ نہیں آئی کہ کوئی اتنے عرصے تک قیمتی کاغذات کیسے ہر وقت اپنے پاس رکھ سکتا؟ پھر جب پیسے ہی کمانے تھے تو سال کی ایک ویڈیو بنانے کا کیا فائدہ۔ ایک بار بنا کر کما لیتا۔ رنگوں میں آہنی فریب بہت اچھا لگا جبکہ وبالِ عشق سو سو تھی۔“

ایم اقبال سینٹرل جیل میانوالی سے لکھتے ہیں ”2 اپریل سوموار کے دن 11:30 بجے جب سالن کے لیے پیاز کاٹ رہا تھا تو جاسوسی کسی نخریلی محبوبہ کی طرح ہماری بانہوں میں آ کر سما گیا۔ سالن بنانے کا کام چھوڑ کر فوراً جاسوسی پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ٹائٹل پر نظر ڈالی تو نگہت حیات کو دیکھ کر ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے سوائے اس کی خوب صورت آنکھوں کے اور ان آنکھوں میں زیادہ تانکا جھانکی نہیں کی اور سید ھا دوستوں کی محفل میں جا پہنچے۔ محمد سجاول کی دھمال اچھی لگی۔ عائشہ مرزا صنفِ نازک کی تعریف نہیں کی تو کنجوسی کا خطاب اور جب تعریف کی تو چھپے رستم کا ٹائٹل واہ جی! تبصرہ بہت پسند کرنے کا شکریہ۔ بلقیس خان کی والدہ کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا، اللہ پاک مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل پر اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔ عباس برادران کا تبصرہ پڑھ کر آدمی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بھائی کسی کو تو بخش دیا کرو۔ طلعت مسعود یہاں سے جتنی مشکل سے تبصرہ بھیجا جاتا ہے شائع ہونے پر اتنی خوشی تو منانی بھی چاہیے کہ نہیں، دعاؤں کا شکریہ برادر۔ سیف خان آنسو ٹھنڈے نہیں گرم ہوتے ہیں جو سید ھا دل کے پار ہوتے ہیں۔ عبدالودود عامر جاسوسی کا مطالعہ تو ہماری جیل کی تنہائی کا ساتھی ہے۔ داد کے تو ہم خود مستحق ہیں۔ اپنے ہم نام کا تبصرہ پڑھا اچھا لگا۔ باقی بھی سب کے تبصرے اپنی اپنی جگہ محفل کی رونقیں بڑھا رہے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی فیورٹ انگارے پڑھی۔ تاجور کا دارابی کھوتے سے نکاح، تاجور اور شاہی پھر جدا، پتا نہیں ہم پیار کرنے والوں کے مقدر میں جدائی کیوں ہوتی ہے۔ انیق پر بہت غصہ آ رہا ہے، شاہ زیب بینکاک پہنچ گیا، اب انگاروں سے شعلے نکلنے چاہئیں۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ روڈلف کی جگہ اگر یہ ملکہ حسن یاسمین خانم شہزی کاکا کے ساتھ سیٹ ہوتی تو اچھا تھا۔ پتا نہیں یہ نقاب پوش شہزی کاکا کے ساتھ کیا کرتے ہیں آگے دیکھتے ہیں۔ یہ قسط اچھی رہی۔ رنگوں میں پہلے وبالِ عشق پڑھی۔ زین اور رمشا کی خوب صورت لائف میں نگہت جیسی ضدی اور جنونی کی انٹری اچھی رہی۔ لیکن نگہت کا اسپتال سے رمشا کو اکیلے لے جانا کچھ ہضم نہیں ہوا باقی کہانی ٹھیک رہی۔ رنگوں میں دوسری کہانی آہنی فریب پڑھی جہاں سعید خرم اور بابر جیسے مفاد پرست مجرموں سے اسد عالیہ اور تیمور کو نبرد آزما پایا۔ تیمور اپنی جان دے کر بہت لوگوں کی جان بچا گیا۔ اسد ہیرو ہو کر بھی کوئی خاص کارکردگی نہ دکھا پایا۔ مجھے تو اس کہانی کی کوئی خاص سمجھ نہیں آئی۔“

قصور سے عبدالجبار رومی انصاری کی انکساری ”جاسوسی دوشیزہ کے چہرے پر بلا کا اعتماد جھلک رہا تھا اور ساتھ میں پولیس مین بھی کوئی فرض شناس بندہ لگ رہا ہے۔ سجاول خان کا دھمال تبصرہ اچھا رہا۔ بلقیس خان کی والدہ کا سن کر بہت افسوس ہوا، اللہ ان کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، میرے والد محترم بھی فروری میں ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر سوگوار کر گئے۔ (اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے) عائشہ مرزا اور بلقیس خان کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ بابر عباس، طلعت مسعود، ماہ رخ ارباب، عائشہ خان، سعدیہ قادری، عبدالودود عامر کے تبصرے بہترین تھے۔ اس کے علاوہ بیتے دنوں کی یادیں لیے اسا اورشاہ، لب اشک ڈھونڈتی ایمانے زارا گنگناتی بہار میں ثانیہ مہر، اشفاق شاہین، اکرم میال، محمد اقبال، علی آتش، ادریس احمد خان اور عجب گل بھی اپنے تبصروں میں نمایاں رہے۔ آہنی فریب میں سعید خرم اور بابر نے اپنی چال تو خوب چلی مگر مرنے والے تیمور خالد نے ان سب کا بندوبست کر دیا تھا تبھی عالیہ اور اسد نے ان کی چال انہی پر الٹ دی۔ عمدہ کہانی۔ سرورق کی پہلی کہانی زبردست رہی۔ نگہت عجیب پاگل سی عورت تھی جس نے زین کی خاطر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

محبوب احمد کو قتل کیا اور پھر رمشا کی دشمن بن گئی لیکن وہ زین اور رمشا کو الگ نہ کر سکی اور اپنے جرم میں انجام کو پہنچ کے رہی۔ شاہ زیب کی تاجور تو پھر اس سے چھوٹ گئی۔ اپنے دوست اینق سے بھی مڈبھیڑ ہوگئی۔ اک نیا دوست ملا تو پھر سے پرانی یادوں کے ساتھ کنگ ایسٹرن بننے بینکاک پہنچ گیا۔ اب دیارِ غیر میں ٹیکساری گینگ کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ دیکھو کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ آوارہ گرد کی تیزی کو جیسے فلپائن میں بریک لگ گئے ہیں۔ ان سے تفتیش کرنے والا رانسے اور اس کا ڈرائیور تو نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ شہزی کا شناسا نکلنے والا پتا نہیں دوست ہے یا دشمن آگے پتا چلے گا۔“

فیصل آباد سے عائشہ مرزا کا تبصرہ ”اپریل کے سرورق پر معصوم سے چہرے والی حسینہ کی آنکھیں بے حد خوب صورت تھیں اور پولیس مین کچھ خفا خفا سے لگے۔ اداریہ پڑھا۔ امید ہے بہت جلد آمریت کا خاتمہ ہوگا اور عوام کو صبر کا پھل ملے گا جو میٹھا ضرور ہوگا۔ دوستوں کی محفل میں سجاول خان کو فرنٹ سیٹ پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سجاول صاحب جم کر بیٹھیے کہیں گر نہ جائیں خوشی سے۔ عجب گل کا مختصر اور علی آتش صاحب کا ایمرجنسی وارڈ سے لکھا گیا خط دونوں اچھے تھے۔ علی آتش صاحب کا خط تو دعوتِ عیادت دے رہا تھا۔ ادریس صاحب کا دوٹوک انداز میں کیا گیا تبصرہ اچھا لگا۔ بلقیس صاحبہ آپ نے تو تاجور کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی۔ طلعت صاحب کا ہمیشہ کی طرح اچھا تبصرہ تھا جبکہ ایمانے کا شاید فروری کے شمارے پر تبصرہ شائع ہوا مگر کیوٹ تھا۔ مپال صاحب آپ نے قسم توڑ کر بہت اچھا کیا لیکن آئندہ ایسی قسم مت اٹھانا۔ اسا ورشاہ آپ کا خط میں نے بہت دفعہ پڑھا۔ ماضی کی یادوں میں کھوئے رہنا میرا بھی مشغلہ ہے۔ سچ میں ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ اب کچھ باتیں پیارے پیارے رائٹرز سے کرلیں جو اتنی محنت سے ہمارے لیے لکھتے ہیں۔ رقیب روسیاہ اچھی تحریر رہی۔ سعدیہ اگر خط میں ہی بے وفائی کا اعتراف کر لیتی تو جان سے نہ جاتی لیکن ایسا نہ ہوا۔ شیراز نے اسے مار کر اچھا کیا۔ نسرین منصور بہت پیاری رائٹر ہیں لیکن اس دفعہ مجھے ان کی ہار کی گواہی زیادہ پسند نہیں آئی۔ تمکین رضا کی انتخاب کمال کی تحریر تھی۔ پسینے چھڑا دیے۔ رضا کار مقتول میں کالکن اور آلیور کا کارنامہ قابلِ ستائش رہا۔ اعتراز سلیم صاحب مبارک ہو آپ بھی میرے پسندیدہ رائٹر بن چکے ہیں۔ شکار بہت مزے کی کہانی تھی۔ پہلا رنگ وبالِ عشق ہلکی پھلکی تحریر رہی۔ ایک بات سوچنے والی ہے کہ اگر بوڑھوں کا عشق اور دل لگی ہی ختم نہیں ہو رہی تو نوجوانوں سے کیسا شکوہ؟ دوسرا رنگ روبینہ رشید صاحبہ کے قلم سے آؤٹ اسٹینڈ تک اسٹوری پڑھنے کو ملی، ویری نائس روبینہ جی۔ امجد رئیس صاحب آپ نے سفینۂ مرگ کی صورت میں اپریل کی بہترین کہانی لکھی، بہت خوب صورتی سے انگلش ناول کا ترجمہ کیا گیا۔ مزہ آ گیا، تھینک یو ویری ویری مچ۔ زندگی کی تلاش میں ہم موت کے کتنے پاس آ گئے۔ ذکر ہو جائے انگاروں کا۔ شاہی کے ملک سے باہر جانے کا دکھ بھی ہوا مگر خوشی بھی ہوئی کہ اب گنجے شیطانوں کی بربادی شروع لیکن شاہی اینق والا معاملہ نمٹا کر جاتا تو اچھا ہوتا۔ اب سجاول تو اینق کو اگلے جہان ضرور پہنچا کر رہے گا۔ یقین نہیں آتا کہ اینق بدل گیا۔“

وہاڑی سے منشی محمد عزیز مے کی مہربانی ”29 مارچ کو جاسوسی کا تازہ ترین شمارہ ملا۔ سرورق پر اک نازک مزاج حسینہ اپنے لبوں کے ساتھ ساتھ دانتوں کی بھی نمائش کر رہی تھی۔ قریب ہی ایک باوردی افسر سنجیدگی سے کوئی کیس حل کرنے کی کوشش کرتے نظر آئے۔ سرورق کے حوالے سے ذاکر صاحب سے ایک فرمائش کرنا تھی کہ کبھی اپنے قلم بلکہ برش کے جادو سے لمبے لمبے بالوں والی ایک خوب صورت حسینہ پیش کریں۔ فہرست پر سرسری نظر دوڑانے کے بعد چاچی نکتہ چینی کی محفل میں داخل ہوئے۔ جہاں محمد سجاول خان، صدارت کی خوشی میں دھمال ڈالتے نظر آئے۔ عائشہ مرزا مجھے آتا دیکھ کر اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، شکریہ جی۔ بابر عباس کو اپنی تعریفیں سننے کی لت جو پڑی ہے، وہ اب بھی کم نہیں ہوئی۔ ماہ رخ ارباب، عبدالودود عامر، ثانیہ مہر اور اکرم مپال خط اور سالانہ تجزیے کی پسندیدگی پر مشکور ہوں۔ بلقیس خان، طلعت مسعود، سعدیہ قادری اور اسا ورشاہ نے بھی خوب لکھا۔ ایمانے زارا شاہ اکثر آخری نشست پہ تشریف فرما ہوتی ہیں۔ اعتراف میں سراغ رساں ہی رانفسن نے سارے گڑے مردے اکھاڑ ڈالے اور آخر میں اپنی نانی اور اسکٹ کے ملنے کا سامان بھی کر ڈالا۔ رقیب روسیاہ میں شیراز نے اپنی عزت کے دشمن سگے بھائی سرفراز کو خوب چالوں سے پھنسا ڈالا اور خود بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ انگارے میں اس قسط میں اینق کی بلی بالآخر تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ شاہ زیب بھی ایک بار پھر بینکاک پہنچ گیا، جہاں رضوان کی صورت میں اسے بہت بڑی مدد حاصل ہو گئی ہے۔ اینڈ پر تجسس عروج پر پہنچ گیا ہے۔ شعلہ زن میں منظر امام نے ایک سنجیدہ مسئلے کی ہلکے پھلکے انداز میں بہترین نشاندہی کی ہے۔ خاص طور پر وہ فقرہ کہ اگر لڑکے چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں تو پھر کون ان بدمعاشوں کو لگام ڈالے، انجام نے افسردہ کر ڈالا۔ رضا کار مقتول میں کالکن نے الفاظ کو اپنی گرفت میں لے کر اصل جاسوس اور مجرم اور اس کے ساتھی کو بے نقاب کر ہی ڈالا۔ اعتراز سلیم وصلی کی یہ تحریر تھوڑا ماٹھا لگی اور اس میں کچھ غلطیاں بھی محسوس ہوئیں کہ وہ حساس کاغذات جن کے پیچھے انڈیا اور پاکستان کی حکومتوں کے علاوہ نامی گرامی بدمعاش اور گینگسٹرز بھی ..... پیچھے لگے ہوئے تھے تو وہ کاغذات اتنی آسانی سے دونوں ملکوں کے درمیان گھومتے پھرتے رہے؟ اس کہانی پر لکھاری کی گرفت خاصی کمزور لگی۔ سیاہ رات میں ایڈونچر پسند فطرت کے مالک سمیع نے اپنے باپ کا جرم آشکار کر ہی ڈالا۔ ہار کی گواہی میں محبت و رقابت ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ پادری رابرٹس نے بے گناہ لائیلہ کا خون کر ڈالا اور آخر میں ڈورتھی کے عین موقع پر آ جانے کی وجہ سے گرفتار ہو ہی گیا۔ انتخاب پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اف خدایا، کتنا اذیت ناک اور مشکل ترین مرحلہ تھا اس خاص دستے میں شمولیت کا، انجام حیران کن تھا۔ سرورق کا پہلا رنگ وبالِ عشق میں ایک جنونی عورت نگہت کی وحشت و جنون کو فاروق انجم نے خوب پیش کیا۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

فائزہ بھٹی، چتوکی۔ ساگر ٹلوکر، چشمہ بیراج۔ محمد صفدر معاویہ، خانیوال۔ بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، کھاریاں۔ محمد اقبال، کراچی۔

ادارے کے قدیم معاون اور مقبول مصور، ذاکر حسین کافی دنوں سے علیل ہیں اور پیشہ ورانہ کام کرنے سے قاصر ہیں۔ قارئین ان کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رقابت و رفاقت

روبینہ رشید

اولین صفحات کی سوغات...... تادیر یادرہ جانے والی داستان محبت......

اکثر ہم عالمِ اطمینان و سکون میں ایسے جذبات کی یاد تازہ کرتے ہیں جو کسی وقت ہم پر طاری رہے ہوں... جذبات کی اس یاد کے نتیجے میں گویا ہمارے اندر نئے سرے سے ایک توانائی انگڑائی لیتی ہے... انسان پھر سے خود کو مضبوط و توانا محسوس کرنے لگتا ہے... دوسری طرف اگر ان جذبات و احساسات کا تعلق تلخ و ترش یادوں سے ہو تو پھر انسان کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی چلی جاتی ہے... وہ ایسے نہاں خانے میں ڈوب جاتا ہے جہاں صرف اور صرف کرب و شکستگی کی حکمرانی ہوتی ہے... پُراسرار ماحول... ماضی کی غلام گردشوں میں ڈوبتی... ابھرتی ایسی داستان جس کے کرداروں کے بیچ مصلحتیں اور ریاکاریاں سمٹ آئی تھیں... تفرقات نے انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا... احساسِ اجنبیت نے احساسِ محبت سے ماورا اور... خوش کن رفاقت کو رقابت و جنونِ انتقام میں بدل ڈالا تھا...

بدگمانی...... بے اعتمادی...... خودغرضی اور نفرت و انتقام کی حیلہ سازیاں......

موسم خاصا سرد تھا۔

شام سے شروع ہونے والی پھوار اب موسلا دھار طوفانی بارش میں ڈھل گئی تھی۔ اس چھوٹے سے قصبے کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہفتے میں دو تین بار بارش یہاں کا معمول تھا اور یہاں کے مکین اس کے عادی تھے۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ثمینہ اپنے ولا نما گھر کی اوپری منزل کے لاؤنج میں کھڑی تھی۔ ان کا گھر سڑک اور آبادی سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔ البتہ لاؤنج کی کھڑکی سے سامنے درختوں سے ڈھکی سڑک کو دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ اس وقت اسے اپنے شوہر وقار کی آمد کا انتظار تھا۔ اس نے کھڑکی پر پڑے پردے کو سرکایا اور شیشے سے چہرہ ٹکا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی گرم سانسوں نے لمحے بھر میں سرد شیشے کو دھندلا دیا۔ ثمینہ نے ہاتھ کی پشت سے شیشے کو صاف کیا اور باہر دیکھا دور تک وقار کی کار کی آمد کا کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے مایوسی

......سے سر ہلایا عین اسی وقت بجلی کڑکی جس نے لمحہ بھر کے لیے سارے ماحول کو جگمگا دیا۔ ان کے گھر کے سامنے موجود درخت گویا بارش کے خوف سے لرز رہے تھے۔ الٹے ہاتھ پر بنے شیڈ میں موجود تینوں کتے پوری شدومد سے بھونک رہے تھے۔

''یہ اتنے بے چین کیوں ہیں؟ ان کے پاس ان کی سپلائی تو موجود ہے نا؟'' وہ ایک لمحے کو فکرمند ہوئی۔ ''فرید اپنا کام ذمے داری سے کرتا ہے۔ موسم کو دیکھ کر وہ ان کی خوراک کا انتظام کر کے گیا ہوگا، اگلے ہی لمحے اس نے اپنے خدشے کا خود ہی جواب سوچ لیا تھا۔ یہ سچ بھی تھا۔ فرید اور اس کی بیوی گل سات سال سے ان کے پاس کام کر رہے تھے۔ گھر کے بیرونی حصوں کی صفائی، پودے، کتوں وغیرہ کی دیکھ بھال کا کام فرید کے سپرد تھا جبکہ اس کی بیوی گل گھریلو کاموں میں ثمینہ کی مدد اور صفائی وغیرہ کیا کرتی۔ دوپہر تک ان کا کام ختم ہو جاتا اور پھر وہ اپنے گھر کی راہ لیتے تھے۔ وقار کے کئی بار کے اصرار کے باوجود ثمینہ کو کبھی کسی کل وقتی ملازم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی یہ علاقہ محفوظ اور پرسکون تھا۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ خود اس کے شوہر کے خاندان کے کافی لوگ برسوں سے یہیں مقیم تھے۔

''خدا کرے آج وقار کسی کام میں نہ پھنسیں اور گھر جلد لوٹ آئیں۔'' اس نے سوچا۔

''ممی۔'' اچانک ایک ننھی سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، اس کی چھ سالہ بیٹی نینا اس کے پاس منہ بسورے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں معمول کے مطابق اس کی لاڈلی کپڑے کی گڑیا تھی جسے اس نے پری کا نام دے رکھا تھا۔

''میری گڑیا......'' اس نے لپک کر بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ ''نینو تم ابھی تک جاگ رہی ہو، میں تمہیں سلا کر آئی تھی نا؟'' ثمینہ نے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے گھورا۔

''تو چھوڑ کر آئیں کیوں؟'' وہ زور سے ہنس کر بولی۔ نینا کا سامنے والا دانت دو روز قبل ہی ٹوٹا تھا۔

''چوہا لے گیا تمہارا دانت۔'' ثمینہ نے اسے چھیڑا۔

''نہیں مم، آپ کو تو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔'' وہ ننھا سا ہاتھ ماتھے پر مارتے ہوئے بولی۔ ''بچے جب بڑے ہوتے ہیں نا، تو دانت ٹوٹتے ہیں، پھر اللہ میاں انہیں نئے دانت دے دیتے ہیں۔ پہلے والے چاکلیٹ ٹافی سے خراب ہو جاتے ہیں نا اس لیے......'' وہ بڑی متانت سے اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''اچھا دادی اماں سمجھ گئی میں...... اب چلو بستر پر فوراً۔'' اس نے اپنی گود سے اتارا اور دونوں ماں بیٹی آگے پیچھے بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ نینا کا بیڈروم گلابی رنگ سے سجا ہوا تھا۔ اس کی دیواریں، چادر، فرنیچر، پردے، کارپٹ پر گلابی رنگ کے مختلف شیڈز بکھرے ہوئے تھے۔

''لیجیے ہم پہنچ گئے آپ کے پنک لینڈ میں...... اب لیٹیں اپنے بستر پر...... آپ کو معلوم ہے نا کہ بچوں کو جلد سونا چاہیے۔'' وہ اسے کمبل اڑھاتے ہوئے بولی۔

''اور میری لوری......'' نینا نے آنکھیں گھمائیں۔

''سن تو چکی ہو۔'' ثمینہ نے اسے گھورا۔

''تو سوئی تو نہیں نا اب سوتے ہوئے سننا ہے۔'' وہ بولی۔

''بہت تنگ کرتی ہو نینو کی بچی۔'' ثمینہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے سامنے میز پر رکھے میوزک باکس کی طرف بڑھی۔ یہ اس نے نینا کی پہلی سالگرہ پر اس کے لیے خریدا تھا۔ اس میں صرف ایک ہی لوری تھی۔ نینا کو سوتے وقت اس لوری کو سننے کی عادت تھی۔ ثمینہ نے بٹن دبایا اور کمرے میں ''میرے گھر آئی ایک ننھی پری...... ایک ننھی پری'' کے بول گونجنے لگے۔ وہ نینا کے پاس ہی بیٹھ گئی، اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں کہ بادل زور سے گرجے ساتھ ہی بجلی کی زوردار کڑک پر وہ دونوں ہی اچھل کر بیٹھ گئیں۔

''ممی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' نینا اس سے لپٹ کر بولی۔

''نو، تم تو میری بہادر بیٹی ہو...... بادل اور بجلی سے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ چلو میں تمہیں ایک اچھی سی کہانی سناتی ہوں۔ پیاری شہزادی اور ڈریگن کی کہانی۔ جس میں وہ ڈریگن، شہزادی کا دوست بن گیا تھا۔'' ثمینہ خود کو سنبھال کر بولی۔

نینا کہانی کے درمیان ہی سو گئی۔ ثمینہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے سامنے دیوار پر لگی پرنسز وال کلاک کی جانب دیکھا۔ سوئیاں ساڑھے دس بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ ثمینہ احتیاط سے نینا کے بیڈ سے کھڑی ہوئی۔ اس کا کمبل ٹھیک کیا پھر کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا رخ نچلی منزل پر موجود تھا ڈائننگ لاؤنج کی طرف تھا۔ وہاں موجود فون

سے اس نے وقار کے دفتر کا نمبر ملایا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد بھی جب فون ریسیو نہیں ہوا تو اس نے گہری سانس لے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

لاؤنج کے سامنے موجود شیلف پر ان کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ درمیان والی بڑی تصویر میں، وقار، نینا اور خود اس نے جوکر والی ناک لگا رکھی تھی۔ ''کہاں ہو تم......؟'' اس نے وقار کی تصویر سے پوچھا۔

اسے آج عجیب سی وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ باہر ان کے کتوں کی آوازوں میں شدت آتی جا رہی تھی۔ وہ ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ بج اٹھا۔ ایک لمحے کو ثمینہ ساکت سی رہ گئی۔ وقار واپس آتا تو وہ اپنی چابی سے دروازہ کھول کر اندر آچکا ہوتا پھر اس وقت اس موسم میں یہ کون ہو سکتا تھا؟ کسی نے بیرونی دروازے کو تین بار نہایت زور سے بجایا۔ ثمینہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بمشکل چند قدم آگے بڑھی۔

''کک...... کک کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

جواب میں دروازے پر کسی نے لات ماری تھی۔

''کون ہے باہر......؟'' اس بار اس نے زور سے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔'' دوسری جانب سے آنے والی آواز میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

''جاؤ یہاں سے...... ورنہ میں پولیس کو کال کر دوں گی۔''

اس بار کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ کتوں کا مسلسل بھونکنا اسے اب اچھا لگ رہا تھا۔ شاید وہ جو کوئی بھی تھا، ان سے خوف زدہ ہو کر بھاگ جائے۔ ثمینہ نے ایک بار پھر فون کا ریسیور اٹھایا مگر لائن کام نہیں کر رہی تھی۔ اس قسم کی بارشوں میں فون کا خراب ہو جانا یا کام نہ کرنا حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس نے مایوسی سے ریسیور کو کریڈل پر پٹخا، کاش وقار جلد پہنچ جائے۔

وہ اوپر نینا کے کمرے میں جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اسے کسی کتے کے رونے کی مہین سی آواز آئی۔ اس کے بعد بالکل خاموشی سی چھا گئی تھی۔

'کتے کیوں خاموش ہو گئے تھے؟' اس سوچ نے اسے اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ کھسکا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اسی وقت بجلی ایک بار پھر کڑکی۔ ثمینہ ہلکی سی چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ کھڑکی کی دوسری جانب کوئی اسے گھور رہا تھا۔

لمحے بھر بعد ہی پھر اس نے دروازے کو دیوانہ وار بجانا شروع کر دیا۔ ثمینہ ایک لمحے کو اپنی جگہ کھڑی رہی پھر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نینا کے کمرے میں پہنچی۔ وہ اس شور کی وجہ سے پہلے ہی جاگ چکی تھی۔

''ممی...... یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں بیٹا۔'' ثمینہ حد سے زیادہ ہراساں تھی۔ ''دیکھو ابھی کوئی سوال مت کرو، ممی تمہارے ساتھ ایک گیم کھیلنا چاہتی ہیں...... ٹھیک ہے؟'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

''گیم......؟'' نینا نے پوچھا۔

''ہاں چھپن چھپائی۔ جو ہم اکثر باہر کھیلتے ہیں نا...... تم...... تم جلدی اٹھو اور اپنی الماری میں چھپ جاؤ...... آؤ......'' وہ اس کو کھڑا کرتے ہوئے بولی۔ ''نینو کچھ بھی ہو تمہیں وہاں سے باہر نہیں نکلنا ہے، سمجھ رہی ہو نا میری بات......؟''

نینا نے سر ہلایا اور بستر پر کھڑی ہو گئی۔ ثمینہ نے اسے گلے سے لگا کر اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

''ممی میں پری کو اپنے ساتھ رکھ لوں؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑی گڑیا کو لہراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... رکھ لو......'' ثمینہ نے جواب دیا اور اسے گود میں لے کر الماری میں جگہ بنا کر بٹھا دیا۔ ''تمہیں بالکل چپ رہنا ہے نینو اور یہاں سے تم صرف اپنے ڈیڈی کے کہنے پر نکلو گی۔ وعدہ کرو مجھ سے...... جب تک ڈیڈی کی آواز نہیں آئے گی...... وہ تم کو باہر آنے کو نہ کہیں تو یہیں چھپی رہو گی۔'' اس نے دوبارہ اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

''جی ممی......'' نینا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے وعدہ کر لیا۔

ثمینہ نے الماری کا دروازہ بند کیا اور دوڑتے ہوئے نیچے اتر گئی۔ 'اگر کچھ برا ہونا بھی ہے تو اس کی بیٹی کو اس سے محفوظ رہنا چاہیے......' اس نے سوچا۔

''دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو......'' باہر سے آنے والی آواز میں وحشیانہ غصہ تھا۔

ثمینہ نے چند لمحے گہری سانسیں لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی پھر کچن سے بڑا چاقو اٹھایا اور پچھلے دروازے کو نہایت آہستگی سے کھولا۔ بیرونی دروازے

سے اس کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ وہ آہستگی سے باہر نکلی اور دروازے کو باہر سے بند کرلیا۔

بارش کے تھپیڑے منظر کو دھندلا رہے تھے، وہ گھوم کر گھر کے کونے پر پہنچی وہ اب بھی وہیں موجود تھا اور دروازے کو لاتیں مار رہا تھا۔ ثمینہ نے مڑ کر شیڈ کی طرف دیکھا، وہاں مکمل خاموشی تھی نہ جانے اس نے کتوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اس نے سوچا، وہ چاقو کو ہاتھ میں تھامے آگے بڑھی۔ وہ اس سے چند قدم دور تھی جب اس نے بیرونی دروازے کے ٹوٹنے کی آواز سنی، وہ اب اندر گھسنے ہی والا تھا۔ ثمینہ نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچی۔ اس نے چاقو والے ہاتھ کو بلند کیا مگر اس سے قبل کہ وہ اس کی پشت میں پیوست ہو جاتا، وہ مڑا اور اس نے ثمینہ کے چاقو والے بازو کو آہنی گرفت میں لے لیا۔ لمحہ بھر میں چاقو اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

''تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔'' وہ غرایا۔ اس نے جھک کر چاقو اٹھایا اور ثمینہ کو بازو سے گھسیٹتا ہوا اندر لے جانے لگا۔ ثمینہ نے پلٹ کر اس کے ہاتھ پر کاٹنے کی کوشش کی۔ جواب میں اس کا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا جس سے وہ الٹ کر نیچے گری۔ اس بار اس نے ثمینہ کا بازو نہایت سختی سے پکڑا تھا۔

''تم...... تم یہ کیوں کر رہے ہو؟'' ثمینہ نے بمشکل پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔'' وہ غرایا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت، دیوانگی اور نفرت چمک رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے رسی نکالی۔ گویا وہ مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ ثمینہ کے ہاتھوں کو سختی سے رسی سے باندھنے کے بعد اس نے اس کے منہ پر اسی کا دوپٹا باندھا اور اسے گھسیٹتا ہوا اوپر تینا کے کمرے میں لے آیا۔ ثمینہ کو قالین پر پٹخنے کے بعد اس نے اس کے پیروں کو بھی رسی سے باندھ دیا۔ پھر عقابی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ثمینہ کی نگاہیں اسی پر جمی تھیں جونہی اس کی نظر الماری کے بھڑے ہوئے دروازے پر رکی، ثمینہ کا دل گویا ڈوب سا گیا۔

''تم مجھے احمق سمجھتی ہو؟'' اس نے وحشیانہ غراہٹ سے پوچھا۔ ''پہلے میں اس کا معاملہ نمٹا دوں پھر تم کو دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چاقو پر گرفت مضبوط کرتا ہوا الماری کی جانب بڑھا۔

چند لمحوں میں کمرا چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

20 سال بعد......

زندگی بحالی مرکز کی انتظار گاہ میں جلی ہوئی لکڑی کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ کم از کم وہاں موجود بے آرام کرسی پر پہلو بدلتی صدف کو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے میز پر پڑے کھانے پکانے کی ترکیبوں سے مزین رسالے کو اٹھایا۔ اس میں جن کھانوں کی ترکیبیں تھیں انہیں وہ فی الحال دیکھنا بھی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بیزار ہو کر رسالہ واپس میز پر ڈال دیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ سے یہاں انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کے بارے میں سوچا اسی وقت ریسپشنسٹ نے اس کا نام پکارا۔ چند لمحوں بعد وہ بحالیِ مرکز کی ڈائریکٹر شہلا آپا کے سامنے بیٹھی تھی۔

''صدف مجھے اندازہ ہے کہ میں نے تمہیں بہت شارٹ نوٹس پر بلایا ہے مگر یہ ایک ایسا موقع ہے جو تمہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

صدف بھی جواباً مسکرائی۔ غیر ارادی طور پر اس نے ہاتھ میں پہنے لکڑی کے موتیوں والے تسبیح نما نعمت، بریسلیٹ کو چھوا۔ ''مجھے اچھے مواقع ملتے ہیں۔'' موتی ہلاتے ہی اس کے ذہن نے ملنے والی نعمت کو دہرایا۔

یہ بریسلیٹ اور یہ سوچ اسی بحالی سینٹر پر ان کے گروپ کی انسٹرکٹر نے سکھائی تھی اور یہ بریسلیٹ بھی دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ دن بھر میں ملنے والی ہر چیز اور ہر آسانی ایک نعمت اور اللہ کا تحفہ ہوتی ہے۔ اگر بندے کو ان نعمتوں کا صحیح طور پر احساس ہو جائے تو اس کا دل و دماغ ہمیشہ مطمئن رہ سکتے ہیں۔ اسے ان کا جملہ یاد تھا کہ جس دل میں شکر گزاری ہوتی ہے وہاں غصہ، دکھ، انتقام، غم، حسد کی جگہ نہیں بچتی۔ اب تو ہر اچھی بات پر موتی کھسکا کر اس کو ذہن میں رجسٹر کرنا اس کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

''صدف تمہیں ابھی دو گھنٹے میں ایک انٹرویو دینے جانا ہے۔ ہمارے پاس موجود لوگوں میں صرف تم ہی بزنس مینجمنٹ میں گریجویٹ ہو اور تمہیں ایک بڑے ادارے میں کام کا موقع مل سکتا ہے۔''

''میں کالج گریجویٹ ہوں۔'' صدف نے ایک موتی کھسکایا۔

''جب تم یہ سنو گی کہ تمہیں کس کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا تو تمہیں زیادہ خوشی ہوگی۔'' آپا بولیں۔ ''احمد فاروقؔ کے ساتھ۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''احمد فاروق......'' اسے یہ نام کچھ سنا ہوا سا لگا تھا مگر وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

''ارے تم احمد فاروق کو نہیں جانتیں؟'' شہلا آپا نے کچھ اتنی حیرت سے پوچھا کہ صدف کو اپنی اس نااہلی پر شرم سی آنے لگی۔

''ارے وہ بہت مشہور ہیں۔ ان کا خاندان ملک کی سب سے بڑی سافٹ ویئر کمپنی کا مالک ہے۔ وہ خود مصنف ہیں اور اکثر ٹی وی پروگراموں میں نظر آتے ہیں۔''

''میڈم میرے پاس ٹی وی نہیں ہے۔'' صدف بالآخر بولی۔ ''کیا ملازمت کے لیے ان کے بارے میں جاننا ضروری ہے؟'' وہ حقیقت میں پریشان ہو گئی تھی۔ اسے اس ملازمت کی اشد ضرورت تھی۔ اسے فلیٹ کے کرائے اور بجلی کے بل کا نوٹس یاد آیا۔ اس وقت اس ملازمت کا مل جانا کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔

''ارے نہیں نہیں، چونکہ یہ پرسنل اسسٹنٹ کی جاب ہے اس لیے تمہیں ان کے بارے میں معلومات ہونی چاہئیں۔ اصل میں ان کی والدہ ہماری ایک بورڈ میٹنگ میں آئی تھیں۔ وہ بحالی سینٹر کے کام سے بہت متاثر ہوئی ہیں اور انہوں نے اپنے بیٹے کو یہاں کے کم از کم ایک شخص کو ملازمت دینے پر تیار کیا ہے، بس یوں سمجھو کہ ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔'' شہلا آپا سانس لینے کے لیے رکیں اور ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ''یہ وہاں کا پتا ہے۔ تمہیں تین بجے وہاں ہونا ہے، کیا تم یہ کر لو گی...... میرا مطلب ہے کہ تمہارے پاس صرف دو گھنٹے ہیں۔''

''جی......'' صدف کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''میں وہاں وقت پر پہنچ جاؤں گی، آپ کا بہت شکریہ۔''

ٹھیک پونے تین بجے وہ کال اے ٹیک کے دفتر میں موجود تھی۔ تین بجنے میں دو منٹ پر احمد فاروق کی سیکریٹری نے اسے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

صدف مسکراتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ وہ اپنا سب سے بہترین سوٹ پہن کر آئی تھی جو اس نے استعمال شدہ کپڑوں کی بوتیک سے خریدا تھا اور گزشتہ ڈیڑھ سال سے اسے پہنتی آئی تھی۔ احمد فاروق کی سیکریٹری کے کپڑوں کے سامنے اسے اپنا آپ کافی حقیر سا لگ رہا تھا۔ کمرے میں داخلے کا دروازہ شیشے کا تھا۔ اس نے اپنے عکس پر ایک نظر ڈالی، سنہری گندمی رنگت، چمکتی ہوئی آنکھیں، خوب صورت ہونٹ اور سنہرے مائل بھورے بالوں کی پونی ٹیل...... اسے خدا نے بہت کچھ عطا کیا تھا۔ اس نے بے اختیار بریسلیٹ کا موتی کھسکایا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ احمد فاروق کا رخ اس وقت دوسری جانب تھا اور وہ کسی پر برس رہا تھا۔

''اگر مجھے ہی ہر معاملے کا حل ڈھونڈنا ہے تو پھر مجھے تمہاری کیا ضرورت ہے؟ یا تو اس مسئلے کو شام تک حل ہو جانا چاہیے یا پھر مجھے کسی اہل شخص کو ڈھونڈنا ہو گا۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی کرسی گھومی اور صدف کو اسے دیکھ کر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ اس کے خیال میں احمد فاروق کسی بڑی عمر کے تجربے کار شخص کا نام ہونا چاہیے تھا جبکہ اوک کی بنی اس قیمتی میز کے پیچھے موجود شخص کی عمر بتیس پینتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی گہری بھوری آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ ماتھے پر بھورے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''تم بحالی مرکز سے آئی ہو؟'' اس نے فون میز پر رکھتے ہوئے پوچھا اور ہاتھ بڑھا کر سامنے رکھی فائل کو کھول لیا۔ وہ صدف کی سی وی تھی۔

''جی سر......'' اس نے جواب دیا۔

''یہ میری ممی کا آئیڈیا ہے۔ میں اس طرح ہائرنگ کا مخالف ہوں۔ میرے کام کرنے کا انداز الگ ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ بحالی مرکز سے آنے والا کوئی شخص میرے ساتھ چل پائے گا مگر میں یہ ممی کو نہیں سمجھا سکتا۔ تمہیں میری پرسنل اسسٹنٹ کا کام کرنا ہو گا مگر یہ صرف آفس جاب نہیں ہے۔ تمہیں کسی بھی اسائنمنٹ پر کہیں بھی بھیجا جا سکتا ہے، کیا تم یہ کر سکو گی؟''

''جی بالکل......'' صدف بولی۔ احمد فاروق کا پُرغرور لہجہ اسے پسند نہیں آیا تھا مگر اس کے حالات نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔

''ہم......'' وہ اس کی فائل پر نظر جما کر بولا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے قصہ مختصر مجھے ایک اسسٹنٹ چاہیے ہے اور تمہیں ملازمت...... میں تم سے عام انٹرویو جیسے سوالات نہیں پوچھوں گا مگر میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور تم کم از کم اتنا دماغ رکھتی ہو کہ دو اور دو کیا ہوتے ہیں، یہ سمجھ سکو اسی لیے میں اپنے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں کہ اچھے نمبر سے بزنس مینجمنٹ کرنے کے بعد تمہیں کوئی اصل ملازمت کیوں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہیں مل سکی؟"

صدف کو اس طرح کے سوال کی توقع نہیں تھی، وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ "زندگی بحالی مرکز زندگی میں کسی بڑی مشکل یا ابیوز (بدسلوکی) سے متاثرہ لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ میں وہاں سے آئی ہوں۔ مجھے کوئی "اصل ملازمت" اس لیے نہیں مل سکی کہ پڑھائی ختم کرتے ہی میں کچھ ایسے حالات کا شکار ہو گئی تھی جو مجھے اس سینٹر تک لے آئے جہاں تک اعتماد کی بات ہے، میں چاہوں گی کہ آپ میرے لفظوں کے بجائے میرے عمل سے اس کا اندازہ کریں، بس یہ بتائے دیتی ہوں کہ اچھے برے کا فرق جانتی ہوں اور مجھے اس ملازمت کی شدید ضرورت ہے...... اس کے علاوہ میں یہ جانتی ہوں کہ دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں، انہیں تین یا پانچ بنانے کی کوشش نقصان پہنچاتی ہے۔" صدف کی گفتگو کے دوران میں اس نے صحیح معنوں میں پہلی بار اس پر توجہ دی تھی۔ اس کے چپ ہو جانے کے بعد بھی وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"گڈ...... مجھے تمہاری بات اچھی لگی۔ میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔ تمہیں اپنے پہلے اسائنمنٹ کے لیے فضل آباد جانا ہوگا، کیا تم کبھی وہاں گئی ہو؟"

صدف نے کبھی فضل آباد کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ "نہیں سر......" وہ بولی۔

"میں نے وہاں ایک گھر خریدا ہے۔ وہ گھر بیس سالوں سے کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے وہاں آنے سے قبل تم اسے رہنے کے قابل بنا دو۔"

صدف ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئی۔ بزنس مینجمنٹ اور دو دو چار کے سوالوں کے بعد وہ اسے کسی گھر کی صفائی کا کام سونپ رہا تھا۔

"کیا یہ کام تمہارے لیے مشکل ہے......؟" وہ اس کے تاثرات دیکھ کر بولا۔

"نو سر...... بالکل نہیں۔" صدف نے سر ہلایا۔

"بہت خوب......" وہ بولا۔ "میرے کام کرنے کے چند اصول ہیں جو تمہیں سمجھ لینے چاہئیں۔ پہلا اصول یہ کہ زیادہ سوال مت کرو، اگر تمہیں کام میں کوئی مشکل محسوس ہو تو اس کا حل تلاش کرو۔ اصول نمبر 2 مجھے بہانے سننا بالکل پسند نہیں ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے ان اصولوں کے مطابق کام نہیں کیا تو میں فائر کرنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگاؤں گا جتنی دیر تم بہانہ سوچنے میں لوگی۔"

صدف خاموشی سے سن رہی تھی۔ "اب تم سدرہ سے بات کر لو وہ تمہیں اپائنٹمنٹ لیٹر ایک ماہ کی ایڈوانس تنخواہ بھی دے دے گی اور فضل آباد والے کام کی تفصیلات بھی سمجھا دے گی۔"

وہ شاید کچھ اور کہتا مگر صدف کے لیے ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ کی خبر اتنی خوش کن تھی کہ وہ شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل آئی۔

باہر نکلتے ہوئے اس کی انگلیاں لکڑی کے موتیوں کو کھسکا رہی تھیں اور اس کے ذہن میں ایک جملہ گونج رہا تھا۔

"میری زندگی بدلنے والی ہے۔"

☆☆☆

تین دن میں اس کی زندگی کافی بدل گئی تھی۔ اس نے فلیٹ کا کرایہ ادا کر دیا تھا۔ بجلی کا بل بھی بھر دیا تھا۔ اسٹور والے انکل کے پیسے دے دیے تھے۔ چند نئے جوڑے اور ضرورت کی چیزیں بھی خرید لی تھیں۔ اس وقت وہ سولہ سوہی سی کی کار میں فضل آباد کی طرف جا رہی تھی۔ وہ جہاز کے ذریعے اسلام آباد پہنچی تھی۔ جہاں ائرپورٹ پر کرائے کی گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ڈرائیو کرنا جانتی تھی مگر اسے راستے کا بالکل اندازہ نہیں تھا لہٰذا طے یہ ہوا تھا ڈرائیور اسے فضل آباد گھر تک پہنچا کر گاڑی وہیں چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔

"وہ گھر آبادی سے تھوڑے فاصلے پر ہے اس لیے تمہارے پاس سواری کا موجود ہونا ضروری ہوگا۔" مس سدرہ نے اسے بتایا تھا۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی، اردگرد کے خوب صورت مناظر اور موسم اسے اپنا گرویدہ بناتے جا رہے تھے۔ اس کی انگلیاں ہر چند لمحے بعد لکڑی کے موتیوں پر پھسلنے لگتی تھیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ مس سدرہ کے دیے گئے نقشے اور ہدایات کے مطابق علاقے کے واحد بڑے سپر اسٹور کے پاس رکے تھے۔

"کیا آپ لوگ راستہ بھول گئے ہیں؟" گاڑی رکتے ہی ایک درمیانی قد و قامت کا شخص ان کے قریب آ گیا، اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ "میرا نام وارث ہے مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

''بہت شکریہ وارث صاحب۔'' صدف گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔ ''میں یہیں فضل آباد آئی ہوں، اصل میں میرے باس احمد فاروق نے یہاں ایک پرانا مکان خریدا ہے، مجھے ان کے لیے اسے رینویٹ (آراستہ) کرنا ہے۔''

''پرانا مکان......'' ایک سرد اور بھاری آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ اسٹور سے ایک وہیل چیئر باہر آتی نظر آئی تھی۔ وہ اسی پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک کیم شحیم شخص تھا۔ اس کے سر کے بال سرمئی رنگت کے ہو چکے تھے۔ جبکہ داڑھی کے بال سیاہ تھے۔ اس کی تیز چمکتی نظریں صدف کے چہرے پر جمی تھیں جس کی وجہ سے وہ قدرے گھبرا گئی تھی۔

''جی...... مجھے بتایا گیا ہے کہ میں ضرورت کا سارا سامان اس اسٹور سے خرید سکتی ہوں اور یہ بھی کہ اس حوالے سے اسٹور والوں سے بات ہو چکی ہے۔''

''ہاں، ہاں، مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہیں ہر چیز مہیا کر دی جائے اس کی ادائیگی تمہارے باس کے اکاؤنٹ سے کی جائے گی۔'' ریچھ نما شخص نے سر ہلایا۔ ''میرا نام تیمور چنگیزی ہے اور میں اس اسٹور کا مالک ہوں۔''

''یہ ان تمام چیزوں کی لسٹ ہے جس کی مجھے ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' صدف نے پرس سے لسٹ نکالی جو اس نے مس سدرہ کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔

''وارث تمہیں سامان پہنچا دے گا۔'' تیمور بولا۔

''مجھے حیرت ہے کہ احمد فاروق خود نہیں آیا۔ جب وہ آخری بار یہاں آیا تھا تب تو وہ اس مکان کے لیے بہت بے چین لگ رہا تھا۔''

''جی، وہ جلد آ جائیں گے۔ اس سے قبل مجھے گھر کی حالت ٹھیک کرنا ہے۔''

''اور تم یہاں اکیلی رہو گی؟'' اس نے آنکھیں گھمائیں۔

صدف نے اپنے ہونٹ کاٹے آخر یہ اتنے سوال کیوں کر رہا ہے۔ اس نے الجھ کر سوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، ایک سفید کار اس کے قریب آ کر رکی۔

''کیا آپ لوگ راستہ بھول گئے ہیں؟'' اس سے اترنے والا شخص بھی لمبا چوڑا اور خوش شکل تھا۔ ''میں علاقے کا ایس ایچ او وقار چنگیزی ہوں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ فضل آباد میں مہمان بہت کم آتے ہیں۔'' صدف مسکرائی۔ ''میں راستہ نہیں بھولی، مجھے یہاں احمد فاروق صاحب کے گھر کی حالت درست کرنی ہے۔''

''اچھا اچھا...... آپ اس کے لیے یہاں آئی ہیں۔ وہ پہلے ہمارا مکان ہوتا تھا مگر وہاں برسوں سے اب کوئی نہیں رہتا۔ کیا آپ وہاں اکیلی رہیں گی؟''

''جی وقار صاحب! مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ فضل آباد ایک محفوظ جگہ ہے، کیا آپ کے خیال میں وہاں میرا اکیلا رہنا مناسب نہیں ہے؟'' صدف نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

اس کے سوال کے جواب میں تیمور اور وقار نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، ان کی نظروں میں ایسا کچھ تھا جس نے ایک لمحے کو صدف کو خوف زدہ کر دیا۔

''نہیں، نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور موبائل کے سگنل وہاں کم آتے ہیں تو اس کی وجہ سے کچھ مشکلات ہو سکتی ہیں۔ ویسے آپ کو کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو میں اور میرا بھائی یہاں ہر وقت موجود ہیں۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''آپ دونوں بھائی ہیں؟'' صدف اتنی دیر میں خود کو سنبھال چکی تھی۔

''جی ہاں...... ہمارا خاندان کئی دہائیوں سے یہاں مقیم ہے۔'' تیمور چنگیزی بولا۔

''میں آپ کا سامان پہنچا دوں گا۔'' وارث کے ہاتھ میں اس کی لسٹ تھی۔ ''اور میرا مشورہ ہے کہ آپ مجھے اس میں گروسری کی کچھ اور چیزیں شامل کرنے کی اجازت دے دیں۔ آپ کو ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ ''پانی کی بوتلیں میں ابھی گاڑی میں رکھ دیتا ہوں۔''

جب صدف وہاں سے روانہ ہوئی تو اس کے ہاتھ میں وقار چنگیزی کا کارڈ تھا۔ پانی کی بوتلیں اور کھانے پینے کا کچھ سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ گاڑی کے آگے بڑھنے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تینوں سڑک کے درمیان کھڑے اس کو جاتا دیکھ رہے تھے۔ صدف کے ذہن میں کئی سوالات اور الجھنیں تھیں مگر فی الحال اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس نے لکڑی کے موتی کو سرکایا۔ 'میں سب کر سکتی ہوں، مجھے خود پر یقین ہے۔' پھر اس نے سر جھٹک کر اس سب کو اسی طرح ذہن سے نکالنا چاہا جیسے وہ گزرے ہوئے تین سالوں کو اور رحمان کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

☆☆☆

گھر دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ بڑے بڑے درختوں سے ڈھکا وہ مکان کسی خوب صورت سینری کا حصہ لگ رہا تھا۔ مکان کی اندرونی حالت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ گھر میں ضرورت کا تمام فرنیچر اور سامان موجود تھا۔ یہ اسے مس سدرہ بتا چکی تھیں۔ اس مکان کی خریداری کے بعد وہ یہاں آچکی تھیں اور اس نے ہی یہاں ابتدائی صفائی کروا کر اسے کسی حد تک رہنے کے قابل بنا دیا تھا۔ فرنیچر پرانا مگر مضبوط تھا۔ احمد فاروق اسے تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اسے ویسا ہی رکھ کر اس پر شیٹس ڈال دی گئی تھیں۔ گرد البتہ ہر جگہ موجود تھی۔ صدف نے اندر داخل ہوتے ہی تمام لائٹس جلا دی تھیں۔ آسمان پر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سیاہ بادلوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔ اس لیے ڈرائیور سامان اندر پہنچا کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ صدف بیرونی دروازہ بند کر کے ڈائننگ لاؤنج سے گزرتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔ مس سدرہ کے مطابق کچن کا اوون، فریج وغیرہ سب کام کر رہے تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور اوپری منزل کے جائزے کے لیے سیڑھی پر قدم رکھا۔

اچانک اسے کسی بچے کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ آواز اتنی واضح تھی کہ اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

"کیا یہاں کوئی موجود ہے؟" صدف نے بے اختیار زور سے پوچھا۔ ایک لمحے بعد ہی سے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ اول تو گھر کا تالا خود اس نے کھولا تھا کسی کے اندر ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوتا بھی تو یقیناً اس کے اس طرح پکارنے پر باہر آنے والا نہیں تھا۔

اس نے اپنا سر جھٹکا۔ "شاید تھک گئی ہوں میں......"

اس نے سوچا۔ اوپری منزل پر تین کمرے تھے۔ دونوں ابتدائی کمروں میں کارڈ بورڈ کے ڈبوں کی قطاریں موجود تھیں جن میں غالباً پرانے مکینوں کا ذاتی سامان موجود تھا۔ صدف تمام کمروں کی روشنیاں جلاتی جا رہی تھی۔ آخری کمرے کی لائٹ جلتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ یہ شاید کسی ننھی بچی کا کمرا تھا۔ کمرے میں ہر طرف گلابی رنگ کی حکمرانی تھی۔ بیڈ سائڈ پر ایک پرانا میوزک باکس رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کپڑے کی گڑیا اور کہانیوں کی ایک کتاب بھی موجود تھی۔

ایسا ہی ایک کمرا وہ بھی بنانا چاہتی تھی مگر...... اس سوچ نے ذہن میں تکلیف دہ یادوں کی قطار لگا دی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ غبار اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا، اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔ لکڑی کے موتی کو سرکایا اور خود سے بولی۔

"میں اب محفوظ ہوں، رحمان اب میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔"

پھر اس نے گڑیا کو پیار سے چھوا اور کمرے سے باہر نکلنے لگی۔ عین اسی وقت کمرے میں "میرے گھر آئی ایک ننھی پری" کی دھن بجنے لگی۔ وہ تیزی سے مڑی۔ بیڈ سائڈ پر رکھے میوزک باکس کو دیکھا وہ اسی طرح بند تھا۔

"یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟" خوف اس کے رگ و پے میں پھیلنے لگا۔

اچانک باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ صدف کو ڈائننگ لاؤنج کی کھڑکی کا خیال آیا جسے وہ کھول کر آئی تھی۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف لپکی۔ اس دوران میں گانا بھی بند ہو چکا تھا۔

کھڑکی بند کر کے وہ مڑی ہی تھی کہ لاؤنج میں رکھا فون بج اٹھا۔ اس نے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"احمد فاروق ریذیڈنس (گھر) فرمائیے۔" دوسری جانب سے صرف گہری گہری سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔

"کون بول رہا ہے؟ کیا آپ کو میری آواز آ رہی ہے؟" دوسری جانب سے جواب نہ پا کر اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور پرس سے موبائل نکالنے کے لیے آگے بڑھی۔ وہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ سگنل کام کر رہے ہیں یا نہیں...... اتنے میں لینڈ لائن فون پھر بج اٹھا۔

"ہیلو......" صدف نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب پھر وہی خاموشی تھی۔ اس نے ریسیور پٹخ دیا۔ اگلے ہی لمحے فون پھر بج اٹھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

"اگر آپ نے اب اس فون پر کال کی تو میں آپ کی رپورٹ کر دوں گی۔" صدف غصے میں بولی۔ اس سے قبل کہ وہ ریسیور رکھتی، فون سے وہی دھن سنائی دینے لگی۔

"میرے گھر آئی ایک ننھی پری......"

صدف ایک لمحے کو ساکت سی ہو گئی، ریسیور اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے، اس نے سوچا پھر اس نے تیزی سے اپنا پرس کھولا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ایس ایچ او وقار چنگیزی کا کارڈ نکالا ہی تھا کہ دروازے پر ہونے والی تیز دستک نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

اسے ایک لمحے کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

یہاں اس وقت کون آسکتا تھا؟ اس سوچ نے اسے منجمد کر دیا۔ 'کیا اسے آوازیں سنائی دینے لگی ہیں؟' اس نے بے یقینی سے سوچا۔ اسی وقت دوبارہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' اس کے گلے سے بمشکل ہلکی سی آواز نکل پائی۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی۔

دروازے میں کوئی ہیپ ہول موجود نہیں تھا جس سے وہ باہر دیکھ پاتی۔ باہر یوں بھی تیز بارش ہو رہی تھی۔ اس نے چاروں جانب دیکھا پھر کچن کی دیوار کے ساتھ لگا ایک ڈنڈا اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھی دوسرے ہاتھ سے اس نے لکڑی کا موٹی سرکایا اور بڑبڑائی۔

''میں خوف زدہ نہیں ہوں، میں خوف زدہ نہیں ہوں۔''

صدف نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے کا ناب گھمایا۔ باہر وارث کھڑا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

''آپ......؟''

''جی، جی میں، پلیز اس ڈنڈے کو اس طرف کر لیں۔'' وہ بارش میں بھیگا ہوا تھا۔ ''مجھے تیمور صاحب نے بھیجا ہے۔ میں باقی سامان تو صبح پہنچاؤں گا۔ اس وقت انہوں نے آپ کے لیے جنریٹر بھجوایا ہے، بارش کی وجہ سے لائٹ جاسکتی ہے۔ تو اس وقت یہ آپ کی مدد کرے گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے سیٹ کر دوں۔''

''ہاں ضرور اور میری طرف سے ان کا شکریہ بھی ادا کر دینا۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔''

''مہربانی کیسی صدف جی، وہ اس کے پیسے میرا مطلب ہے کرایہ احمد صاحب سے وصول کریں گے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

اسے جنریٹر لگانے اور صدف کو اس کے بارے میں سمجھانے میں بیس منٹ لگ گئے۔ صدف نے اس دوران میں چائے بنالی تھی۔ اب وہ خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔

''ویسے آپ بہت بہادر خاتون ہیں۔'' وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔

''بہادر......'' صدف نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کہ کم ہی لوگ ایسی جگہ پر اکیلے رہ سکتے ہیں۔'' وہ ہچکچایا پھر بولا۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے......''

''ایسی جگہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''اصل میں...... اس گھر کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ...... میں اس بات پر ویسے یقین نہیں رکھتا مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ گھر ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ شاید یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔''

صدف چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ بولی۔

''اب جب یہ بات ہوگئی ہے تو میں نے یہاں...... یہاں کسی کے ہنسنے کی آوازیں سنی ہیں۔''

''ہنسنے کی آوازیں......؟'' وارث کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

''ہاں کسی چھوٹی بچی کی ہنسی کی آواز...... ہوسکتا ہے کہ اس بند گھر کو کوئی استعمال کر رہا ہو؟''

''یہ ممکن تو نہیں پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے چاروں طرف ایک چکر لگا لیتا ہوں۔'' وہ کھڑے ہوتا ہوا بولا۔ اس کے اوپر جانے کے بعد صدف اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں مس سدرہ کا ایک پیغام موجود تھا۔

''احمد صاحب دو دن میں وہاں پہنچ رہے ہیں۔''

دو دن...... صدف کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہاں سے آتے ہوئے یہ طے ہوا تھا کہ وہ ایک ہفتے میں گھر اور یہاں کے سسٹم کو ٹھیک کرے گی اور پھر احمد صاحب یہاں آئیں گے، دو دن اس ساری گڑبڑ کے لیے بہت کم تھے۔ اس نے سر ہلایا۔

''یہاں کوئی نہیں ہے صدف صاحبہ۔'' وارث اتنی دیر میں واپس آگیا تھا۔ ''کیا کوئی مسئلہ ہے؟''

''اوکے...... آپ مجھے صدف کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں میرے باس دو دن میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔ مجھے اب بائیونک وومن کی طرح کام کرنا ہوگا۔'' وہ مسکرائی۔

''اوہ، آپ کو اگر کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو اسٹور پر کال کر دیجیے گا۔'' وہ اس کے سیل فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے اب فضل دین بھی آگیا ہے اور میں نے اس سے بات بھی کر لی ہے، وہ کل آکر آپ کی لینڈ لائن کو بھی چالو کر دے گا۔''

''لینڈ لائن...... کیا مطلب؟'' صدف کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''مگر یہ فون تو کام کر رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس پر کئی بار کال آئی ہے۔''

''کیا......؟'' وارث کا منہ کھل گیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے میڈم...... یہ فون تو کب سے بند ہے اور یہاں صرف فضل

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دین ہی یہ کام کرتا ہے۔ وہ پچھلے چھ سات دن سے اپنے سسرال گیا ہوا تھا دوسرے شہر، آج ہی تو واپس آیا ہے وہ......"

"مگر اس کی گھنٹی بجی تھی......"

"کہیں وہ کال موبائل پر تو نہیں آئی تھی؟" وارث نے پوچھا۔

"نہیں۔" صدف نے اسے گھورا۔ "تم خود دیکھو لائن کام کر رہی ہے۔" اس نے ریسیور اٹھا کر وارث کی جانب بڑھایا، وارث نے اسے کان سے لگایا پھر صدف کی جانب بڑھا دیا۔ صدف نے ریسیور کو کان سے لگایا۔ وہاں کوئی ڈائل ٹون نہیں تھی لائن بالکل بے جان پڑی تھی۔ صدف نے بے یقینی سے فون اور پھر وارث کی جانب دیکھا۔ "مگر یہ بجا تھا......"

"پریشان مت ہوں صدف، آپ دن بھر کی تھکی ہوئی ہیں، پھر یہاں کی تنہائی بھی اعصاب پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔" وارث ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

صدف اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر وہ دوبارہ اپنے لیے پاگل کا لفظ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ دوبارہ اپنے ساتھ یہ نہیں کر سکتی تھی۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ "آپ کا شکریہ......"

وارث کی پک اپ کی روشنی دیکھتے ہی دیکھتے دور ہو گئی تھی۔ صدف نے دروازہ بند کیا۔ "مجھے اس وقت کسی اور معاملے پر دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ گویا اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ "دو دن میں وہ چنگیز خان یہاں آنے والا ہے۔ اس سے قبل مجھے یہ سارا کام ختم کرنا ہے ورنہ وہ اپنے اس تو بہانہ تو تفصیل موڈ پر جا کر میری چھٹی کر دے گا اور مجھے اس کام کی بہت زیادہ ضرورت ہے تو صدف بی بی سب بھول جاؤ اور صفائی کا کام شروع کردو۔"

نیند تو اسے ویسے بھی نہیں آرہی تھی۔ سونے سے قبل وہ ایک کمرا تو صاف کر ہی سکتی تھی۔ اس نے پہلے ماسٹر بیڈ روم کی صفائی کا فیصلہ کیا۔ وہ پھر وہیں سو بھی سکتی تھی۔ صدف نے وارث کے لائے ہوئے سامان میں سے آلاتِ صفائی برآمد کیے اور جھاڑو لہراتی ہوئی کمرے کی راہ لی۔ ابھی اس نے کام شروع ہی کیا تھا کہ کسی بچے کی شرارتی ہنسی نے اس کی سماعت کو چھوا۔ وہ باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس رہا یا رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ انتہائی تشویشناک سیاق و سباق کے باوجود اس کی ہنسی خوف زدہ کرنے والی نہیں تھی۔ یہ ایک معصوم ہنسی تھی۔ صدف ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ "لگتا ہے وارث نے ٹھیک سے جائزہ نہیں لیا ہے یقیناً کوئی بچہ اس گھر میں گھسا ہوا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ "خیر میں خود بھی دیکھ سکتی ہوں۔" اس نے دل کڑا کر کے سوچا۔

"کون ہے یہاں؟" اس نے زور سے پوچھا۔

جواب میں ہنسی کی زیادہ بلند آواز سنائی دی۔

"میں تمہاری آواز سن رہی ہوں، کیا تمہارے گھر والوں کو معلوم ہے کہ تم یہاں ہو؟" وہ آواز کا تعاقب کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی تھی اور اب وہ اسی گلابی رنگ والے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر لائٹ جلائی۔ ہنسی کی آواز واضح طور پر سامنے رکھی الماری میں سے آرہی تھی۔

"میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے۔ اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی، یکلخت اس کی نظر اپنے دائیں جانب پڑی۔ ہلکی روشنی میں اس کا سایہ سامنے والی دیوار پر قدرے بڑا نظر آرہا تھا۔ اس کے بالکل پیچھے ایک دوسرا سایہ تھا، یہ کوئی بڑا سا آدمی تھا اور اس کے ہاتھ صدف کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ خود کو بچانے کے لیے بے اختیار مڑی مگر اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ دیوار پر موجود پرانے وال پیپر کا کوئی ٹکڑا شاید یہ شعبدے دکھلا رہا تھا۔

صدف نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا۔ 'شاید، وہ واقعی تھک رہی تھی۔ یہ نئی جگہ شاید واقعی اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ اس کا تخیل اسے نئی نئی چیزیں دکھلا رہا تھا پھر اسے یاد آیا کہ وہ اس کمرے میں ہنسی کی آواز سن کر آئی تھی۔ وہ تیزی سے الماری کی جانب بڑھی۔

"کیا تم یہاں ہو؟ گھبراؤ مت، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔" اس نے کہا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ وہاں اس کی توقعات کے برعکس کوئی نہیں تھا۔ الماری بالکل خالی تھی۔

صدف چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔

شاید ہنسی کی آواز بھی اس کے تخیل کی کارفرمائی تھی۔

وہ مڑی۔ بڑے بیڈروم میں جا کر اس نے اپنے پرس سے ہینڈ فری نکال کر کانوں میں فٹ کیا۔ موبائل میں ڈاؤن لوڈ گانوں کے فولڈر کو ٹچ کیا اور کمرے کی صفائی میں جُت گئی۔ ایک گھنٹے بعد کمرا چمک رہا تھا۔ پہلے اس نے کچھ کھانے کے بارے میں سوچا مگر تھکن اسے بستر پر لے گئی۔ بارش کی ٹپا

ٹپ نے لوری کا کام دیا اور وہ نیند کی وادی میں کھو گئی۔
اس کے کانوں میں ہینڈ فری اسی طرح لگا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کی آنکھ شور شرابے کی آوازوں سے کھلی تھی۔ ایک لمحے کو تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے پھر وہ کانوں سے ہینڈ فری اتار کر کھڑکی کی طرف لپکی۔ نیچے مکان کے باہر وارث کھڑا تھا جو اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ تین خواتین اور ایک مرد بھی ہے۔ صدف نے اسے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا اور خود سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

''ہم دستک دے دے کر تھک گئے تھے اور اب تو مجھے آپ کی فکر ہونے لگی تھی۔'' وارث نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''بس رات میں نے کچھ کام کیا اور پھر جو سوئی تو بس گھوڑے گدھے سب بیچ ڈالے۔'' صدف مسکرائی۔

''میں آپ کو ان لوگوں سے ملانا چاہتا ہوں۔ یہ فضل دین ہے جس کا میں نے کل ذکر کیا تھا۔ یہ آج آپ کے فون کو چالو کر دے گا اور یہ تینوں رابعہ، سمیرا اور صائمہ ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ گھر کے کاموں میں آپ کی مدد کر دیں گی تاکہ آپ سب کچھ بروقت ختم کر سکیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر میرے پاس ایسا کوئی بجٹ نہیں ہے۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں، ان کی اجرت ہم اسٹور کے بل کے ساتھ شامل کر دیں گے۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' صدف بھی مسکرائی۔

تھوڑی دیر میں فضل دین اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ وارث نے رضاکارانہ طور پر الٹے ہاتھ پر بنے شیڈ کی صفائی کے کام کا ذمہ لے لیا تھا جبکہ وہ تینوں صدف کے ساتھ صفائی میں لگ گئی تھیں۔

''ہم لوگ تو اسی بات پر حیران ہیں کہ آپ کے باس نے اس ویران گھر میں کیا دیکھا جو اسے خرید لیا۔'' سمیرا بولی۔

''کیوں؟ اچھا خاصا گھر ہے...... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' صدف نے پوچھا۔

سمیرا نے صدف کی بات سن کر اپنی دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اشاروں کے بعد وہ تینوں اس کے قریب آ گئیں۔ سمیرا نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''یہ بات آپ نے ہم سے نہیں سنی مگر سچ یہ ہے کہ اس مکان میں کسی کا قتل ہوا تھا۔''

''قتل؟'' صدف نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی محسوس کی۔

''ہاں سمیرا ٹھیک کہہ رہی ہے، یہ واقعہ 20 سال پہلے ہوا تھا مگر اب بھی یہاں بہت سے لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم ہے۔ میں اس وقت دس سال کی تھی۔ قصبے میں اس سارے معاملے کو چھپایا گیا تھا۔''

''کیوں؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''بھئی یہاں ایک خاندان کے پاس زیادہ تر پیسا اور طاقت ہے اور اس وقت انہوں نے جو چاہا، وہ ہوا...... یہ......'' وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر فضل دین کی اچانک آمد سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''یہ تم کیا افواہیں سنا رہی ہو میڈم کو......'' وہ سمیرا کو گھورتا ہوا بولا۔

''فضل ان کو اس مکان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔'' سمیرا بولی۔

''سمیرا یہ مکان احمد صاحب کا ہے اور ان کو یہاں جو کچھ بھی ہوا اس کے بارے میں سب معلوم ہے۔'' وہ ان تینوں کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہاں میڈم کی مدد کے لیے لایا گیا ہے اور تم اپنا اور ان کا وقت ضائع کر رہی ہو۔'' وہ اس وقت تک وہیں کھڑا انہیں گھورتا رہا تھا جب تک وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے کام سے نہ لگ گئیں۔ ''میڈم! میں معذرت خواہ ہوں، اصل میں یہ تینوں میری رشتے دار ہیں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وارث کہاں ہے؟''

''وہ باہر شیڈ کے پاس ہے۔ آج غالباً کچھ نیا فرنیچر اور اپلائنس یہاں پہنچ رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' صدف نے جواب دیا اور صفائی کے لیے پنک روم میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی کئی کارڈ بورڈ کے ڈبے موجود تھے ان میں سے ایک کے اوپر اسے وہ کپڑے کی گڑیا نظر آئی۔ اس کے بال سرخ تھے اور ایک کندھے کے پاس دھاگے تھوڑے سے ادھڑے ہوئے تھے۔ اسے یاد آیا کہ کل یہ گڑیا سائڈ بورڈ پر رکھی تھی اسے دیکھ کر اس کو اپنا بچپن یاد آ گیا اور بچپن کے ساتھ خاندان والوں کی یاد نے اس کی آنکھوں میں دھواں سا بھر دیا۔

''صدف......'' اس نے خود کو تنبیہ کی اور گڑیا کو ڈبے

پر رکھ کر زمین کی صفائی شروع کی۔ اسی وقت اسے پھر وہ ہنسی سنائی دی۔

''اب دوبارہ نہیں......'' وہ بڑبڑائی اور کمرے سے باہر نکلی۔ دوسرے کمرے میں اسے سمیرا نظر آئی۔

''سمیرا مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے شاید تمہیں کچھ عجیب بھی لگے، یہ بتاؤ تم جب سے آئی ہو، تمہیں یہاں کسی بچے کے ہنسنے کی آواز آئی ہے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہنسنے کی آواز......'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''نہیں تو، اصل میں یہ پرانا مکان ہے اور اس کے اردگرد اس قدر درخت ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ کسی جنگلی پرندے کی آواز ہو......''

''پرندہ......'' صدف نے دہرایا۔

''ہاں مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں، کیا آپ نے کچھ سنا ہے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے کہا اور فوراً گلابی رنگ والے کمرے کی طرف پلٹ آئی۔ زمین کی صفائی کے بعد اس نے الماری کی صفائی کے لیے اس کا دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے الماری میں بائیں جانب وہی گڑیا پڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی آنکھوں پر تھا۔ صدف ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔

''میڈم......'' اسی لمحے اس آواز نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اس کے سامنے سمیرا کھڑی تھی۔

''سوری...... میں نے آپ کو ڈرا دیا۔''

''نہیں، نہیں کوئی بات نہیں کہو تمہیں کیا چاہیے؟'' صدف نے کپڑے کی گڑیا کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ گڑیا ڈبے پر سے الماری تک کیسے پہنچی۔

''اوہ آج تقریباً بائیس تیئس سال بعد میں اس گڑیا کو دیکھ رہی ہوں۔''

''تم اسے جانتی ہو، میرا مطلب ہے کہ تم نے اسے دیکھا ہے؟''

''ہاں بالکل...... میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ اس گھر میں جو چھوٹی بچی رہتی تھی، وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ لے کر گھومتی تھی۔ میں بھی اس وقت کافی چھوٹی تھی۔ ہم اسے اس کا تیسرا ہاتھ کہا کرتے تھے۔'' وہ مسکرائی۔ ''وہ بہت ہی پیاری تھی۔''

''تم جانتی ہو کہ یہ گڑیا کس کی تھی؟'' صدف نے پوچھا۔

''ہاں میڈم! بالکل یہ برسوں پرانی بات ہے مگر میں اسے بھول نہیں سکی ہوں، یہ ہمارے ایس ایچ او وقار چنگیزی کی بیٹی کی گڑیا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

☆☆☆

''وقار چنگیزی کی بیٹی......؟'' صدف نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، اس کا نام نینا تھا۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ اس وقت مجھے یہ سوچ کر جھرجھری سی آرہی ہے کہ میں اس گھر میں کھڑی ہوں جہاں اس پیاری سی بچی کا قتل ہوا تھا۔''

''یہ...... یہ کیسے ہوا تھا؟''

''اصل میں......'' اس نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ باقی دونوں لڑکیاں بھی وہاں آگئیں۔

''سمیرا، فضل بلا رہا ہے۔ میڈم ہم سب کا کام ختم ہو گیا ہے، پورا گھر چکا چک چمک گیا ہے۔'' ان میں سے ایک بولی۔

''میں بہت شکر گزار ہوں۔'' واقعی ان کی آمد سے صدف پر سے کام کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اب صرف وارث وہاں رہ گیا تھا جو شیڈ اور وہاں بنے اسٹور میں کام کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کام نمٹا کر اس کے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

''احمد صاحب کی دی ہوئی لسٹ کے مطابق میں وہ تمام چیزیں اسٹور میں پہنچا چکا ہوں جسے وہ محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''کیا انہوں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کیا محفوظ رکھنا چاہتے ہیں؟'' صدف نے حیرت سے پوچھا۔ اس کے حساب سے یہ لسٹ اس کے پاس ہونی چاہیے تھی۔

''ہاں، میرا خیال ہے کہ احمد صاحب نے سارا ذاتی سامان اسی لیے پیک کروا کر رکھا ہے تاکہ اگر وقار صاحب مانگیں تو وہ دے سکیں۔''

''مجھے تو وہ اس قدر ہمدرد انسان نہیں لگتے۔'' صدف نے بے اختیار کہا۔

''میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔ اکثر لوگ وہ نہیں نکلتے جو نظر آتے ہیں۔''

صدف کا ذہن فوراً رحمان کی طرف گیا تھا... شروع میں وہ اس قدر خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا نظر آتا تھا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جب اُن کی شادی ہوگئی تب اس کی شخصیت کا اصل رنگ سامنے آنا شروع ہوا۔ وہ لرزسی گئی۔ ''ٹھیک ہے یہ بات بھی...'' وہ بولی۔

''درحقیقت یہاں ہوا کیا تھا وارث؟'' اس نے براہِ راست سوال کیا۔

''پوری حقیقت کا علم تو کسی کو بھی نہیں ہے، اس رات بہت بارش ہوئی تھی۔ وقار صاحب کی اہلیہ اور بچی یہاں تھے۔ انہیں شہر میں ہونے والے ایک حادثے کی وجہ سے وہاں جانا پڑ گیا تھا۔ انہوں نے فون کر کے تیمور صاحب کو کہا تھا کہ وہ گھر جا کر ان کی خیریت معلوم کر لیں۔ وہ یہاں آنے کے لیے نکلے بھی تھے مگر راستے میں ان کا ٹرک اُلٹ گیا اور وہ حادثے کا شکار ہو گئے۔''

''اوہ...... پھر......''

''بس اُس رات وہ پاگل آدمی یہاں آیا۔''

''کون پاگل آدمی؟''

صدف کے سوال پر وارث ایک دم چونک گیا۔

''صدف صاحبہ......''

''مجھے صدف کہہ سکتے ہیں آپ......''

''صدف سامان آگیا ہے، میں شام سے پہلے ہر چیز جگہ پر پہنچا دینا چاہتا ہوں۔'' اس کے بعد وہ رکا نہیں تھا۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد کارڈ بورڈز کے سارے ڈبوں سمیت تمام غیر ضروری چیزیں اسٹور میں پہنچ چکی تھیں۔ نیا سامان اور چیزیں اپنی جگہوں پر سیٹ ہو چکی تھیں۔ اب پورا گھر گزشتہ رات سے کافی مختلف اور بہتر نظر آرہا تھا۔

کام سے فراغت کے بعد اُس نے وارث سے پھر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اس حوالے سے کوئی بھی بات کرنے سے معذرت کر لی تھی۔

اس کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر باہر کھڑی مکان کو گھورتی رہی تھی۔ ''کیا راز چھپایا ہوا ہے تم نے اپنے اندر؟'' وہ گویا مکان سے پوچھ رہی تھی پھر وہ ہنس پڑی۔ ''صدف بیگم ہوش کے ناخن لو۔'' وہ خود کو لتاڑتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس نے فریج کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہی ہنسی اسے دوبارہ سنائی دی۔

وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی، یہ کسی جنگلی پرندے کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

''نینا......'' اس نے آواز دی۔ اس کا ہاتھ لکڑی کے موتی کھسکا رہا تھا۔

''میں بہادر ہوں میں بھوتوں سے نہیں ڈرتی......''

اس نے خود سے کہا۔ اس بار سنائی دینے والی ہنسی مزید بلند اور واضح تھی۔

''نینا کیا یہ تم ہو؟ کیا تم یہاں اس گھر میں موجود ہو......؟'' وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے کمرے تک آئی۔ ''تمہیں معلوم ہے نا کہ لوگوں کو ڈرانا بُری بات ہے۔'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

وارث نے کمرا پورا خالی کر دیا تھا، اب وہاں صرف نیا آنے والا بیڈ اور بیڈ سائڈ موجود تھے۔ صدف کی نظر بیڈ کی سفید شیٹ پر پڑی اور وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔

بستر پر سرخ بالوں والی کپڑے کی گڑیا پڑی ہوئی تھی۔

''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ قسم کھا سکتی تھی کہ اس گڑیا کو وارث نے اس کی آنکھوں کے سامنے اسٹور میں رکھا تھا۔ ہنسی کی آواز اب بھی اسی طرح گونج رہی تھی۔ اس نے لپک کر گڑیا کو اٹھایا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ کچن کا دروازہ کھول کر وہ شیڈ کی طرف بھاگی۔ وہ اس گڑیا سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔ شیڈ میں پہنچ کر اس نے اسٹور کا دروازہ کھولا۔ گڑیا کو سب سے پہلے ڈبے کے اوپر رکھا۔ دروازہ بند کر کے شیڈ سے باہر آگئی۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ جیسے ہی وہ شیڈ سے نکلی، ایک پتھر پر اس کا پیر پڑا۔ اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر وہ خود کو سنبھال نہیں سکی۔ زمین پر گرتے ہوئے اس کا سر سرخ اینٹوں سے بنائی گئی کیاری سے لگا اور پھر تمام منظر اندھیرے میں ڈوب گئے۔

''جاہل عورت...... یہ کیا بکواس ناشتا بنایا ہے، تمہیں کسی نے کھانا بنانا بھی نہیں سکھایا۔ میں یہ واہیات آملیٹ نہیں کھا سکتا۔'' گہرے اندھیرے سے ابھرتا ایک منظر اسے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ منظر سے باہر بھی موجود تھی اور خود کو اس پلیٹ کی زد سے بچتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی جو چیختے ہوئے رحمان نے اس کی جانب پھینکی تھی۔ شادی کے سات ماہ میں اُسے اب موقع پر ہوشیار ہونا آگیا تھا ورنہ شروع میں تو رحمان کی پھینکی ہوئی چیزیں اس کے چہرے اور جسم پر نشانات چھوڑ جایا کرتی تھیں۔ اب وہ خود کو گھبراتے ہوئے زمین سے

اٹھا اور اس پلیٹ کے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی جو اس کی مرحومہ نانی نے اسے تحفے میں دی تھیں۔ کانچ اٹھاتے ہوئے ایک کانچ اس کی انگلی میں چبھ گیا تھا اور خون کی موٹی موٹی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ رحمان یہ دیکھ کر اس کی طرف لپکا تھا۔

''اوہ صدف...... تم نے اپنا ہاتھ زخمی کر لیا، تم اپنا خیال کیوں نہیں رکھتیں۔ یہ سب میری غلطی ہے۔ سوری مجھے غصہ آگیا تھا۔'' وہ اب بہت زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا، زخم کے بعد مرہم پھر زخم اور پھر مرہم۔ وہ اس معمول سے تھک چکی تھی۔ وہ ہر وقت خوف زدہ رہتی تھی۔ وہ اس خوف، تکلیف اور ذلت سے بچنا چاہتی تھی...... وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔

''صدف کیا تم ٹھیک ہو، آنکھیں کھولو......''

آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں مگر وہ آنکھیں کھول کر رحمان کو ہرگز نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

اس بار اس کے چہرے پر پانی گرا تھا جس کے بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے عین سامنے کچھ پریشان اور کچھ بیزار احمد فاروق کھڑا تھا۔

''سر......'' وہ اسے دیکھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں سر...... مم میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو کل آنا تھا۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

''میں نے اپنا پروگرام بدل لیا تھا مگر تم باہر زمین پر پڑی کیا کر رہی تھیں، کیا تم اب ٹھیک ہو؟''

''جی...... جی سر......'' اس نے سر پر ابھر آنے والے گومڑے کو چھوا۔ ''کیا آپ مجھے اندر لائے ہیں...... میں بہت شرمندہ ہوں۔ یہ ایک حادثہ تھا۔''

''ویسے تو ایسا ہونا مشکل ہے کہ تم نے خود اپنے سر پر کچھ مار کر خود کو بے ہوش کر لیا ہو مگر تم نے یہ میری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کیا ہے تو سمجھ لو کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

صدف کو ایک لمحے کے لیے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کا منہ کھلا مگر پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

''آئی ایم سوری...... جو ہوا اس پر مجھے افسوس ہے، یہ میری غلطی تھی۔''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہاری عادت ہے۔'' احمد فاروق ٹھوڑی کو سہلاتے ہوئے بولا۔

''کیا......؟ بے ہوش ہو جانا؟'' صدف نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، ہر بات پر معافی مانگنا...... کیا تم اس طرح مجھے یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ میں ایک ظالم باس ہوں؟''

''سوری سر......'' وہ بے اختیار بولی۔

''بھول جاؤ۔'' احمد نے چڑ کر کہا۔

صدف اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی پھر جیسے اُسے کچھ یاد آگیا۔

''سر، اب جبکہ آپ یہاں آچکے ہیں اور یہاں کا کام سمٹ چکا ہے تو کیا میں کل صبح واپس دفتر جا سکتی ہوں؟''

''کیا مطلب؟'' احمد نے ایک ابرو اٹھا کر پوچھا۔

''مس سدرہ نے کہا تھا کہ جب آپ یہاں آجائیں تو مجھے واپس دفتر میں رپورٹ کرنا ہوگا۔''

''تم میرے لیے کام کرتی ہو یا سدرہ کے لیے؟''

''آپ کے لیے......''

''ٹھیک ہے تو مجھے یہاں تمہاری خدمات کی ضرورت ہے۔ یہ بات تم پر پہلے دن کلیئر کر دی گئی تھی کہ تمہیں آفس سے باہر بھی کوئی بھی ڈیوٹی دی جا سکتی ہے میں جب تک یہاں ہوں، تمہیں یہاں کے معاملات میں میری مدد کرنا ہوگی۔ اِز اٹ کلیئر......؟'' اس نے پوچھا۔

''یس سر......'' وہ ایک لمحے کے بعد بولی۔ ''میں یہاں کے حوالے سے ایک بات آپ کے علم میں لانا چاہتی ہوں، کیا آپ جانتے ہیں کہ اس مکان کے بارے میں یہاں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں؟''

''میں جانتا ہوں صدف۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور ماسٹر بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔

صدف کو نیند کے عالم میں اپنی گردن کے پاس کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر اس کیفیت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کی گردن کو کتر رہا ہو۔ اس نے گردن پر ہاتھ پھیرا پھر ہاتھ کو سر کے نیچے رکھ کر سونے کی کوشش کی تو اسے اس پر کچھ نمی سی محسوس ہوئی۔ اس نے اٹھ کر سائڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کی روشنی میں اپنے ہاتھ پر نظر ڈالی۔

ہاتھ پر نظر پڑتے ہی دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کے منہ سے زوردار چیخ بلند ہوئی۔

''صدف کیا ہوا ہے، کیا ہوا ہے آخر......؟'' احمد اس کی چیخ پر بھاگتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اب بھی ساکت بیٹھی پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے ہاتھ کو گھور رہی تھی۔

''کچھ بولو...... بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' احمد نے کوئی جواب نہ پاکر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے چونک کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا جس پر خون کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ احمد نے کچھ نہ سمجھنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہاں...... یہاں کچھ ہے کسی نے میری گردن پر کاٹا ہے۔'' وہ اچھل کر بستر سے کھڑی ہوگئی۔

''یہاں کیا ہوسکتا ہے؟'' احمد نے اس کی پشت کی طرف آکر اس کی گردن کو بغور دیکھا۔ وہاں لال سے باریک نشان اب بھی موجود تھے۔ اس نے ایک لمحے کو اس نشان کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر اس کے تکیے کو اٹھا کر جھٹکا۔ تکیے کے غلاف سے دو جونکیں زمین پر گری تھیں۔ وہ خوب پھولی ہوئی تھیں اور اس وقت حرکت کے قابل نہیں تھیں۔

صدف انہیں دیکھ کر اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔

''یہ لو...... مل گیا تمہارا مجرم۔'' احمد مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب تم انہیں اٹھا کر باہر پھینکو گی؟''

''میں نہیں...... آپ......'' وہ قطعیت سے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ تم میری اسسٹنٹ ہو لہٰذا یہ طے کرنا میرا کام ہے کہ کون کیا کرے گا۔'' اس نے اسے گھورا۔

''مگر میں یہ نہیں کر سکتی۔ اگر یہ میرے قریب بھی آئیں تو میں پھر چیخنے لگوں گی...... آئی ایم ویری سوری۔'' وہ لجاجت سے بولی۔

احمد نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے جونکوں کو کاغذ کے ذریعے نیچے پھینکا۔ اس کے بستر کو مزید جھاڑنے پر ایک جونک اور ملی تھی۔ اسے بھی کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بعد وہ باہر کی طرف چلا۔

''میں اب یہاں اکیلی نہیں سوسکوں گی۔'' اس نے لکڑی کے موتی کو کھسکاتے ہوئے کہا۔

''اب وہاں کچھ نہیں ہے۔''

''پھر بھی...... سوری مجھے ڈر لگے گا۔''

''مس صدف، آپ کوئی بچی نہیں ہیں اور میں آپ کو اپنے کمرے میں سونے کی اجازت نہیں دے سکتا...... آہا کہیں یہ آپ کی کوئی چال تو نہیں ہے؟'' وہ آنکھوں کو سکیڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے اس جملے پر صدف کا دماغ اڑ گیا تھا۔

''کس قسم کی باتیں کرتے ہیں آپ...... آپ کو شرم آنی چاہیے۔'' صدف کو اس قدر غصہ آیا تھا کہ گھر کا کرایہ، بجلی وغیرہ کے بل، راشن کے خالی ڈبے اور اپنی پریشانیاں وہ ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول گئی تھی۔

''یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہی ہیں؟'' احمد نے بگڑ کر اس سے پوچھا۔

''یہ سوال آپ کو پہلے خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے۔ آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں...۔۔۔۔۔ اب میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کو یہاں کے سب مسئلوں کا علم تھا اسی لیے اپنی والدہ کا بہانہ بنا کر بحالی مرکز سے ملازم رکھا تا کہ وہ آپ کے سامنے کچھ نہ بول سکے اور آپ اسے اچھی طرح استعمال کر سکیں......''

''بس مس صدف اگر آپ اپنی ملازمت سے اس قدر ناخوش ہیں تو میں آپ کو ابھی اسی وقت ملازمت سے فارغ کرتا ہوں۔ یو آر فائرڈ......'' اس کے لہجے میں سخت غصہ تھا۔

صدف کو بات مکمل کرتے ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر تیر کمان سے نکل گیا تھا۔

''احمد صاحب...... میں شرمندہ ہوں......''

''فیصلہ ہو چکا ہے۔ کل صبح آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر رکا نہیں تھا، سیدھا نکلتا چلا گیا تھا۔

'اف یہ میں نے کیا کر دیا؟ کیا میں سچ مچ پاگل ہو گئی ہوں؟' صدف نے اپنا سر پکڑ لیا۔ آج کا دن یوں بھی اس کے لیے بہت مشکل ثابت ہوا تھا پھر رحمان اور وہ ساری تکلیف دہ یادیں اور پھر وہ حادثہ...... یہاں ہونے والی چیزیں...... سب نے مل کر اس کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ لکڑی کے ایک موتی کو سرکایا۔

'وہ تو ویسے بھی مجھے نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اپنی ماں کی وجہ سے نوکری دینا پڑی تھی۔ ان کی تو جان چھوٹی مگر تم اب کیا کرو گی؟ اتنی مشکلوں سے تو زندگی کی گاڑی تھوڑی بہت پٹری پر آئی تھی۔' اس نے خود سے پوچھا۔

'مگر انسان کی تھوڑی بہت عزتِ نفس بھی ہوتی ہے، احمد صاحب کو کس نے حق دیا کہ وہ خود کو عظیم سمجھ کر دوسروں پر شک کرتے رہیں۔' اس کے دل نے تڑپ کر صفائی پیش

English
سر نہ کھجائیں..
Healthy ہو جائیں!
English
nglish
English
اصل کی پہچان HOLOGRAPHIC PRINT
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
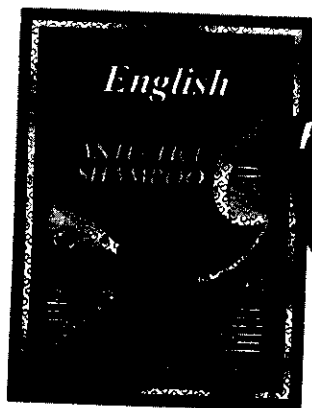
کی۔ ’’نہیں میری بے عزتی کرنے کا لائسنس تو نہیں ملا ہے۔‘‘

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے احمد کے کمرے پر دستک دی۔

’’اندر آجاؤ......‘‘ احمد کی ٹھہری ہوئی سرد آواز نے اس کا استقبال کیا۔

’’احمد صاحب، میں بہت شرمندہ ہوں۔ ذہنی دباؤ اور غصے کی وجہ سے میرے منہ سے وہ سب نکل گیا جو میں کہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔‘‘ وہ شرمندگی سے بولی۔

’’بات ختم ہو چکی ہے صدف۔‘‘ وہ بولا۔ ’’اور میں اس حوالے سے اب کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔‘‘ اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ وہ مزید ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائی تھی۔ ’’اور ہاں میں جانتا ہوں کہ تم غصے اور دباؤ میں کچھ بھی کر سکتی ہو۔‘‘

اس کے اس جملے پر صدف نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

’’اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے صدف، میں تمہارے بارے میں سب جانتا ہوں، تمہاری شادی، تمہارے شوہر رحمان خان کے بارے میں، کس طرح تم نے خاندان کے خلاف جا کر اس سے شادی کی اور یہ بھی کہ وہ ایک نفسیاتی شکی مرد تھا جس نے تمہاری زندگی جہنم بنا دی۔ میں تمہارا ہر راز جانتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب میں کسی کو اپنے پرسنل اسسٹنٹ کی جاب دے رہا ہوں تو میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کیے بغیر تو یہ کام نہیں کر سکتا۔‘‘

’’تب......تب تو آپ کو معلوم ہوگا......‘‘ وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

احمد اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا اور ایک لمحے بعد بولا۔ ’’تم نے کس طرح اسے ہلاک کیا؟ ہاں میں یہ بھی جانتا ہوں۔‘‘

☆☆☆

صدف کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

احمد کو ایک لمحے کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ جائے۔ اس نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کی گندمی سنہری رنگت اور چہرے کا بھولپن اس کی زندگی کی کہانی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی گہری بھوری آنکھیں اس کے جذبات کو عیاں کرنے میں آئینے کا کام کرتی تھیں۔ اس کے چمکتے ہوئے بال اس کے نازک سراپا کو مزید دلکش بناتے تھے۔ مگر وہ اس کے لیے ایک معما تھی اور احمد کو معمے بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ پہلے دن سے جانتا تھا کہ اس نے اپنے شوہر رحمان خان کو قتل کیا تھا اس کی کمپنی کی سیکیورٹی ٹیم صدف کے بارے میں اپنی مکمل رپورٹ پیش کر چکی تھی۔ عدالت نے اسے بری کیا تھا کیونکہ اس نے یہ قتل اپنے بچاؤ میں کیا تھا۔ وہ خود پولیس کو شدید زخمی حالت میں ملی تھی۔ اس کے بعد اسے نفسیاتی علاج کے ایک مرکز میں رکھا گیا تھا جہاں سے وہ اس بحالی مرکز تک آئی تھی۔ احمد کے علم میں یہ بھی تھا کہ اس کے خاندان نے رحمان سے شادی کی وجہ سے اس سے سارے رشتے توڑ لیے تھے۔ بعد میں اس کی بدسلوکی کی وجہ سے وہ کئی بار صدف کو اپنے ساتھ لے گئے مگر وہ ہر بار رحمان کی باتوں میں آجاتی تھی۔ شادی کے ڈیڑھ سال کے اندر اندر یہ سب ہو گیا تھا۔

وہ اسے ملازمت دینے کا مخالف تھا مگر اس کی ماں کے خیال میں وہ اس ملازمت کے لیے اہل تھی۔ اسے ان کی بات ماننی پڑی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے انٹرویو میں ناک آؤٹ کر دے گا اور وہ خود ہی پلٹ کر نہیں آئے گی مگر اس نے اپنی بہادری سے اسے حیران کر دیا تھا۔

’’آپ کو اس سب کی وجوہات معلوم نہیں ہیں اور آپ کو مجھ سے اس بارے میں سوال کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔‘‘ وہ بالآخر بولی۔ اس کا ہاتھ لکڑی کے موتیوں کو سرکا رہا تھا۔

احمد نے غور سے بریسلیٹ کو دیکھا۔ ’’میں مزید جاننا بھی نہیں چاہتا، اس نے تمہیں پریشان کیا، تم نے اسے قتل کر دیا، بس یہ بات ہے۔‘‘

’’یہ صرف اتنی سی بات نہیں تھی۔‘‘ وہ بولی۔ ’’بہرحال میں جانتی ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ غلط کیا جس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔‘‘

’’اس کے باوجود میں آپ کو فائر کر چکا ہوں۔‘‘

صدف نے اس کے جواب میں سر کو ہلکا سا جھکایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ احمد کچھ الجھ سا گیا تھا۔ اسے صدف کو ملازمت دینی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ اس کا فیصلہ درست ہے مگر پھر بھی وہ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

چند لمحوں بعد اس کے دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ صدف اس بار اپنے سوٹ کیس کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

’’یہ تم کیا کر رہی ہو؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’میں نے سوچا ہے کہ میں اسی وقت چلی جاؤں، اب میرے لیے یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔‘‘ وہ افسردگی سے بولی۔

’’اگر تم اپنی نوکری کے حوالے سے بات کر رہی ہو تو تم اب بھی فائرڈ ہو مگر تمہیں اس وقت جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ باہر بارش ہو رہی ہے، موسم خراب ہے اور صبح ہونے والی ہے۔ تم ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتی ہو کہ میں کوئی ظالم قسم کا انسان ہوں۔‘‘

صدف نے کوئی جواب نہیں دیا اور دروازے کی جانب چل پڑی۔

’’کیا تم واقعی اس وقت، اس بارش میں جا رہی ہو......؟‘‘ اس نے پھر پوچھا۔

’’یہی بہتر رہے گا، میں کام کے اس موقع کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ احمد کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا رہ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے بیرونی دروازے کے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔

’’کیا مسئلہ ہے یہ۔‘‘ وہ بڑبڑایا۔ ’’اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے اسے اس وقت جانے کو نہیں کہا تھا۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا۔‘‘ احمد نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کندھے اچکائے۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر اوپری لاؤنج میں آیا تو اسے گلابی کمرے سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔

’’کیا تم واپس آگئی ہو؟‘‘

جواب میں دوبارہ وہی ہنسی سنائی دی۔

’’اب یہ کیا ڈراما ہے؟‘‘ وہ چڑ کر اس کمرے میں داخل ہوا۔ صدف وہاں نہیں تھی۔ اس کے بستر پر کپڑے کی ایک گڑیا پڑی تھی جس کے بال سرخ اون سے بنائے گئے تھے۔

اس نے بغیر سوچے اسے ہاتھ میں اٹھالیا۔

’’کیا تم ہنس رہی تھیں؟‘‘ اس نے گڑیا سے پوچھا پھر ہنس پڑا۔ ’’پاگل پن بھی چھوت کا مرض ہوتا ہے شاید، میں گڑیا سے باتیں کر رہا ہوں۔‘‘ اس نے گڑیا کو بستر پر

بے ایمان

بنارس کے ٹھگ اور ممبئی کے جیب تراش بہت مشہور ہیں۔ مرزا قندیل بیگ کو ناز تھا کہ کوئی ان کی جیب نہیں تراش سکتا۔ اسی چکر میں ایک دوست سے ان کی شرط لگ گئی۔ انہوں نے اپنی شیروانی کی اندرونی جیب میں دس ہزار کے نئے اور کرارے نوٹ ڈالے اور اپنے دوست کے ساتھ ایک معروف اور مصروف بازار میں نکل گئے۔ انہوں نے بہت ہوشیاری سے اپنی رقم کی حفاظت کی۔ واپس گھر پہنچے تو فخر سے اپنی جیب سے رقم نکال کر دوست کو دکھائی۔ اس بے چارے کا منہ اتر گیا۔

رقم گنتے ہوئے اچانک مرزا کی نظر ایک کاغذ پر پڑی جو نوٹوں کے درمیان اڑسا ہوا تھا۔ کھولا تو تحریر پڑھ کر ان کے توتے اڑ گئے۔

لکھا تھا۔ ’’بے ایمان، بے شرم! جعلی نوٹ لے کر گھوم رہا ہے۔ پکڑا گیا تو ضمانت بھی نہیں ہوگی۔ جلا دے انہیں۔‘‘

حیدر آباد دکن سے مرزا عباس کی سوغات

ترکیب

ریستوران میں ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔

وہ اپنی دوست کے ساتھ کاؤنٹر پر کھڑا، پریشانی کے عالم میں ہال کا جائزہ لیتا رہا پھر یکایک اس نے کوئی نمبر ملائے بغیر اپنا فون کان سے لگایا اور بلند آواز میں بولا۔ ’’بھائی جان! جلدی آئیں۔ آپ کی دوست یہاں کسی اور کے ساتھ بیٹھی ڈنر کر رہی ہے۔‘‘

اچانک پانچ میزوں پر ہلچل ہوئی اور وہاں موجود جوڑے اپنا کھانا ادھورا چھوڑ کر نکل گئے۔

اسلام آباد سے منصور خان کی ترکیب

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ڈال کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

''یہ کر کیا رہی ہے؟'' صدف کی کرائے کی گاڑی کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ وہ گاڑی اسٹارٹ نہیں کر پا رہی تھی۔ باہر خاصی تیز بارش ہو رہی تھی پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کار اسٹارٹ ہو کر ریورس ہوئی پھر لڑکھڑائی اور چند قدم چل کر درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔

احمد تیزی سے بھاگتا ہوا گھر سے باہر آیا۔ ''تم یہ کیا کر رہی تھیں؟'' اس نے گاڑی کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں پوچھا۔ ''صدف......''

جواب نہ پا کر اس نے ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھولا۔ صدف کا سر اسٹیئرنگ وہیل پر تھا۔ وہ شاید خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ احمد نے برستی بارش کا پانی ہاتھ میں لے کر اس کے چہرے پر چھینٹا مارا۔

ہلکی سی کھانسی کے ساتھ اس کو ہوش آ گیا تھا۔

''چلو باہر نکلو......'' احمد نے کہا۔

''مگر......''

''ایک لفظ نہیں، میں ہر بار تمہیں اٹھا کر اندر نہیں لے جا سکتا۔'' اس کے ان الفاظ پر وہ باہر آ گئی تھی۔

''تم اندر چلو، میں گاڑی کو چیک کر کے آ رہا ہوں۔'' احمد نے کہا۔ گاڑی کو سائڈ پر لگا کر باہر نکلتے ہوئے اس کی نظر پسنجر سیٹ پر پڑی، وہاں کپڑے کی وہی سرخ بالوں والی گڑیا پڑی تھی۔

☆☆☆

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں لاؤنج میں موجود تھے۔ صدف تھری سیٹر صوفے پر کمبل اوڑھے بیٹھی تھی جبکہ احمد سامنے رکھے کاؤچ پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ چند لمحے بعد صدف نے اٹھنے کی کوشش کی مگر سر کی تکلیف نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ اس کے ہونٹوں سے کراہ سن کر احمد نے اس کی جانب دیکھا۔

''اب تم اٹھنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ ان چوبیس گھنٹوں میں دو بار بے ہوش ہو چکی ہو تم...... کہیں تم نے یہ سارا چکر کمپنسیشن (معاوضہ) کے لیے تو نہیں چلایا۔ اگر ایسا ہے بھی تو بھول جاؤ۔ میں تمہیں اس حادثے سے پہلے فائر کر چکا تھا۔''

صدف جواباً مسکرا دی۔

''ابھی جب میں کپڑے بدلنے اوپر گیا تھا تو میں نے تمہارے کمرے کو چیک کیا تھا وہاں کچھ اور جونکیں ملی ہیں۔ کل اس کی دوبارہ صفائی کروانی ہوگی۔''

''میں نے انہیں وہاں نہیں رکھا تھا۔'' صدف دھیرے سے بولی۔

''کیا میں نے یہ کہا ہے؟'' وہ قدرے زور سے بولا۔ صدف اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر والے احمد سے خاصا مختلف لگ رہا تھا۔ ایسے جیسے کچھ فکر مند ہو۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' اس کی آواز پر صدف چونکی۔ ''میں نے کار کی پسنجر سیٹ پر ایک عجیب چیز دیکھی تھی۔''

''کیسی عجیب چیز......؟''

وہ ڈائننگ ایریا کی طرف گیا اور چند لمحے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کپڑے کی وہ گڑیا تھی۔

''یہ......''

''یہ تو اسٹور میں رکھوا دی گئی تھی۔'' صدف بمشکل بولی۔

''اوکے، یعنی تم نے اسے اسٹور میں دیکھا تھا اور میں نے تمہاری گاڑی میں اور اس سے پہلے اسے تمہارے کمرے میں دیکھا تھا۔ تمہارے خیال میں اس کا کیا مطلب ہے؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

صدف خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ایک معاہدہ کریں......'' وہ چند لمحے کی خاموشی کے بعد یک دم بولا۔

''معاہدہ؟''

''ہاں، ڈیل...... جو کچھ تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا، ہم دونوں اسے بھول جاتے ہیں۔''

''یعنی......'' صدف نے لکڑی کے موتی کو کھسکایا۔

''یعنی یہ کہ تم اپنی نوکری پر بحال کی جاتی ہو مگر تمہیں یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ تم اپنا کام مزید کسی حادثے کے کرو گی۔''

صدف نے اطمینان کی سانس لی۔

''تم کیا کہتی ہو؟''

''میں تیار ہوں، میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''گڈ، تو پھر اب جتنی رات باقی ہے، میرا... خیال ہے کہ اسے سو کر گزارتے ہیں۔ تم بس اس صوفے پر براجمان رہو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تکیہ اور

کمبل تھا۔

''اب یہ کیا ہو رہا ہے؟'' صدف نے پوچھا۔

''میں سونے کی تیاری کر رہا ہوں۔''

''یہاں؟''

''ہاں اس کاؤچ پر...... تم دو بار اپنا سر توڑنے کی کوشش کر چکی ہو اس لیے کم از کم آج کی رات تمہیں تنہا چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مجھے تمہیں یاد دلانا پڑے گا کہ میں تمہارا باس ہوں لہٰذا کس چیز کی ضرورت ہے، اس کا فیصلہ بھی میں کروں گا۔ اس وقت مجھے نیند کی ضرورت ہے اور تم بھی آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔''

☆☆☆

دوسری صبح کرائے کی کار کو ورکشاپ بھجوا دیا گیا۔ یہ معمولی سی بات قصبے کے لیے خبر بن سکتی ہے، اس کا اندازہ انہیں تیمور چنگیزی کے اسٹور پر پہنچنے کے بعد ہوا تھا۔

''کیا کوئی حادثہ ہوا ہے؟'' تیمور نے اپنے ملازم کو ان کے سامان کی لسٹ کے مطابق چیزیں نکالنے کا حکم دینے کے بعد پہلا سوال یہی کیا تھا۔

''نہیں کار ٹھیک کام نہیں کر رہی تھی۔'' صدف نے بتایا۔

''تمہارے ماتھے پر یہ چوٹ کیسی ہے؟'' ایس ایچ او وقار چنگیزی بھی اسی وقت اسٹور میں داخل ہوا تھا۔

''کل سامان کی ترتیب کے دوران میں ٹکرا گئی تھی دروازے سے۔'' وہ مسکرائی۔

''اصل میں اس مکان کی شہرت ہی ایسی ہے......'' وہاں موجود ایک شخص نے اپنی رائے دی۔ وقار واضح طور پر اس ذکر کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر بات بڑھتی جا رہی تھی۔

''یہ تو سچ ہے۔'' احمد اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''ہم جس مکان میں رہ رہے ہیں، وہاں لوگوں کا خون ہوا ہے اور ابھی تک وہ کیس حل نہیں ہو سکا ہے نا وقار صاحب؟''

''نہیں، ہم جانتے ہیں کہ نینا کو کس نے مارا تھا۔'' وقار چنگیزی بولا۔

''مگر اس رات وہاں ایک قتل اور بھی تو ہوا تھا۔'' وارث نے صدف کو تھیلی پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ہم...... مگر میرا خیال ہے کہ کچھ لوگوں کا خون ہو جانا اتنا اہم نہیں ہوتا۔'' اس کی نگاہیں وقار چنگیزی پر تھیں جو اب اسٹور سے باہر جا چکا تھا۔ چند لمحے بعد وہ واپسی کے لیے کار میں بیٹھ گئے تو صدف نے احمد سے پوچھا۔

''اس گھر میں اور کس کا خون ہوا تھا؟''

احمد بالکل خاموش رہا تھا۔ صدف چند لمحوں تک جواب کا انتظار کرتی رہی پھر وہ بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

دوسرا جملہ اُس نے گھر کے سامنے کار پارک کرنے کے بعد بولا تھا۔ ''میں نے اس مکان کو ایک بہت اہم وجہ سے خریدا ہے۔'' صدف اس کے مزید بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ ''میرے والدین اسے میرا پاگل پن سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔''

''کیا......؟''

''ماضی...... مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ یہاں جو بھی کچھ ہوا، اس نے مجھ پر بہت اثر ڈالا ہے۔ مجھے اپنے سوالات کے جواب درکار ہیں۔''

''کیسے سوال......؟''

''مجھے جاننا ہے کہ اس رات حقیقت میں یہاں کیا ہوا تھا۔ مجھے وہ سچ درکار ہے۔'' وہ اسی کیفیت میں کہے جا رہا تھا۔

''مگر کیوں؟''

احمد اس سوال کے جواب میں بالکل خاموش رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ گھر کے اندر تھے۔

''اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی مددگار بن سکوں تو آپ کو مجھے سب کچھ بتانا ہوگا۔'' وہ سامان میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں میری مدد تو کرنی ہی ہے، تم میری پرسنل اسسٹنٹ جو ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''سب سے پہلا کام جو تمہیں کرنا ہے، وہ اسٹور روم سے ان چیزوں کو نکال کر لانا ہے۔'' وہ ایک کاغذ اس کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔ ''کوشش کرو کہ ایک گھنٹے میں مجھے یہ سب مل جائے۔''

صدف نے لسٹ پر نظر ڈالی...... اسے کچھ پکچر البم، ڈائری وغیرہ درکار تھی۔ ''بس صرف یہی......؟''

''ہاں فی الحال یہی، شاید اس سے مجھے کچھ سراغ مل سکے۔''

''ٹھیک ہے، میں یہ سب لے آتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اسٹور کی طرف چل دی۔ احمد اسے جاتا ہوا دیکھ رہا

تھا پھر وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''مجھے سچ ڈھونڈنا ہے۔'' اس نے سر گھما کر اوپری منزل کی جانب جانے والی سیڑھیوں کو دیکھا۔

''نینا میں معلوم کر کے رہوں گا کہ اس رات یہاں کیا ہوا تھا...... تمہارا مجرم میں ہی ڈھونڈ کر لاؤں گا...... تمہارے بھائی کی حیثیت سے یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

☆☆☆

اسے سامان تلاش کرنے میں بمشکل دس منٹ لگے تھے۔ وہ فوٹو البمز اور ڈائری لے کر اسٹور روم سے باہر آ... رہی تھی کہ اچانک روشنی کے جھپاکے نے اسے وقتی طور پر بینائی سے محروم کر دیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے پوچھا، اسٹور روم کے دروازے پر پینتیس چھتیس سال کی ایک خوبرو عورت اور اسی عمر کا ایک مرد موجود تھا۔ مرد کے ہاتھوں میں کیمرا تھا اور چند لمحے پہلے اس کی فلیش لائٹ نے ہی صدف کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔

''کون ہو تم لوگ......'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''کس سے پوچھ کر تم نے میری تصویر لی ہے؟''

''میرا نام صائمہ فیروز ہے اور یہ ہمارا فوٹوگرافر کریم ہے۔ ہم ''مشہور لوگ'' میگزین کے رپورٹر ہیں۔ تم نے غالباً اس کا نام سُن رکھا ہوگا؟'' وہ عورت مسکرائی۔

''نہیں۔'' صدف بولی۔ اسی وقت اس کے ہاتھ سے البم زمین پر جا گری وہ جھک کر بکھری ہوئی تصویروں کو جمع کر رہی تھی کہ فلیش دوبارہ چمکی۔

''کیا ہو رہا ہے...... بند کرو یہ سب۔ تم جس بھی چیتھڑے اخبار کے نمائندے ہو، کیا تمہیں یہ بتایا نہیں گیا کہ اس طرح کسی کے گھر میں بلا اجازت گھسنا جرم ہے؟'' صدف غرائی۔

''چیتھڑا......'' صائمہ نے اسے گھورا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اس سے اس انداز میں بھی بات کر سکتا ہے۔ ''میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ہمارا رسالہ کوئی فضول اخبار نہیں ہے، ہم صرف سچ چھاپتے ہیں۔''

''تب بھی تم لوگ یہاں کر کیا رہے ہو؟''

اسی دوران میں وارث بھی اپنی پک اَپ کھڑی کر کے ان تک پہنچ گیا تھا۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مشہور صنعت کار اور مصنف احمد فاروق اس گھر میں کسی عورت کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' صائمہ بولی۔

''اگر ایسا ہے بھی تو......''

''احمد فاروق کا نام اب تک کسی عورت کے ساتھ نہیں جڑا ہے یہ رسالے کے لیے خاص اسٹوری بن سکتی ہے مگر......'' وہ صدف کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولی۔ ''مجھے اس کے انتخاب پر حیرت ہے۔''

''وارث تم پولیس کو فون کرو۔'' صدف بولی۔

''اس کی ضرورت نہیں، ہم جا رہے ہیں۔'' کریم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

''مگر ہمارے پاس تصویریں ہیں۔'' صائمہ مسکرائی۔

''دیکھو میں اس کی دوست نہیں، اس کی اسسٹنٹ ہوں لہٰذا یہ خبر سچ نہیں ہوگی۔''

''میں تم پر یقین کیوں کروں؟''

''مت کرو اور اپنی اسٹوری چھاپ دو، باقی کا کام احمد صاحب خود کر لیں گے۔''

''او کے...... ہم اس پر مزید کام کریں گے، چلو کریم۔''

''تم یہاں کیسے آئے؟'' صدف نے ان کے جانے کے بعد وارث کی طرف دیکھا۔

''میں ان دونوں کے پیچھے ہی نکلا تھا۔ یہ اسٹور میں کیمرا سے یہاں کا پتا پوچھ رہے تھے۔ مجھے کچھ مشکوک لگے تو میں ان کے پیچھے یہاں تک آیا تا کہ اگر مدد کی ضرورت ہو تو کچھ کر سکوں۔''

وہ دونوں آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ احمد لاؤنج میں ان کا منتظر تھا۔ اس نے پہلے صدف کے سرخ چہرے اور پھر وارث کو دیکھا۔

''کیا کچھ ہوا ہے؟''

''یہاں دو رپورٹرز آئے تھے۔ میں اسٹور سے ان کے پیچھے یہاں آیا ہوں، وہ صدف میڈم کو ہراساں کر رہے تھے۔''

''رپورٹرز......؟''

''جی، وہ کہہ رہے تھے کہ انہیں خبر ملی ہے کہ آپ یہاں ایک خاتون کے ساتھ رہ رہے ہیں۔''

''خاتون...... صدف میری اسسٹنٹ ہے۔''

''جی یہی صدف نے ان سے کہا ہے مگر وہ عورت مجھے بہت ڈھیٹ لگتی ہے۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''اوہ...... یہ ایک نئی مصیبت آ گئی ہے۔'' وہ چند لمحے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''یہ درست رہے گا۔ وارث کیا تم چند دنوں کے لیے یہاں ہمارے پاس شفٹ ہو سکتے ہو؟''

☆☆☆

''کیا یہ چیزیں کچھ مدد کر پائی ہیں؟'' وارث کے اپنے سامان لینے جانے کے بعد وہ احمد کے سامنے صوفے پر بیٹھی اسے فوٹو البمز کا جائزہ لیتا دیکھ رہی تھی۔

''میں ان کی تصویریں تلاش کر رہا تھا یہ دیکھو......'' وہ ایک خوب صورت خاتون کی تصویر تھی۔ ''یہ ثمینہ شاہ ہیں۔''

''یہ وقار چنگیزی کی بیوی تھیں۔ اس کے مقابلے میں بہت خوب صورت ہیں۔'' احمد نے اس کے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک اور تصویر پر انگلی رکھی۔ یہ ایک متاثر کن شخصیت والے مرد کی تصویر تھی۔ اس کے بال بھورے تھے۔ گہری بھوری آنکھیں۔ صدف نے غیر ارادی طور پر اس شخص کو اور پھر احمد کو دیکھا۔

''کیا یہ چنگیزی خاندان کے کوئی دوست تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس بات کا جواب اس پر منحصر ہے کہ پوچھ کون رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''مگر ان دو افراد کی تصویر سے آپ کو کیا معلوم ہو گا؟'' صدف نے الجھ کر پوچھا۔

''دو نہیں ہیں۔ مجھے وقار چنگیزی کی تصویر بھی درکار ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''کیونکہ سالوں پہلے یہاں جو کچھ ہوا تھا، اس میں ان تینوں کا بہت کردار تھا۔''

''کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ آپ یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہیں؟''

''اس کے لیے؟'' احمد نے ایک چھ سالہ بچی کی تصویر پر انگلی رکھی۔

''نینا......؟ مگر کیوں؟ آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟''

''کیونکہ وہ میری بہن تھی۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

صدف یہ سن کر اچھل سی پڑی۔ ''آپ کی بہن...... مگر کس طرح......؟''

''کیا یہ جاننا تمہارے لیے ضروری ہے؟''

''ہاں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں حقیقت میں آپ کی مدد کر سکوں تو آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا ہو گا اور وہ بھی آدھا ادھورا نہیں پورا......'' وہ اعتماد سے بولی۔

''ویسے کیا تمہیں اس کام کے لیے تنخواہ نہیں مل رہی......؟'' احمد نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

''تنخواہ مجھے آپ کی مدد کرنے کی ملتی ہے...... ایسے مرڈر کیسز کے حل کی نہیں جو میری پیدائش سے پہلے ہوئے ہوں۔'' صدف بولی۔ وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔

احمد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''سوری......'' وہ دھیمے سے بولی۔

''کس بات پر......؟''

''شاید میں زیادہ بول گئی۔''

''تم ہمیشہ معافی مانگتی رہتی ہو...... خود کو گلٹی (غلط) کیوں سمجھتی ہو؟'' احمد نے پوچھا۔ ''تمہیں اس سے باہر نکلنا ہو گا۔ میں عموماً سخت فیصلے کرتا ہوں اور کسی پر اعتماد نہیں کرتا مگر تمہارے انٹرویو کے دوران ہی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میری زندگی کے اس اہم ترین اسائمنٹ میں تم ہی میری مدد کر سکتی ہو، اس کے لیے مجھے کسی ٹیسٹ یا امتحان کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔ تمہارے اندر ایسا کچھ ہے جو مجھے متاثر کرتا ہے۔''

صدف منہ کھولے اس کی بات سن رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ احمد فاروق کے منہ سے سن رہی ہے۔

''مگر اب زیادہ غلط فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح مل کر کام کریں۔''

''ہمیں کیا کرنا ہو گا؟'' صدف نے پوچھا۔

''وقار چنگیزی کے بارے میں ہر بات معلوم کرنے کی کوشش کرنا ہو گی۔''

''یہ کیسے ہو گا؟''

''سمیرا اور دوسری عورتوں کی مدد سے، تم ان سے مل چکی ہو۔ وہ اسٹور پر بھی ہوتی ہیں۔'' وہ بولا۔ ''وہ عورتیں سب جانتی ہیں۔ ان 20 برسوں میں وہ کیا کرتا رہا ہے؟ سب کچھ؟''

''میں کوشش کروں گی۔ کیا آپ کے خیال میں وقار چنگیزی کا اپنی بیوی اور بیٹی کے قتل میں کوئی ہاتھ ہو سکتا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے؟''

''ہم فی الحال کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ بات کوئی چشم دید گواہ ہی بتا سکتا ہے۔ نینا کو قتل کیا گیا، یہ ایک حقیقت ہے۔ وہ اس رات اس گھر میں اپنی ماں کے ساتھ اکیلی تھی۔ پولیس رپورٹ اور تفتیش یہ بتاتی ہے کہ یہاں کوئی دروازہ توڑ کر گھسا تھا۔''

''تو آپ پولیس رپورٹ دیکھ چکے ہیں؟''

''ظاہر ہے۔'' وہ اس کو گھور کر بولا۔ ''وہ دونوں وقار کے گھر پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ اس رات گھر نہیں آیا۔''

''کیوں؟''

''رپورٹ کے مطابق اس رات طوفانی بارش ہوئی تھی، وہ آنا چاہ رہا تھا مگر ایک حادثے کی وجہ سے اسے جانا پڑا، اس نے اپنے بھائی تیمور کو اپنے گھر جانے کو کہا تھا۔''

''وہ جو اسٹور کا مالک ہے اور چل نہیں سکتا؟''

''ہاں اس رات نے کئی زندگیوں کو بدل ڈالا تھا۔''

''آپ کے کہنے کے مطابق وقار چنگیزی اپنی فیملی کو بچانے نہیں پہنچ سکا۔''

''شاید وہ بچانا چاہتا بھی نہ ہو اور اس کا بھائی بھی یہاں نہیں پہنچ پایا۔ وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ وہ اس حادثے کے بعد دو ہفتوں تک بے ہوش رہا تھا۔ یعنی وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا بھائی حادثے کے بعد سے اس کے پاس ہی رہا ہے۔ وہ اس دوران میں گھر جا کر واپس آ سکتا تھا۔'' احمد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''اس حادثے نے اور کس کس کی زندگی کو بدل ڈالا؟'' صدف نے پوچھا۔

''تیمور کی...... وہ ہمیشہ سے وہیل چیئر پر نہیں تھا۔''

''اوکے...... مگر ایک گتھی سلجھنا بہت ضروری ہے...... نینا آپ کی بہن کس طرح تھی۔ اسے وقار چنگیزی نے گود ...... لیا تھا؟''

''نہیں......''

'کیا اسے اغوا کیا گیا تھا؟'

''کیا آپ دونوں کی ماں ایک تھی......؟'' کچھ سوچنے کے بعد صدف نے پوچھا۔ احمد اس سوال کے جواب میں خاموش رہا تھا اور اس کی خاموشی ہی صدف کا جواب تھی۔

''مگر یہ کیونکر ممکن ہے۔ گوگل کے مطابق آپ کی والدہ اور والد دونوں حیات ہیں؟''

''ہاں، الحمدللہ۔ انہوں نے میری پرورش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے صدف کہ وہ میرے چچا اور چچی ہیں اور انہوں نے مجھے بچپن میں گود لے لیا تھا۔''

''اوہ۔'' صدف نے کہا۔ وہ غور سے اس الجھے ہوئے شخص کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ لاؤنج سے جڑے کچن میں فریج کی دوسری جانب کھڑا وارث یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس دوران اپنے کچھ کپڑے وغیرہ لے کر لوٹ آیا تھا۔ صدف اور احمد کی گفتگو ختم ہوتے ہی اس نے جیب سے فون نکالا اور تیزی سے میسج ٹائپ کرنے لگا۔

☆☆☆

تیمور اور وقار چنگیزی اس وقت اسٹور میں بنے چھوٹے سے دفتر میں موجود تھے۔ ''میں نے سنا ہے کہ احمد فاروق یہاں اپنے سوالوں کے جواب تلاش کرنے آیا ہے۔'' تیمور بولا۔

''کیسے سوال؟''

''وہ اس رات کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' تیمور نے خشک لہجے میں کہا۔ ''کم از کم وارث نے یہی سنا ہے۔''

''آخر قاتل اب تک گرفتار تو نہیں ہو سکا ہے۔''

''میں جانتا ہوں تیمور۔ قاتل کیا ہمارے پاس تو کوئی گواہ تک نہیں ہے نہ ہی آلۂ قتل برآمد ہو سکا ہے۔ وہ واحد شخص جو اس بارے میں کچھ بتا سکتا ہے وہ......''

''کیا تم اس بارے میں بات کرنا بند نہیں کر سکتے۔'' وقار نے کہا۔ ''احمد فاروق پرانے زخموں کو کیوں کریدر رہا ہے؟''

''تم اس سوال کا جواب جانتے ہو۔ تمہیں مکان بیچنے سے قبل اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے تھیں۔'' تیمور نے کہا۔

''مکان اس کے کسی ایجنٹ نے خریدا تھا۔ قیمت بہترین تھی اس لیے میں نے انکار نہیں کیا۔ بہر حال میں بہت مشکل سے گزر چکا ہوں اور اب میں کسی کو مجھے دوبارہ اس عذاب میں ڈالنے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' وقار یہ کہتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔

ماضی، حال اور مستقبل تیمور کے دماغ میں پتنگ

پانگ کھیل رہے تھے اور وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا بھائی کیا سوچ رہا ہے۔

☆☆☆

صدف اور احمد اس وقت قصبے کی طرف جا رہے تھے۔

''اگر تمہیں وہ رپورٹر دوبارہ نظر آئیں تو انہیں نظرانداز کر دینا۔ وہ تم سے سوالات کریں گے، تم انہیں کوئی جواب مت دینا۔''

''اور......''

''وہ احمق سمجھتے ہیں کہ میں تمہارے چکر میں ہوں۔'' احمد ہنس کر بولا۔

''جیسے میں یہ پسند کروں گی۔'' صدف بلا سوچے سمجھے بول گئی۔

''کیا مطلب؟''

''مم میرا مطلب ہے کہ میں اب اس حوالے سے سوچنا بھی نہیں چاہتی۔''

''مگر کیوں، میں ہینڈسم ہوں۔ پیسا بھی ہے کامیاب بھی ہوں، میرا مطلب ہے کہ ایک بہترین شکار۔'' وہ مسکرایا۔

''ہم دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ میں شکار کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''کیوں تمہیں دوبارہ ناکامی یا غلطی کا خوف ہے؟''

''مسٹر احمد فاروق۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد جب صدف بولی تو اس کا لہجہ ٹھہرا ہوا مگر آواز سرد تھی۔

''میری بات غور سے سنیے، میں جانتی ہوں کہ آپ میرے باس ہیں اور یوں بھی میرا ماضی بہت خوشگوار نہیں ہے مگر میری ذاتی زندگی کو اس طرح ڈسکس کرنے کی اجازت میں آپ کو نہیں دوں گی۔ آپ مجھے نوکری سے نکال سکتے ہیں۔ میں آپ کو اس سے نہیں روک سکتی مگر برائے مہربانی آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کیجیے گا۔''

اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے اور اس کا دل ڈھول کی طرح بج رہا تھا۔

''ہم......'' احمد نے سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی موجود ہے۔''

''کیا......؟''

''میں سوچنے لگا تھا کہ جس پُرعزم لڑکی کا انٹرویو میں

عینک

''تم نے اپنے شوہر کو قتل کیا؟''

''جی ہاں، جناب والا!''

''تم کہتی ہو کہ وہ نشے میں تھا۔''

''جی ہاں!''

''نشے میں ہونا اتنا بڑا جرم نہیں تھا کہ تم اسے قتل کر دیتیں!''

''جی ہاں......مگر اس نے عینک مانگی تھی......!''

''عینک مانگی...... اور تم نے اسے مار دیا؟'' جج نے اس کی بات کاٹ کر حیرت سے کہا۔ ''کیا کہا تھا اس نے؟''

''اس نے کہا تھا پنکی میری عینک کہاں ہے؟''

''اس میں اشتعال والی کیا بات تھی؟''

''مائی لارڈ! میرا نام پنکی نہیں ساحرہ ہے......!''

کراچی سے طاہرہ رضا کا انتقام

چور

مہنگے اسکول کے سوئمنگ پول کے کنارے سے ایک بچے کا تولیا گم ہو گیا۔ ابا جان کو بہت غصہ آیا اور سیدھے اسکول پہنچ کر نگراں خاتون پر برس پڑے۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس اسکول میں میرے بیٹے کے ساتھ چور اُچکّے بھی پڑھتے ہیں...... حد ہو گئی کہ تولیا ہی چرا لیا۔ ایسے بچوں کے ساتھ دوسروں کی کیا تربیت ہوگی؟''

خاتون نے شرمندگی سے کہا۔ ''واقعی یہ بہت بُری بات ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی بچہ غلطی سے لے گیا ہو۔ ہم پتا لگانے کی کوشش کریں گے...... آپ کے بچے کے تولیے کی کیا پہچان ہے؟''

''پہچان کیا ہوگی۔'' وہ بُرا سا منہ بنا کر بولے۔ ''سفید رنگ کا ہاتھ سائز کا بڑا تولیا ہے اور ہاں...... اس کے ایک کونے پر ریٹز ہوٹل کڑھا ہوا ہے!'' ان کے لہجے میں ندامت کا شائبہ تک نہیں تھا!

پشاور سے عجب خان کا پُرغرور انداز

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے لیا تھا اور جو میرے سامنے یہ کہتے ہوئے نہیں ہچکچائی تھی کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں انہیں پانچ یا تین بنانے کی کوشش کرنا غلط ہے۔ شاید فریب تھا۔ میرے سامنے منمناتی ہر وقت معافی طلب کرتی خاتون وہ نہیں ہے۔''

''یعنی آپ میرے ساتھ یہ جان بوجھ کر کر رہے تھے۔''

''میں تمہیں تمہاری اصل شخصیت کی طرف لوٹانا چاہتا ہوں۔ اس گلٹ کانشس سے باہر نکل آؤ، میں یہی چاہتا ہوں۔''

صدف خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ ہر بار وہ اسے غلط ثابت کر دیتا تھا۔

''اس گھر میں کچھ ہو رہا ہے...... کیا تمہیں کسی عجیب چیز کا تجربہ ہوا ہے؟'' احمد نے اس سے پوچھا۔

''آپ کیا جانتے ہیں؟''

''کچھ نہ کچھ عجیب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں اس قصبے میں حقائق کو چھپا کر رکھا گیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی پوری صلاحیتوں سے وقار کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو...... اس میں تمہیں کسی پر یقین نہیں کرنا ہے نہ ہی اعتماد کرنا ہے...... یہ تمہاری بقا کے لیے بہت ضروری ہے۔''

صدف نے پورے زور و شور سے گردن ہلائی تھی۔ وہ دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ کوئی اور ان پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

☆☆☆

''سمیرا تم سے تو اس دن کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' صدف کو وہ حسبِ توقع اسٹور میں مل گئی تھی۔

''ہاں، آپ مصروف تھیں اس لیے فضل دین نے مجھے آپ کو زحمت دینے سے منع کیا تھا۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''میں مصروف نہیں ہوں اب، بس یہاں میری کوئی دوست نہیں ہے۔ تم سے اس روز بات کر کے اچھا لگا تھا، کیا ہم تھوڑی دیر بات کر سکتے ہیں؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، آپ بہت اچھی ہیں۔''

''آپ نہیں تم......'' صدف مسکرائی۔ ''میں اصل میں اس گھر کو لے کر ہی پریشان ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ وقار صاحب نے اپنا ذاتی سامان، تصاویر سب یہیں اس مکان میں چھوڑ دیے۔''

''اصل میں مجھے بھی بہت زیادہ تفصیل یاد نہیں ہے کیونکہ اس وقت میری عمر بھی کم تھی بس یہ سنا ہے کہ اسے اس سب کی وجہ سے شدید صدمہ ہوا تھا۔''

''ظاہر ہے انہوں نے اپنی فیملی کو کھویا ہے۔ اس کے بعد اس گھر میں لوٹنا آسان نہیں تھا۔''

''ہاں، وہ اس گھر میں واپس نہیں گیا اور جب وہ اپنے بھائی تیمور کو واپس لے کر آیا تھا تو بہت سی عورتوں نے دیکھا تھا کہ اس کی انگلی میں اس کی شادی کی انگوٹھی بھی نہیں تھی۔''

''میں یہی کہہ رہی ہوں کہ صدمہ ہی بہت بڑا تھا۔''

''نہیں......'' سمیرا اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''تمہیں ساری باتوں کا علم نہیں ہے۔''

''کیسی باتیں؟'' صدف نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔ اس نے فضل دین کو اسٹور میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ اس سب کے بعد کچھ عرصے تک وہ بہت شراب پینے لگا تھا۔ ایک روز بہت ہنگامہ ہوا تھا۔ اس نے سب کے سامنے کہا تھا کہ ثمینہ اس کے ساتھ برا کر رہی تھی اور یہ بھی کہ شاید نینا بھی اس کی بیٹی نہیں تھی۔ ویسے تو سب کہتے ہیں کہ اس کی بیوی بہت اچھی اور نیک تھی مگر جو کچھ اس رات ہوا، اس کے بعد ہم وقار صاحب کی بات کو بالکل غلط بھی نہیں کہہ سکتے......''

''سمیرا......'' فضل دین اتنی دیر میں ان کے قریب آ گیا تھا۔ ''اگر تم فارغ ہو تو ہم گھر چلیں اور میں نے تم سے کہا تھا نا کہ افواہیں مت پھیلاؤ۔'' اس نے اسے گھورا۔

''اچھا اچھا...... میں تو صدف صاحبہ کو صرف سچ بات ہی بتا رہی تھی۔'' وہ چڑ کر بولی پھر صدف کی طرف مڑی۔ ''آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ فضل دین کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وارث نے صدف کو بتایا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔

صدف باہر کی طرف مڑی تو اسے اس روز والا کیمرا مین خود کو گھورتا ہوا ملا۔ اس نے صدف کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا مگر اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

اسٹور کے باہر تیمور، وارث اور احمد موجود تھے۔

''وارث تم شام کو آ رہے ہو نا؟'' احمد نے اس کے ہاتھ سے تھیلے پکڑتے ہوئے کہا۔

''بالکل سر......'' اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"آپ کی آمد سے مجھے خوشی ہوئی ہے احمد صاحب۔" تیمور اسے جاتا دیکھ کر بولا۔

"ظاہر ہے میری آمد کا مطلب زیادہ بکری جو ہے۔" وہ مسکرایا۔ جواب میں تیمور بھی قہقہہ مار کر ہنسا۔ "یہ دونوں آپ کے ساتھ ہیں؟" اس نے صائمہ اور کریم کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر پوچھا۔

"ساتھ نہیں، یہ پیچھے ہیں۔ انہیں میری یہاں آمد کی خبر مل گئی ہے اس سے کوئی خبر بنانے کی کوشش میں ہیں۔" احمد ہنسا۔

"مگر مجھے ایسے لوگ پسند نہیں جو خوامخواہ ہر بات میں گھسنے کی کوشش کریں۔"

"بجا فرمایا۔ یہ کوئی بھی پسند نہیں کرے گا۔" احمد یہ کہتے ہوئے گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ جہاں صدف اس کا پہلے سے ہی انتظار کر رہی تھی۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ناراض تھا اور اپنی بیٹی کو بھی اپنی اولاد تسلیم نہیں کر رہا تھا۔" وہ اس کی رپورٹ سن کر بڑبڑایا۔

"ہاں اس نے یہی کہا ہے۔"

احمد نے سر ہلایا۔

"آپ نے ان دو رپورٹرز کو دیکھا؟ وہ ہمیں ہی گھور رہے تھے میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کوئی کارڈ یا بیج لینا چاہیے جس پر پرسنل اسسٹنٹ لکھا ہوتا کہ غلط فہمیاں نہ ہوں۔"

"ہاہاہا...... ان کو گھورنے دو، ان سے ہمیں فائدہ ہی ہوا ہے۔ ان کی وجہ سے ہم وارث کو وہاں رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

"کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔" وہ گھر کے پاس گاڑی روکتا ہوا بولا۔

صدف کے مکان میں جانے کے ایک لمحے بعد اس نے جیب سے ایک فون نکالا اور ایک گمنام میسج ٹائپ کرنے لگا۔

"ان دونوں میں تعلق موجود ہے۔ اگر تم اسے ثابت کرنا چاہو تو تمہیں گھر میں گھسنا ہوگا۔" اس نے یہ میسج سینڈ کیا اور پھر مسکراتا ہوا گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

☆☆☆

"واؤ۔" سمیرا نے نعرہ لگایا۔

"کیا ہوا ہے؟" کریم نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ موٹر سائیکل پر تھے۔

"ہمیں ایک اور ٹپ ملی ہے کریم۔ ہمیں اس اسٹوری کے لیے ان کے گھر میں گھسنا ہوگا۔ یہ ہماری زندگی کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اسٹوری ہو گی۔"

"اس طرح کسی کے اور خصوصاً احمد فاروق کے گھر میں گھسنے کا نتیجہ جیل بھی ہو سکتا ہے۔" کریم نے کہا۔

"رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ ہم چپکے سے اندر جائیں گے اور اپنا کام کر کے غائب ہو جائیں گے۔"

"واہ...... ہمیں کوئی نہیں دیکھ پائے گا جیسے ہم وہاں تھے ہی نہیں۔" کریم مسکرایا۔

"بالکل......" صائمہ نے سر ہلایا۔ "بالکل کسی بھوت کی طرح...... اور اگر ہم انہیں ڈرانے میں کامیاب ہو گئے تو شاید ہمیں کوئی زبردست تصویر بھی مل جائے۔" صائمہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ لاؤنج کے صوفے پر لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ جونکوں والے واقعے کے بعد سے اس نے بیڈ روم میں سونا بند کر دیا تھا۔ باہر تیز بارش جاری تھی۔ ان چند دنوں میں اس نے اپنی گزری ہوئی ساری عمر سے زیادہ بارش دیکھ لی تھی۔

آخر احمد صاحب یہ سب کیسے معلوم کر پائیں گے؟ اس گھر میں کچھ نہ کچھ مسئلہ ضرور تھا۔ اگر یہاں موجود لوگوں میں سے کوئی قاتل تھا تو وہ انہیں بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ خیالات کی یلغار تھی جو اس کے ذہن پر حملہ آور تھی۔ وہ سوچ میں مگن تھی کہ اچانک چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ صدف کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"میں جنریٹر چلا رہا ہوں۔" احمد کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔

"جی میں بھی آ رہی ہوں۔" وہ صوفے سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

کئی منٹ کی کوششوں کے بعد بھی جنریٹر اسٹارٹ نہیں ہوا تھا اچانک اوپر والی منزل پر کوئی دروازہ زور سے بند ہوا۔

"اوپر کوئی ہے۔" صدف کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

’’شش...... میں دیکھتا ہوں۔‘‘ احمد بولا۔
’’میں بھی ساتھ چلوں گی۔‘‘ وہ بولی۔
وہ سیڑھی کی طرف بڑھے تھے کہ اوپر سے کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی صدف بھی چیخ کر احمد سے لپٹ گئی تھی۔
’’صدف خود کو سنبھالو۔‘‘ وہ ایک لمحے بعد بولا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اوپر کی طرف چلا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل کی ٹارچ روشن تھی۔ وہ سیڑھیوں کے درمیان میں تھے کہ روشنی کا جھماکا سا ہوا۔
’’بجلی...... بجلی اندر آگئی ہے۔‘‘ صدف بدحواس ہو کر بولی اور احمد کو گھسیٹتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب دوڑی۔
’’مجھے یہاں نہیں رہنا ہے، مجھے یہاں نہیں رہنا ہے۔‘‘ وہ ہذیانی انداز میں بولتی جارہی تھی۔
’’صدف، ہوش کرو۔‘‘ احمد نے اسے ڈانٹا۔ ’’مجھے یہ کچھ اور معاملہ لگ رہا ہے۔‘‘
’’مجھے بھی...... احمد صاحب یہ ہوسکتا ہے ناکہ یہ...... یہ...... ہاں میں اس بات کو کیسے بھول سکتی کہ ثمینہ چنگیزی کی روح بھی تو ہوسکتی ہے۔‘‘
’’کیا کہہ رہی ہو......؟‘‘
’’ہاں، اس کی بیٹی کو قتل کیا گیا ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے اسے قاتلوں سے نفرت ہوگی اور میں...... مجھ سے بھی تو مجبوری میں ہی سہی ایک قتل ہوا ہے۔ وہ مجھے مار ڈالے گی۔‘‘ وہ بارش میں کھڑی بولے جارہی تھی۔
’’صدف کیا تمہیں کوئی دورہ پڑ گیا ہے؟‘‘ احمد نے کہا۔ ’’میں ایک بات تمہیں یقین سے بتا سکتا ہوں، یہ نینا کی ماں کی روح تمہیں کچھ نہیں کہے گی مگر ہم اسی طرح اس بارش میں کھڑے رہے تو ہمیں نمونیا ہوجائے گا۔‘‘
’’آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟‘‘
’’ظاہر ہے کہ بارش میں بھیگنے سے نمونیا ہو ہی جائے گا۔‘‘
’’نہیں میں نینا کی والدہ کے بارے میں بات کررہی ہوں۔ آپ اتنے یقین سے کیسے یہ بات کہہ سکتے ہیں؟‘‘
’’میں کہہ سکتا ہوں۔‘‘ وہ بولتے بولتے رکا۔
’’کیونکہ ثمینہ زندہ ہیں۔‘‘ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر کے اندر لاتا ہوا بولا۔
’’کیا مطلب...... کیا ان کا قتل نہیں ہوا تھا؟‘‘ وہ الجھ سی گئی تھی۔
’’ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں۔ بیس سال پہلے یہاں دو قتل ہوئے تھے مگر وہ اس میں شامل نہیں تھیں۔ یہاں جو کچھ ہورہا ہے، وہ کچھ عجیب ضرور ہے مگر......‘‘ وہ تولیا اٹھا کر اس کی طرف پھینکتا ہوا بولا۔ اسی وقت بجلی واپس آگئی تھی۔
’’شکر ہے۔‘‘ صدف بے اختیار بولی۔
’’ہم اس موضوع پر بات کریں گے صدف۔ پہلے تم کپڑے بدل لو اور میں بھی دو منٹ میں آتا ہوں۔‘‘
دس منٹ بعد ان دونوں کے ہاتھوں میں کافی کے کپ تھے۔
’’میں جانتا ہوں کہ اس گھر میں کچھ عجیب ہورہا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں بھوت ہیں۔‘‘
’’احمد صاحب......‘‘ صدف نے بولنا شروع کیا۔
’’میرا خیال ہے کہ یہاں کچھ لوگ ہمیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس گھر میں کوئی مسئلہ ہے۔‘‘
’’مگر کیوں؟ اور کون ایسا کرے گا؟‘‘
’’ہمیں یہی معلوم کرنا ہے۔ ایک بات طے ہے کہ ان لوگوں کو ہماری خصوصاً میری آمد پسند نہیں آئی۔‘‘
’’کیا آپ کو وارث پر شک ہے؟‘‘ ایک لمحہ سوچ کر صدف نے پوچھا۔
’’میرا خیال ہے کہ یہ سب اس کا آئیڈیا یقینی طور پر نہیں ہے مگر وہ تیمور چنگیزی کے لیے کام کررہا ہے۔‘‘
’’مگر تیمور یہ کیوں ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔‘‘
’’میں بھی یہ جاننے کی کوشش میں ہوں۔ تم نے وہ مثال سنی ہوگی ناکہ دوستوں کو قریب رکھو اور دشمنوں کو قریب تر تاکہ تم ان پر نظر رکھ سکو۔‘‘
’’ہاں، تو اسی لیے آپ نے وارث کو یہاں ٹھہرنے کو کہا ہے۔‘‘
’’کہہ سکتی ہو۔‘‘ وہ بولا۔
’’اس کا مطلب ہے کہ آپ کے خیال میں وارث کو معلوم ہے کہ نینا کا قاتل کون ہے؟‘‘
’’مجھے یہ جاننے کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے صدف۔‘‘ وہ دل گرفتہ سے انداز میں بولا۔
’’کیا مطلب؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ قاتل کون

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے؟'' صدف نے پوچھا۔
''ہاں......'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔
''وہ کون تھا؟'' صدف نے پوچھا۔
احمد نے اس کی طرف دیکھا۔ صدف کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں پانی سا تیر رہا ہو پھر وہ بولا۔
''میرے ڈیڈ......''

☆☆☆

''آپ کے ڈیڈ نے مینا کو قتل کیا ہے؟'' صدف ایک مرتبہ سانس لینا بھول گئی تھی۔ اس کا ہاتھ لکڑی کے موتیوں پر جم سا گیا تھا۔
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''
''اگر یہ کام ان کا نہیں ہے تو پھر دوسرا آپشن وقار چنگیزی کا ہے۔''
''آپ کے والد اتنے نامور شخص ہیں وہ کیسے......''
صدف اب تک وہیں تھی۔
''تم کچھ غلط سمجھ رہی ہو۔''
''کیا غلط سمجھ رہی ہوں؟''
''تم شاید فاروق سجاد کی بات کر رہی ہو۔ کال اے ٹیک کے بانی اور مالک...... ہے نا؟''
''ہاں، وہی تمہارے ڈیڈ ہیں۔''
''تم بھول رہی ہو۔ بائیولوجیکل وہ میرے چچا ہیں باقی ہر معنی میں وہ میرے باپ ہی ہیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے میرے پیدا ہوتے ہی مجھے گود لے لیا تھا۔''
''اور آپ کی والدہ...... اگر وہ زندہ ہیں تو وہ کہاں ہیں؟ وہ تو اس تمام واقعے کی چشم دید گواہ ہیں، اگر وہ زندہ ہیں تو کیا وہ حقیقت نہیں بتا سکتیں؟'' صدف نے پوچھا۔
''میری زندگی کی سب سے اچھی بات یہ ہی ہوئی کہ فاروق سجاد اور ان کی بیوی نے مجھے گود لے لیا۔ ورنہ ثمینہ اور شہزاد سجاد دونوں ہی اچھے ماں باپ ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔''
''شہزاد سجاد؟ کیا یہ آپ کے والد کا نام ہے۔ آپ کے اصل والد کا؟''
''اصل نہیں، بائیولوجیکل والد...... میں اپنا باپ صرف ایک ہی شخص کو سمجھتا ہوں۔''
''وہ کہاں ہیں؟'' صدف نے سر ہلایا اور پھر پوچھا۔

خوب صورت باتیں

☆ جب لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ زندگی کیا چیز ہے تو وہ آدمی سے زیادہ گزر چکی ہوتی ہے۔
☆ آج پہلا قدم اٹھایا ہے تو کل منزل پر بھی پہنچ گے۔
سنو! لمبی مسافتوں میں تکلیفیں بھی ہیں، سفری تھکان اور کچھ نہ کچھ کھو دینے کا احساس بھی ہے لیکن آخر کامیابی ہے جس کی خوشی کا کوئی مقابلہ نہیں۔
☆ اگر تم غلطیوں کو روکنے کے لیے دروازہ بند کرو گے تو سچ بھی باہر ہی رہ جائے گا۔
☆ ہم سب کو ایسا ماحول بنانا چاہیے جس میں زندگی ایک سزا نہ ہو۔
☆ زندگی کی کتاب پڑھ کر صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کی توجہ اگلے باب پر ہوتی ہے۔

عبدالجبار، رومی انصاری، قصور

جھگڑا

ایک گدھا کسی گھر کی دیوار سے کان لگا کر کھڑا تھا۔ بکری کا وہاں سے گزر ہوا تو پوچھنے لگی۔ ''گدھے بھائی، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''
گدھا۔ ''اندر دو بھائی جھگڑا کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو گدھے کا بچہ کہہ رہے ہیں۔ جاننا چاہتا ہوں کہ میرا بچہ اس گھر میں کیا کر رہا ہے؟''

سیٹ

ایک غائب دماغ آدمی ٹرین سے سفر کر کے گھر پہنچا تو نہایت غصے میں تھا۔
بیوی نے وجہ پوچھی تو بولا۔ ''میری سیٹ کے قریب والی کھڑکی خراب تھی، دھول اور مٹی سے برا حال ہو گیا۔''
بیوی بولی۔ ''تو آپ کچھ دیر کے لیے سامنے والے سے سیٹ بدل لیتے۔''
غائب دماغ آدمی بولا۔ ''چاہتا تو میں بھی یہی تھا لیکن سامنے والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہی نہیں تھا۔''

رومیو کی تھائی لینڈ سے بے بسی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''جس رات نینا کا قتل ہوا اس رات ہی اس گھر میں ہونے والا دوسرا قتل ان کا تھا۔ مجھے اس کی بقیہ تفصیلات کا علم نہیں ہے بس اتنا سنا ہے کہ میری۔ والدہ اور والد کے درمیان کوئی معاملہ چل رہا تھا۔''

''یہ سب بہت عجیب ہے۔ آپ کے والد نینا کا خون کیوں کریں گے اور پھر انہیں کس نے قتل کیا؟ وقار چنگیزی نے؟ مگر کیوں؟ وہ قاتل بننے کے بجائے اپنی بیوی کو طلاق بھی دے سکتا تھا؟ اور پھر آپ کی والدہ کا اس حوالے سے کیا بیان ہے؟''

''پتا نہیں، یہ سب کیا اور کیسے ہوا مگر ہوا یہی ہے۔ بیس سال قبل میرے بائیولوجیکل والد اور میری بہن اس گھر میں قتل کیے گئے اور میری بائیولوجیکل والدہ ذہنی طور پر اس قدر متاثر ہوئیں کہ آج تک ان کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا ہے۔''

''اوہ......'' صدف بولی، وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ بظاہر اس قدر کامیاب نظر آنے والے احمد فاروق کی زندگی میں اس قدر پیچیدگیاں ہوں گی۔ اسے اپنی مشکل اپنا دکھ اس سے کم نظر آرہا تھا۔

''اب تم مجھے اتنی ترس کھانے والی نظروں سے بھی مت دیکھو، یاد رکھو کہ میں تمہارا باس ہوں اور تمہاری تنخواہ اس جرم میں کاٹ سکتا ہوں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

صدف مسکرائی مگر اسی وقت اوپری منزل پر دروازہ بند ہونے کا دھماکا ہوا۔

''اوہ یہ پھر شروع ہو گیا۔'' احمد اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اسے پکڑنا ہوگا۔''

وہ دونوں آگے پیچھے دوڑتے اوپر پہنچے مگر وہاں کوئی نہیں تھا چند ہی لمحوں بعد گرا ''میرے گھر آئی ننھی پری'' کی دھن سے گونج اٹھا۔

احمد نے آگے بڑھ کر الماری کھولی۔ خالی الماری کے دوسرے ریک پر وہ میوزک باکس رکھا تھا، اس نے آگے بڑھ کر اسے کھولا۔ دھن ویسے ہی چند لمحے گونجتی رہی پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

وہ دونوں اس میوزک باکس کو گھور رہے تھے پھر احمد نے اسے اٹھایا۔ اس کا کور کھولا۔ سالوں کی گرد نے اسے زنگ آلود سا کر دیا تھا۔ یہ میوزک باکس سیلز کے ذریعے کام کرتا تھا۔ احمد نے اس کا سیل والا ڈھکن کھولا۔ وہاں سیل موجود نہیں تھے۔ اس نے نظریں اٹھا کر صدف کو دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا اب بھی آپ کو یہ شک ہو کہ یہ سب کوئی انسان کر رہا ہے؟'' وہ کانپتی آواز میں بولی۔

''ہاں۔'' احمد نے جواب دیا۔ ''صدف کوئی بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ کیا یہاں اس گھر میں کہیں کوئی ایسا آلہ لگانا ناممکن ہے جس سے جب چاہیں کسی کو بھی کچھ سنایا جا سکے، دروازہ بند ہونے کا دھماکا، ہنسی کی آوازیں، عورتوں کی چیخیں یا پھر یہ گانا...... بولو......''

صدف اس کو دیکھتی رہی...... جیسے جیسے وہ سوچ رہی تھی، یہ حقیقت تھی کہ ایسا کرنا بالکل ممکن تھا۔

''تو آپ کو یقین ہے کہ یہ سب کچھ کسی کے اشارے پر وارث کر رہا ہے؟''

''یہ میرا اندازہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سچ ثابت ہوگا۔'' وہ بولا۔

☆☆☆

صائمہ کے سامنے احمد اور صدف کی تصویریں تھیں، وہ اسے بارش میں اندر لا رہا تھا۔ ''کیا یہ کافی ہوں گی؟'' کریم نے پوچھا۔

''ہاں، فی الحال یہ کافی ہیں، تم دیکھنا کہ یہ اسٹوری ہماری زندگی بدل دے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسٹر ملینر بھی خود ہمیں بہت کچھ دینے پر آمادہ ہو جائے۔''

''کیا مطلب......؟'' کریم نے اسے دیکھا۔

''میں نے اس کیس پر تھوڑی ریسرچ کی ہے۔ اس سیکریٹری کا ماضی بھی ایک اسٹوری ہے۔ یہ ایک قتل کر چکی ہے۔'' صائمہ نے بریکنگ نیوز والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

قصبے کے واحد اسٹور کے دفتر میں اس وقت تیمور، وقار اور وارث موجود تھے۔

''ہمیں اس سلسلے کو جلد ختم کرنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ احمد اب مزید یہاں نظر آئے...... یہ سب میرے اعصاب کے لیے بہت سے کچھ زیادہ ہے۔'' وقار چنگیزی نے کہا۔

''تو پھر تمہیں اسے یہ مکان فروخت نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' تیمور بولا۔

''میں نے یہ مکان اسے نہیں بیچا تھا۔ مجھ سے تو سارا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سودا کسی اور ہی نے کیا تھا۔ مجھے رقم کی ضرورت تھی اور یوں بھی اس مکان میں مجھے کون سی خوشی ملی تھی سوائے نینا کے......''

''مگر تمہیں اندازہ تو ہے کہ وہ بھی...... تمہاری بیٹی نہیں تھی۔'' تیمور نے دھیرے سے کہا۔

''مگر یقین تو نہیں ہے نا تیمور۔'' وقار نے تیزی سے کہا۔ ''اگر وہ میری بیٹی نہیں تھی تب بھی اسے میں نے پالا تھا۔''

''خیر تم اب کیا چاہتے ہو؟''

''مس صدف بہت اچھی خاتون ہیں اور یوں تو احمد صاحب بھی......'' وارث نے بولنا چاہا۔

''تمہیں یہ یاد رکھنا ہوگا وارث کے تم ہمارے وفادار ہو...... کہیں ان کی محبت یا دوستی میں تم کہیں کمزور تو نہیں پڑ گئے؟ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک یہاں نظر آ رہے ہیں؟'' تیمور غرایا۔

''یہ بالکل غلط بات ہے۔ میں وہ سب کر رہا ہوں جس کی مجھے ہدایت دی گئی تھی۔ وارث اپنے کام میں کبھی بے ایمانی نہیں کرتا، یہ آپ جانتے ہیں۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''یہ تو وارث ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' وقار نے کہا۔ ''بہرحال ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ یہ قصہ جلد از جلد ختم ہو۔'' اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ اسے ختم کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا...... کچھ بھی۔

☆☆☆

ثمینہ شاہ کو اس نرسنگ ہوم میں رہتے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے۔ ان بیس سالوں میں وہ کسی سائے کے مانند جاگتی تھی۔ کچھ کھاتی پیتی اور دیواروں کو گھورتی رہتی تھی۔ اس نے ان سالوں میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ شروع کے سالوں میں وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پاتی تھی، اکثر راتوں کو اسے دورہ سا پڑ جایا کرتا صرف یہی وہ وقت ہوتا تھا جب اس کی آواز سنی جاسکتی تھی۔ بول وہ اس وقت بھی نہیں سکتی تھی البتہ اس کی چیخیں سننے والوں کے دل دہلا دیتی تھی۔ برسوں کے علاج نے اب اسے خاصا پُرسکون کر دیا تھا۔ حقیقت میں تو ڈاکٹرز نے دو سال قبل ہی احمد اور اس کے والدین سے یہ کہہ دیا تھا کہ اب وہ کسی بھی وقت نارمل زندگی کی طرف لوٹ سکتی تھی۔ احمد ہر ماہ اپنی ماں سے ملنے آتا تھا مگر وہ اسے اجنبیوں کی طرح تکتی رہتی تھی۔

اس وقت بھی وہ آرام کرسی پر بیٹھی چھت سے لٹکے پنکھے کو گھومتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں اور چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور فاروق سجاد کی اہلیہ صنوبر فاروق کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''ثمینہ کیسی ہو تم؟'' وہ اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے بولیں۔

''تمہیں اب اپنے گھر لوٹ آنا چاہیے۔ اس رات کو، اور اس سب کو بھلانے کا بہترین طریقہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تم اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کرو...... جب تک تم یہ نہیں کرو گی تم اس سب سے باہر نہیں نکل پاؤ گی۔'' وہ بولیں۔

ثمینہ اسی طرح بے تاثر چہرہ لیے انہیں تک رہی تھی۔

''خیر یہ سب تو میں تمہیں دو سال سے کہہ رہی ہوں۔ آج میری آمد کا ایک خاص مقصد ہے، ثمینہ تم سن رہی ہو نا...... نینا اس رات مر گئی تھی مگر نینا سے آٹھ سال قبل تم نے ایک اور بچے کو بھی جنم دیا تھا...... یاد ہے نا تمہیں...... تمہارا بیٹا جو میرا بیٹا اور میری جان بھی ہے...... احمد...... وہ تمہاری بھی اولاد ہے اور اب تمہاری وہ اولاد بھی خطرے میں ہے، تم سن رہی ہو نا...... وہ اسی قاتل گھر میں چلا گیا ہے، وہ اپنی بہن کے قاتل کو جاننا چاہتا ہے۔ اس رات وہاں جو کچھ ہوا، اسے سمجھنا چاہتا ہے۔ وہاں کے خطرات کو تم ہم سے بہتر سمجھ سکتی ہو...... ہم اسے روک نہیں سکتے ثمینہ مگر تم اس کی مدد کر سکتی ہو...... تمہیں جو بھی معلوم ہے، اسے یاد کرو...... اپنے بیٹے کو اس آسیبی گھر میں مت رہنے دو، اس کی مدد کرو ثمینہ......'' وہ بولتے بولتے تھک گئی تھیں۔

''میں جا رہی ہوں۔ تم اگر اس کے لیے کچھ نہیں کرو گی تو میں کروں گی مگر خدا کے لیے اس کی ماں ہونے کا ایک فرض تو ادا کر دو۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی تھیں۔ ثمینہ اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔

چند لمحوں بعد اس کی ایک آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا تھا جو اس کے گال سے پھسلتا ہوا نیچے جا گرا تھا۔

☆☆☆

''کیا تم وارث پر یقین کرتے ہو؟'' وقار نے تیمور سے پوچھا۔

''تم اس پر بلاوجہ شک کر رہے ہو، وہ کوئی باہر کا آدمی نہیں، ہمارا بھانجا ہے وقار...... '' تیمور نے جواب دیا۔

''مگر وہ کچھ عجیب طرح سے برتاؤ کر رہا ہے، نہ جانے مجھے کیوں یہ لگ رہا ہے کہ اگر ہم اور شہزاد کا وہ بیٹا آمنے سامنے کھڑے ہوئے تو وارث کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں گی۔'' وقار نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم ضرورت سے زیادہ سوچ رہے ہو، ایسا کچھ نہیں ہے...... '' تیمور وہیل چیئر کو آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

''آخر تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟''

''بس شاید یہ میری گٹ فیلنگ ہے۔''

''اور تم اپنی اس فیلنگ (محسوسات) پر یقین بھی کرتے ہو۔ یہ وہی ادراک ہے نا جس کے بل بوتے پر برسوں پہلے تمہیں یقین تھا کہ تم ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہو۔'' تیمور نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اگر میں تمہیں اس عورت کا اصل چہرہ نہ دکھاتا تو تمہیں کبھی اس کے بارے میں اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔''

''تم جانتے ہو کہ تم میں سب سے بڑی خرابی کیا ہے؟ تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ تمہیں کب کیا بولنا ہے اور کب چپ رہنا ہے۔'' وقار نے جواب دیا۔ تیمور نے اس کی دکھتی رگ پر پیر رکھ دیا تھا۔

''ہوسکتا ہے مگر تمہیں ابھی یہ اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تمہاری توجہ کا مرکز وارث کو نہیں شہزاد کے بیٹے کو ہونا چاہیے۔ وہ اس قصبے میں اب تک موجود ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ وہ خود ہی یہ قصبہ چھوڑ جائے۔'' وقار نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''اور وہ یہ کیوں کرے گا؟''

''ایک تو وہ زیادہ وقت تک اپنے کاروبار سے دور نہیں رہ سکتا۔ دوسرے جب وہ کچھ حاصل نہیں کر پائے گا تو یہاں رکنے کا جواز ختم ہوجائے گا اور سب سے بڑی وجہ صدف بھی ہوسکتی ہے۔'' وقار ہوا میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''اس کی وہ اسسٹنٹ...... میں نے اس کا بیک گراؤنڈ چیک کیا ہے، وہ ایک قتل کر چکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری خوش قسمتی اس سے دوسرا قتل کروا دے۔'' اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کچھ چل رہا ہے۔ تیمور نے وقار کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں سکیڑ کر کچھ سوچنے لگا۔

☆☆☆

صنوبر فاروق نے اپنا ای میل کھولا۔ انہیں ابھی ابھی کمپنی کے برانڈ ہیڈ کا میسج ملا تھا جس نے انہیں اپنی ای میل دیکھنے کی درخواست کی تھی۔ ای میل میں ایک رسالے میں چھپنے والے مضمون کے تراشے کا کلپ موجود تھا۔ جس میں احمد کی ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ تصویریں بھی موجود تھیں۔ مختصر سے مضمون میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ بالآخر کروڑپتی احمد فاروق محبت میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اس وقت فضل آباد میں موجود ہیں۔

وہ کچھ دیر اس کلپ کو دیکھتی رہیں۔ ''یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔'' وہ بالآخر بڑبڑائیں ان کی پریشانی کی وجہ احمد کا کسی لڑکی کے ساتھ ہونا نہیں تھا۔ اس طرح وہ سب کی نظروں میں آ رہا تھا جو اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

وہ چند لمحے اپنے خوب صورتی سے مینی کیور کیے گئے ناخنوں کو میز پر بجاتی رہیں پھر موبائل لے کر اپنے بیڈروم کا رخ کیا۔

''فاروق......'' انہوں نے گہری نیند میں ڈوبے شوہر کو تقریباً جھنجوڑ ہی دیا تھا۔

''کک کیا ہوا ہے صنوبر...... کیا کہیں آگ لگ گئی ہے؟''

''نہیں......'' وہ بولیں۔

''ہمارے کسی دفتر میں ہڑتال ہوگئی ہے؟''

''نہیں بھئی......''

''پھر کیا ہوا ہے نصف بہتر صاحبہ۔'' وہ جزبز ہو کر بولے۔

''یہ ہمارے بیٹے کے متعلق ہے...... اسے پڑھ لیجیے پہلے۔'' وہ فون ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

فاروق سجاد نے چند لمحے میں اس مضمون کو پڑھا پھر سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ اس پر کچھ نہیں کہیں گے؟''

''کہوں گا کہ یہ سب بکواس ہے مگر یہ بے چارے چھوٹے موٹے رسالے اس طرح کی خبریں چھاپ کر اپنا کام چلاتے ہیں۔''

''فاروق معاملہ صرف اتنا نہیں ہے۔'' وہ بولیں۔

''یہ وہ لڑکی ہے جسے اس نے میرے کہنے پر ملازمت پر رکھا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا بحالیِ مرکز سے آنے والی لڑکی......''

''اوہ اچھا تم نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ اس لڑکی نے اپنے سابقہ شوہر کو اپنے سیلف ڈیفنس میں قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ مرکز میں پہنچی تھی۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''جی......'' وہ پریشانی سے بولیں۔

''دیکھو صنوبر! ہم نے اپنے بیٹے کو ایک اچھی تربیت دی ہے۔ تم اس پر اعتماد کرو وہ کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔ جو بھی قدم اٹھائے گا سوچ سمجھ کر اٹھائے گا۔'' وہ بیوی کو تسلی دیتے ہوئے بولے۔

''مجھے تو اس کا وہاں جانا اور پھر اس مکان کو خریدنا ہی غلط لگا تھا اور اب یہ لڑکی...... میرا مطلب ہے کہ اپنے ماضی کی وجہ سے وہ بالکل نارمل تو نہیں ہوگی نا...... کہیں اس سے میرے بیٹے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔''

''کمال کرتی ہو تم...... میرا مشورہ یہی ہے کہ اسے اپنا کام کرنے دو، اس میں مداخلت نہ کرو...... دعا کرو کہ سب ٹھیک رہے اوکے......'' وہ مسکرائے۔

''ٹھیک ہے مگر اگر کوئی بات بڑھتی ہے تو میں اس کے پاس چلی جاؤں گی۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

فاروق سجاد بیوی کی دھمکی پر مسکرائے پھر انہوں نے بیڈ سائڈ پر رکھا اپنا فون اٹھایا چند نمبر دبائے پھر بولے۔

''یہ میں ہوں، فضل آباد میں معاملات کچھ الجھ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دیکھو کہ وہاں کیا چل رہا ہے اور یہ مضمون والا معاملہ آج ہی ختم ہونا چاہیے۔'' انہوں نے اتنا کہہ کہ کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا۔ اب نیند ان کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ پیشانی پر چند شکنیں تھیں۔ صنوبر کے سامنے بے پروائی کے اظہار کے باوجود انہیں اپنے بیٹے کی بہت فکر تھی۔ صرف ان کا طریقۂ کار الگ تھا۔ وہ سامنے آئے بغیر اس کے راستے کے کنکر صاف کرنے کا فن جانتے تھے۔

☆☆☆

ان کی صبح کا آغاز نینا کے کمرے کی جانچ پڑتال سے ہوا تھا۔ احمد ہر کونے کھدرے اور ہر جگہ کو نہایت باریک بینی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کمرے میں کوئی نہ کوئی سیٹ اپ کیا گیا تھا۔ کافی دیر کی عرق ریزی کے بعد کمرے کی بڑی کھڑکی کی اوپری چوکھٹ کے ساتھ ایک باریک سا تار برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ صدف بے یقینی سے اس تار کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گزشتہ ایک ہفتے سے بے خوابی، خوف اور دہشت کے جس سمندر سے گزری تھی اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی، یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

''ہمیں اسے یہیں رہنے دینا ہے۔ اس کا گمان بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس راز تک پہنچ گئے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اتنی محنت کے بعد ایک اچھا کپ کافی تو ملنا ہی چاہیے مس اسسٹنٹ۔'' وہ ہاتھ جھاڑتا ہوا بولا۔

اس تار اور پھر اس سے وابستہ چھوٹے سے آلے تک پہنچ جانے نے احمد کا موڈ بہتر کر دیا تھا۔ کم از کم یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ گھر آسیب زدہ نہیں ہے...... ہاں انہیں بھگانے کے لیے اسے آسیب زدہ دکھایا ضرور جا رہا تھا۔

کافی کا کپ اس کے ہاتھ میں آنے تک اس کا موڈ بگڑ چکا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' صدف نے اس کی جانب غور سے دیکھا۔

''بعض اوقات انسان کی عقل ہی اس کی دشمن بن جاتی ہے۔'' وہ بولا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم جانتی ہو نا کہ میں وارث کو یہاں روکنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مجھے کسی ٹھوس وجہ کی ضرورت تھی اس لیے میں نے گمنام پیغام بھیج کر ان دو رپورٹرز کو اپنی طرف متوجہ کیا۔'' وہ صدف کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''اب تم شروع مت ہو جانا...... میرے اور تمہارے چکر کا آئیڈیا ان کا اپنا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو اس میں حرج کیا ہے؟''

''حرج کیا ہے؟'' صدف نے اس کا جملہ دہرایا۔

''میرا مطلب ہے کہ ان کی بکواس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''مگر آپ کو مجھے اس بارے میں بتانا چاہیے تھا، کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا؟'' صدف نے اسے گھورا۔

''شاید مگر میرا فوکس اصل معاملے کی طرف زیادہ

تھا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔
''اور اب کیا ہوا ہے؟''
''اب......'' احمد نے گہری سانس لی۔ اب ان احمقوں نے ہمارے بارے میں ایک مضمون چھاپ دیا ہے اور میری ماں نے ابھی ابھی مجھے فون کر کے پوچھا ہے کہ کیا مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے؟''
''اُف......'' صدف بولی۔ ''اور آپ نے کیا جواب دیا، کیا میں یہ جان سکتی ہوں؟''
''کیوں نہیں، میں نے ان سے کہا کہ شاید مگر فی الحال یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' وہ مسکرایا۔
''شاید، اس کا کیا مطلب ہے آپ خود اس چیز کو مشکوک کیوں بنا رہے ہیں؟'' صدف نے اسے گھورا۔
''یعنی مجھے انہیں کہنا چاہیے تھا کہ ہاں......؟''
''اُف...... آپ کو کہنا چاہیے تھا نہیں، یاد نہیں آپ کو، آپ نے خود کہا تھا کہ میں آپ کی ٹائپ کی نہیں ہوں۔'' صدف روانی میں کہتی چلی گئی۔
''ہاں، وہ تو سچ ہے، تم میری ٹائپ کی نہیں ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم تھوڑی مشکل ہو۔''
''یہ مذاق کی بات نہیں ہے آپ کو ان رپورٹرز کو اس معاملے میں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ نہ جانے آپ کی امی اور دوسرے لوگ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟''
''دیکھو صدف دوسروں کے کچھ بھی سوچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں مجھے اندازہ ہے کہ اس طرح تھوڑی گڑبڑ ہوگئی، میں اس حوالے سے تم سے معذرت کرتا ہوں، پلیز آئی ایم سوری۔'' اس کے ان الفاظ پر صدف نے اسے چونک کر دیکھا۔
''آپ معذرت کر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔''
''کیوں؟''
''کیونکہ میں جس احمد فاروق کو جانتی ہوں، وہ عموماً ایک مغرور انسان نظر آتا ہے۔'' وہ بولی۔
''وہ صدف جو فائٹر ہے جو کچھ بھی کر سکتی ہے، وہ ابھرتی نظر آرہی ہے۔'' وہ مسکرایا۔
''آئی ایم سوری۔'' صدف بولی۔
''مت کرو ویسے اب میں تمہاری ملٹی پل (مختلف) شخصیت کا عادی ہوتا جا رہا ہوں۔''

اسی وقت اس کے فون کی بپ بجی۔ صنوبر نے اس آرٹیکل کا لنک میسج کیا تھا۔ احمد نے لنک پر کلک کر کے مضمون پڑھا۔ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ ان رپورٹرز نے اس مضمون میں صدف کے ماضی کو بھی نشانہ بنایا تھا۔ صدف اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
''کیا مزید کچھ اور بھی ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں مگر اب میں ان رپورٹرز کو برباد کر دوں گا۔'' وہ غرایا۔ ''انہوں نے تمہارے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے لیے میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس مکان، میری بہن کو بھی اپنے مضمون کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔''
''مجھے اسی کا ڈر تھا۔'' وہ بولی۔
''پلیز مجھے معاف کر دو...... یہ سب میری غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔
''میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ کو میری وجہ سے یعنی میرے ذکر کی وجہ سے شرمندگی تو نہیں ہو رہی نا......''
''کیا تمہیں ایسا لگتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''ایسا نہیں ہے ہاں اگر کوئی تمہاری عزت میں کمی کی کوشش کرے گا تو یقیناً اسے مجھ سے ملاقات کرنا پڑے گی۔''
اس کے اس جواب پر صدف کا ہاتھ لکڑی کے موتیوں کی طرف بڑھا تھا۔ زندگی اس کے حصے کی خوشیاں ڈھونڈ لائی تھی۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک نے صدف کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ وارث ہوگا مگر دروازہ کھلتے ہی سدرہ کو سامنے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی سر کو خم کیا اور پھر اندر داخل ہوگئی۔
''مسٹر احمد......'' وہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے سیاہ بال سر پر جوڑے کی شکل میں نفاست سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے ڈیزائنر سوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں چمڑے کا سیاہ فولڈر تھا۔
''سدرہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ کیا امی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟''
''نہیں سر، مجھے چند اہم کانٹریکٹس پر آپ کے دستخط درکار تھے میں اسی لیے یہاں آئی ہوں۔ آپ کی والدہ نے موجودہ ایشوز کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ میں نے

وکیلوں سے بات کرلی ہے اور وہ مضمون ہر جگہ سے ہٹوا دیا گیا ہے۔''

''بہت شکریہ سدرہ۔'' وہ اس کے دیے ہوئے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ اس مضمون کی وجہ سے کتنی ٹینشن ہوگی آپ کو، مگر اب وہ ہٹوا دیا گیا ہے۔ مس صدف کے بارے میں افواہیں بھی دو چار دن میں دم توڑ جائیں گی۔''

صدف اس وقت کافی کی ٹرے لے کر لاؤنج میں آرہی تھی اپنے ذکر پر ٹرے اس کے ہاتھوں میں لرز گئی۔

''صدف...... تمہیں محتاط رہنا چاہیے، تمہارے ہاتھ پر کافی گری ہے؟'' وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کی انگلیوں کو غور سے دیکھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔ اس کی نظریں سدرہ پر تھیں جس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''اپنا منہ بند کرو سدرہ، کہیں کوئی مکھی اندر نہ چلی جائے، میں نے کاغذات پر دستخط کر دیے ہیں۔ تم کافی پی کر جا سکتی ہو۔''

''بالکل سر۔'' وہ مسکرائی۔

''میں اس ساری زحمت اور اضافی کام کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' صدف، سدرہ کے قریب آکر بولی۔

''ارے یہ تو میرا کام ہے۔ میں تو صرف اس بات پر حیران ہوں، میں نے اتنے برسوں میں انہیں کبھی کسی کی اتنی فکر کرتے نہیں دیکھا۔ لوگ انہیں بہت سخت دل کا مالک سمجھتے ہیں۔ خواتین سے وہ صرف ضرورت کی بات کرتے آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی والدہ انہیں اس طرح تمہاری فکر کرتے دیکھ لیں تو وہ بے ہوش ہو جائیں گی۔'' وہ مسکرائی۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے کہ یہ تم غلط کر رہی ہو۔'' کیمرا مین کریم بولا۔

''تم صرف ڈرتے رہو گے...... اس صورت میں تم کبھی کوئی بڑی اسٹوری نہیں بنا سکو گے۔'' صائمہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''ہم نے آج ان پر مضمون لگایا ہے اب انصاف کے تقاضے کے طور پر ان کا نکتۂ نظر بھی شائع کرنا چاہیے۔'' وہ دونوں اس وقت احمد کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔

صائمہ نے اپنی بات مکمل کر کے دروازے پر دستک دی۔

صدف ان دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''تم لوگوں کی یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم آپ کا اور مسٹر احمد کا نکتۂ نظر لینے آئے ہیں تاکہ اسے بھی شائع کیا جا سکے۔'' صائمہ نے کہا۔

احمد بھی اس دوران میں باہر آگیا تھا۔ وہ چند لمحے کے سکوت کے بعد بولا۔ ''میں یا مس صدف آپ دونوں سے کوئی بات کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ میں آپ کو مطلع کر رہا ہوں کہ اگر دو منٹ میں آپ میرے گھر کی حدود سے باہر نہ نکلے تو میں پولیس کو فون کر دوں گا اور اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ آپ لوگوں کو کافی عرصے تک سرکاری میزبانی کا شرف حاصل رہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا؟'' کریم بولا۔

''یہ خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ اگلی خبر پر ان کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔'' صائمہ غصے سے بولی۔

''فی الحال تو یہاں سے نکلو ایسا نہ ہو کہ وہ واقعی پولیس کو کال کر دے۔'' کریم گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''اسٹور سے ہوتے ہوئے چلو، مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔'' صائمہ کے کہنے پر اس نے گاڑی کا رخ اسٹور کی جانب کر لیا۔

☆☆☆

''میں یہ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ تم اتنا فالتو بولتی کیوں ہو؟'' فضل دین اور سمیرا چنگیزی اسٹور میں پارٹ ٹائم ملازمت کرتے تھے۔ اس وقت فضل دین، سمیرا پر ہی بگڑ رہا تھا۔

''میں نے زیادہ کب بولا اب اس بے چاری کو حقیقت کا علم تو ہونا ہی چاہیے نا۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''تم نے کیا بتایا اسے......؟''

''یہی کہ اس گھر میں جہاں اب احمد صاحب اور وہ رہ رہے ہیں اپنے وقار صاحب کی بیٹی کا قتل ہوا تھا اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس مکان پر سایہ ہے۔''

''معاف کرنا، تم لوگ اتنی زور سے بول رہے تھے

کہ ہمیں سب کچھ سننا پڑا۔'' صائمہ شیلف کی دوسری جانب سے باہر آتے ہوئے بولی تو وہ دونوں چونک اٹھے۔

''کیا احمد صاحب نے وہ مکان اس قتل کی وجہ سے خریدا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں وہ قتل تو بہت پہلے ہوا تھا۔ میں نے مس صدف کو یہی بتایا تھا کہ احمد صاحب نے جانتے بوجھتے وہ مکان خرید لیا۔''

''سمیرا اپنا کام کرو۔'' فضل دین سخت لہجے میں بولا۔ ''آپ کو کیا درکار ہے میڈم؟'' وہ صائمہ کی طرف مڑا۔

''میں تیمور صاحب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ مسکرائی اور اسٹور میں بنے چھوٹے سے دفتر میں گھس گئی۔

''تیمور صاحب آپ ایس ایچ او وقار صاحب کے بھائی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی..... آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کے بھائی اور احمد صاحب کا تعلق کیا ہے؟''

''اس سوچ کی وجہ.....؟'' تیمور نے ایک ابرو اٹھا کر پوچھا۔

''کیا آپ کو اس بات پر حیرت نہیں ہے کہ احمد صاحب نے وہ مکان یہ جانتے ہوئے بھی خرید لیا کہ وہاں وقار صاحب کی بیٹی کا قتل ہوا تھا۔ عموماً لوگ ایسی جگہیں لینا پسند نہیں کرتے۔''

''ہر ایک کو موت سے اتنا ڈر نہیں لگتا۔'' پیچھے سے آنے والی آواز پر وہ مڑی، وقار چنگیزی دروازے کے پاس موجود تھا۔

''ایس ایچ او صاحب میں آپ کی بات ہی کر رہی تھی۔''

''وہ میں نے سن لیا ہے، میں نہیں جانتا کہ یہاں فضل آباد میں آپ کا کیا کام ہے مگر یہاں کے لوگ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتے جو دوسروں کی زندگی میں دخل اندازی کرتے ہوں۔''

''کیا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں ایک رپورٹر ہوں اور سوال کرنا میرا کام ہے۔''

''نہیں آپ کا کام خبریں دینا ہے، مرے ہوئے لوگوں کو اکھاڑنا نہیں۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میری بیٹی کے قتل کا معاملہ ابھی حل نہیں ہوا آپ کے سوالات میری تفتیش میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کسی جیل میں رات گزاری ہے؟''

''کیا مطلب......؟''

''اگر میں نے آج کے بعد آپ کو اپنی بیٹی کے حوالے سے اناپ شناپ بکتے دیکھا تو میں یہی کروں گا۔'' وہ غرایا۔

اس کے بعد صائمہ اور کریم نے وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

☆☆☆

''یہاں بہت گڑبڑ ہے مگر کوئی زبان کھولنے کو تیار نہیں ہے۔'' صائمہ اور کریم قصبے کو جانے والی سڑک سے متصل جنگل کے قریب اپنی کار میں بیٹھے تھے۔

''میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہم فضل آباد کا پیچھا چھوڑ کر کسی اور اسٹوری پر کام کرتے ہیں، یہاں وہ احمد اور وقار دونوں ہی ہمارے دشمن بن چکے ہیں، ان دو دنوں میں ہم نے ایس ایچ او کی بیٹی کے قتل کے حوالے سے جس جس سے بات کرنے کی کوشش کی ہے ہمیں نقصان ہی ہوا ہے۔'' کریم بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ اگر ہم نے اس کہانی پر کام کر لیا تو ہمیں اس کے کتنے پیسے ملیں گے۔ کتنی واہ واہ ہوگی۔ یوں بھی میں ان لوگوں کو سخت جواب دینا چاہتی ہوں۔'' صائمہ بولی۔

''میرا فیصلہ اب بھی وہی ہے میں آج کا ایک دن اور تمہارے ساتھ کام کروں گا، اس کے بعد تم اکیلے ہی یہ واہ واہ سمیٹنا۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''اچھا میں ایک کال کر کے آتی ہوں پھر ہم ہوٹل کی طرف چلتے ہیں۔'' صائمہ کار سے اترتے ہوئے بولی۔

''وہ دس منٹ میں واپس آ گئی تھی۔ کریم کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا بس اس کا سر اب اسٹیئرنگ وہیل پر تھا۔

''ایک نمبر کے سست اور سوتو انسان ہو تم کریم...... چلو میں آ گئی ہوں۔'' وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اس کے دروازہ بند کرنے کے بعد کریم نے اپنی جگہ سے

حرکت نہیں کی تو اس نے اسے جھنجوڑا۔
''سونے کی اداکاری کر رہے ہو؟'' اس کا ہاتھ لگتے ہی وہ گویا ڈھے گیا تھا۔
''کیا ہوا کریم......؟'' صائمہ نے بوکھلا کر اسے سیدھا کیا۔
اس کی بے نور نگاہیں اب صائمہ پر جمی ہوئی تھیں۔ جبکہ اس کی گردن سے خون اب تک نکل رہا تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھتی رہی پھر اس سے قبل کہ اس کے منہ سے کوئی چیخ نکل پاتی، پچھلی سیٹ سے کسی نے اس کی گردن پر ریوالور رکھ کر گولی چلا دی، نال پر چڑھے سائلنسر کی وجہ سے اردگرد اڑتے پرندوں تک موت کی آہٹ نہیں پہنچ پائی تھی۔

☆☆☆

''امی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی واپس آجاؤں گا۔'' احمد فون کان سے لگائے مسلسل بول رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس نے فون بند کیا اور گہری سانس لی۔ وہ رات کا کھانا جلد ہی کھا چکے تھے۔ آج وارث یہیں پر تھا۔ وہ دونوں اوپر لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے جبکہ اس نے نیچے ڈائننگ لاؤنج کے صوفے پر قبضہ کیا ہوا تھا۔
''آپ کی امی آپ کو لے کر بہت پریشان ہیں۔'' احمد کے فون بند کرنے کے بعد صدف نے کہا۔
''ہاں، میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اتنے اچھے والدین ملے۔'' وہ بولا۔ ''نینا اتنی خوش قسمت نہیں تھی۔''
صدف نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ نیچے سے ایک دہشت زدہ کر دینے والی چیخ نے ان دونوں کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ اس بار یہ چیخ کسی مرد کی تھی۔
''یہ...... یہ تو وارث کی آواز لگتی ہے۔'' احمد نے کہا اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے نیچے پہنچے۔
وارث سیڑھیوں کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کا گہرا سایہ چھایا ہوا تھا۔
''کیا ہوا وارث......؟'' صدف نے پوچھا۔
''بولو وارث......؟'' احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''وہ...... وہ......'' وارث نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ احمد اور صدف کی نظر ایک ساتھ دیوار پر پڑی تھی جہاں خون سے لکھا تھا۔
''موت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

☆☆☆

''میں معافی چاہتا ہوں مگر اب آپ اس گھر میں نہیں رہ سکیں گے۔'' وقار چنگیزی نے کہا۔ ''اب یہ ایک کرائم سین بن چکا ہے۔''
''اگر کوئی آپ کے گھر میں گھس کر کچھ لکھ دے تو کیا آپ اپنا گھر خالی کر دیں گے؟'' احمد نے اسے گھورا۔
''احمد صاحب یہ پینٹ یا سیاہی نہیں، یہ خون ہے اور میں اسے پہچان سکتا ہوں۔ یہ کس کا خون ہے کہاں سے

آیا ہے اور اس کے پیچھے کون ہے، یہ جاننا بہت ضروری ہے۔"

"ایس ایچ او صاحب......" ایک انسپکٹر نے آکر اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

"بولو......"

"آپ کو ساتھ آنا پڑے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

وقار چنگیزی انہیں انتظار کرنے کا کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

"تو اب ہم کیا کریں گے ؟" صدف نے احمد سے پوچھا۔

"ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔" احمد بولا۔

"اگر یہ کرائم سین ڈیکلیئر ہوجاتا ہے تو آپ دونوں کچھ دنوں کے لیے میرے گھر بھی رہ سکتے ہیں۔" وارث بولا۔

"تمہارا بہت شکریہ۔" احمد مسکرایا۔

"یہ مت کرنا وارث ورنہ تم پریشانی میں پڑ جاؤ گے۔" ایس ایچ او وقار کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟" احمد نے اسے گھورا۔

"دیوار پر پائے جانے والے خون کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ دو رپورٹر جنھوں نے تمہارے بارے میں مضمون لگایا تھا، انہیں قتل کردیا گیا اور یہ ان کا ہی خون ہے اور اس حوالے سے میرے لیے تم دونوں مشکوک افراد میں پہلے نمبر پر آتے ہو۔"

"کس بات کا شک کررہے ہیں آپ ہم پر......؟" صدف نے پوچھا۔

"قتل کا......"

"فکر مت کرو صدف......" احمد نے اسے دیکھا۔ "ہمارے وکیل اس جھوٹ کا مقابلہ کرلیں گے۔"

☆☆☆

"یس سر، میں سمجھ گئی ہوں اور میں اس معاملے کو دیکھ لیتی ہوں۔" سدرہ نے کہا۔ فون رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اسے یہ کام آج ہی نمٹانا تھا۔ اس کا رخ ثمینہ شاہ کے نرسنگ ہوم کی طرف تھا۔

"آپ مجھے نہیں جانتیں۔" وہ آرام کرسی پر بیٹھی ثمینہ کے سامنے پہنچ کر بولی۔ "میرا نام سدرہ ہے میں جانتی ہوں کہ اب آپ، بول سکتی ہیں مگر شاید بولنا نہیں چاہتیں یا پھر بولنا بھول گئی ہیں۔ میں یہاں آپ کو لینے آئی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

☆☆☆

"تمہیں آج ہی یہ گھر خالی کرنا ہوگا۔" ایس ایچ او وقار اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے مگر اس کے لیے تمہیں میرے وکیل کا انتظار کرنا ہوگا۔" احمد نے متانت سے کہا۔

"وہ کب یہاں پہنچے گا؟"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ راستے میں ہے۔"

سدرہ اور ثمینہ 16 سو سی سی کی سیاہ کار میں بیٹھے کسی کا انتظار کررہے تھے۔ چند لمحوں بعد ٹنٹڈ گلاسوں والا دروازہ کھلا اور صنوبر فاروق نے پچھلی نشست پر ثمینہ کے برابر جگہ سنبھال لی۔

"ہم کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے سدرہ؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"صرف ایک گھنٹا لگے گا میڈم۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے بھی ثمینہ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"میں تمہیں ایک خبر دینا چاہتی ہوں ثمینہ، تمہارے سابق شوہر وقار چنگیزی، تمہارے بیٹے پر قتل کا مقدمہ، جھوٹا مقدمہ بنانے کی کوشش کررہا ہے شاید تم اس بار خون کے اس آخری رشتے سے بھی محروم ہونے والی ہو۔"

اس کے ان الفاظ پر ثمینہ کے جامد چہرے پر تکلیف اور پھر غصے کے تاثرات اُبھرے تھے۔

"تمہارے پاس یہی وقت ہے اپنا منہ کھول دو، ہمت کرو...... اب تم ٹھیک ہو، بول سکتی ہو، اور تم تنہا قصوروار نہیں ہو، خود کو اتنی کڑی سزا مت دو۔" وہ کہے جارہی تھیں۔

ان کے الفاظ کے درمیان کہیں کسی لمحے ثمینہ کے منہ سے ایک چیخ سی برآمد ہوئی اور پھر وہ صنوبر کے گلے لگ کر زاروقطار رونا شروع ہوگئی۔

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر صنوبر فاروق نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

اب سب ٹھیک ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

وقار اور احمد کے درمیان بحث جاری تھی۔ صدف

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اور وارث خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دروازے پر ہونے والی دستک کے جواب میں وارث آگے بڑھا تھا۔

''تم......'' اندر آنے والے کو دیکھ کر وقار نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو تیمور؟''

''مجھے ابھی ابھی رپورٹرز کے معاملے کا علم ہوا اور پھر پتا چلا کہ تم یہاں ہو میں اسی لیے چلا آیا کہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔'' فضل دین، تیمور کی وہیل چیئر چلاتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں بس اس گھر کو فی الحال سیل کرنا ہے اور احمد فاروق صاحب کے وکیل کا انتظار ہو رہا ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

''مجھے اس مکان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وقار صاحب۔ میں صرف حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔'' احمد سنجیدگی سے بولا۔ ''نینا کے ساتھ کیا ہوا تھا، یہ جاننا چاہتا ہوں۔''

''نینا کے ساتھ۔'' وقار بولا۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ ''تم یہ جاننا چاہتے ہو۔ میں بتاتا ہوں تمہیں، اسے قتل کیا گیا تھا۔ شہزاد سجاد نے تمہارے باپ نے اسے قتل کیا تھا۔ کیونکہ وہ تمہاری ماں سے دوبارہ شادی کرنا چاہتا تھا اور تمہاری ماں نے...... ثمینہ نے اسے قتل کر دیا۔ یہ ہے کل کہانی......''

''نہیں، یہ سچ نہیں ہے۔'' ایک بھنچی ہوئی روہانسی آواز نے ان سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی تھی۔

''ثمینہ...... تم......'' تیمور اسے دیکھ کر چیخ پڑا تھا۔ وقار اسے گھورے جا رہا تھا۔

ثمینہ کے پیچھے سدرہ کھڑی تھی۔

''سدرہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تم یہاں کیوں آئی ہو اور انہیں یہاں کیوں لے کر آئی ہو؟''

''آپ کے والدین نے مجھے یہ ذمے داری دی ہے، مسز ثمینہ بول سکتی ہیں اور میں انہیں یہاں لے کر آئی ہوں۔''

''اگر تم سچ جاننا چاہتے ہو احمد تو میں وہ تمہیں بتا سکتی ہوں۔''

وہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

''نینا کا اس طرح جانا ایک ایسا دکھ تھا جو میری زبان، میری سوچوں کو مقفل کر گیا تھا۔ میری بچی......'' آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

''اب رونے کا کیا فائدہ ثمینہ تمہاری وجہ سے ہم سب کی زندگیاں برباد ہو گئیں۔'' وقار غرایا۔

''تم حقیقت نہیں جانتے وقار......''

''میں نہیں جانتا...... بہت خوب......''

''میڈم کیا آپ نے شہزاد سجاد کو قتل کیا تھا؟'' وارث نے پوچھا۔

سب کی آنکھیں ثمینہ پر تھیں جبکہ وہ اپنے سابق شوہر وقار کو گھور رہی تھی۔

''نہیں وہ بالآخر بولی۔

''اگر آپ نے نہیں تو انہیں کس نے مارا تھا؟'' صدف خود کو روک نہیں پائی تھی۔

''اچھا سوال ہے۔'' اس کی نگاہیں اب بھی وقار پر جمی ہوئی تھیں۔

''بولیے انہیں کس نے قتل کیا تھا؟'' اس بار احمد نے پوچھا۔

''اسی شخص نے جس نے نینا کو مارا تھا۔'' وہ بولی۔

''یعنی انہوں نے خود اپنے آپ کو مار لیا۔'' احمد بولا۔

''نہیں...... وہ یہ تھا......'' اس کی انگلی کا رخ تیمور چنگیزی کی طرف تھا۔

''تیمور......'' وقار چیخ پڑا۔ ''نہیں تم جھوٹ بول رہی ہو، میرا بھائی ایسا نہیں کر سکتا وہ تو خود حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔''

''کیا آگے کی کہانی تم انہیں سناؤ گے یا مجھے ہی بات مکمل کرنی ہو گی تیمور؟'' ثمینہ نے آہستگی سے پوچھا۔

''خاموش رہو۔'' تیمور جواباً چلایا۔

''اب خاموشی ختم ہو چکی ہے تیمور، وقار، شہزاد برا انسان تھا میں نے اسی لیے اس سے طلاق لی تھی۔ اور پھر تم سے شادی کی تھی۔ تمہیں یاد ہے کہ ہم خوش تھے۔ میں اس قصبے میں آ کر یہیں کی ہو گئی تھی۔ شہزاد نے آخری سالوں میں مجھ سے رابطہ کیا تھا، وہ مجھ سے دوبارہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں تم سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لوں تاکہ وہ اپنے بھائی سے احمد کو چھین سکے۔ اسے اپنے بھائی سے اس کی اچھائیوں سے نفرت تھی۔ میں یہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر کہانی صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ تمہارا بھائی تیمور مجھے پسند کرتا تھا اور میرے قریب آنے کی کئی بار کوشش بھی کر چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا

کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اگر میں تم سے طلاق لے لوں تو وہ مجھ سے شادی کرلے گا۔ میں نے اسے ایک ہی جواب دیا تھا کہ نینا کی خوشی اب میری زندگی ہے اور میں یہ سب نہیں سوچ سکتی۔ جس کے جواب میں اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے ختم کردے گا، مجھے ایسی سزا دے گا کہ میں کبھی نہیں بھولوں گی اور یہ کہ جو وہ چاہتا ہے اگر اسے نہیں مل سکتا تو پھر وہ ختم ہوجاتا ہے۔‘‘ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

’’یہ جھوٹ بول رہی ہے وقار اس کی بات مت سنو، یہ چڑیل ہے۔‘‘ تیمور حلق کے بل چیخا۔

’’اس رات ہم گھر میں تنہا تھے۔ شام کو شہزاد کا فون آیا تھا اسے میرا جواب چاہیے تھا۔ میرے انکار پر اس نے مجھے برباد کردینے کی دھمکی دی تھی۔ اس رات تیمور ہمارے گھر آیا تھا۔ میں نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے مجھ سے چاقو چھین لیا اور پھر نینا کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کردیا۔ میری معصوم بچی کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں اور ہر چیخ کے جواب میں اس کے جسم میں چاقو کا ایک نیا زخم بن رہا تھا۔ یہ اس کے بعد مجھے قتل کرنے والا تھا کہ اس وقت شہزاد گھر میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے بچانے کے لیے تیمور پر حملہ کردیا مگر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تیمور نے اسے بھی قتل کردیا۔ اس کے بعد میرے ہوش وحواس جواب دے گئے تھے شاید اس نے مجھے مردہ ہی سمجھا ہو اور وہاں سے بھاگ گیا۔‘‘

’’یہ...... یہ نہیں ہوسکتا۔‘‘ وقار بولا۔ پھر وہ تیمور کی طرف مڑا۔ ’’تیمور مجھے بتاؤ حقیقت کیا ہے؟‘‘

’’حقیقت......‘‘ وہ ہنس پڑا۔ ’’کیا تم اس عورت پر یقین کروگے؟‘‘

’’اسے کرنا ہوگا...... تم نے سنا ہے نا کہ مرنے والے کا اعترافی بیان سچ ہوتا ہے۔‘‘ ثمینہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وقار کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ’’میں کب کی مر چکی ہوں اور اس کا ذمے دار یہ ہے۔‘‘ اس نے بات کرتے کرتے اچانک وقار کے ہولسٹر میں لگا ریوالور کھینچ لیا اور اس کا رخ تیمور کی طرف کردیا۔

’’تیمور مرے ہوئے شخص کو کسی کا خوف نہیں ہوتا، تمہارے پاس یہ ایک آخری موقع ہے سچ بولو......‘‘ وہ دیوانوں کی طرح بول رہی تھی۔ باقی سب ساکت ہوکر یہ سب سن اور دیکھ رہے تھے۔

’’سچ بولو تیمور۔‘‘ وہ چیخ پڑی تھی۔

’’مجھے تمہیں اسی رات مار ڈالنا چاہیے تھا۔‘‘ وہ اسے نفرت سے گھورتے ہوئے بولا پھر یک دم خاموش ہوگیا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہو۔

وقار پھٹی پھٹی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

’’تم نے میری بیٹی کا خون کیا؟‘‘ وہ بمشکل بولا۔

’’تم نے زندگی بھر مجھے خود سے آگے بڑھنے نہیں دیا، میرا ہر فیصلہ خود کرتے رہے۔ ہر بہترین چیز پر خود ہی تمہارا حق ہوجاتا اور میں منہ دیکھتا رہتا۔‘‘ تیمور اب اپنے بھائی سے مخاطب تھا۔ ’’ہاں میں نے کیا...... مگر اس کی وجہ یہ تھی...... اس نے مجھے غصہ دلایا تھا۔ پھر میں نے خود کو تم سے ذہین ثابت کرنے کی ٹھانی...... اتنے برس تک تم کچھ نہیں جان سکے۔ یہ میں تھا جس نے تمہارے دل میں اس کے لیے بدگمانی پیدا کی...... ہاہاہا۔ میں جلتا رہتا اور تم خوش رہتے، یہ تو کوئی انصاف نہیں تھا پھر میں نے اس سب پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اس گھر کو آسیب زدہ مشہور کیا تبھی اس کا یہ بیٹا یہاں آپہنچا...... وارث کے ساتھ مل کر اس کو ڈرایا دھمکایا مگر سب بے سود ثابت ہوا...... وقار...... اس کے خاندان کی وجہ سے کہیں یہ ساری کہانی نہ کھل جائے اس لیے میں نے ان دونوں رپورٹروں کا خون کیا۔ مگر ہوا کیا...... وہی......‘‘ وہ پاگلوں کی طرح قہقہہ لگا کر بولا۔ ’’آخر دی اینڈ ہوگیا۔‘‘

’’ابھی دی اینڈ نہیں ہوا۔‘‘ ثمینہ سرسراتی آواز میں بولی۔ ’’اب...... اب ہوگا دی اینڈ۔‘‘ اس نے ہاتھ سیدھا کرکے اچانک تیمور کے سینے پر گولی ماردی۔ وہ اچھل کر کرسی سے نیچے گرا...... اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ بھی کرپاتا، اس نے ایک نظر احمد پر ڈالی اور ریوالور کو اپنے سر پر رکھ کر ٹریگر دبادیا۔

لاؤنج میں سب لوگ ساکت سے کھڑے رہ گئے۔ صدف نے احمد کا بازو تھاما ہوا تھا جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرگئی تھیں۔ وقار لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

تیمور کی کھلی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ خواہش کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے والے خودغرضی اور نفرت کے گھوڑے پر کبھی کسی منزل پر نہیں پہنچے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں نے دو سال پہلے جی اولیٹی کی آخری رسومات میں شرکت کی تھی۔ اس لیے اسے اپنے دفتر کی انتظارگاہ میں کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر سگریٹ نیچے پھینک دیا۔ میں نے اپنے چہرے کے آگے سے دھواں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔“

”مجھے اُمید ہے کہ تم کچھ خیال نہیں کرو گے کہ میں تمہارے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔“

پانی پر سفر

تنویر ریاض

اعلیٰ تحقیقاتی اداروں میں کام کرنے والوں کی ذمّے داریاں قدرے جدا ہوتی ہیں... ان اداروں کے اسپیشل ایجنٹ گوکہ آہستگی سے حرکت میں آتے ہیں مگر بالآخر تمام ثبوت حاصل کر ہی لیتے ہیں... ایسے ہی ایجنٹوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف اور مفادات کی کشمکش... پانی کی سطح پر تیرتے مجرموں کی کارکردگی...

بغاوت وعداوت...... مجرموں اور انصاف پسندوں کا انتقام......

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ بہت پریشان لگ رہا تھا اور اسے دیکھ کر میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ واقعتاً مر چکا ہے۔

''اندر چلو بریڈ۔'' اس نے ایک اور سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میری مدد؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ایک مردہ شخص کو پرائیویٹ سراغ رساں کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

''کوئی ہے جو مجھے مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم پہلے ہی مر چکے ہو۔ خبروں کے مطابق تم نے خودکشی کی تھی۔''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''وفاقی ایجنسی کا خیال تھا کہ اگر مجھے مردہ مشہور کر دیا جائے تو میرے لیے گواہوں کے تحفظ کے پروگرام میں جانا بہتر رہے گا۔''

میں نے اپنے ناشتے کا بیگ میز پر رکھا جس میں کافی کا جگ اور انڈوں کے سینڈوچ تھے اور اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تمہارا تابوت بہت ہلکا تھا۔''

اس نے سگریٹ ہونٹوں سے لگایا تو میں نے کہا۔ ''ایک منٹ رک جاؤ۔ پہلے میں کھڑکی کھول لوں۔''

''اس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر کان میں لگالی اور بولا۔ ''تم پاگل ہوگئے ہو، اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو؟''

''وہ کون لوگ ہیں؟''

''نیکو کے آدمی، انہوں نے مجھے اوگل لالا، میں دیکھ لیا تھا۔''

نیکو کا پورا نام ڈومینکو میسینا تھا۔ وہ اس گروہ کا سربراہ تھا جس سے دو سال قبل جمی نے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ نیکو کی نظر میں یہ بغاوت تھی۔ نیکو کو پچیس برس کی سزا ہوئی اور اس کے فوراً بعد ہی جمی کی خودکشی کی خبر پھیل گئی۔ اس کے بارے میں بہت سی کہانیاں تھیں جبکہ حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے نیکو کے خلاف گواہی دی تھی اور وفاقی ایجنسی اسے تحفظ دے رہی تھی۔

''اوگل لالا؟ یہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نیبراسکا، کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اسی جگہ انہوں نے مجھے تجہیز و تدفین کے بعد چھپا دیا تھا جہاں میں نے ایک نئی زندگی کی شروعات کی۔''

''لیکن انہوں نے تمہیں وہاں بھی تلاش کر لیا؟''

''میں وہاں ایک ہائی اسکول میں مددگار ٹیچر کے طور پر ملازمت کر رہا ہوں۔ گزشتہ روز کام پر سے واپس آتے ہوئے ایک گیس اسٹیشن پر سگریٹ لینے کے لیے رکا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سب وے ہے۔ میں اسی طرف سے آیا اور گیس اسٹیشن میں چلا گیا۔ وہیں میں نے انہیں دیکھا۔ تین مضبوط جسم والے بدمعاش ایک کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔''

''تم صرف اس وجہ سے وہ محفوظ جگہ چھوڑ کر چلے آئے کہ تم نے تین بدمعاشوں کو ایک کار میں بیٹھے دیکھ لیا؟''

جمی اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔ ''وہ صرف تین غنڈے ہی نہیں تھے بلکہ ان میں ایک مارکو فلیٹی بھی تھا۔''

مارکو فلیٹی، نیکو کا انتہائی قابلِ اعتماد اور نمبر ایک کارندہ تھا۔ اس کے جیل جانے کے باوجود ایجنسی والے مارکو اور گروہ کے تعلق کے بارے میں کوئی ثبوت تلاش نہ کر سکے اور اسی لیے وہ اب بھی درپردہ نیکو کے احکامات کی تعمیل کر رہا تھا۔

''میں گیس اسٹیشن کے اندر خریداری کر رہا تھا تبھی کلرک نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے دوست مجھے مل گئے۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ 'دوست؟' اس نے کھڑکی سے باہر ایک کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ دیر پہلے اندر آئے تھے اور نام لے کر میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ میرے پرانے دوست ہیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ان میں سے ایک پمپ کا دوبارہ جائزہ لینے کے لیے کار سے اُتر رہا تھا۔ میں نے اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں مارکو فلیٹی کو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میری تلاش میں وہاں آئے تھے۔ لہٰذا فوراً ہی پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ وہ مارکو ہی تھا؟''

''بالکل اور وہ میرا نام بھی جانتے تھے۔ وہ نام جو میں نے گواہوں کے تحفظ کے پروگرام میں شمولیت کے بعد اختیار کیا۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں تک کیسے پہنچے؟''

اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی کار اسکول کی پارکنگ میں چھوڑی اور ایک بار میں چلا گیا۔ وہاں سے فون کر کے ٹیکسی منگوائی اور سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے شکاگو کا ٹکٹ خریدا اور آج صبح چھ بجے یونین اسٹیشن پر اُتر کر فون بک میں تمہارا پتا تلاش کیا اور یہاں پہنچ گیا۔''

اس کی کہانی سمجھ میں آرہی تھی۔ جمی اور میں ایک ہی

محلے میں پلے بڑھے تھے۔ ہائی اسکول کے بعد میں فوج میں چلا گیا۔ میں نے خلیج کی جنگ کے دوران سعودیہ میں خدمات انجام دیں۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد پولیس میں بھرتی ہو گیا اور جب میں نے اکیڈمی سے گریجویشن کی تو اس وقت جمی مقامی مافیا میں شامل ہو چکا تھا۔ ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ لیکن پرانی دوستی کی وجہ سے کبھی کبھی رابطہ ہو جاتا تھا۔ مجھے ایک بار پھر محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جہاں میرے دو ساتھی دھماکے کا شکار ہو گئے اور اس کی وجہ سے میرے بائیں کان کی سماعت بھی متاثر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میرا فوجی کیریئر بھی ختم ہو گیا اور میں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے کے بعد پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام شروع کر دیا۔

تقریباً انہی دنوں میں وفاقی ایجنسی نے بالآخر کئی بدمعاشوں کو پکڑ لیا۔ ان میں شکاگو میں مافیا کا سرغنہ ڈومینکو میسینا بھی شامل تھا۔ پھر ایک سمجھوتے کے تحت حاصل ہونے والی رعایت کے بدلے جمی اپنے باس کے خلاف گواہی دینے پر تیار ہو گیا۔ جب نیکو کو سزا سنائی گئی تو اس کے کچھ ہی عرصے بعد وہ اپنے ہوٹل میں مردہ پایا گیا۔

"تمہاری آخری رسومات بہت شاندار تھیں۔ دوبارہ یہ تماشا کب دکھاؤ گے؟"

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ مجھے فوراً ہی روپوش ہونا ہے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کسی کو معلوم تو نہیں کہ تم یہاں آئے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرے مارشل سروس میں چند جاننے والے ہیں۔"

میں نے اپنا سیل فون نکالا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں انہیں فون کر کے تمہیں نئی شناخت کے ساتھ اس پروگرام میں شامل کروا دوں گا۔"

"بالکل نہیں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں۔" اس نے اپنی گردن دائیں بائیں گھماتے ہوئے کہا۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مارکو اندر کے کسی آدمی کی مدد کے بغیر مجھے اوکل لالا جیسی جگہ پر تلاش کر لیتا۔ اسے میرا نیا نام، پتا سب کچھ معلوم تھا۔ ضرور کہیں سے لیک ہوا ہے۔"

"تمہارا اشارہ مارشل سروس کی جانب ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔

میں نے اپنا ناشتا جمی کو دیا اور کہا کہ وہ کھڑکیوں اور دروازوں سے دور رہے اور میرے جانے کے بعد دفتر کا دروازہ اندر سے مقفل کر لے۔

میرے وفاقی ایجنسی میں چند لوگوں سے تعلقات تھے لیکن جس امریکی اٹارنی نے میسینا کو سزا دلوائی، اس نے اس سے خوب نام کمایا۔ ڈگلس ہین شا، اس مقدمے کے دوران پانچ اور دس بجے کی خبروں میں وہ چھایا رہا اور مافیا کے ڈان کو سزا سنائے جانے کے بعد تو وہ پریس اور عوام کا ہیرو بن گیا جبکہ حالیہ دنوں میں اس کا ستارہ کچھ مدھم پڑ گیا تھا اور یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ شاید اسے واشنگٹن بھیج دیا جائے لیکن میری اطلاعات کے مطابق وہ ابھی تک اسی شہر میں تھا۔

میں ایک ٹیکسی کر کے فیڈرل بلڈنگ پہنچ گیا۔ کیونکہ صبح کے وقت سڑکوں پر بہت رش ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی کار میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں بیس منٹ لگے۔ دورانِ سفر میں جمی کی باتوں پر غور کرتا رہا جو اس نے مجھے بتائی تھیں۔ نیکو کو سزا سنائے جانے کے بعد اس نے نام نہاد خودکشی کا ڈراما رچایا اور اس کی آخری رسومات بھی ادا کی گئیں۔ وہ سب گواہوں کو تحفظ دینے کے پروگرام کا حصہ تھا۔ اس کا تابوت بند تھا اور کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ اس کے خاندان میں ایک بہن کے سوا کوئی موجود نہیں تھا جو کسی دوسرے شہر میں رہتی تھی۔

عمارت کے صدر دروازے پر مجھے روک لیا گیا اور ایک محافظ نے مجھ سے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے بتایا کہ امریکی اٹارنی ڈگلس ہین شا سے ملنا ہے لیکن میں نے اس سے ملاقات کا وقت نہیں لیا۔ وہ تھوڑا سا ہچکچایا تو میں نے اسے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ "اسے بتا دو کہ میں نیکو میسینا کے کیس کے سلسلے میں ملنا چاہ رہا ہوں۔"

اس نے اپنی حیرانی مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دی اور مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ پندرہ منٹ بعد سوٹ میں ملبوس دو افراد وہاں آئے۔ ان کے سینوں پر سرکاری بیج لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "تم ہی بریڈ اسٹیل ہو؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"میں ایجنٹ مولی گن ہوں اور میرا تعلق مارشل سروس سے ہے۔ تم اٹارنی ہین شا سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"یہ میرے اور اس کے درمیان ہے۔" میں نے کہا۔

مولی گن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے غصے سے کہا۔ "وہ بہت مصروف ہے۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تو میں نے ایک پتا اور پھینکا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"اسے بتادو کہ میں نے جمی اولیٹی کی آخری رسومات میں شرکت کی تھی۔"

جمی کا نام سُن کر مولی گن نے پلکیں جھپکائیں اور چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سیل فون سے کسی کو کال کرنے لگا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور گارڈ کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے الیکٹرانک واک تھرو گیٹ کے راستے اندر آنے دے۔ انہوں نے میرا پستول یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لیا کہ اس عمارت میں کسی کو ہتھیار لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

وہ مجھے اکیسویں منزل پر واقع ڈگلس ہین شا کے دفتر لے گئے۔ وہ اس وقت فون پر باتیں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا اور کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کیا۔

"مسٹر اسٹیل۔" اس نے کہا۔ "میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میں جمی اولیٹی کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔ اب تک تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ لاپتا ہو گیا ہے۔"

اس کے جبڑے تھوڑے سے بھینچ گئے اور وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "اولیٹی غائب ہو گیا ہے؟"

"ہاں وہ اس جگہ نہیں ہے جہاں اسے رکھا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم یہ بات پہلے سے جانتے ہو۔"

"اور تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟" مولی گن میرے قریب آتے ہوئے بولا۔

"جمی نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ پہچان لیا گیا ہے کیونکہ اس کی شناخت ظاہر ہو گئی تھی۔"

"شناخت ظاہر ہو گئی تھی؟" ہین شا نے بھویں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، نیکو کے کچھ لوگ اوگل لالا میں اسے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اس گیس اسٹیشن تک پہنچ گئے جہاں وہ کچھ خریداری کر رہا تھا۔"

مولی گن منہ بناتے ہوئے بولا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دوسری طرح سوچ رہا ہے اور اسی لیے غائب ہو گیا ہے کیونکہ اس کی جان کو خطرہ تھا۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اٹارنی بولا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

مولی گن نے میرا کندھا پکڑا اور بولا۔ "بہتر ہوگا کہ تم ہمیں وہ سب بتادو جو جانتے ہو ورنہ تمہارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اب وہ میرا کلائنٹ ہے۔ اس کا پروگرام میں شامل ہونے کا پکا ارادہ ہے لیکن وہ پہلے کچھ یقین دہانیاں چاہتا ہے۔"

"کیسی یقین دہانیاں؟" ہین شا نے پوچھا۔

"تمہارے ادارے میں کہیں نہ کہیں کوئی لیک ہے، تمہیں اسے بند کرنا ہوگا۔"

مولی گن غراتے ہوئے بولا۔ "کیا تم مارشل سروس پر الزام لگا رہے ہو؟"

"میں نے پورے ادارے کی نہیں صرف ایک دو لوگوں کی بات کی ہے۔"

"مسٹر اسٹیل۔" ہین شا بولا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم اولیٹی کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اسے حفاظتی تحویل میں رکھ سکیں جب تک کہ کوئی دوسرا بندوبست نہ ہو جائے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تک تم اپنا گھر ٹھیک نہیں کر لیتے۔"

"فرض کرو اگر ہم یہ کہیں کہ یہ ایک غیر اطمینان بخش شرط ہے؟" ہین شا نے کہا۔

میں نے کہا۔ "میں چند ایسے رپورٹرز کو جانتا ہوں جنہیں اس طرح کی خبروں میں دلچسپی ہو سکتی ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر ایک فرضی سرخی لکھی۔ "گواہوں کے تحفظ کے پروگرام میں لیک اور پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ جمی کی موت ایک ڈراما تھی۔"

"تم جانتے ہو کہ اس سے پروگرام کا اعتبار متاثر ہو گا؟" مولی گن غرایا۔ "اور اس کے ساتھ ہی مارشل سروس کی ساکھ پر بھی حرف آئے گا۔ ان پرندوں کو اڑنے سے روکنا مشکل ہے اگر وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم چاہتے ہو کہ میں کچھ اور مناسب سرخیاں بتاؤں؟"

اس سے پہلے کہ مولی گن کچھ کہتا، ہین شا نے مداخلت کی اور کہا کہ میں کچھ دیر باہر انتظار کروں۔ میں باہر جا کر انتظار گاہ میں بیٹھ گیا۔ بیس منٹ بعد مولی گن نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"تم نے جو کچھ بتایا، ہم نے اس کے کچھ حصوں کی تصدیق کر لی ہے۔" ہین شا نے کہا۔ "اور ہم اپنے طور پر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس معاملے کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ اب میں پھر یہی کہوں گا کہ تم جی کو ہمارے حوالے کر دو تا کہ اس کی حفاظت کی جا سکے۔“

”میں یہ تجویز اس کے سامنے رکھوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”جب وہ دوبارہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔ اس دوران تم مجھے اپنی اندرونی تحقیقات سے باخبر رکھنا۔“

یہ کہہ کر میں اس کے دفتر سے باہر آ گیا۔ میرے پاس چند آپشن تھے۔ میں کچھ عرصے کے لیے جی کو نظروں سے اوجھل رکھ سکتا تھا لیکن یہ مہنگا ہونے کے علاوہ دشوار بھی تھا۔ اس کے علاوہ یہ محض ایک عارضی حل ہوتا۔ جلد یا بدیر اسے نئی شناخت مل جاتی۔ اس لیے میں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

عمارت سے باہر آ کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا رہا۔

”کیا کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”شاید۔ میں تمہیں بیس ڈالرز زیادہ دوں گا اگر تم اسے چکر دے سکو۔“

اس نے مسکرا کر عقبی آئینے میں دیکھا اور اچانک ہی بے ہنگم طریقے سے موڑ کاٹا۔ پھر اس کی ٹیکسی کسی سانپ کی طرح لہراتی ہوئی زگ زیگ انداز میں ٹریفک میں سے گزرتی رہی پھر اس نے میرے دفتر کے قریب ایک گلی میں ٹیکسی روک دی۔

”میرا خیال ہے کہ کوئی شخص تمہارا تعاقب کر رہا تھا باس۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں نے بھی اسے گھما دیا۔“

میں نے اسے کرائے کے علاوہ بیس ڈالر دیے اور احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا عمارت کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ لابی میں سیکیورٹی کیمرے لگے ہوئے ہیں اور میں اپنے اطمینان کے لیے ویڈیو کی کاپی مانگ سکتا ہوں۔ جب میں نے لفٹ کا دروازہ کھولا اور راہداری میں نظر دوڑائی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔ جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو میں نے عقب میں کسی کے تیز قدموں کی آواز سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور اپنے پستول پر ہاتھ رکھ لیا۔ مولی گن اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اسی طرف آ رہا تھا۔

”ایجنٹ مولی گن، تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“ میں نے یہ آواز بلند کہا تا کہ جی ہوشیار ہو جائے۔ میرے دفتر کے اندرونی حصے میں الماری تھی جہاں وہ وقتی طور پر چھپ سکتا تھا۔

مولی گن اور اس کے دونوں ساتھی مجھے ایک طرف دھکیلتے ہوئے انتظار گاہ میں داخل ہو گئے پھر انہوں نے مجھ سے دفتر کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا لیکن انہیں وہاں کچھ نہیں ملا۔ وہ دفتر کے اندرونی حصے کی تلاشی لینے کے بعد باہر آ گئے اور مولی گن نے کہا۔

”بتاؤ وہ کہاں ہے؟“

”کیا تم مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے ہو کہ اسے یہاں چھپا کر رکھوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہے تو تم نے ٹیکسی ڈرائیور کے ذریعے ہمیں چکر دینے کی کوشش کیوں کی؟“

میرا اس سے مزید الجھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں نے اسے جواب دینے کے بجائے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور کہا۔ ”تو گیارہ کو ناپسندیدہ مہمانوں کی اطلاع دینے کے علاوہ اس ملاقات کو ریکارڈ بھی کر رہا ہوں تا کہ آئندہ بھی کام آ سکے۔“

اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے مقفل کیا اور دفتر کا جائزہ لینے لگا کہ شاید جی نے جاتے وقت کوئی خط یا سراغ چھوڑا ہو لیکن ایسی کوئی چیز نہیں ملی تو تھک ہار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جی نے پوچھا۔ ”تم اکیلے ہو؟“

”فی الحال۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں سگریٹ لینے باہر گیا تھا۔ واپس آیا تو کچھ بدمعاش بلڈنگ میں داخل ہو رہے تھے۔“

”وہ ایجنسی کے لوگ تھے اور تمہاری تلاش میں آئے تھے۔“

”انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں آیا تھا؟“

”لمبی کہانی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت تم کہاں ہو؟“

”تمہارے دفتر سے کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ میں ہوں۔ ان کے یہاں پے فون کی سہولت ہے۔“

میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے پے فون کا نمبر دے دے اور کچھ دیر کے لیے وہیں رک جائے۔ میں اسے جلد فون کروں گا۔“

میرا خیال تھا کہ مولی گن نے عمارت اور خاص طور پر میری نگرانی کے لیے باہر کچھ لوگ تعینات کیے ہوں گے۔ اس کے علاوہ مجھے جی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کا طریقہ بھی سوچنا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق چل رہا تھا اور فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والے بھی رواں دواں تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان میں

سے میری نگرانی کرنے والے کون ہو سکتے ہیں۔
میں نے دفتر کو تالا لگایا اور لائٹس کھلی چھوڑ دیں۔ راہداری پر نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن نگرانی کرنے والے خارجی راستوں پر موجود ہو سکتے تھے۔ مجھے ان کی نظروں سے بچ کر نکلنا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ ہین شا نے میرے فون ٹیپ کرنے کا بندوبست نہ کر لیا ہو۔ اس طرح وہ میری نقل و حرکت کا پتا لگا سکتے تھے۔ لہٰذا مجھے اسے بھی ذہن میں رکھنا تھا۔ اس لیے میں نے فوری کارروائی کا فیصلہ کیا۔ لفٹ کے ذریعے نیچے آیا۔ باہر آ کر ٹیکسی پکڑی اور اس سے بیل الیکٹرانکس چلنے کے لیے کہا۔ وہاں کا مالک جوئے میرا پرانا واقف تھا۔ میں اس پر پورا بھروسا کر سکتا تھا۔ میں نے اسے فون کر کے کہا کہ دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں اور اسے فون کر کے بتا دیا کہ مجھے کیا چاہیے۔
اس کے بعد میں نے فون بند کیا اور اس کی بیٹری نکال دی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے اسٹور سے کچھ فاصلے پر اتار کر عقبی سڑک پر چلا جائے۔ وہاں تازہ کلچے ملتے ہیں۔ میں وہاں آ جاؤں گا۔
اس نے مجھے اسٹور سے ایک بلاک دور اُتار دیا۔ میں نے اسے کرایہ دیا اور مزید ہدایات بھی دیں۔ کچھ دیر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مجھے مولی گن کے آدمی کہیں نظر نہیں آئے۔ میں محتاط انداز میں چلتا ہوا اسٹور میں داخل ہو گیا۔ جوئے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور ایک بیگ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا بل ای میل کر دوں گا۔"
میں نے بیگ اٹھایا اور دکان کے عقبی حصے کی جانب اشارہ کیا۔ جوئے نے کہا۔ "میکسی نے اپنی دکان کا عقبی دروازہ تمہارے لیے کھول دیا ہے۔"
اس کا اشارہ اپنے کزن کی جانب تھا جس کی کھانوں کی دکان تقریباً جوئے کے اسٹور کے عقب میں تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی تھی۔ میں نے عقبی دروازے سے نکل کر گلی پار کی اور میکسی کی دکان کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میکسی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں مسکراتا ہوا دکان کے مرکزی دروازے سے باہر فٹ پاتھ پر آ گیا جہاں میری ٹیکسی کھڑی تھی۔
میں نے بیگ سے جوئے کا دیا ہوا برنر فون نکالا اور جمی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ "میں دس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں، تیار رہنا۔"
"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"شمال کی جانب۔" میں نے جواب دیا۔
میں جمی کے ساتھ ایک پرائیویٹ ائرپورٹ پہنچا۔ وہاں سے ایک چھوٹے طیارے کے ذریعے ہم اپل ٹن پہنچے جہاں ایک کرائے کی کار ہماری منتظر تھی۔ جب ہم ٹوماک کی مرکزی شاہراہ سے گزر رہے تھے تو جمی نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ مجھے بالکل اوگل لالا جیسی لگ رہی ہے۔"
"انکل گورڈن کے گھر میں تم بالکل محفوظ ہو گے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں پر ہو۔"
"کیا ہم تمہارے انکل پر بھروسا کر سکتے ہیں؟"
"بالکل۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنی بیمہ پالیسی ان کے نام کر دی ہے۔ میرے مرنے کے بعد وہی اس کے حق دار ہوں گے۔"
انکل گورڈن میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب میں آخری بار فوجی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں آیا تو وہ مجھے جھیل پر واقع اپنے کیبن میں لے گئے اور پورے عرصے میرے ساتھ رہے۔ ان کا کیبن ایسی جگہ تھا جہاں سیل فون کے سگنل نہیں آتے تھے۔
میں نے انکل گورڈن کے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔ "کیا ہم کھانا کھانے آئے ہیں۔" جمی نے پوچھا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"
"یہاں کا کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ باورچی کام چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ میرے انکل نے سنبھال لی ہے۔"
جمی حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "پھر ان کا ریسٹورنٹ کیسے چل رہا ہے؟"
"یہ اس قصبے کا بہترین ریسٹورنٹ ہے۔" میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
ہم ریسٹورنٹ کے اندر چلے گئے۔ وہاں تین بوڑھے بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے، ان کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ انکل گورڈن نے مجھے دیکھا اور عقبی کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم ان کے پیچھے چلتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ میں نے جمی کا تعارف کروایا اور ان کی بڑھی ہوئی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہارا ریزر گم ہو گیا ہے؟"
"نہیں۔ یہ داڑھی اس لیے بڑھائی ہے کہ مجھے ایک ڈرامے میں ابراہام لنکن کا کردار ادا کرنا ہے۔"
ہم عمارت کے عقبی دروازے سے نکل کر چھوٹے سے پارکنگ ایریا میں آئے جہاں انکل کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ انکل کا مکان قصبے کے مضافات میں واقع لنکن کالونی میں تھا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جہاں سے جھیل چند میل کے فاصلے پر تھی۔ مجھے بالکل بھی یاد نہ رہا کہ وہ مکان کتنا خوب صورت اور الگ تھلگ تھا۔ جمی اس علاقے کی خوب صورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔ ''یہاں تو فطری حسن بکھرا پڑا ہے۔''

''ابھی تم نے کیبن نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔

انکل گورڈن نے بائیں جانب سڑک پر جیپ موڑ لی جس کے دونوں جانب شاہ بلوط کے درختوں کی قطار تھی۔ ایک مکان کے پاس سے گزرتے ہوئے جیپ کی رفتار آہستہ ہوئی تو جمی نے پوچھا۔ ''کیا میں یہاں رہوں گا؟''

''بشرطیکہ تم بلیوں اور چمگادڑوں کے ساتھ رہنا پسند کرو۔'' انکل نے کہا۔ ''چھ ماہ قبل یہاں آگ لگ گئی تھی۔ اب میں موسم بہتر ہونے کا انتظار کر رہا ہوں تاکہ چھت ڈال سکوں۔''

''پھر تم کہاں سوتے ہو؟'' جمی نے پوچھا۔

''ریستوران کے اوپر اپارٹمنٹ میں۔''

ہم مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک لکڑی کے پل کے پاس رک گئے جو پیدل چلنے والوں کے لیے بنایا گیا تھا۔

''یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟'' جمی نے پوچھا۔

''فشنگ کیبن۔'' انکل نے پل کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تم قیام کرو گے۔''

جمی نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ''زبردست۔ میں جنگل میں تنہا رہوں گا۔''

ہم انکل کے پیچھے چل دیے۔ دس فٹ نیچے پانی بہتا ہوا ایک جھیل کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ پانی اس بند سے آرہا تھا جو کئی برس پہلے دریا پر باندھا گیا تھا۔ ہمیں تیس گز کے فاصلہ پر کیبن نظر آگیا۔ وہ دیکھنے میں ایک چھوٹا سا بنگلا تھا جس کے تین طرف گھنا جنگل تھا جبکہ اس کا عقبی حصہ پانی کی طرف تھا۔ جمی نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''اس میں پانی کا انتظام تو ہے نا؟''

''ہاں، لیکن اگر تمہیں اندھیرا ہونے کے بعد بجلی چاہیے تو اس کے لیے تمہیں جنریٹر چلانا ہوگا۔ اس کے ساتھ پانچ گیلن کیروسین کا کین موجود ہے۔''

کیبن میں داخل ہونے اور وہاں کا جائزہ لینے کے بعد جمی مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ یہاں تمہاری تلاش میں کوئی نہیں آئے گا۔''

''میں تمہیں گروسری اسٹور لے جاؤں گا تاکہ تم کھانے کا کچھ سامان ذخیرہ کر سکو۔ کیا تمہیں کھانا پکانا آتا ہے؟'' انکل نے کہا۔

''کیا تم مذاق کر رہے ہو؟'' جمی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ماضی میں مجھے شیف کے نام سے پکارا جاتا تھا۔''

انکل گورڈن نے بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ میں تم سے ریستوران میں کام لوں۔''

''مجھے اپنی کرائے کی کار تک پہنچا دو۔'' میں نے انکل سے کہا۔ ''مجھے واپس شکاگو جانا ہے۔''

''تم مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' جمی نے کہا۔ اس کی آواز میں ہلکا سا درد تھا۔

انکل گورڈن نے کہا۔ ''جیسا کہ بریڈ کہہ چکا ہے۔ یہاں کوئی تمہیں تلاش کرنے نہیں آئے گا۔''

دوسرے روز میں نے ہین شا کو فون کر کے پیش رفت کے بارے میں دریافت کیا۔

''جیسا کہ میں نے کل تم سے کہا تھا کہ ہم معاملے کی چھان بین کر رہے ہیں۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''زبردست۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ جمی یہ سن کر خوش ہوگا۔''

وہ چند سیکنڈ خاموش رہا پھر بولا۔ ''کیا تم ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہوئے بتاؤ گے کہ اوکیٹی کہاں ہے؟''

''تم نے جیسے ہی پروگرام میں لیکج تلاش کر لی۔ وہ اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دے گا۔''

ہین شا نے بھناتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے مقابلے میں اس کی بہتر حفاظت کر سکتے ہو؟''

''شاید۔'' میں نے کہا۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ جمی کی موت بڑی حد تک قابلِ یقین تھی پھر میسینا کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ درحقیقت وہ زندہ ہے۔''

''جن گواہوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ وہ ہماری ہدایات کے باوجود لوگوں سے ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جمی سے بھی یہ غلطی سرزد ہوئی ہو۔''

''جمی کا کہنا ہے کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ اپنی نئی شناخت کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا کہ مارکو فلیٹی اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔''

''اسٹیل، بہتر ہوگا کہ تم اپنے آپ کو پرائیویٹ سراغ رسانی تک محدود رکھو۔'' ہین شا نے کہا۔ ''تم اپنی حدود سے باہر نکل رہے ہو۔ بتاؤ کہ تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔''

''جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ سینٹ لوئیس میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ شاید ہین شا میرے گھر اور دفتر کے فون کی نگرانی کر رہا ہوگا کہ اس نے عدالت سے سمن حاصل کر کے میرے کریڈٹ کارڈ کا ریکارڈ بھی حاصل کر لیا ہو۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ ایجنٹ مولی گن نے پہلے ہی میری کار میں جی پی ایس ٹریکر لگا رکھا ہو۔ اس لیے میں وقتی طور پر کرائے کی کار اور برنر فون پر انحصار کر رہا تھا۔ میں نے پوری صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے ایک پرانے ساتھی لین جانسن سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا جو ان دنوں آرگنائزڈ کرائم سیکشن میں کام کر رہا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''حال ہی میں نیکو میسینا کو کہاں دیکھا گیا ہے؟''

''میسینا؟'' لین نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ جیل میں ہے۔ ایجنسی نے اسے دو سال پہلے گرفتار کیا تھا۔''

''ایسا کوئی امکان ہے کہ اس پر کوئی نیا مقدمہ بنایا گیا ہو یا کوئی اور بات؟''

''کوئی اور بات؟'' لین نے قہقہہ لگایا۔ ''وہ بہت بیمار ہے بلکہ حقیقت میں مرنے والا ہے۔ انہوں نے ایک پادری کی خدمات حاصل کر لی ہیں تاکہ مرنے سے پہلے اس سے اعتراف کروا لیا جائے اور سینٹ پیٹر جانے سے پہلے اس کے تمام معاملات سیدھے ہو جائیں۔''

میں نے لین کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا اور اس کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرنے لگا۔ میسینا انتہائی ظالم اور بے رحم شخص تھا۔ اس کے دل میں اب بھی جمی سے انتقام لینے کی خواہش موجود ہوگی جو کبھی اس کا با اعتماد ساتھی تھا اور جس نے اسے دھوکا دیا لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور اس کے آدمیوں نے اسے ادگل لالا جیسی جگہ پر بھی تلاش کر لیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی پیچ ہے۔

میرے برنر فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے جمی سے اسی وقت روزانہ فون کرنے کے لیے کہا تھا۔

''کیا حال ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''زیادہ بُرے نہیں۔ مجھے تمہارے انکل کے ریسٹورانٹ میں کام مل گیا ہے۔''

میں اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس سے کہا کہ وہ اپنے گاہکوں پر توجہ دے۔ گو کہ ہم برنر فون پر بات کر رہے تھے لیکن میں اس امکان کو رد نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں میری غیر موجودگی میں مولی گن نے میرے دفتر میں خفیہ مائیکروفون لگا دیے ہوں۔

''ٹھیک ہے۔'' فون بند کرنے سے پہلے جمی نے کہا۔ ''میں کل تمہیں فون کروں گا۔ اسی وقت، اسی جگہ سے۔''

اگلے روز اس کا فون نہیں آیا تو میں پریشان ہو گیا۔ ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد میں نے دو بجے انکل گورڈن کو فون کیا۔ ''میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا لیکن کچھ مصروفیت زیادہ تھی۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں تمہارے دوست کو واپس کیبن چھوڑ آیا ہوں۔''

''وہ ٹھیک تو ہے؟''

''اس کی حالت اس خرگوش جیسی ہے جس کے پیچھے بھیڑیا لگا ہو۔ وہ سگریٹ لینے باہر گیا تھا لیکن فوراً ہی دوڑتا ہوا واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مرکزی سڑک پر اس نے کسی کو دیکھا ہے جو اس کا پیچھا کر رہا تھا۔''

''یہ نہیں بتایا کہ وہ کون تھا؟''

''نہیں۔'' انکل گورڈن نے کہا۔ ''بس یہ کہا کہ وہ چھپنا چاہتا ہے چنانچہ میں اسے کیبن چھوڑ آیا۔''

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ ہین شا میری جاسوسی کر رہا ہے۔ کیا وہ میری نقل و حرکت کا پتا لگانے میں کامیاب ہو گیا؟ اگر اس کی رسائی میرے کریڈٹ کارڈ کے حالیہ استعمال تک ہو گئی ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں بذریعہ ہوائی جہاز ایپل ٹن گیا تھا اور وہاں سے میں نے کرائے کی کار کے ذریعے ٹوماک تک کا سفر طے کیا۔ اس کے علاوہ میرے سینڈ باکس میں انکل گورڈن کا پتا بھی موجود تھا۔ اگر میرے کمرے میں خفیہ مائیکروفون نصب ہیں تو اس نے گزشتہ روز ہونے والی میری اور جمی کی گفتگو میں سُن لی ہوگی۔

''تم نے قصبے میں کسی اجنبی کو تو نہیں دیکھا؟'' میں نے انکل سے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ لوگوں پر نظر رکھوں۔''

میں نے انکل سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ میں جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں پھر میں نے اسی چارٹر پلین سروس کو فون کیا اور کہا کہ اس مرتبہ مجھے ٹوماک ائرپورٹ جانا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں میرا واسطہ کن لوگوں سے پڑ سکتا ہے۔ اس لیے احتیاطاً اپنا بریٹا پستول اور دو فالتو میگزین بھی ساتھ رکھ لیے۔

جب ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد وہاں پہنچا تو انکل

گورڈن ائرپورٹ پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ راستے میں، میں نے اپنا پستول نکالا اور اس میں میگزین ڈالنے لگا۔ یہ دیکھ کر انکل گورڈن مسکرائے اور انہوں نے نشستوں کے درمیان رکھی ہوئی شاٹ گن پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”عام طور پر میں اسے کاؤنٹر کے پیچھے رکھتا ہوں۔ کئی برسوں سے استعمال نہیں کیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کی ضرورت پیش آئے گی؟“

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے قصبے میں کسی مشتبہ شخص کو تو نہیں دیکھا؟“

”جولیا کا کہنا ہے کہ اس نے تین آدمیوں کو ریستوران کے باہر گھومتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ اس سے زیادہ نہیں بتا سکی۔“

”وہ دیکھنے میں کیسے لگ رہے تھے؟“

انکل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”تم ان لڑکیوں کو جانتے ہو۔ انہیں تیس سال سے عمر کے سب لوگ ایک جیسے لگتے ہیں۔ بس وہ اتنا ہی بتا سکی کہ وہ تینوں بڑی عمر کے سفید فام تھے۔“

اگر وہ مولی گن کے آدمی تھے تو شاید مقامی پولیس کی نظروں میں آگئے ہوں۔ یہی سوچ کر میں نے مقامی پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد میرا رابطہ پولیس چیف سے ہو گیا۔ میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا کہ میں امریکی مارشل سروس کے لیے کام کر رہا ہوں اور مجھے یہاں اپنے کچھ ساتھیوں سے ملنے کی توقع ہے۔

”ایسے کسی شخص نے ہمیں رپورٹ نہیں کی۔“

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے فرض کر لیا تھا کہ مولی گن کے آدمی ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آگئے ہیں لیکن اگر وہ نہیں ہیں تو یہ مارکو اور اس کے بدمعاش بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارا سامنا بے رحم قاتلوں سے ہو سکتا ہے۔ میں نے پولیس چیف کو کیبن کے محل وقوع کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ہماری مدد کے لیے کچھ لوگ بھیج دیے جائیں۔

”وہ جگہ لنکن کاؤنٹی کی حدود میں آتی ہے۔“ چیف نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم انہیں فون کر کے بتا دو کہ وہاں تین مشتبہ افراد گھات لگائے بیٹھے ہیں اور قوی امکان ہے کہ وہ مسلح اور خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔“

”کیا؟ کون؟“ اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سیل فون کے سگنل آنا بند ہو گئے۔

”کیا صرف ہم دونوں ہی وہاں جا رہے ہیں؟“ انکل گورڈن نے پوچھا۔

”نہیں صرف میں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالو۔“

انکل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے اس ہتھیار کو آزمائے ہوئے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس میں صرف دو گولیاں ہی ہیں۔“

”بہتر ہوگا کہ ہم انہیں ضائع نہ کریں۔“ میں نے کہا۔ ہائی وے کا موڑ آگیا تھا اور کیبن وہاں سے صرف ایک منٹ کی مسافت پر تھا۔

انکل نے گلوو باکس میں سے ایک دوربین نکالی۔ میں نے اسے آنکھوں پر لگایا۔ ایک ایس یو وی کار لکڑی کے پل کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی اور ایک آدمی اس کے اگلے حصے پر جھکا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

”لگتا ہے وہ یہاں پہنچ چکے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں وہاں پہنچ کر کسی طرح انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

انہوں نے موڑ کاٹا اور ایک جگہ گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ”تم اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے ہو کہ مشرق کی جانب سے پانی پر چلتے ہوئے جاؤ۔ وہ پورا کنارہ دلدلی کائی سے بھرا ہوا ہے۔ اگر تم مسلسل چلتے رہے تو محفوظ رہو گے۔ ورنہ ڈوبنے کا خطرہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم سڑک پر جاؤ اور مدد کے پہنچنے کا انتظار کرو۔“

”اور تمہیں تنہا چھوڑ دوں؟“

”ہاں، تمہارے پاس صرف دو گولیاں ہیں۔ اس کے علاوہ سڑک پر بھی کسی کو موجود ہونا چاہیے تاکہ آنے والوں کو راستہ دکھا سکے۔“

میں ناہموار راستے پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کنارے تک پہنچا۔ پورا علاقہ خودرو جھاڑیوں اور درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے آگے گدلا پانی تھا جس پر کائی تیر رہی تھی۔ جب اس جگہ کے قریب پہنچا تو وہاں سے کیبن کا عقبی حصہ جھیل کے پار تیس گز کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ اس جانب دو کھڑکیاں بھی تھیں۔ اس کے اندر سے مجھے کوئی بھی دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

میں نے سطح پر قدم بڑھایا اور میرا پاؤں ہلکا سا اس میں دھنس گیا اور میرے جوتوں پر گدلی مٹی لگ گئی۔ دوسرا قدم اٹھایا تو دلدلی سطح نے اسے جکڑ لیا۔ مجھے انکل کے الفاظ یاد آگئے۔ ”رکنا نہیں ورنہ ڈوب جاؤ گے۔“

میں نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ مجھے کیبن میں کچھ نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا لیکن میرے لیے رکنا خطرناک تھا۔ مجھے کھڑکی میں ایک سر نظر آیا لیکن ایک لمحہ بعد ہی غائب ہو گیا۔ پھر میں نے مزید نقل و حرکت دیکھی۔ اس سے لگ رہا تھا کہ اندر کم از کم دو افراد ہیں۔ میرے لیے رکنا ممکن نہیں تھا ورنہ ڈوب جاتا۔ میں نے اپنا پاؤں دلدل سے نکالا اور دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ میرے اور کیبن کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ بالآخر میں نے وہ بھی طے کر لیا۔ پانی میری کمر تک آچکا تھا۔ میں نے پانی سے بچانے کے لیے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور کیبن کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اندر سے آنے والی آوازیں سن سکتا تھا۔

''تم نے دیکھا جینو۔'' ایک آدمی نے کہا۔ ''تم گروہ کے بنیادی اصول بھول گئے۔ کوئی بھی مخبری پسند نہیں کرتا۔''

''مارکو پلیز۔'' یہ جمی کی آواز تھی۔ ''میرے پاس کچھ رقم ہے۔ وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ انہیں کہہ دینا کہ تم مجھے تلاش نہیں کر سکے۔''

میں نے ایک زوردار آواز سنی۔ اس کے بعد کوئی درد سے کراہنے لگا۔

''تمہارا خیال ہے کہ تم مجھے خرید سکتے ہو؟'' مارکو نے کہا۔ ''تم نے ہمارا قانون توڑا ہے۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔''

میں نے وہ زوردار آواز دوبارہ سنی۔ میں لپک کر دروازے پر پہنچا لیکن وہ مقفل تھا۔

''مارکو، ہم کبھی دوست تھے۔'' جمی کراہتے ہوئے بولا۔

''چپ ہو جاؤ۔'' مارکو نے کہا۔ ''جینو، وہ گیسولین کا کین لے کر آؤ جو ہم نے جنریٹر کے پاس رکھا دیکھا تھا۔ نیکو چاہتا ہے کہ اسے زندہ جلا دیا جائے۔''

''نہیں، نہیں۔ ایسا مت کرو۔'' جمی چلاتے ہوئے بولا۔

''میں مجبور ہوں۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ باس کا حکم ہے۔''

میں جھک گیا اور کھڑکی کے نیچے سے گزرتا ہوا کیبن کے کونے تک پہنچا۔ وہاں شیڈ کے نیچے جنریٹر اور گیسولین کا کین رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا پستول نکال لیا اور مارکو کے ساتھی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اسے شیڈ کی طرف جاتے دیکھا پھر کین کھینچنے کی آواز آئی۔ قدموں کی آواز دور ہوتی گئی۔ وہ شخص واپس بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے شیڈ سے نکل کر اس کا پیچھا کیا اور کیبن کے سامنے والے کونے پر رک گیا۔ جب وہ اندر داخل ہو گیا تو میں کھڑکی کے نیچے سے رینگتا ہوا کھلے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا پھر مجھے مٹی کا تیل چھڑکنے کی آواز آئی۔

''اب یہی جگہ تمہارا قبرستان بنے گی۔'' مارکو نے کہا۔

''نہیں، مجھ پر کیروسین مت ڈالو۔'' جمی نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی مارکو کا قہقہہ اور اس کی چیخ سنائی دی۔ میرے لیے اب یا کبھی نہیں والا مرحلہ آ گیا تھا۔ میں سیدھا ہوا۔ پستول کا رخ سامنے کی طرف کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

جمی کمرے کے وسط میں ایک لکڑی کی کرسی پر بندھا ہوا تھا اور مارکو اس کے برابر میں لائٹر پکڑے ہوئے کھڑا ہوا تھا جبکہ دوسرے بدمعاش کی پشت میری طرف تھی۔ کیروسین کا ڈبا جمی کی ٹانگوں کے پاس پڑا ہوا تھا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور پوری قوت سے پستول کا دستہ دوسرے بدمعاش کے سر پر مار دیا۔ وہ چکرا کر نیچے گر گیا اور میں نے پستول کا رخ مارکو کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''لائٹر نیچے پھینک دو اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر لائٹر اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ فرش پر بیٹھ جائے اور اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لے۔

''اے، فرش پر گیسولین پڑا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ دراصل کیروسین ہے۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے اپنی جیب سے چاقو نکال لیا اور کہا۔ ''اور تمہیں فرش پر ڈالنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے تھا۔''

میں کرسی کے قریب چلا گیا اور جمی کی رسیاں کاٹنا شروع کر دیں۔ اس نے مجھے زخمی آنکھ سے دیکھا جو سوجن کی وجہ سے تقریباً بند ہو چکی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اس نے پوری قوت سے مارکو کے چہرے پر لات مار دی۔ پھر دور کہیں سے مجھے سائرن کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد ہلکل گورڈن نے بھی ایک فائر کر دیا۔ اس کے باوجود ان کے پاس ایک گولی باقی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ اب انہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

چھ گھنٹے بعد میں ایک بار پھر جمی اپن شا کے دفتر میں موجود تھا۔ اس کی خوب صورت سیکریٹری نے مسکرا کر مجھے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی، میں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"تم مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے۔" میں نے ہین شا کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں بہت مصروف ہوں۔ تمہیں میری سیکریٹری سے وقت لینا ہوگا۔"

میں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "کیا تم یہاں سے جانے کی تیاری نہیں کر رہے؟ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔"

ہین شا کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ "ہاں، میں استعفا دے رہا ہوں لیکن اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔"

"اوہ، اب تم پرائیویٹ پریکٹس کرو گے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ زیادہ فائدے میں رہو گے۔"

"دیکھو اسٹیل، میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس وقت بہت مصروف ہوں۔ ہم اب بھی اولیٹی والے معاملے کی تحقیقات کر رہے ہیں اس لیے معافی چاہتا ہوں۔"

"اولیٹی والے معاملے کی تحقیقات۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ تو تمہارے لیے پوری ہو چکی۔"

"تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟"

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے میرا کھوج لگانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کے علاوہ تم نے کیا تحقیقات کی؟"

"اس کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرتے۔"

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ مارکو سے کچھ معلوم ہو سکے گا یا ہو سکتا ہے کہ وہ بتا دے ورنہ اس کے کسی ساتھی سے اگلوانا پڑے گا۔"

"مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟"

"میں مارکو فلیٹی اور اس کے دو ساتھیوں کی بات کر رہا ہوں جنہیں تم نے ٹوماک بھیجا تھا۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" ہین شا نے کہا۔ "چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں دھکے دے کر نکال دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون اٹھایا۔

"میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ تم جانتے تھے کہ نیکو پر انتقام کا بھوت سوار ہے اور اس نے تمہیں جمی کے بدلے ایک بھاری پیشکش کی یعنی کیمن آئی لینڈ کے خفیہ اکاؤنٹ میں بڑی رقم کی منتقلی تاکہ تم پرائیویٹ پریکٹس شروع کر سکو۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں نے کوئی رشوت لی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ ایف بی آئی کے اسپیشل ایجنٹ یہ معلوم کرلیں گے بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کر چکے ہیں۔ وہ اس وقت سے ہی مولی گن اور تم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے جب ہم نے مارکو اور اس کے ساتھیوں کو پکڑا۔ میں جانتا تھا کہ یہ کام تم دونوں میں سے کسی ایک کا ہے۔"

ہین شا نے منہ کھولا لیکن کچھ بولا نہیں۔

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک مولی گن کا تعلق ہے تو وہ چند خامیوں کے باوجود محض ایک پولیس افسر ہے جبکہ تم ایک وکیل ہو۔ اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اصل کھلاڑی کون ہے۔"

"پھر بھی تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سارا مسئلہ وقت کا ہے۔ تم نے ٹوماک میں انکل کے ریستوران پر ہمارا کھوج لگا لیا لیکن مولی گن کو دیر سے اطلاع دی کہ ہم کہاں ہیں اور یہی چیز تمہارے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اسپیشل ایجنٹ بعض اوقات آہستگی سے حرکت کرتے ہیں لیکن بالآخر وہ تمام ثبوت اکٹھا کرلیں گے۔ شاید تمہاری سوچ سے بہت جلدی۔" میں گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

اب ہین شا کو پسینے آرہے تھے۔ اس نے اپنی نظریں دروازے پر جمائیں اور بولا۔ "دیکھو بریڈ۔ ہم اس معاملے پر بات کر سکتے ہیں۔ تم اتنے برے آدمی نہیں ہو......"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ دروازے کی ناب پر رکھ دیا۔ "میں تو برا آدمی نہیں ہوں لیکن وہ ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہاں پیٹرک مولی گن اپنے دو بھاری بھرکم ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ناراضگی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

"تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری وجہ سے میں نے پانی پر چلنے کا تجربہ بھی کرلیا۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خود حفاظتی

محمد یاسر اعوان

اپنی حفاظت کی ذمّے داری کا بار ہر شخص کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے... اس کشیدہ علاقے میں ہر طرف بدامنی تھی... شریف لوگوں کے لیے گھر سے نکلنا دشوار تر ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود اس نے فسادی علاقے میں گھر لے لیا تھا... اسے اعتماد تھا کہ وہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے...

ماضی سے حال تک کا طویل سفر کرتی پیچیدہ کہانی

ڈپٹی انسپکٹر تھامسن ٹیلر اس وقت پولیس اسٹیشن کے نوٹس بورڈ پر ایک نیا نوٹس آویزاں کر رہا تھا جب وہ خوش لباس اجنبی اندر آیا۔ اس نے ڈیسک سارجنٹ کو نہایت شائستگی سے مخاطب کیا۔ خوش لباسی اور شائستگی دونوں ایسی خصوصیات تھیں جو دسویں پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہونے والوں میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی تھیں اسی لیے ڈپٹی انسپکٹر تھامسن اس شخص کی طرف بغور دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ تھامسن اس پولیس اسٹیشن کا انچارج تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"میں ایک جرم کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا ہوں۔" اجنبی نے کہا۔

"بہت بہتر جناب۔" ڈیسک سارجنٹ گرافٹ نے دلچسپی ظاہر کیے بغیر گویا محض خانہ پُری کی نیت سے کہا۔

اجنبی جو غالباً کوئی شکایت لے کر آیا تھا، دُبلے پتلے جسم کا مالک تھا۔ اس کے خدوخال سے نفاست بلکہ کسی حد تک نزاکت عیاں تھی۔ اس کا حلیہ چونکہ بگڑا ہوا نہیں تھا اس لیے تھامسن نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اپنی کار میں پولیس اسٹیشن تک آیا ہوگا۔ اگر وہ لوکل ٹرین سے آیا ہوتا تو ریلوے اسٹیشن سے پولیس اسٹیشن تک خیریت سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسے یقیناً راستے میں لوٹ لیا گیا ہوتا لیکن جب اجنبی نے اصل بات شروع کی تو تھامسن کو فوراً اندازہ ہوگیا کہ اسے لازماً لوٹا جاچکا ہے۔ تاہم یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا حلیہ صحیح سلامت تھا۔

"یہ واقعہ انیسویں شاہراہ پر پیش آیا۔" اجنبی کہہ رہا تھا۔ "چرچ کے عین سامنے دن دہاڑے کئی راہ گیروں کی موجودگی میں ایک نوجوان لٹیرے نے مجھے روکا اور تیز دھار چاقو دکھا کر مجھ سے رقم طلب کی۔"

سارجنٹ گرافٹ نے قطعاً حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ دسویں پولیس اسٹیشن پر مہینے میں مجرمانہ حملوں اور لوٹ مار کی اوسطاً اسّی سے نوّے شکایات موصول ہوتی تھیں اور ان میں سے بیشتر وارداتیں ایسی ہی ہوتی تھیں جن کا ارتکاب ڈھیروں چشم دید گواہوں کی موجودگی میں کیا جاتا تھا۔ سارجنٹ گرافٹ کو اس وقت یقیناً حیرت ہوتی جب کوئی چشم دید گواہ کسی فریادی کے ہمراہ پولیس اسٹیشن تک بھی چلا آتا۔

زیرو ففتھ پوائنٹ، نامی اس قصبے کی تاریخ میں شاذونادر ہی ایسا ہوا تھا۔ یہاں کے باسی کسی جرم کا باضابطہ گواہ بننا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک شکایتی فارم اور قلم نکال کر ڈیسک سارجنٹ نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "اس لٹیرے کا حلیہ بیان کر سکتے ہیں آپ؟"

"میرے خیال میں مجھے حلیہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔" اجنبی بولا۔

"آپ کسی کو بھیج دیں کہ جا کر اس کا جائزہ لے لے۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔"

سارجنٹ گرافٹ نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے الفاظ کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا ہو۔

اجنبی نے معذرت خواہانہ لہجے میں مزید کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میرے ہاتھوں مارا جاچکا ہے۔ اسے غیر مسلح کرنے کی غرض سے میں نے اسے اپنے کندھوں پر سے قلابازی کھلائی تو وہ سر کے بل فٹ پاتھ پر جا گرا اور اس کا بھیجا باہر آگیا۔"

سارجنٹ بدستور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا قلم شکایتی فارم پر ٹکا ہوا تھا مگر اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔

اس لمحے تھامسن آگے بڑھا۔ "میں ڈپٹی انسپکٹر تھامسن ٹیلر ہوں، اس پولیس اسٹیشن کا انچارج۔" اس نے اجنبی سے اپنا تعارف کرایا۔

دُبلے پتلے اور مختصر الوجود اجنبی نے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا اور جواباً اپنا بھی تعارف کرایا۔ "مجھے جیکسن کہتے ہیں۔"

جب تک تھامسن اور جیکسن تعارف اور باتوں میں مصروف رہے، تب تک ڈیسک سارجنٹ کم از کم اس حد تک سنبھل چکا تھا کہ اس نے مائیک اٹھا کر ایک ریڈیو کار کے لیے پیغام نشر کردیا کہ وہ دسویں شاہراہ پر چرچ کے سامنے جائے وقوع کا جائزہ لے سکے۔ اس کے علاوہ اس نے شکایتی فارم پر جیکسن کا نام بھی لکھ لیا۔ "ایڈریس پلیز؟" اس نے اجنبی سے پوچھا۔

"ایک سو بارہ، سائمن بلڈنگ......" اجنبی نے جواب دیا۔

ڈیسک سارجنٹ نے ایک بار پھر پہلے سے زیادہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ سائمن بلڈنگ میں رہتے ہیں؟" اس نے گویا تصدیق چاہی۔

"بے شک۔" اجنبی نے خوش دلی سے جواب دیا۔

سارجنٹ کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات برقرار رہے، تاہم اس نے فارم پر ایڈریس لکھ لیا۔ "کتنے عرصے سے آپ یہاں رہ رہے ہیں مسٹر جیکسن؟" اس نے پوچھا۔

"میں گزشتہ شب ہی یہاں منتقل ہوا ہوں، میں اس وقت کام پر جارہا تھا جب یہ لٹیرا مجھ سے آن اُلجھا۔" اجنبی نے بتایا۔

"گویا آپ یہیں...... زیرو ففتھ میں ہی کام کرتے ہیں؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

"نہیں...... مین ہٹن میں فورٹی ایونیو پر میرا بیوٹی سیلون ہے۔ میں نے جب یہ کہا کہ کام پر جارہا تھا تو میرا مطلب یہ تھا کہ میں سب وے اسٹیشن کی طرف جارہا تھا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تاکہ ٹرین پکڑ کر مین ہٹن جاسکوں۔" اجنبی نے وضاحت کی۔

اس بار سارجنٹ گرافٹ ہی نہیں، ڈپٹی انسپکٹر تھامسن بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بالآخر تھامسن پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "آخرکار آپ نے رہائش کے لیے ریاست کے اسی حصے کا انتخاب کیوں کرلیا مسٹر جیکسن؟"

اجنبی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں جو اس کی ناگواری کی مظہر تھیں۔ "میں اس سوال کا مقصد نہیں سمجھا آفیسر...... اور نہ ہی تمہارے لہجے میں چھپی ہوئی ناگواری کی وجہ سمجھ سکا ہوں؟"

"اس سوال سے میرا مقصد ناگواری ظاہر کرنا ہرگز نہیں تھا مسٹر جیکسن۔" تھامسن نے ملائمت سے کہا۔ "دراصل آپ اپنے حلیے، طرزِ عمل اور گفتگو سے شریف، مہذب اور نرم خو نظر آتے ہیں جبکہ سائمن بلڈنگ اور اس کے اردگرد کا علاقہ شرفا کی رہائش کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہے۔"

"مجھے تو اس علاقے میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔" جیکسن نے کندھے اچکائے۔ "اور پھر وہاں کرایہ بھی معقول ہے۔"

سارجنٹ گرافٹ نے اب اپنے لہجے کی ناگواری چھپائے بغیر کہا۔ "جب پانچ سات مرتبہ آپ کو وہاں لوٹ لیا جائے گا تو پھر کرایہ آپ کو اتنا معقول محسوس نہیں ہوگا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اس علاقے کے پچانوے فیصد لڑکے لوٹ مار کرنے کے عادی ہیں۔ اسی لیے وہ علاقہ رہائش کے نقطۂ نظر سے بے حد خطرناک ہے۔ اس بلاک میں جہاں آپ رہتے ہیں۔ گزشتہ تین ہفتوں میں مار پیٹ اور تشدد کے ساتھ لوٹنے کی پندرہ وارداتیں ہوئی ہیں۔ مجرمانہ حملے اور قتل کی ایک ایک واردات ہوئی، تین افراد کی موت زیادہ منشیات استعمال کرنے کی وجہ سے واقع ہوئی اور اس کے علاوہ ایک بچی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا۔"

"چچ...... چچ...... چچ۔" جیکسن نے افسوس کا اظہار کیا۔ "یہ سب کچھ اس علاقے میں ہوا جو پولیس اسٹیشن سے اس قدر قریب ہے بلکہ یوں کہیں کہ ایک ہی سڑک کی بات ہے۔"

تھامسن کے چہرے پر سرخی آگئی۔ "زیرِ دفعہ پوائنٹ میں جرائم کی شرح اس لیے زیادہ ہے کہ یہاں منشیات کا استعمال اور غربت زیادہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ پولیس کی کارکردگی بہتر نہیں ہے۔ بیشتر مجرموں کو ہم گرفتار کر لیتے ہیں۔" اس نے صفائی پیش کی۔

"مجھے یقین ہے، آپ اپنے کام میں کوتاہی نہیں برتتے ہوں گے۔" جیکسن نے مسکرا کر کہا۔ "بہرحال آپ کو میرے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی حفاظت کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ میں نے جیوجستو میں بلیک بیلٹ حاصل کی ہوئی ہے اور یہ وہ بلیک بیلٹ نہیں جو امریکا میں ریوڑیوں کی طرح بانٹی جاتی ہے بلکہ یہ بیلٹ میں نے جاپان ہی سے لی ہے اور صحیح معنوں میں جیوجستو ہی میں حاصل کی ہے۔ اسکولوں میں جو سکھائی جاتی ہے، وہ درحقیقت جیوجستو نہیں بلکہ جوڈو کراٹے ہی کی ایک قسم ہے۔ حقیقی جیوجستو جس کا بانی سمورائے تھا اور جو نسل در نسل سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک ضابطۂ حیات ہے۔ بغیر ہتھیار کے اپنا دفاع کرنے کا اعلیٰ ترین فن ہے اور جوڈو کراٹے اور ایکاڈو سے کہیں زیادہ ریاضت طلب کرتا ہے۔ امریکا کے نام نہاد مارشل آرٹ سے جیوجستو میں بلیک بیلٹ حاصل کرنے والے کسی بھی چیمپئن کو میں چند سیکنڈ میں دہرا کر کے پھینک سکتا ہوں۔"

ڈپٹی انسپکٹر تھامسن بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن پھر اسے یاد آگیا کہ جیکسن کو لوٹنے کی کوشش کرنے والا ایک بدمعاش بازار میں فٹ پاتھ پر مردہ پڑا ہے۔ تب اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی لہراتی ہوئی پرچھائیاں غائب ہوگئیں۔ "اس کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ نے ایسے علاقے میں رہنا کیوں پسند کیا جہاں جرائم کی شرح بہت ہی زیادہ ہے مسٹر جیکسن؟" تھامسن نے کہا۔

جیکسن نے کچھ کہنے سے پہلے اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ تھامسن قد میں اس سے کہیں اونچا تھا۔ بالآخر وہ خشک لہجے میں بولا۔ "کیا آپ یہ کہنے کی کوشش کررہے ہیں کہ اس علاقے میں رہنے کے لیے پولیس کی اجازت لینا ضروری ہے؟"

تھامسن نے ایک بار پھر اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس کیں۔ "نہیں...... میں نے یہ کہنے کی کوشش نہیں کی۔" اس نے اختصار سے جواب دیا۔

پھر اس نے گویا کھسیاہٹ مٹانے کے لیے سارجنٹ گرافٹ کو براہِ راست مخاطب کیا۔ "میں چاہتا ہوں اس معاملے کی اچھی طرح تحقیقات کی جائے۔" پھر وہ کھٹ کھٹ کرتا اپنے دفتر میں چلا گیا۔ سارجنٹ حیرت سے اُسے جاتا دیکھتا رہا شاید وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ جب ایک شخص خود

آ کر اعتراف کر رہا ہے کہ اس کے ہاتھوں خود حفاظتی کے عمل میں ایک لٹیرا قتل ہو گیا ہے تو اس میں تحقیقات کس بات کی، کی جائے؟

یہ واقعہ منگل کی صبح کو پیش آیا تھا۔ اسی شام سارجنٹ گرافٹ نے تھامسن کو رپورٹ دی کہ میڈیکل ایگزامنر اور شعبۂ قتل کی تحقیقاتی ٹیم کے بیانات کے مطابق اس نوجوان کی موت واقعی خود حفاظتی کے نتیجے میں واقع ہوئی تھی اور وہ واقعی ایک عادی نشے باز، لٹیرا اور بدمعاش تھا۔ کئی مرتبہ مجرمانہ حملوں اور ڈکیتیوں کے سلسلے میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال تھی اور اس کا ریکارڈ بے حد خراب تھا۔ غرضیکہ کوئی نکتہ ایسا نہیں تھا جس سے جیکسن کے خلاف کوئی کیس بنا کر عدالت میں پیش کیا جا سکتا۔

لوٹ مار اور قتل، زیرو ففتھ پوائنٹ میں ایسی عام سی بات تھی کہ مقامی اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ اب اس قسم کے واقعات میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس معاملے کی بھی کسی اخبار نے ایک سطری خبر تک نہیں چھاپی۔

دو دن کی چھٹی گزار کر اگلے پیر کو تھامسن دفتر پہنچا تو سارجنٹ گرافٹ نے اسے بتایا کہ سنیچر کی شام جیکسن نے اپنی رہائشی عمارت کی راہداری میں ایک اور لٹیرے کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ اس مرتبہ بھی میڈیکل ایگزامنر اور تحقیقاتی ٹیم کی رپورٹ یہی تھی کہ یہ قتل خود حفاظتی کے سلسلے میں ہی سرزد ہوا ہے۔ اس وقت ہلاک ہونے والا تیس سالہ مارٹن نامی شخص بھی پیشہ ور بدمعاش اور عادی مجرم تھا۔ تشدد بھرے طریقے سے لوٹ مار کرنے کے جرم میں تین مرتبہ اُسے سزا بھی ہو چکی تھی۔ ”مارٹن اس وقت سیڑھیوں میں چھپا ہوا کسی شکار کا انتظار کر رہا تھا جب جیکسن باہر کہیں سے رات کا کھانا کھا کر واپس آیا۔“ سارجنٹ گرافٹ نے بتایا۔ ”مارٹن نے لوہے کے پائپ سے اس پر حملہ کیا اور اس کی کھوپڑی توڑنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے جیکسن نے اس کی پیشانی پر کراٹے کا وار کیا اور ایک ہی وار میں وہ ہلاک ہو گیا۔“

تھامسن اپنے دفتر میں بیٹھا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس واقعے پر غور کرتا رہا۔ بالآخر وہ اٹھ کر ڈیسک سارجنٹ کے پاس آیا۔

”تمہیں معلوم ہے یہ جیکسن اس وقت کہاں ہوگا؟“

”مین ٹاؤن میں...... اپنے بیوٹی سیلون میں۔“ سارجنٹ گرافٹ نے جواب دیا۔

”اسے فون کر کے کہو کہ واپسی پر مجھ سے ملتا جائے...... میں اس سے ملاقات کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔“ تھامسن نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

جیکسن شام چھ بجے اسے ملنے آیا۔ تھامسن نے اسے کرسی پیش کی اور بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ”مسٹر جیکسن آپ کو زیرو ففتھ پوائنٹ میں رہائش اختیار کیے ایک ہفتے سے بھی کم عرصہ گزرا ہے اور ان چند دنوں میں ہی آپ کو مجبوراً دو لٹیروں اور بدمعاشوں کو ہلاک کرنا پڑا ہے۔ کیا آپ اب بھی قائل نہیں ہوئے کہ یہ علاقہ رہائش کے لیے موزوں نہیں؟“

”ہزاروں لوگ زیرو ففتھ پوائنٹ میں رہتے ہیں کیا آپ سب کو یہی مشورہ دیتے ہیں؟“ جیکسن نے چبھتے لہجے میں کہا۔

”میں آپ کو خاص طور پر یہ مشورہ اس لیے دے رہا ہوں مسٹر جیکسن! کہ آپ کا حلیہ اور وضع قطع لٹیروں کو طبع آزمائی کی دعوت دیتی ہے۔“ تھامسن بے تابی سے بولا۔ ”آپ آسودہ حال، نرم و نازک اور آسانی سے شکار ہونے والے نظر آتے ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ آپ پر مزید حملے بھی کیے جائیں گے۔“

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنا دفاع کر سکتا ہوں“

تھامسن نے ملائمت سے کہا۔ ”اگر کوئی ایسا لٹیرا آپ سے ٹکرا گیا جس کے پاس ریوالور ہوا تو پھر......؟“

”مجھے ہیرو بننے کا قطعی شوق نہیں آفیسر۔“ جیکسن مسکرایا۔ ”میں اس کا مطالبہ پورا کر دوں گا۔ ویسے بھی میرے پاس عموماً چند ڈالر سے زیادہ رقم نہیں ہوتی اور جان کو خطرے میں ڈالنے کی نسبت اس رقم سے ہاتھ دھو لینا ہی بہتر ہے۔ البتہ اگر ریوالور بردار لٹیرے نے میرے زیادہ قریب آنے کی حماقت کی تو شاید میں اسے سزا دینے پر مجبور ہو جاؤں۔“

تھامسن چند لمحے اُسے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔ ”بالفرض آپ تمام متوقع حملوں میں گزند سے محفوظ بھی رہے، تب بھی پولیس آئندہ ہلاک ہونے والے لٹیروں کی موت پر غور و خوض کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ آپ کو پتا ہے کہ خود حفاظتی کا جواز صرف اس وقت قابلِ قبول ہوتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ حملہ آور کے خلاف صرف اتنی ہی طاقت استعمال کی گئی، جتنی اس کا حملہ روکنے کے لیے ضروری تھی۔“

”مجھے معلوم ہے......“ جیکسن نے اطمینان سے کہا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے یہاں سے چلتا کرنے کی کوشش

قطعاً نہیں کر رہے کہ میں نے ان دونوں حملہ آوروں کو جان بوجھ کر ہلاک کیا تھا۔ دونوں کی موت کو اتفاقی اور حادثاتی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں نے تو محض اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی تھی۔"

تھامسن نے بلاتامل کہا۔ "لیکن اگر تیسری مرتبہ بھی آپ نے اپنا دفاع اسی انداز سے کیا تو عین ممکن ہے کہ آپ کو اقدامِ قتل کے الزام میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے۔"

جیکسن نے معصومانہ حیرت سے بھویں اچکائیں۔ "کیا واقعی آپ کے خیال میں کوئی جیوری مجھے قصوروار قرار دے سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔" تھامسن نے کہا۔ "اگر ہم یہ ثابت کر دیں کہ حملہ آوروں کو گویا حملے کی دعوت دی گئی تھی۔"

"لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی آفیسر۔" جیکسن حیرت سے بولا۔ "اگر میں سڑک پر نوٹ لہراتا پھر رہا ہوتا، تب تو تمہیں شاید جواز مل جاتا مگر دونوں واقعات میں میری طرف سے کسی قسم کی ترغیب نہیں دی گئی تھی اور دونوں مقامات بھی ایسے تھے جہاں اصولاً مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک حملہ مجھ پر عین چرچ کے سامنے دن کی روشنی میں کیا گیا اور دوسرا تقریباً میرے گھر کی دہلیز پر...... اگر ان معاملات پر غور کرنے کے لیے کسی جیوری کو دعوت دی گئی تو میرے خیال میں وہ اصل مجرم دسویں پولیس اسٹیشن کو پائے گی جو اپنے پاس پڑوس کے لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے۔"

تھامسن چند لمحے برہمی سے اس مختصر الوجود شخص کو گھورتا رہا، بالآخر شکست خوردہ انداز میں گہری سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے مسٹر جیکسن! بہرحال میرا نکتہ ضرور یاد رکھیے گا کہ حملے کے جواب میں صرف اتنی ہی طاقت استعمال کی جاسکتی ہے، جتنی حملے کو ناکام بنانے کے لیے ضروری ہو۔"

اس ملاقات کے بعد جب ایک ہفتہ گزر گیا اور جیکسن کا کوئی ذکر سننے میں نہ آیا تو تھامسن اُسے تقریباً بھول ہی گیا تھا لیکن پیر کی صبح اسے اطلاع ملی کہ جیکسن کے ہاتھوں تیسرا لٹیرا ہلاک ہو چکا ہے اور چوتھا شدید زخمی ہے۔ ان بدمعاشوں نے بھی اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دونوں تقریباً اٹھارہ انیس سال کی عمر کے تھے اور دونوں ہی منشیات کے عادی تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس اس وقت ہلکی سی کلہاڑی تھی اور دوسرے کے پاس چھوٹا سا تیغا جب انہوں نے پولیس اسٹیشن سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چوراہے پر جیکسن کو گھیرا۔ جیکسن نے ان میں سے ایک کو عین اس وقت اس کے اپنے ہی ساتھی کے سامنے دھکیل دیا تھا جب وہ پوری قوت سے جیکسن پر کلہاڑی سے وار کرنے لگا۔ کلہاڑی جیکسن کے لگنے کے بجائے اس کے اپنے ہی ساتھی کے سر پر پڑی اور اس کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جیکسن نے کلہاڑی والے کو ایک چلتے ٹرک کے سامنے اچھال دیا، جس کے نتیجے میں وہ اس عالم میں اسپتال پہنچا تھا کہ اس کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور اسے ظاہری و مخفی نہ جانے کتنے زخم آئے تھے۔

"کم از کم اس مرتبہ جیکسن نے کسی کو ہلاک نہیں کیا۔" سارجنٹ گرافٹ نے تبصرہ کیا۔ "ایک بدمعاش اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں ہلاک ہوا، اور دوسرا ٹرک تلے کچلا گیا۔"

تاہم تھامسن کو اندازہ تھا کہ یہ جیکسن ہی کی مہارت تھی جس نے صورتِ حال کو یہ رنگ دیا تھا اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ٹرک کے سامنے گرنے والا بدمعاش بچ گیا تھا، ورنہ اس کی ہلاکت کا تو پورا پورا سامان کیا گیا تھا۔

"اس واقعے کی طرف بھی اخبارات متوجہ ہوئے ہیں یا نہیں؟' تھامسن نے پوچھا۔

گرافٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اخبارات والے زیرو ففتھ پوائنٹ میں تشدد کی وارداتوں سے اتنے بور ہو چکے ہیں کہ اب پولیس اسٹیشن آکر پریس نوٹ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ بس فون کر کے کبھی کبھار پوچھ لیتے ہیں کہ کوئی خاص بات تو نہیں...... میں نے سوچا تم پسند نہ کرو اس لیے میں نے انہیں فون پر کچھ نہیں بتایا۔"

"اچھا کیا۔" تھامسن نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "میں دانستہ طور پر جرائم کی خبروں کو چھپانا پسند نہیں کرتا لیکن یہ جیکسن والے معاملے میں، میں چاہتا ہوں کہ صرف اسی وقت معلومات فراہم کی جائیں جب کوئی رپورٹر ازخود اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔"

تحقیقاتی ٹیم نے جیکسن کے سلسلے میں ریکارڈ بھی کھنگالا جس سے معلوم ہوا کہ مقامی سطح پر جیکسن کبھی کسی جرم میں ملوث نہیں رہا لیکن تھامسن نے بہتر سمجھا کہ کچھ باریک بینی سے چیک کیا جائے۔ اس نے ایف بی آئی والوں کو واشنگٹن ٹیلی گرام بھیجا۔ ان کے جواب سے بھی تصدیق ہو گئی کہ جیکسن نامی وہ مختصر الوجود شخص کبھی کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث نہیں رہا۔

اس کے بعد تھامسن نے بہتر سمجھا کہ علاقے کے اعلیٰ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حکام کو بھی اس معاملے سے باخبر رکھا جائے۔اس نے ٹرانکس کے پورے علاقے کے چیف انسپکٹر ہوریسٹ بارٹن کو فون پر سارا قصہ سنایا۔ ہوریسٹ نے ڈسٹرکٹ اٹارنی جنرل سے بات کی اور ڈسٹرکٹ اٹارنی نے خود تھامسن کو فون کیا اور اس کی زبانی تمام تفصیلات سننے کے بعد کہا۔ ''یہ شخص یقیناً جان بوجھ کر لٹیروں اور بدمعاشوں کو ہلاک کر رہا ہے تھامسن، جیوجتسو کے بارے میں کالج کے زمانے سے مجھے بھی کچھ معلومات ہیں۔ اگر وہ جیوجتسو میں اتنا ہی ماہر ہے جتنا اس کا دعویٰ ہے تو پھر وہ اپنے دفاعی حملوں کی شدت کچھ کم کر سکتا تھا اور حملہ آوروں کو ہلاک کیے بغیر اپنے آپ کو بچا سکتا تھا۔''

''ممکن ہے......'' تھامسن بولا۔ ''لیکن اس ذاتی رائے کی بنیاد پر کسی جیوری کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جیوری ایک معزز اور کاروباری آدمی کو اس امر پر سزا دلوا سکے کہ اس نے عادی اور پیشہ ور مجرموں کے حملے سے اپنے آپ کو بچایا تھا جبکہ مجرم مسلح تھے اور وہ نہتا...... اور حملے میں پہل بھی مجرموں ہی نے کی تھی جن میں سے ہر ایک کا ریکارڈ شرمناک تھا۔''

''نہیں، میں کسی جیوری سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتا۔'' ڈسٹرکٹ اٹارنی نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''بہرحال تمہارے لیے خاص طور پر لمحۂ فکریہ ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ شخص لٹیروں اور بدمعاشوں کا صفایا جاری رکھے گا اور جلد یا بدیر کوئی رپورٹر اس طرف متوجہ ہو جائے گا اور نہایت سنسنی خیز کہانی تیار کرے گا جس کے بعد لوگوں کو نئے سرے سے یاد آ جائے گا کہ دسویں پولیس اسٹیشن کے نواح میں امنِ عامہ کی حالت کس قدر ابتر ہے اور یہاں بدمعاشوں سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی جیوجتسو میں مہارت حاصل کرے۔''

''بدنامی صرف زیرو ففتھ پوائنٹ ہی کی نہیں، پورے ٹرانکس کی ہوگی۔'' تھامسن نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''جب اعداد و شمار زیرِ بحث آئیں گے تو پتا چلے گا کہ صرف زیرو ففتھ پوائنٹ ہی ایسا علاقہ نہیں جہاں جرائم کی شرح زیادہ ہے۔''

ڈسٹرکٹ اٹارنی ایک بار پھر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا بالآخر وہ بولا۔ ''میرے ایک طرف کنواں ہے تو دوسری طرف کھائی۔ اگر میں جیکسن پر قتل کے الزام میں قانونی کارروائی نہیں کرتا تو میرا حریف آئندہ الیکشن میں میرے خلاف یہ نکتہ پکڑ سکتا ہے کہ میں نے ایک نفسیاتی مریض کو ڈھیل دیے رکھی اور اگر میں قانونی کارروائی کرتا ہوں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے ایک شریف اور بے گناہ پر اس 'جرم' میں مقدمہ چلایا کہ اس نے چند عادی مجرموں کے مقابلے میں اپنا دفاع کیا تھا اور یہ کہ اگر میں نے اپنے فرائض اچھی طرح انجام دیے ہوتے تو اتنی تعداد میں یہ بدمعاش یوں کھلے بندوں سڑکوں پر پھرتے نظر ہی نہ آتے۔ وغیرہ وغیرہ......''

''آپ کا مشورہ کیا ہے؟'' تھامسن نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے سب سے پہلے تو مجھے اس شخص سے مل لینا چاہیے۔'' ڈسٹرکٹ اٹارنی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس مقصد کے لیے میں تمہارے ہی آفس آ جاؤں تو بہتر رہے گا۔ تم اُسے فون کر کے شام سات بجے کی ملاقات طے کر لو، میں اور چیف انسپکٹر ہوریسٹ دونوں ہی آ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' تھامسن نے طمانیت سے کہا۔

ڈسٹرکٹ اٹارنی اور چیف انسپکٹر اس شام ٹھیک سات بجے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ تھامسن فون پر جیکسن سے ملاقات طے کر چکا تھا...... جیکسن پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش لباس، تازہ دم اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ تعارف ہو چکا اور سب نشستیں سنبھال چکے تو ڈسٹرکٹ اٹارنی نے بلاتمہید کہا۔

''میں اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کروں گا مسٹر جیکسن...... میں جیوجتسو کے فن سے بنیادی طور پر واقف ہوں اور اسی لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ چاہتے تو تینوں حملہ آوروں کے معاملے میں کم از کم اتنی نرمی ضرور اختیار کر سکتے تھے کہ وہ موت کے منہ میں نہ جاتے۔''

''اس کوشش میں خواہ مخواہ میں خود موت کے منہ میں چلا جاتا۔'' جیکسن نے استہزائیہ لہجے میں کہا پھر گویا وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال کورٹ میں اس امر کو ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا کہ میں نے ضرورت سے زیادہ طاقت استعمال کی۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا واحد مقصد اپنی حفاظت کرنا تھا۔ تینوں اموات قطعی حادثاتی تھیں۔''

''تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو میتائل۔'' چیف انسپکٹر ہوریسٹ نے ڈسٹرکٹ اٹارنی کو مخاطب کیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ شخص کوئی نفسیاتی مریض ہے جس کا خیال ہے کہ اس نے اپنی تفریحِ طبع کے لیے لٹیروں اور بدمعاشوں کو قتل کرنے کا ایک قانونی راستہ تلاش کر لیا ہے۔ اس کی

خوش فہمی دور کرنے کے لیے ہمیں جلد از جلد اسے گرینڈ جیوری کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔'' جیکسن نے پُرسکون انداز میں چیف انسپکٹر ہوریسٹ کی طرف دیکھا اور خوشگوار لہجے میں بولا۔

''ڈسٹرکٹ اٹارنی اس بات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ اس معاملے کو گرینڈ جیوری کے سامنے سماعت کے لیے منظور بھی نہیں کروا سکتے، میرے خلاف فیصلہ لینا تو دور کی بات ہے۔''

''ہمیں بحث میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' ڈسٹرکٹ اٹارنی نے گویا ماحول کی تلخی ختم کرنے کی کوشش کی اور براہِ راست جیکسن کو مخاطب کیا۔ ''کیا میں امید رکھوں کہ آپ آئندہ مزید قتل و خون سے گریز کریں گے؟''

''کوشش تو میری یہی ہوگی کہ کم از کم میرے ہاتھ سے کسی کی موت واقع نہ ہو۔'' جیکسن نے خلوص سے کہا۔

''کیا اس کا بہتر طریقہ یہ نہیں کہ آپ زیرو ففتھ پوائنٹ سے ترکِ سکونت کرلیں۔'' ڈسٹرکٹ اٹارنی نے ملامت سے کہا۔

جیکسن نے ناگواری سے ڈسٹرکٹ اٹارنی کی طرف دیکھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ صرف (ماسکو) روس میں شہریوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ انہیں کہاں رہنا ہے اور کہاں نہیں رہنا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ امریکا میں بھی ایسا ہونے لگا ہے۔''

''میں آپ کو حکم نہیں دے رہا کہ آپ یہاں سے ترکِ سکونت کرلیں۔'' اٹارنی جنرل نے تحمل سے کہا۔ ''میں تو آپ سے صرف تعاون کی درخواست کررہا ہوں۔''

''کیا اس مسئلے کا زیادہ مناسب حل یہ نہیں کہ پولیس ففتھ پوائنٹ کے گلی کوچوں اور سڑکوں کو اس قابل بنانے کی کوشش کرے کہ کم از کم دن کی روشنی میں تو لوگ ان پر سکون اور اطمینان سے چل سکیں اور اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرسکیں؟'' جیکسن نے ملامت سے کہا۔

''اور یقیناً آپ کو یاد ہوگا کہ آپ ہی کے میڈیکل اگزامنر نے پچھلے دنوں ایک رپورٹ مرتب کی تھی جس کے مطابق صرف میرے علاقے میں گزشتہ دس ماہ میں چالیس اموات ہوئی تھیں جن میں صرف دو طبعی تھیں۔ باقی سب کے سب کسی نہ کسی کے ہاتھوں قتل ہی ہوئے ہوں گے۔ میرے خیال میں یہ محکمہ پولیس کے لیے بڑی شرم کی بات ہونی چاہیے۔'' اس نے رک کر ان کی جانب دیکھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ وہ لوگ پولیس اور قانون کے خوف سے کسی بھی شریف آدمی پر حملے کرنا بند کردیں۔''

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بس...... آپ لوگوں کو مجھ سے یہی باتیں کرنا تھیں؟''

ڈسٹرکٹ اٹارنی اور چیف انسپکٹر دونوں بے حس و حرکت بیٹھے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر بالآخر جیکسن رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک کمرے میں سکوت ہی رہا پھر ڈسٹرکٹ اٹارنی بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں تو کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ دوبارہ ایک عام وکیل کی حیثیت سے ہی پرائیویٹ پریکٹس شروع کردوں۔ سرکاری منصب سنبھالنے میں بڑے بکھیڑے ہیں۔'' پھر وہ بھی رخصت ہوگیا۔

اس کے چند لمحے بعد چیف انسپکٹر ہوریسٹ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''میں چاہتا تو پانچ ماہ پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے چکا ہوتا...... لیکن میرے خیال میں اب بھی کچھ نہیں بگڑا، اب بھی موقع ہے کہ میں عزت سے رخصت ہوجاؤں۔''

ان کے جانے کے بعد تھامسن اپنے آفس میں دیر تک تنہا بیٹھا رہا، حالانکہ اس کی ڈیوٹی کا وقت کب کا ختم ہوچکا تھا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اور چیف انسپکٹر ہوریسٹ کا فیصلہ سننے کے بعد وہ خود بھی سنجیدگی سے استعفا دینے کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اسی سوچ بچار میں دن ڈھلنے لگا...... جب وہ اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا، جیکسن ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ معمول سے کچھ زیادہ ہی مسرور نظر آرہا تھا۔

''میں ایک نئے واقعے کی اطلاع دینے آیا ہوں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''میں جس عمارت میں رہتا ہوں، اس کے قریب ہی ایک عمارت کے تاریک برآمدے سے نکل کر ایک بدمعاش نے لوہے کی بھاری چین سے مجھ پر حملہ کیا...... یہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے کی بات ہے۔ میں یہاں سے گھر جارہا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمام تر احتیاط کے باوجود میرے وار سے اس کی پیشانی پھٹ گئی اور اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ آس پاس کے دو ایک آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کچھ زیادہ ہی خطرناک بدمعاش تھا اور اس کے جرائم کا ریکارڈ کئی برسوں پر محیط ہے۔ کئی بار وہ جیل بھی جاچکا تھا مگر تھوڑی بہت سزا کاٹ

کروا پس آجاتا تھا۔ وہ شخص جیسا بھی تھا، بہر حال اس کی موت کوئی خوشگوار واقعہ نہیں۔ اب تو میں بھی تمہارے اس خیال سے متفق ہوں کہ زیرو ففتھ پوائنٹ رہائش کے لیے موزوں علاقہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے میں صبح ہی مین ہٹن منتقل ہو جاؤں گا۔ وہاں رہائش مہنگی تو پڑے گی مگر اس روز روز کی پنجہ آزمائی اور روز کے ٹرین کے سفر سے تو بچوں گا۔ تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے انسپکٹر کہ اس نے بہت جلد ہی میرے دل میں یہ خیال ڈال دیا۔ ورنہ میرا تو نہ جانے کا ارادہ پختہ ہو چکا تھا۔''

انسپکٹر تھامسن اپنی جگہ بیٹھا اُسے گھور رہا تھا پھر وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اب جب تم نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اصل بات بتاتے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہاں نہ تو کسی مقصد کے بغیر آئے تھے اور نہ ہی اب محض میری تجویز سے متفق ہو کر یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے...... تم مجھے اصل بات بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔'' اس کی آنکھوں میں اب برہمی کی جگہ التجا نے لے لی تھی۔

''کارروائی تو تم کسی بھی صورت میں نہیں کر سکتے۔'' جیکسن مسکرایا۔ ''بہر حال تمہاری تسلی کے لیے اصل بات بتا دیتا ہوں۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت جاپان میں تھا۔ کیتھرین نام کی ایک عورت زیرو ففتھ پوائنٹ کی اسی عمارت میں ایک فلیٹ میں رہتی تھی، جہاں آج کل میں رہائش پذیر ہوں۔ اس نے یہاں کے ایک معمولی سے دکان دار سے شادی کی تھی۔ یہ جذباتی شادی تھی۔ شادی کے بعد ہی وہ مین ہٹن سے مستقل طور پر یہاں آئی تھی۔ شادی کے بعد ان کے ہاں ایک ہی بچہ پیدا ہوا تھا۔ وہ بہت پیارا اور بے حد ذہین بچہ تھا۔ ویسے تو ہر ماں کو ہی اپنا بچہ پیارا ہوتا ہے مگر کیتھی تو اپنے بچے کی کچھ زیادہ ہی دیوانی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹرز نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ مزید اولاد پیدا نہیں کر سکے گی۔ اب وہی بچہ اس کی تمام تر امیدوں اور خوشیوں کا محور تھا۔ ایک دن ایک بدمعاش نے محض دن بھر کی کمائی لوٹنے کے لیے اس کے شوہر کو قتل کر دیا۔ اس نے قاتل کو دیکھ لیا تھا، پہچان بھی لیا تھا مگر قاتل نے عدالت میں جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ایک ثبوت پیش کر دیا اور محض اس ثبوت کی بنا پر وہ صاف بچ گیا، مقتول کی بیوہ کی شہادت بے اثر ہو گئی۔ پھر اسی بدمعاش نے شاید اس سے اس ناکام شہادت کا بدلہ لینے کے لیے یا محض اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر ایک دن اس عورت کو بے عزت کرنے کے لیے سرِ راہ روکا اور درندوں کی طرح اسے نوچتا، کھسوٹتا اور اس کا لباس تار تار کرتا رہا۔ کمسن بچہ ماں کے سامنے ڈھال بننے کے لیے بڑھا تو بدمعاش نے اسے پوری قوت سے ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور اندرونی چوٹ آنے سے وہ وہیں دم توڑ گیا۔ تم اس ماں کے غم کا اندازہ نہیں کر سکتے، کیونکہ تم آئے دن اس قسم کی کہانیاں سننے کے عادی ہو گئے ہو...... اسے سکتہ سا ہو گیا اور وہ آج تک سکتے کی حالت میں ہی زندگی گزار رہی ہے۔ تاہم میں نے جاپان سے آنے کے بعد اس سے اس بدمعاش کے بارے میں ضروری معلومات کسی نہ کسی طرح حاصل کر لی تھیں، جو محض شک کا فائدہ اٹھا کر ایک بار سزا سے بچ گیا تھا۔ میرے سامنے اب دو ہی راستے تھے کہ اس بدمعاش کو سیدھے سادے طریقے سے قتل کر دوں اور قانون کی طرف سے اپنے لیے موت قبول کر لوں، یا پھر جس طرح وہ قانون کی خامیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کامیابی سے آئے دن کسی نہ کسی کی زندگی برباد کرنے میں مصروف تھا، اسی طرح میں بھی قانون کے کسی سقم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایسی سزا دوں جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق تھا۔ یہ خود حفاظتی، والا طریق کار میں نے صرف اسی کے لیے اختیار کیا تھا۔ پہلے چار بدمعاش تو محض اسی کے انتظار میں میرے ہاتھوں سزا پا گئے۔ بہر حال پھر بھی وہ میری توقع سے کہیں پہلے ہی مجھ سے آ ٹکرایا۔ ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اس کے انتظار میں مجھے نہ جانے کتنے بدمعاشوں کو ٹھکانے لگانا پڑے...... یہ پانچواں بدمعاش جسے میں کچھ دیر پہلے جہنم رسید کر کے آ رہا ہوں، وہی تھا۔''

''اور وہ عورت...... کیتھرین تمہاری کون تھی؟'' تھامسن نے سنبھل کر پوچھا۔

''وہ میری سگی بہن ہے۔'' جیکسن نے آہستگی سے جواب دیا۔

انسپکٹر تھامسن نے پہلی بار اس کی آواز میں دکھ کی لرزش محسوس کی مگر بظاہر اس کا چہرہ سپاٹ تھا پھر وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور خدا حافظ کہہ کر تھامسن کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

روشن مستقبل

منظر امام

ماضی شاندار... حال جاندار ہو نہ ہو مستقبل سے اُمیدیں ضرور وابستہ ہوتی ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کی رام کتھا... ہر شخص اس کے روشن مستقبل کے لیے فکرمند تھا...

ہلکے پھلکے پیرائے میں پوشیدہ گہری بات کا افسانہ

میرے ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

نہ جانے لوگ کیا ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔

میں جب میٹرک کر چکا تو میرے تایا نے ابا سے کہا۔

''روشن مستقبل کو کیا بنانے کا ارادہ ہے؟''

واضح ہو کہ میرا نام ہی روشن مستقبل ہے۔ نہ جانے ایسا عجیب نام کیوں رکھ دیا گیا۔ میرے خاندان کے ایک بزرگ نے کہا تھا کہ بچے کا نام روشن مستقبل رکھنا۔

میرے ابّا نے احتجاج کیا۔ ''جناب ایسا نام کچھ عجیب سا نہیں ہوگا؟''

''نہیں۔ کیونکہ جب اس کا مستقبل روشن ہو جائے گا تو سب ہی اس نام پر رشک کریں گے۔'' بزرگ نے کہا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ اس کا مستقبل روشن ہوگا؟''

''سو فیصد۔ کیونکہ اس کے استخارے میں یہی نکلا ہے۔''

تو اس طرح میں روشن مستقبل ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ میرا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکا۔ صرف نام ہی رہا۔ میں یہ بتا

رہا تھا کہ جب میں نے میٹرک کرلیا تو تایا نے کہا کہ اس کو تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی ہنر بھی سکھاؤ۔ زندگی بھر عیش کرے گا۔

زندگی بھر عیش کرنے کے لیے ابا نے مجھے ایک گیرج میں مکینک کا کام سیکھنے پر لگا دیا۔ میں نے ایک سال تک اس گیرج میں کام کیا۔ پھر ایک دن میرے ایک پھوپھا تشریف لے آئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں گیرج میں کام سیکھ رہا ہوں تو بہت ناراض ہوئے۔ ”بھائی بچے کو کیا بنانا چاہ رہے ہو، مستری؟ گیرج میں کام کرنے والا؟“

”بھائی میاں، یہ تو بہت بڑے ہنر کی بات ہے۔“ ابا نے کہا۔

”کیا خاک ہنر کی بات ہے؟ بھائی زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے۔ آج کل آٹو موبائل کا کام بھی کمپیوٹر کے ذریعے ہوا کرتا ہے۔ دنیا کا سارا علم کمپیوٹر میں سمٹ آیا ہے۔ تم اسے کمپیوٹر کی تعلیم دلواؤ۔“

لیں صاحب۔ اب میرا کمپیوٹر کا کورس شروع ہوگیا۔ کچھ دن گزارنے کے بعد اندازہ ہوا کہ کمپیوٹر تو کم بخت شیطان کی آنت ہے۔ ابھی ایک کورس سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ دوسرا آگیا۔ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

بہرحال دو سال اسی میں لگا دیے۔ اس دوران میں انٹر بھی کر چکا تھا۔

اسی دوران میرے ایک خالو فرانس میں دس سال گزارنے کے بعد خالہ اور بچوں کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے پاکستان آگئے۔

کیا شان تھی ان کی۔ نہ جانے کتنا سامان ساتھ لائے تھے۔ شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں پورا خاندان ٹھہرا تھا۔ ہم لوگوں نے بھی ایک دن ان کو کھانے پر بلایا تھا۔

”امجد بھائی۔ پیرس تو بہت زبردست شہر ہوگا۔“ ابا نے پوچھا۔

”ایسا ویسا۔ جس گلی سے گزرو۔ ایسا لگے گا جیسے پھولوں کے باغ سے گزر رہے ہو۔ کیا نہیں ہے وہاں۔“ امجد خالو نے جواب دیا۔

”تم لوگ تو کرائے کے مکان میں رہتے ہوگے؟“

”نہیں بھائی، کرائے کا جھنجٹ تو ختم ہوگیا۔ اب ہمارا اپنا ولا ہے۔“ خالو نے بتایا۔ ”سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ بچے پیرس کے بہترین اسکول میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اور یہ سب کہاں سے ہوا ہے، معلوم ہے؟“

”ظاہر ہے تمہاری اعلیٰ تعلیم کام آرہی ہے۔“

”ارے بھاڑ میں ڈالو اعلیٰ تعلیم کو۔ وہاں ہماری تعلیم والیم نہیں چلتی۔ بس میرا ہنر کام آرہا ہے۔“

”کیسا ہنر؟“

”یہی کھانا پکانے کا۔“ خالو نے بتایا۔ ”مجھے بچپن سے شوق تھا۔ اس کے علاوہ باہر جانے کا جنون بھی تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ بھائی تم کوکنگ کلاسز جوائن کرلو۔ باہر اس کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ خدا بھلا کرے اس شریف آدمی کا۔ جس نے مجھے یہ مشورہ دیا۔ میں نے ایک کوکنگ سکھانے کے ادارے میں داخلہ لے لیا۔ اور آج اسی کی بنیاد پر پیرس جیسے شہر میں اعلیٰ معیار کی زندگی گزار رہا ہوں...“

ہم سب دنگ ہوکر ان کی باتیں سنتے رہے۔ ایک الگ ہی داستان تھی ان کی۔

خالو نے ہم سبھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی اپنے روشن مستقبل کو کوکنگ کا کورس کروادو۔ میں خود اسے فرانس کے لیے اسپانسر کردوں گا۔“

لیں جناب پھر کیا تھا میں نے پڑھائی، کمپیوٹر اور گیرج کے کام کے ساتھ ساتھ کھانے بنانے کا ہنر بھی سیکھنا شروع کردیا۔

دو مہینوں میں اتنا ہوگیا کہ میں گھر والوں کو چائنیز بنا کر کھلانے لگا تھا۔

سب کو اب یہی امید تھی کہ روشن مستقبل کا مستقبل واقعی روشن ہونے والا ہے۔ اسی دوران ایک اور واقعہ ہوا۔ ابا کے ایک دوست ابا سے ملنے آگئے۔ وہ ایک سرکاری آفیسر تھے۔ انہیں جب میرے بارے میں معلوم ہوا تو وہ ابا پر برس پڑے۔ ”یار یہ تم کیا اپنے بچے کی زندگی برباد کررہے ہو، اس کو ایسا کام سکھاؤ جو اس کے کام بھی آئے۔“

”کوکنگ تو بہت اچھی لائن ہے۔“ ابا نے کہا۔

”ہاں کسی زمانے میں بہت اچھی تھی۔ اب کچھ بھی نہیں ہے۔ دنیا کے ہر شہر میں کوکنگ کلاسز کھلی ہوئی ہیں۔ اب باہر سے کوئی کسی کو نہیں بلاتا۔“

”تو پھر تم ہی مشورہ دو کہ روشن مستقبل کے ساتھ کیا کیا جائے؟“ ابا نے پوچھا۔

”بھئی سیدھی سی بات ہے اسے پٹواری کا کام سکھادو۔“ انہوں نے کہا۔

”پٹواری کا کام؟“ ابا حیران رہ گئے تھے۔ خود میں بھی یہ مشورہ سن کر دنگ رہ گیا۔

”ہاں بھائی، میں چونکہ سرکاری آفیسر ہوں اسی لیے میں جانتا ہوں کہ اس کام کی کیا اہمیت ہے۔ بڑے بڑے زمیندار پٹواریوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے ہیں۔ لاکھوں

کے تحائف ملتے ہیں۔ کسی زمیندار سے کچھ بھی کہو وہ فوراً تیار ہو جاتا ہے۔ پوری زندگی نہ صرف خود عیش کرے گا بلکہ اپنی نسلوں کو بھی عیش کروائے گا۔"

"مشورہ تو تمہارا اچھا ہے لیکن اس کا کورس کہاں سے ہوتا ہے؟" ابا نے پوچھا۔

"اس کا کورس کہیں سے نہیں ہوتا بلکہ یہ سینہ بہ سینہ چلتا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"پھر تو ہم نہیں کرواسکتے۔" ابا نے کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ بہت سے پٹواری میری جان پہچان والے ہیں۔ کسی سے بھی کہہ دوں گا۔ وہ اسے ماہر کردے گا۔"

لیں جناب۔ اس کے بعد پٹواری بننے کے مرحلے سے گزرنے لگا۔ کھاتے بہی۔ مربعوں اور گزوں کا حساب۔ بہت ٹیکنیکل کام تھا۔ بہت محنت تھی اس میں۔ ایک سال تک سیکھتا چلا گیا۔ خود مجھے احساس ہوگیا تھا کہ اس میں فائدے ہی فائدے ہیں۔

لیکن ابھی میری قسمت میں اور بھی کچھ تھا۔ ایک اور رشتے دار تشریف لے آئے۔ ان کی دھوم اس لیے مچی ہوئی تھی کہ انہوں نے چھوٹے سے کاروبار سے بہت بڑی فیکٹری بنالی تھی۔

ابا سے جس وقت ان کی گفتگو ہورہی تھی، اس وقت میں بھی موجود تھا۔ وہ اپنی کامیابیوں کے بارے میں بتارہے تھے۔

"بھائی تم تو جانتے ہو کہ میری کیا ورتھ تھی۔ میں بیلٹ، بیگ اور اسی قسم کی چیزیں بیچا کرتا تھا۔ وہ چیزیں جو چمڑے سے بنائی جاتی ہیں۔ خالص لیدر کا کام تھا میرا۔ وہیں سے مجھے لیدر سے دلچسپی ہوگئی۔ میں نے ایک کارخانے میں چمڑے کا کام سیکھنا شروع کردیا اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔"

"ہاں بھائی، تمہاری ترقی تو قابلِ رشک ہے۔" ابا نے کہا۔

"اگر تم چاہو تو اپنے بیٹے کو بھی قابلِ رشک بناسکتے ہو۔"

"وہ کس طرح؟"

"اسے چمڑے کا کام سکھادو۔" انہوں نے کہا۔

"چمڑے کا کام؟" ابا حیران رہ گئے۔

"ہاں بھائی، کوئی بھی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔" انہوں نے کہا۔ "اس دور میں صرف پیسا دیکھا جاتا ہے۔ ساری عزت اسی کی ہے جس کے پاس دولت ہے۔ تم کو تو معلوم ہے کہ جب میرے پاس کچھ نہیں تھا تو کوئی مجھے نہیں پوچھتا تھا۔ لیکن اب سب آگے پیچھے ہوتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ میرے پاس دولت ہے۔ تم اپنے بچے کو کل سے میری فیکٹری میں بھیجنا شروع کردو۔ ایک سال میں کام سیکھ جائے گا۔ اس کے بعد اس کے عیش ہی عیش ہوں گے۔"

اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی میں نے فیکٹری جا کر چمڑے رنگنے کا کام سیکھنا شروع کردیا۔ کیونکہ میری قسمت میں آگے چل کر عیش کرنا لکھا تھا۔

چھ مہینے اس میں لگ گئے۔ آپ سوچیں میری ابتدا کہاں سے ہوئی تھی۔ پہلے تو تعلیم۔ جو میں اپنے طور پر حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک گیرج میں کام سیکھنا شروع کیا۔ ابھی وہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ کھانا پکانے کا کام سیکھنے لگا اس کے بعد پٹواری ہوگیا۔ پھر چمڑہ رنگنے لگا اور مستقبل کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔

اس دوران میری تعلیم جاری رہی تھی۔ میں نے تعلیم کا سلسلہ ختم نہیں کیا تھا۔

میں ایم اے کرچکا تھا اور وہ بھی اکنامکس جیسے سبجیکٹ میں۔ امید تھی کہ کسی بینک میں اچھی ملازمت مل جائے گی۔

اتفاق سے ایک بینک میں ویکنسی نکل آئی۔ کام وہی تھا جس کی میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے درخواست دے دی۔ انٹرویو کے لیے بھی بلایا گیا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ انٹرویو دینے پہنچ گیا۔

میری سی وی اس کے ہاتھ میں تھی جو میرا انٹرویو لے رہا

لذیذ غلطی

ہوٹل میں مقامی پادریوں کا اجلاس ہورہا تھا۔ موسم کی مناسبت سے یخ بستہ تربوز پیش کیے گئے جن میں سادے مشروب کے بجائے غلطی سے وہسکی داخل کردی گئی۔ سروس منیجر کو غلطی کا علم ہوا تو وہ بہت بوکھلایا مگر تلافی کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے اجلاس میں خدمات انجام دینے والے ویٹرز کے سربراہ کو بلا کر پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ "کیا ہورہا ہے...... پادری ناراض ہورہے ہوں گے!"

"کچھ بھی نہیں...... سب نلکیوں سے مزے مزے سے چسکیاں لے رہے ہیں اور ایک دوسرے کی نظریں بچا کر اپنے اپنے تربوزوں کے بیج جیب میں ڈال رہے ہیں۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھا۔ ''تعلیم تو تمہاری مناسب ہے۔'' اس نے کہا۔
''جی جناب۔'' میں نے جواب دیا۔
''تم نے یہ نہیں لکھا کہ تم اور کیا کر سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''جناب، میں گیرج میں کام کرتا رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔
''اوہو، پھر تو تمہارا بینک میں کام کرنا بہت مشکل ہوگا۔'' اس نے کہا۔
''وہ کیوں جناب؟''
''سیدھی سی بات ہے۔ تمہارا ذہن تو سات نمبر یا چھ نمبر پانے میں لگا رہے گا۔ کون سی گاڑی کس میک کی ہے۔ تم یہی سب سوچتے رہو گے اور بینک کی جاب ایسی ہوتی ہے کہ ذرا سا دھیان اِدھر اُدھر ہوا کام خراب ہو گیا۔ سوری ہم تم کو جاب نہیں دے سکتے۔''
میں نے گھر پہنچ کر ابا کو جب یہ بتایا تو وہ بہت افسوس کرنے لگے۔ ''پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ارے ان باتوں کا بینک کی ملازمت سے کیا تعلق۔ خیر چھوڑو۔ پریشان مت ہو۔ میرے ایک دوست کا شوروم ہے گاڑیوں کا۔ وہاں تمہارا یہ تجربہ بہت کام آئے گا۔ ان کو ایک منیجر کی بھی ضرورت ہے۔ میں تمہیں وہاں بھیج دیتا ہوں۔''
ابا نے مجھے شوروم کے مالک کے پاس بھیج دیا۔ وہ ایک معقول انسان تھا۔
''ہاں، میرا خیال ہے کہ تم شوروم سنبھال لو گے۔ تمہاری تعلیم بھی اچھی ہے۔ اور گیراج کا تجربہ بھی ہے۔ ورنہ تمہاری عمر کے نوجوانوں کے پاس تجربہ کہاں ہوتا ہے۔ ویسے اور کیا کیا آتا ہے تمہیں؟''
''جناب، مجھے کوکنگ بھی آتی ہے۔'' میں نے فخریہ بتایا۔ ''باقاعدہ کورس کیا ہوا ہے۔''
''کیا؟'' وہ یہ سن کر اچھل پڑا۔ ''بیٹے پھر تو بہت مشکل ہے'' اس نے کہا۔ ''دیکھو یہ ہمارا قیمتی گاڑیوں کا شوروم ہے اور تمہارے ذہن میں ہلدی، دھنیا، گرم مصالحے ہوں گے۔ تم کام کیا کرو گے؟''
''ارے نہیں جناب۔ اب میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے۔ میں سب بھول گیا ہوں۔''
''بہت مشکل ہے بیٹا۔ ایک بار جو بندہ کچن میں گھس جائے، وہ ساری زندگی کچن ہی میں رہتا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں منیر صاحب۔ بہت بڑے سرکاری آفیسر ہیں۔ انہیں کھانے بنانے کا شوق تھا۔ جو آج تک ہے۔ پورے محکمے میں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ انہیں سرکاری باورچی کہا جاتا ہے۔''
مختصر یہ کہ اس شوروم میں بھی جاب نہیں ہو سکی۔
اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں بلاوجہ اتنے دنوں تک جھک مارتا رہا۔
ایک دن ابا نے ایک مفید مشورہ دیا۔ ''بیٹے ایک کام کرو۔ تم اپنی سی وی پھاڑ کر پھینک دو۔ ایک نئی سی وی بناؤ جس میں لکھو کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ صرف تعلیم حاصل کی ہے۔ میں دیکھو کہیں سفارش لگواتا ہوں۔''
ابا نے ایک منسٹر کی سفارش لگوا دی۔ مجھے ایک بڑی فرم میں انٹرویو کے لیے بلوا لیا گیا۔ اب میری سی وی میں کچھ نہیں لکھا تھا۔
انٹرویو لینے والے نے میری سی وی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نوجوان تمہاری سی وی دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے۔ نہ جانے ہمارے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے۔''
''کس بات کا افسوس ہے جناب؟'' میں نے پوچھا۔
''یہی کہ تم نے سوائے تعلیم حاصل کرنے کے اور کچھ نہیں کیا۔'' اس نے کہا۔ ''میاں تعلیم تو ہر شخص حاصل کر لیتا ہے۔ اصل بات ہے ہنرمند ہونا۔ تمہارے پاس کوئی ہنر ہی نہیں ہے۔ اس ملک کو ہنرمند نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہوں اور ہنرمند بھی ہوں۔ ہم نے تو یہی کرائی ٹیریا رکھا ہے۔ افسوس تم کو کچھ نہیں آتا۔ ارے بھائی کم از کم کسی گیرج میں کوئی کام ہی سیکھ لیتے۔ کوکنگ ہی سیکھ لیتے تاکہ جب بھی باہر جانے کا چانس ملے تو اپنی صحت برقرار رکھ سکو۔ سوری میں ایسے جوانوں کو پسند ہی نہیں کرتا ہوں جو صرف اپنی تعلیم پر انحصار کر کے بیٹھ جائیں۔''
میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔
میں نے یہ کیا کہ نوکری کی تلاش ختم کر دی اور دوستوں سے پیسے لے کر ایک چائے خانہ کھول لیا جس کا نام رکھا۔ ''روشن مستقبل چائے ہاؤس۔''
خدا کا شکر ہے کہ اب اچھی خاصی انکم ہونے لگی ہے۔
میری اس کہانی کا مورال یہ ہے کہ اپنے مستقبل کے معاملے میں اگر آپ دوسروں پر بھروسا کرتے رہے تو یہی سب ہوگا جو میرے ساتھ ہوا ہے۔
میں نے تو خیر چائے خانہ کھول لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ سے یہ بھی نہ ہو سکے۔

گمشدہ لڑکی

عکس فاطمہ

کبھی کبھی نادانستگی میں اٹھایا گیا قدم یا غیر معمولی حرکت بہت بھاری پڑ جاتی ہے... ایک ایسے ہی اٹھائے گئے عمل کا ردِ عمل جس کی ہلاکت خیزی نے لمحہ بہ لمحہ سنگین نوعیت اختیار کرلی... اردگرد کے لوگ اس کی لپیٹ میں آتے گئے اور زندگی ان سے روٹھتی چلی گئی...

دوڑتی...... بھاگتی...... رنگ بدلتی دلچسپ کہانی کے سنسنی خیز خونی موڑ

میں اکثر سوچتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی بہت سے انداز سے گزارنے کی کوشش کی لیکن ہوا وہی جو میں نے سوچا نہیں تھا۔

لوگ جب تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں تو سب سے پہلا سوال اُن کے ذہن میں اپنے کیریئر سے متعلق ہوتا ہے۔ کیا کریں؟ کاروبار کے پیسے ہوتے نہیں ہیں۔ کوئی مناسب ملازمت ملتی نہیں ہے۔ کوئی ایسا پروفیشن سامنے ہوتا نہیں ہے جس میں وہ اپنی سروسز دے سکیں۔ جیسے ڈاکٹر،

وکیل، یا استاد وغیرہ۔ لیکن میرے ساتھ یہ ہوا کہ مجھے ایک مشورہ مل گیا جس نے مجھے بہت حد تک سہارا دے دیا۔ وہ مشورہ یہ تھا کہ میں پرائیویٹ سراغ رساں بن جاؤں۔ امریکا میں یہ ایک کامیاب پروفیشن ہے۔ آپ نے تک ویلوٹ کی کہانیاں تو پڑھی ہوں گی۔ کتنا کامیاب سراغ رساں ہے۔ عیش کرتا ہے۔ خیر وہ تو کہانیاں...... لیکن بہت سے ایسے سراغ رساں ہیں جو واقعی کامیاب ہیں۔

شروع شروع میں تو مجھے بھی دشواریاں ہوئیں پھر میرا کام چلنے لگا۔ میرے پاس کیسز آنے لگے۔ میں نے اپنا ایک دفتر بنا لیا۔ ہمارے یہاں کیسز کی نوعیت بہت حد تک ایک جیسی ہوتی ہے۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کے خلاف تحقیقات کرانا چاہتا ہے یا کوئی بیوی اپنے شوہر کی حرکتوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔ اس کے لیے وہ پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کر لیتی ہے۔

اس قسم کے کیسز سیدھے سادے ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی کوئی بڑا معاملہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ اس میں مار پیٹ بھی ہوجایا کرتی ہے۔ جان کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ (فلموں میں ضرور دیکھا ہوگا)

میرا دفتر لاس اینجلس کی ایک شاندار سی بلڈنگ میں ہے۔ میرا نام جانسن سمجھ لیں۔ بلڈنگ شاندار سہی لیکن میرا دفتر بس یونہی سا ہے۔ دو مختصر سے کمروں پر مشتمل۔ پہلا کمرا استقبالیہ ہے جس میں چار پانچ عام سی کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ دوسرا کمرا میں اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ اس کمرے کا فرنیچر بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ ورنہ ایسے بھی سراغ رساں ہیں جن کے دفتر بہت شاندار ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور کلائنٹ منہ مانگی فیس دے دیتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کام زیادہ ہو تو میں اپنے دفتر ہی میں سو جاتا ہوں۔ (ایسا بہت کم ہوتا ہے) اس مقصد کے لیے میں نے ایک کاؤچ بھی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا ہے جس پر لیٹ کر سو جاتا ہوں۔

میں کوئی خوب صورت آدمی تو نہیں ہوں لیکن کچھ خواتین مجھ سے متاثر بھی ہو جاتی ہیں۔ میری ناک چپٹی ہے۔ پہلے سے نہیں تھی لیکن پچھلے سال کسی کیس کے سلسلے میں ایک بدمعاش نے میری ناک کی ہڈی توڑ دی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے لیکن کام آخر کام ہی ہے چاہے ناک کی ہڈی ہی کیوں نہ تڑوانی پڑے۔

یہ کہانی ایک دوپہر سے شروع ہوتی ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے ناخنوں کی صفائی کر رہا تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی باہری کمرے میں تھا۔ میں باہری کمرے کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں کہ شاید کوئی آ ہی جائے۔ ویسے کئی مہینوں سے کوئی نہیں آیا تھا۔

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ کوئی غلطی سے کسی اور دفتر میں جانے کے بجائے میرے دفتر میں چلا آیا ہے لیکن جب کسی نے دروازے پر دستک دی تو پتا چلا کہ کوئی میرے ہی پاس آیا ہے۔

''آجائیں۔'' میں نے آواز لگائی۔

دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر آگئی۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ لانبا قد۔ گہری نیلی آنکھیں۔ شانوں تک بکھرے بال۔ لیکن اس کے چہرے پُر اداسی طاری تھی۔ اس کے شانے سے ایک ہینڈ بیگ لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ جھجک رہی تھی۔ میں نے ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

''مجھے مسٹر جانسن سے ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تشریف رکھیں۔ میں ہی جانسن ہوں۔'' میں نے کہا۔

لیکن وہ بیٹھنے کے بجائے کھڑی رہی تھی۔

''فرمائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ واقعی پرائیویٹ سراغ رساں ہیں؟ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟''

اس کی بات سُن کر غصہ مجھے آگیا تھا۔ میں ذرا تلخ ہو کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں واقعی پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور میرا ہی نام جانسن ہے۔ تم نے دروازے پر میرے نام کا بورڈ دیکھ ہی لیا ہوگا؟''

''جی ہاں، دیکھ لیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اسی لیے آپ سے مدد مانگنے آئی ہوں، پلیز میری مدد کریں۔ میری بہن کہیں غائب ہوگئی ہے اس کو تلاش کر دیں۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو معاملہ یہ ہے کہ تمہاری بہن کہیں غائب ہو گئی ہے اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس کو تلاش کر دوں۔ کیا تم نے پولیس میں رپورٹ کرادی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں پولیس کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

''تمہاری غائب ہو جانے والی بہن کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایلن، ایلن گارفیلڈ۔'' اس نے بتایا۔''میں نے پچھلے سوموار کو اسے اپنے گھر پر کھانے پر بُلایا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ اس کے بعد سے اب تک اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔''

''ہوسکتا ہے کہ اسے تمہارے ہاتھ کے کھانے پسند نہ ہوں اس لیے غائب ہوگئی ہو۔''

''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے مسٹر جانسن۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھنے شروع کر دیے۔ وہ رونے لگی تھی۔''میں اس کے لیے بہت پریشان ہوں۔''

''سوری۔'' میں نے معذرت کی۔

''میں اس کی تلاش میں نیو یارک سے لاس اینجلس آئی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم یہاں نہیں رہتیں؟''

''نہیں، میں نیو یارک میں رہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔''میں اس سے ملنے کے لیے نیو یارک سے آئی ہوں۔ میں نے فون کر کے اسے بتایا کہ میں کس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ وہ میرے پاس آجائے۔ وہ نہیں آئی۔ پھر میں دوسری صبح اس کے دفتر گئی لیکن کسی کو بھی اس کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر کہیں چلی گئی ہے پھر میں اس کے فلیٹ گئی جہاں وہ رہا کرتی تھی لیکن فلیٹ بھی خالی تھا۔ اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ کسی خطرے میں گھری ہو۔ پلیز اسے تلاش کرنے میں میری مدد کریں۔''

''ایک بات بتاؤ۔ تم یہاں پچھلے سوموار کو آئی تھیں۔ تم کو اگلے ہی دن اپنی بہن کی گمشدگی کا پتا چل گیا تھا پھر تم میرے پاس اتنی دیر سے کیوں آئیں؟''

''مسٹر جانسن! یہ تمہارا ایشو نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''اوکے، اب یہ بتا دو کہ تمہاری بہن کا حلیہ کیا ہے۔ یعنی وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟''

''بالکل میری طرح۔ ہم جڑواں ہیں۔'' اس نے بتایا۔''اب تم اپنی فیس بھی بتا دو۔''

''پچاس ڈالر روزانہ۔'' میں نے بتایا۔

''روزانہ پچاس ڈالر اچھے خاصے ہوتے ہیں لیکن مجھے اُمید ہے کہ تم اسے تلاش کرنے میں کوئی کمی نہیں کرو گے۔''

''ظاہر ہے، میں اپنا کام پوری دیانت داری سے کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔''اب تم اپنی بہن کے فلیٹ کا پتا دے دو۔ اس دفتر کا پتا بھی چاہیے جہاں وہ کام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تم مجھے اپنا پتا بھی دو گی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم کو میرے پتے کی ایسی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں خود تمہارے پاس پروگریس معلوم کرنے آجایا کروں گی۔'' اس نے اپنے بیگ سے ڈالرز نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔''یہ کچھ دنوں کی فیس ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ اور کہہ سکتا' وہ میرے دفتر سے چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے ایک کاغذ پر ایڈریس لکھ کر دے دیے تھے۔ میں اسی وقت سے اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ میں نے اس کے دیے ہوئے نوٹ اپنی میز کی دراز میں رکھے۔ اپنے پستول کو چیک کیا۔ میرا خیال تھا کہ فی الحال مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کے بعد دفتر بند کر کے سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے آگیا۔ جہاں پارکنگ میں میری کرسلر کھڑی ہوئی تھی۔

میں کچھ دیر بعد مینسن بلڈنگ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

عمارت پرانی سی تھی۔ ایک شیشے کا دروازہ تھا جس کے گیٹ پر ایک باوردی گارڈ کھڑا ہوا تھا۔

میں شیشے کا دروازہ کھول کر اندر جانے ہی والا تھا کہ گارڈ نے مجھے روک لیا۔''اے مسٹر۔ بات سنو۔''

''کہو کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم اپنی گاڑی اس طرح کھڑی نہیں کر سکتے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ یہاں بلڈنگ میں رہنے والوں کی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ میں اس بلڈنگ میں نہیں رہتا؟'' میں نے کہا۔

''مسٹر، میں یہیں کام کرتا ہوں۔ میری ڈیوٹی اسی گیٹ پر ہوتی ہے۔ میں بلڈنگ میں رہنے والے ہر ایک کو جانتا ہوں۔''

''اوہ، پھر تو تم مس ایلن گارفیلڈ کو بھی جانتے ہو گے۔ میں اسی سے ملنے آیا ہوں۔ اس کے فلیٹ کا نمبر 716 ہے۔''

''ہاں، میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن وہ فلیٹ میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہیں ہے۔ کہیں گئی ہوئی ہے۔"
"کہاں گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"مسٹر! یہ تمہارا بزنس نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی گئی ہو۔" اس نے بہت روکھے پن سے کہا۔
ایسے موقعوں کے لیے ایک نسخہ ہمیشہ میرے کام آیا ہے۔ میں نے اسی کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی جیب سے پانچ ڈالر کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
"جاؤ، یار تھوڑی دیر کے لیے کہیں گھوم پھر کر آؤ۔"
"نہیں مسٹر، میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"
میں نے پانچ ڈالر کا ایک اور نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس بار وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اب میں ایلن گارفیلڈ کے فلیٹ کے دروازے پر تھا۔
میں نے دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ کچھ بھی نہیں۔ بالکل خاموشی۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں۔ میں نے اپنی جیب سے پلاسٹک کا ایک ٹکڑا نکال کر اپنے طریقے سے دروازہ کھول لیا۔
بہت اچھا اور ماڈرن قسم کا فلیٹ تھا۔ ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کمرے بھی دیکھ لیے۔ صاف ستھرے بستر۔ کہیں سے بھی افراتفری کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ کچن میں بھی اسی قسم کی صفائی تھی۔ سارے برتن دھلے ہوئے تھے جو شخص اچانک غائب ہو جائے وہ اتنی صفائی وغیرہ کا جھنجٹ نہیں کرتا۔ لیکن وہاں ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔
میں نے ایک نظر اور کمروں کا جائزہ لیا۔ لیکن ایسی کوئی چیز سامنے نہیں آئی جو ایلن کی گمشدگی کا سراغ دے سکتی۔ میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ دروازے کے باہر ہی دو آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک گھٹے جسم اور چھوٹے قد کا تھا جبکہ دوسرا لانبا اور ستواں ناک والا تھا۔ اسی لانبے کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ یقیناً میری ہی طرف تھا۔
میں نے واپس ہو کر دروازہ بند کرنا چاہا لیکن چھوٹے قد والے نے اپنا ایک پیر اڑا دیا۔ دروازہ بند نہیں ہو سکا اور میرے ساتھ وہ دونوں بھی اندر آ گئے۔
"چلو ہاتھ اوپر کرو۔" لانبے نے حکم دیا۔
میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔
لانبے نے چھوٹے کو حکم دیا کہ میری تلاشی لی جائے۔ چھوٹا میری طرف آیا۔ مجھے اسی موقع کی تلاش تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کے بازو کو جھٹکا دے کر اسے اپنے آگے کر لیا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ اب لانبا گولی چلانا بھی چاہتا تو نہیں چلا سکتا تھا۔
"چلو، میرے راستے سے ہٹ جاؤ" میں نے کہا۔
اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ لانبے نے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے قہقہوں نے مجھے ذرا سی دیر کے لیے اس چھوٹے سے غافل کر دیا تھا۔ اسی وقت ایک زوردار گھونسا میرے چہرے پر پڑا۔ میں فرش پر گر گیا۔
لانبے نے پھر دوسرا گھونسا جڑ دیا۔ کچھ دیر بعد میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک یہ کیفیت رہی ہوگی۔ آہستہ آہستہ جب حواس بحال ہوئے تو اندازہ ہوا کہ میں ایلن کے فلیٹ کے دروازے کے باہر لیٹا ہوا ہوں۔ ان دونوں کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اور کوریڈور میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لیا۔ سر میں دھمک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔
میں اپنے کپڑے درست کر کے نیچے آ گیا۔ وہ گارڈ بھی نہیں تھا۔ میری گاڑی اپنی جگہ کھڑی تھی۔
کچھ دیر بعد میں اپنے آفس میں تھا جہاں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ "ہیلو۔" میں نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔
"جانسن بول رہا ہوں۔"
"سنو جانسن، جو کچھ بھی ہوا ہے اسے بھول جاؤ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ایلن کا خیال چھوڑ دو۔ ورنہ اگلی بار ہلکا ہاتھ نہیں رکھا جائے گا۔"
"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔
لیکن فون بند ہو چکا تھا۔
میں گھر واپس آ گیا۔ اس دن کی بھاگ دوڑ کا کوٹا پورا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ سر کا درد بھی برقرار تھا۔ میں اس رات بے خبر ہو کر سویا تھا۔ صبح سر کا درد بہت کم ہو چکا تھا۔ گرم پانی کے غسل نے طبیعت اور بشاش کر دی۔ اس کے بعد تیار ہو کر کام کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک ریسٹوران سے ناشتا کیا اور مائر کے دفتر پہنچ گیا۔ یہ وہ دفتر تھا جہاں ایلن کام کرتی تھی جس کا پتا اس کی بہن نے لکھ کر دیا تھا۔
دفتر اچھا تھا۔ کچھ دیر بعد میں مسٹر مائر کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پچاس پچپن کی عمر کا ایک مہربان انسان تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا مس ایلن آپ ہی کے یہاں کام کرتی ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے اپنی گردن ہلائی۔ "لیکن وہ پچھلے سوموار سے دفتر نہیں آئی ہے، تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"مجھے اس کی بہن نے اس کا سراغ لگانے کے لیے ہائر کیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "وہ اس کے لیے بہت پریشان ہے۔"

"ہونا بھی چاہیے۔ ہم لوگ بھی پریشان ہیں کہ دفتر کیوں نہیں آرہی ہے؟"

"وہ کس کے ساتھ کام کرتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کرتی تھی سے کیا مراد ہے؟ کیا وہ اس دنیا میں نہیں رہی؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ غائب ہونے سے پہلے وہ کس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اس کے کمرے میں کون ہوتا تھا؟"

"سوزی نام کی ایک لڑکی ہے۔" ہائر نے بتایا۔ "وہ اسی کوریڈور کے آخری کمرے میں ہوگی۔"

میں ہائر کا شکریہ ادا کر کے اس کے کمرے سے باہر آگیا۔

سوزی ایک مہربان اور نرم طبیعت والی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا تم ہی سوزی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں ہی سوزی ہوں، فرمائیں؟"

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری دوست ایلن کے بارے میں کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایلن کے بارے میں؟" اس کی مسکراہٹ ایک دم سے غائب ہوگئی پھر اس نے کہا۔ "ہم یہاں اس دفتر میں ایلن کے بارے میں بات نہیں کر سکتے۔" اس نے کہا۔

"میں نے تمہاری بلڈنگ کے سامنے ایک کافی ہاؤس دیکھا ہے۔ ہم کچھ دیر وہاں بیٹھ سکتے ہیں۔"

"آئیڈیا بُرا نہیں ہے۔" وہ مسکرادی۔ "لیکن مسٹر ہائر شاید یہ پسند نہ کریں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ ہم دونوں گہرے دوست ہیں۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"ایلن کی جڑواں بہن ہیلن اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کہیں غائب ہوگئی ہے یا کسی خطرے میں ہے۔ وہ پچھلے سوموار کو تمہارے آفس بھی اس کے بارے میں معلوم کرنے آئی تھی۔

"ایلن پچھلے سوموار کو اچانک دفتر سے بغیر کچھ بتائے کہیں چلی گئی تھی اور جہاں تک اس کی جڑواں بہن کے دفتر آنے کی بات ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی... بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی کوئی جڑواں بہن بھی ہے۔"

"ایلن کی جڑواں بہن نیویارک میں رہتی ہے۔" میں نے بتایا۔ "تم یہ بتاؤ۔ اس نے دفتر سے جانے کی کوئی وجہ تو بتائی ہوگی؟"

"ہاں اس نے کہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہو رہی۔ وہ جا کر آرام کرے گی۔"

"کیا اس کے لیے کسی کا کوئی پیغام یا فون وغیرہ آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے ایسی کوئی بات یاد...... ہاں شاید کوئی فون آیا تھا جس کے بعد ہی وہ دفتر سے چلی گئی تھی۔"

"کیا کوئی اندازہ ہے کس کا فون ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے کسی کا فون سننے کی عادت نہیں ہے۔"

"کیا تم اس کی کسی دوست کے بارے میں جانتی ہو؟ کوئی مرد یا عورت۔"

"نہیں، میں کسی کے بارے میں نہیں جانتی۔ بس ہم دونوں ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم ڈانس کرنے چلے جایا کرتے تھے۔"

"کیا تم یہ بتا سکتی ہو کہ پچھلی بار تم اور ایلن کہاں گئے تھے اور وہاں کیا ہوا تھا؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے اپنی گردن ہلائی۔ "کیانہ کلب گئے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان ہلکی سی بحث بھی ہوگئی تھی۔"

"کیسی بحث؟"

"رات بہت ہوگئی تھی۔ میں واپس جانا چاہتی تھی لیکن ایلن رکنا چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کو ایک دوست سے ملاقات کرنی ہے جو بہت اچھا آدمی ہے۔"

"کون تھا وہ دوست؟"

"میں نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح کسی پر بھروسا کر لینا اچھا نہیں ہے لیکن وہ مجھ سے جھگڑا کرنے لگی تھی۔ اس کے بعد سے ہم ایک ساتھ کسی کلب میں نہیں گئے۔"

"کیا تم اس کے اس دوست کا نام بتا سکتی ہو؟" میں

نے پوچھا۔
''کیوں نہیں، اس کا نام بینی گریپ ہے۔'' اس نے بتایا۔
''آج رات تم کیا کر رہی ہو؟''
''آج رات میں اپنے دوست کا میچ دیکھوں گی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ایک باکسر ہے۔''
میں نے کافی کے پیسے ادا کیے اور ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔ کیا قسمت ہے۔ سوزی کا دوست ایک باکسر تھا۔

☆☆☆

آپ نے کسی کلب کو دن کے وقت شاید نہ دیکھا ہو۔ نحوست ہی برستی ہے۔ اجاڑ، ویران۔ ایسے مقامات کی اصل رونق رات میں ہوا کرتی ہے جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں رقص کے لیے آتے ہیں۔ بہرحال وہ کلب بھی ویران تھا، میں نے دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ دروازہ تو نہیں کھلا لیکن سائڈ کی ایک کھڑکی ضرور کھل گئی۔
''کیا بات ہے، کیا چاہتے ہو؟ کلب رات دس بجے کھلتا ہے۔''
''میں جانتا ہوں دوست۔ لیکن مجھے بینی گریپ نام کے ایک آدمی کی تلاش ہے۔'' میں نے کہا۔
''میں کسی بینی گریپ کو نہیں جانتا۔'' اس نے جواب دیا۔
وہ کھڑکی کا پٹ بند ہی کرنے والا تھا کہ وہی نسخہ کام آ گیا۔ میں نے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ یہ نسخہ ہمیشہ کی طرح آج بھی کام آ گیا۔ اس نے مجھے بینی گریپ کا پتا ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔
بینی گریپ جس علاقے میں رہتا تھا وہ ایک خستہ حال علاقہ تھا۔ یہاں قدیم طرز کی عمارتیں بنی ہوئی تھیں اور وہ عمارت اور بھی زیادہ تباہ حال تھی جس میں اس کا قیام تھا۔
اس بلڈنگ کے گارڈ کو بھی پانچ ڈالر کا نوٹ دینا پڑا تھا۔ تب جا کر اس نے بینی کے اپارٹمنٹ کا نمبر بتایا تھا۔ وہ پانچویں منزل پر تھا۔
میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہیں۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ خاموشی۔ میں نے دروازے پر ہاتھ لگایا وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ یعنی دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔
کچھ دیر انتظار کے بعد میں اندر داخل ہو گیا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ بہت گندہ۔ ایک کھانے کی میز تھی جو گندے برتنوں سے بھری ہوئی تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا جو اس کے کمرے کا ہو سکتا تھا۔
میں نے رک کر آواز دی اور کوئی جواب نہ ملنے پر کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرا خالی تھا۔ اس کمرے میں ایک واش روم بھی تھا۔ میں اس میں داخل ہوا۔ سامنے ہی نہانے کا ٹب تھا اور بینی گریپ کی لاش اس ٹب میں ڈوبی ہوئی تھی۔
ایک نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ ٹب کے کنارے سے باہر جھول رہا تھا۔ اس میں ایک انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ ٹب کا پانی سرخ ہو رہا تھا۔ اسے گولی ماری گئی تھی۔
میں نے قریب جا کر... لاش کا معائنہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق اسے مرے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب میرا کام کیا تھا۔
میں نے اپنے جوتوں کے نشانات مٹائے۔ ہر اس چیز کو صاف کیا جس سے اندیشہ ہو کہ میری انگلیوں کے نشانات رہ گئے ہوں۔ بڑے کمرے میں ایک فون بھی تھا۔ میں نے اس پر پولیس کے نمبر ملا دیے۔ ''ہیلو۔'' میں نے پولیس کو اس اپارٹمنٹ کا نمبر بتا دیا۔ ''یہاں ایک لاش باتھ ٹب میں پڑی ہوئی ہے۔''
''ہوں، تم کون ہو؟''
میں نے اپنا نام بتا دیا۔
''ٹھیک ہے تم وہیں رکو۔ اور کسی چیز کو چھونا نہیں۔ ہم دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔''
پولیس کے آنے سے پہلے مجھے کچھ اور تلاشی لینی تھی۔ کمرے میں ایک طرف بینی کا کوٹ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں کچھ نوٹ تھے۔ دوسری جیب میں اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا جس پر اس کی تصویر چپکی ہوئی تھی۔ اس کا نام بھی لکھا تھا اور یہ وہی تھا جس کی لاش باتھ ٹب میں تھی۔
میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اب مجھے پولیس کا انتظار تھا۔ دس منٹ کے اندر ہی پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی چلی آئی تھی۔ پھر لکڑی کی سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ پولیس والے آ گئے ہیں۔
وہ دو تھے۔ ایک کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ دوسرا پچیس برس کا ہو گا۔
میں ان کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''لاش کہاں ہے؟'' ایک نے پوچھا۔
میں نے واش روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ دونوں

اندر چلے گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔کچھ دیر بعد دونوں باہر آ گئے۔

"کیوں بھائی، کیوں مارا ہے تم نے اس کو؟" ایک نے پوچھا۔

"میں نے مارا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم پوچھ رہے ہیں کہ تم نے اپنے دوست کو کیوں مارا؟" نوجوان پولیس والے نے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ میں نے نہیں مارا۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں دکھائی دے رہے ہو؟" بڑے والے نے پوچھا۔

"میرا نام جانسن ہے۔ میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔" میں نے بتایا۔ "میں اپنے ایک کلائنٹ کے لیے بینی گریپ سے بات کرنے آیا تھا۔دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں آواز دینے کے بعد اندر آ گیا۔ یہاں میں نے غسل خانے میں اس کی لاش دیکھی۔"

"تمہارے کلائنٹ کا کیا تعلق تھا اس سے؟ اس کے علاوہ کہاں ہے تمہارا کلائنٹ؟"

"سوری، تمہارے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا۔ یہ میرا فرض ہے۔ ویسے ایک بات ضرور بتاؤں گا کہ میرے کلائنٹ کا کوئی تعلق بینی کی موت سے نہیں ہے۔"

نوجوان پولیس والا ناراض ہونے لگا تھا کہ دوسرے نے کہا۔ "آرام سے۔ تم یہیں رہو۔ میں مسٹر جانسن کو پولیس اسٹیشن لے جا رہا ہوں۔"

دس منٹ کے بعد مجھے ایک لاک اَپ میں بند کر دیا گیا۔ یہ ایسا ہی لاک اَپ تھا جیسا ہر پولیس اسٹیشن میں ہوا کرتا ہے۔ بے آرام، بے سکون۔

میرے ساتھ بھی کیا کہانی ہوئی تھی لیکن زیادہ دکھ اس لیے نہیں تھا کہ میرا پروفیشن ہی ایسا تھا۔ اگر آپ بھی پرائیویٹ سراغ رساں ہیں تو کسی بھی حادثے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیں۔

خیالات کا ایک ریلا تھا جس میں میرا ذہن بہہ رہا تھا۔ اس کمرے میں ایک بینچ پڑی ہوئی تھی۔ کچھ یاد آ رہا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ یاد آیا کہ میں جس وقت ایلین کے فلیٹ میں تھا، اس وقت دو غنڈے آئے تھے جنھوں نے میری ٹھکائی کی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں اس فلیٹ میں ہوں۔ یہ بات یقینی طور پر ایلین کی بلڈنگ کے گارڈ نے بتائی ہو گی۔

اس پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد مجھے اس گارڈ سے بات کرنی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک پولیس والا کمرے میں داخل ہوا۔ "کھڑے ہو جاؤ۔"

میں کھڑا ہو گیا۔

"چلو میرے ساتھ۔ سارجنٹ مرفی تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

طویل کوریڈور سے گزر کر ہم سارجنٹ مرفی کے کمرے میں آ گئے۔ وہ پچاس کے لگ بھگ ایک مضبوط جسم والا انسان تھا۔ اس کے چہرے سے کرختگی ظاہر تھی۔ اس نے پولیس کے محکمے میں برسوں گزار دیے تھے اور وہ پرائیویٹ سراغ رسانوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔

وہ چند لمحوں تک اپنی تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا جبکہ میں اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آخرکار سوال داغ ہی دیا۔ "تم بینی کے اپارٹمنٹ میں کیا کر رہے تھے؟"

"مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔" میں نے بتایا۔

"تم نے اسے کیوں مارا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اس کو وہی سب کچھ بتا دیا جو میں پہلے بتا چکا تھا۔

"تمہارا کلائنٹ کون ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"سوری، میں یہ نہیں بتا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ بینی کی موت سے میرے کلائنٹ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ تم بہت کچھ جانتے ہو اور مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"میں جو کچھ بھی جانتا تھا، وہ تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" وہ دہاڑا۔ "اٹھو اور نکلو یہاں سے۔"

"کیا میں گھر واپس جا سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، تم ابھی لاک اَپ میں رہو گے۔"

مجھے ایک بار پھر لاک اپ میں پہنچا دیا گیا جہاں مجھے سوچنے کا موقع مل گیا تھا۔ کچھ یاد آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ وہ کیا تھی۔ وہی یاد نہیں آ رہا تھا۔ شام کے پانچ بج گئے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں بدستور لاک اَپ ہی میں تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پانچ بجے لاک اپ کا دروازہ کھلا اور مرفی داخل ہوا۔
''جاؤ، دفع ہو جاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔ ''تم گھر جا سکتے ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا ارادہ بدل لوں تم یہاں سے چلے جاؤ۔''
اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا ارادہ بدل لیتا میں اس پولیس اسٹیشن سے فوراً باہر چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر مرفی نے مجھے چھوڑ... کیوں دیا تھا۔
میری گاڑی باہر ہی کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا۔ زرد رنگ کی ایک گاڑی میری گاڑی کا پیچھا کر رہی تھی۔ میں نے رفتار تیز کی وہ گاڑی پیچھے لگی رہی۔ میں ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ وہاں سے پھر مین روڈ پر آ گیا۔ وہ گاڑی بدستور تعاقب کرتی رہی تھی۔
سمجھ میں آ گیا کہ مرفی نے مجھے جانے کی اجازت کیوں .... دی تھی۔ کوئی پولیس والا اس کے حکم پر میرا تعاقب کر رہا تھا کہ میں کہاں کہاں جاتا ہوں۔ کس کس سے ملتا ہوں وغیرہ۔ مجھے دیر ہو چکی تھی۔ ہیلن نے پانچ بجے آنے کو کہا تھا۔ میں اب سیدھے اپنے دفتر کی طرف آ گیا۔ زرد رنگ کی گاڑی ابھی تک پیچھے تھی۔
میں نے پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی اور ایک نظر دوسری گاڑی پر ڈالی۔ وہ بلڈنگ کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ میں تیز رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے دفتر آیا۔ کوئی نہیں تھا البتہ میز پر کاغذ کا ایک پرچہ ضرور تھا جس پر لکھا تھا۔ ''مسٹر جانسن! میں آئی تھی۔ ایک بہت ضروری بات کرنی تھی لیکن تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اب میں رات گیارہ بجے کبانہ میں ملوں گی۔''
میں نے پرچہ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔
گیارہ بجنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس سے پہلے مجھے اس گارڈ سے ملنا تھا جس نے ان بدمعاشوں کو ہیلن کے فلیٹ کی راہ دکھائی تھی۔ لیکن اس سے پہلے مجھے اس گاڑی سے نجات حاصل کرنی تھی جو کسی بلا کی طرح اب بھی میرے تعاقب میں تھی۔ میں نے گاڑی کو کئی گلیوں اور سڑکوں سے گزارا اور آخر کار نجات مل ہی گئی۔ لیکن نجات ملنے کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہوا۔ وہ زرد گاڑی میری گاڑی کے تعاقب میں رہی۔
ایک سگنل پر ایسا ہوا کہ میری گاڑی نکل گئی اور وہ زرد گاڑی پھنس گئی۔ لیکن اس پر بھی انہوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ سگنل توڑ کر آگے نکل آئی اور اسی وقت ایک ٹریفک سارجنٹ نے اس گاڑی کو روک لیا۔ یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔
زرد گاڑی میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمی ٹریفک والے سے کچھ بحث کرنے لگے لیکن میں اتنی دیر میں بہت آگے نکل چکا تھا۔
لیکن شاید اس دن واقعات ہی لکھے ہوئے تھے۔ میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب میں نے ایک بار پھر اس زرد گاڑی کو دیکھا۔ ممکن ہے ٹریفک والے نے انہیں چھوڑ دیا ہو۔
میں نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اچانک ایک کتا میری گاڑی کے سامنے آ گیا۔ میں نے ایک زوردار بریک لگا دی۔ گاڑی کے ٹائر چیخ اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور زوردار بریک کی آواز آئی اور ایک دھچکا سا لگا۔
زرد گاڑی میری گاڑی کے پچھلے بمپر سے ٹکرا گئی تھی۔ میری کریسلر پرانی لیکن ٹھوس تھی جبکہ وہ زرد گاڑی جدید انداز سے ہلکی پھلکی بنائی گئی تھی۔ ان دونوں کو تو کچھ نہیں ہوا لیکن وہ گاڑی پچک کر رہ گئی۔
میں اپنی گاڑی سے اُتر کر زرد کار کی طرف آیا۔ وہ دونوں ہکا بکا سے بیٹھے تھے۔ میں نے جھک کر کہا۔ ''شریف انسانو...! گاڑی احتیاط سے چلایا کرو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ میری گاڑی کا زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔''
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر سکتے میں اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں زرد گاڑی کو دھکا دے کر ایک سائڈ میں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں مینسن بلڈنگ میں تھا۔ یہ وہی عمارت تھی جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی۔
بلڈنگ کا گارڈ اپنی جگہ نہیں تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے ایک کمرا تھا جس پر لکھا تھا گارڈ روم۔ میں نے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ گارڈ اپنی کرسی پر سو رہا تھا۔
میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی میز پر ایک پرچہ نظر آیا۔ اس پر ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ وہ فون نمبر کبانہ کلب کا تھا۔
وہی کبانہ کلب جس کا پتا مجھے ہیلن نے دیا تھا۔
یہ ایک بڑا سراغ تھا۔ میں نے وہ پرچہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ اب مجھے کبانہ کی طرف جانا تھا۔
میں سمجھ گیا تھا کہ جن دو آدمیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا ان کا تعلق کبانہ ہی سے تھا۔ گارڈ کے پاس اس کلب کا فون نمبر بھی بتا رہا تھا اور یہ وہی کلب تھا جہاں ہیلن اپنی دوست کے ساتھ ڈانس کے لیے جایا کرتی تھی۔

میں نے اپنی گاڑی کلب سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور کلب کی طرف چل پڑا۔ ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ تیز بارش تھی۔ میں نے کلب کے بند دروازے پر دستک دی۔

دروازے کی کھڑکی کھلی۔ کسی نے جھانک کر دیکھا پھر دروازہ کھل گیا۔

اب ماحول کچھ اور تھا۔ ہلکی موسیقی ہو رہی تھی۔ ڈانسنگ فلور پر کچھ لوگ رقص کر رہے تھے۔ نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نیم تاریک میز منتخب کی۔

ٹھیک گیارہ بجے ہیلن داخل ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہلایا اور میری میز پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا بیگ میز پر رکھ دیا تھا۔

''مسٹر جانسن۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''میں تمہیں تمہارے کام کے پچاس ڈالر روزانہ کی بنیاد پر دے رہی ہوں اور تم وعدہ کر کے بھی اپنے آفس میں نہیں تھے۔ کہاں تھے تم؟''

میں نے ایک گہری سانس لی۔

''یہ ایک طویل کہانی ہے مس ہیلن۔ پہلے ہم کچھ پی لیں اس کے بعد سب بتاتا ہوں۔'' میں نے ویٹر کو آرڈر دے دیا۔

''ہاں اب بتاؤ۔'' اس نے کہا۔

''تمہارے کیس کے سلسلے میں میری زندگی داؤ پر لگ گئی تھی۔ وہ مجھے مارنے والے تھے اور یہ اس وقت ہوا جب میں تمہاری بہن کے اپارٹمنٹ گیا تھا۔ اب یہ بتاؤ۔ کیا تمہیں یہ بینڈ پسند ہے جو اس وقت اسٹیج پر پرفارم کر رہا ہے؟''

''یہ کیسا سوال ہے؟''

''یونہی پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ یہاں جوڈر مرتھا، اس کا قتل ہو چکا ہے۔ کیا تم اس کو جانتی تھیں۔ بنی گریپ نام تھا اس کا۔''

''اوہ مائی گاڈ......!'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں، میں نہیں جانتی۔''

''تو وہ مر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔ اس کے بعد اس کو ساری کہانی بتا دی کہ میرے ساتھ کیا کیا ہوا تھا۔ کس طرح میں پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا اور پھر پولیس والوں نے میرا تعاقب کیا تھا اور میں کس طرح ان سے جان چھڑا کر یہاں پہنچا ہوں۔''

اس کا سارا تناؤ ختم ہو چکا تھا۔

''اب میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم ہر سوال کا ٹھیک جواب دو گی۔''

''ہاں پوچھو۔''

''اپنی گمشدہ بہن کے بارے میں سب بتا دو۔''

''میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ کیونکہ وہ یہاں لاس اینجلس میں رہ رہی تھی۔''

''اور یہ بھی درست ہے کہ تم اس شہر سے ناواقف ہو۔ تم اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتیں۔''

''یہ بھی درست ہے۔''

''تم کو ایلن کے آفس کا پتا معلوم تھا۔ تم وہاں اپنی بہن کے بارے میں پوچھنے گئی تھیں اور تم نے مسٹر مائر سے بات کی تھی۔ وہاں کام کرنے والی ایک لڑکی سوزی ہے۔''

''نہیں، میں نے مسٹر مائر سے بات کی تھی۔''

''مس ہیلن۔ میں نے جب تمہاری بہن کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی تو مجھے ایک بات کھٹکنے لگی۔ اس فلیٹ میں تمہاری بہن کے کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے۔ جیسے وہ اپنے سارے جوڑے لے کر کسی پلاننگ سے گئی ہو۔ اچانک غائب ہو جانے والے تو افراتفری میں سب چھوڑ جاتے ہیں۔''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''اب ایک آخری سوال پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں پوچھو۔''

''تم نے اس ملاقات کے لیے اس کلب کا انتخاب کیوں کیا؟''

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ''میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا میں تمہارے لیے ایک ڈرنک اور منگوا لوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں آرڈر دے دو۔'' اس نے کہا اور لیڈیز روم کی طرف چل دی۔

رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ لوگ رقص کر رہے تھے اور مجھے اس سوال کے جواب کا انتظار تھا کہ ہیلن نے ملنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا تھا۔

دس منٹ ہو گئے، پندرہ منٹ ہو گئے۔ بیس منٹ گزر گئے لیکن وہ واپس نہیں آئی۔

پھر کچھ سوچ کر میں کلب کے انٹرنس پر آگیا۔ یہاں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک گارڈ کھڑا تھا۔
میں نے ہیلن کا حلیہ بتاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ اس نے بتایا۔ ''یس مسٹر۔ اس حلیے کی لڑکی بیس منٹ پہلے یہاں سے جا چکی ہے۔''
''لڑکیاں تو اور بھی گئی ہوں گی۔ تمہیں کیسے یاد رہ گئی؟''
''کیونکہ میں ہی اس کے لیے ٹیکسی لے کر آیا تھا۔''
اس نے بتایا۔
آخر کیوں؟ ہیلن اس طرح کیوں چلی گئی تھی۔ وہ کس سوال کے جواب سے گریز کر رہی تھی۔ کئی سوالات تھے۔ اسی دوران میں نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اسٹیج سے ہوتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔
میں نے اس آدمی کو پہچان لیا تھا۔ وہ جو تھا۔ وہی جس کو میں نے ایک لانبے آدمی کے ساتھ ایلن کے اپارٹمنٹ میں دیکھا تھا جس نے مجھے گھونسا مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی زہریلی مسکراہٹ تھی جو اس دن اس کے ہونٹوں پر تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک اور آدمی اس کو کراس کرتا ہوا تیزی سے میری طرف آرہا تھا۔
اب میں وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ میں نے دو قدم بڑھائے تھے کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ ''ایکسکیوز می سر۔''
میں نے اپنے قدم تیز کر لیے۔ اس نے پھر آواز دی۔ ''ایک منٹ بات سنیں۔''
مجھے رکنا پڑا۔ دوسرا آدمی میرے پاس آگیا۔
''سر، آپ نے اپنا بل ادا نہیں کیا ہے۔''
مجھے یاد آیا کہ میں نے واقعی اپنا بل ادا نہیں کیا تھا۔ میں نے جلدی سے جیب سے دس ڈالر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ''بقیہ تم رکھ لینا۔''
میری طرف آنے والا جو ابھی بھی کچھ فاصلے پر تھا۔ میں اتنی دیر میں دروازے سے گزر کر باہر جا سکتا تھا۔ لیکن اس کم بخت ویٹر نے ایک بار پھر روک لیا۔ ''سوری سر، آپ کے بارہ ڈالر بنتے ہیں۔''
میں نے پانچ ڈالرز اور اس کی طرف بڑھا دیے۔
''چلو باقی تم رکھ لینا۔''
میں دروازے سے باہر نکل گیا۔ لیکن دروازے کے عین سامنے جو کا لانبا ساتھی اس انداز سے کھڑا ہوا تھا جیسے اسے میرا ہی انتظار ہو۔
میں اب کسی طرف نہیں جا سکتا تھا۔

☆☆☆

آگے وہ لانبا تھا اور میرے پیچھے جو کھڑا تھا۔
اس وقت میں نے ایک ایسی حرکت کی جو ان کے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ میں تیزی سے جو کی طرف لپکا۔ اور میں نے جو کے کاندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر تھرکنا شروع کر دیا۔ میں جو کو لے کر ڈانس کرنے لگا۔ وہاں دوسرے بھی ڈانس کر رہے تھے۔
میں نے لانبے کی طرف دیکھا وہ بے بسی اور حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک جو نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکال کر میری کمر سے لگا دیا۔ ''بند کرو یہ مسخرہ پن۔ ورنہ میں یہ چاقو تمہارے بدن میں اتار دوں گا۔''
آس پاس کے لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھنے لگے تھے۔ میں نے اپنا ایک پیر اٹھایا اور پوری قوت سے ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ ایک دردناک چیخ کے ساتھ فرش پر گر پڑا۔ لانبا میری طرف بڑھا آرہا تھا۔ اس کا غصے سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
میں نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ بہت سے لوگ میزوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ فرش بہت چکنا ہو رہا تھا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن میں فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ ایک میز مجھ پر الٹ گئی۔ کھانا اور نہ جانے کیا کیا مجھ پر گر پڑا تھا۔
میں نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ سامنے کچن کا دروازہ تھا۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ لانبا اور چھوٹا دونوں قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے کچن میں داخل ہوتے ہی دروازہ زور سے بند کر دیا۔
اب سامنے سے تین کک اپنے ہاتھوں میں لانبا سا چھرا لیے میری طرف چلے آرہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان سے بھڑ جاؤں لیکن یہ میری حماقت ہوتی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک چولھے پر فرائی پان میں گرم سوپ رکھا ہوا تھا۔
میں نے وہی سوپ ان تینوں کی طرف پھینک دیا۔ تینوں بُری طرح چیخنے لگے۔ اسی دوران وہ لانبا اور چھوٹا دونوں کچن میں داخل ہو چکے تھے۔
لانبے کے ہاتھ میں ایک پستول بھی تھا۔ اس نے افراتفری میں گولی چلا دی۔ ایک دھماکا ہوا اور ایک باورچی بری طرح چیختا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ لانبے کی چلائی ہوئی گولی اس کی ایک ٹانگ میں لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں سنبھل سکتے میں نے ایک طرف رکھے ہوئے گندے برتن اٹھا کر ان دونوں کی طرف پھینکنے شروع کر دیے۔

وہ چیخنے چلانے لگے۔ کچن کا ایک عقبی دروازہ تھا۔ میں کسی طرح اس سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک تاریک گلی تھی۔ میں جتنی تیز رفتاری سے دوڑ سکتا تھا دوڑتا چلا گیا۔ میرے عقب میں آوازیں تھیں لیکن میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

میری گاڑی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

نہ جانے کب ہوش آیا ہوگا۔ سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں۔

''اب کیسے ہو تم؟'' کسی نے کہا۔

میں نے آنکھیں کھول کر بہ مشکل اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک پولیس والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ میں پولیس اسٹیشن میں تھا۔

''کیسے ہو تم؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' میری آواز بہت کمزور تھی۔ ''لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے سر کو کسی نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہو۔''

''تم خوش قسمت ہو کہ ابھی تک زندہ ہو۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ کسی گاڑی نے تمہیں مارنے میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی۔ تم گولڈن ڈرائیو کے پاس سڑک کنارے بے ہوش پڑے تھے۔''

گولڈن ڈرائیو وہ سڑک تھی جس پر وہ کلب کبانہ واقع تھا۔

''میں گولڈن ڈرائیو کیسے پہنچ گیا؟''

''ہمیں ایک فون ملا تھا کہ کبانہ کلب میں کسی پاگل شخص نے گھس کر توڑ پھوڑ مچا دی ہے۔ فرنیچر اور کراکری توڑ دی ہے۔ ہم پولیس کی موبائل لے کر وہاں پہنچ گئے لیکن وہ پاگل شخص فرار ہو چکا تھا۔ ہم واپس آ رہے تھے کہ ہم نے تم کو سڑک کنارے پڑا ہوا پایا۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پہلے سے بہت بہتر۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم چل سکتے ہو؟''

''ہاں۔''

''تو پھر آؤ، میرے ساتھ۔'' اس نے کہا۔ ''ایک دوست تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ اسی کوریڈور کے ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں سارجنٹ مرفی موجود تھا۔ اپنے درشت انداز اور کرخت چہرے کے ساتھ۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا لیکن اس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔

''ہاں، اب تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ سب کیا ہے؟ تم کیوں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟ میں ہر بات سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''کہانی صرف اتنی ہے کہ میں بہت دیر تک کبانہ میں بیٹھا رہا تھا۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو میں کلب سے باہر آیا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے سر پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔''

''تم سڑک کے درمیان اس طرح پڑے ہوئے تھے کہ کوئی بھی گاڑی تمہیں کچل سکتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی یا کچھ لوگ تمہیں مارنا چاہتے ہیں۔''

''بہت سے لوگ ہیں۔ ان میں کچھ پولیس والے بھی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم آدھی رات سے پہلے کلب سے باہر آ گئے تھے؟''

''ہاں، میں آدھی رات سے پہلے نکل آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''پھر تو تم نے کلب میں ہونے والا ہنگامہ بھی نہیں دیکھا ہوگا؟''

''کون سا ہنگامہ؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''مصنوعی حیرت کی ضرورت نہیں ہے۔'' مرفی نے کہا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ کلب میں جانسن نام کے ایک آدمی نے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ اس نے دو آدمیوں کو زخمی کرنے کے ساتھ سیکڑوں ڈالرز کا نقصان بھی کیا ہے۔ برتن اور فرنیچر بھی توڑ دیے ہیں۔ وہ پاگلوں کی طرح پورے کلب کو روندر رہا تھا۔''

اب میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

''ایک بات بتاؤ۔'' اب مرفی مسکرا رہا تھا۔ ''کیا اس کلب کا ستیاناس اکیلے تم نے کیا ہے یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

اب میں خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔

''جی جناب۔'' میں فخریہ لہجے میں بولا۔ ''سب میں نے تنہا ہی کیا تھا۔''

''اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہیں اس جرم پر کم از کم چھ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مہینے کے لیے جیل بھیجا جاسکتا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ مسکرا دیا۔
''یس مسٹر مرفی! میں جانتا ہوں لیکن جو کچھ بھی ہوا، وہ میں نے اپنے دفاع میں کیا تھا۔ وہاں میری جان کو خطرہ تھا۔ وہ کلب غنڈوں کا اڈا بنا ہوا ہے۔''
سارجنٹ مرفی نے ایک گہری سانس لی۔ ''مسٹر جانسن! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اس کلب میں بنی گریپ کی موت کی تحقیقات کرنے گئے تھے۔''
اب بتا ہی دینا مناسب تھا۔ ''یس سر، میں اسی لیے گیا تھا۔''
''وہ کلب میری نگاہوں میں بھی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں غیر قانونی کام ہوا کرتے ہیں۔ غنڈے پرورش پا رہے ہیں لیکن اب وقت آگیا ہے کہ تم مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ سب کچھ جو تم جانتے ہو، میں جھوٹ سننا پسند نہیں کروں گا۔''
کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ایلن کے غائب سے لے کر بنی کی موت تک۔ اس کے بعد کلب میں ہونے والے واقعات۔ سب کچھ بتا دیا تھا۔
''ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس بار تم نے سچ بتایا ہے لیکن ایک بات کا وعدہ کرو کہ جو کچھ بھی تمہیں بنی گریپ اور کبانہ کلب کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہو، ہمیں ضرور بتاؤ گے۔''
''ٹھیک ہے سارجنٹ، میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔''
میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پولیس اسٹیشن سے باہر آگیا۔ اپنی گاڑی تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک ٹیکسی کرلی۔ میری کرسلر وہیں کھڑی تھی۔ میں اپنے دفتر آ گیا۔ دفتر میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کوئی خط یا کسی کا پیغام وہاں موجود نہیں تھا۔
بلڈنگ کے نیچے ہی ایک ریستوران تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دے دیا اور اطمینان سے بیٹھ کر سارے واقعات پر غور کرنے لگا۔ اب تک جو بھی ہوا تھا وہ ایک خواب کی طرح تھا۔
مجھے یاد آیا کہ ہیلن نے اچانک اٹھ کر چل دینے سے پہلے کبانہ کے بارے میں کچھ کہا تھا۔
مجھے کچھ اور بھی کرنا تھا۔ ایک فون کال۔
میں نے ریستوران کی فون ڈائریکٹری میں ایلن کے دفتر مائر اینڈ مائر کا نمبر تلاش کیا۔ نمبر جلد ہی مل گیا تھا۔ ''مائر اینڈ مائر۔'' دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔
''سوزی، میں جانسن بول رہا ہوں۔ تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔''
''ہاں پہچان لیا ہے، کیسے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔
''تم یہ بتاؤ کہ تمہارے بوائے فرینڈ کی فائٹ کا کیا ہوا؟''
''وہ یہ فائٹ ہار گیا۔'' اس نے بتایا۔
''تمہارے دوست کی ہار کا سن کر افسوس ہوا۔''
''لیکن اب وہ میرا دوست نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔
''مجھے خوشی ہوئی سن کر۔'' میں نے کہا۔
''لیکن اب میرا ایک اور دوست ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ویٹ لفٹر ہے، بہت زبردست۔''
''چلو ٹھیک ہے۔ رہنے دو اس کو۔ تم اپنے باس مسٹر مائر سے میری بات کروا دو۔ میں نے اسی لیے فون کیا تھا۔''
میں نے ریسیور پر اپنا رومال رکھ دیا۔ اب مائر میری آواز نہیں پہچان سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، میں مائر بول رہا ہوں۔''
''مسٹر مائر! میں پولیس ڈپارٹمنٹ سے سارجنٹ مرفی بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔
مجھے یقین تھا کہ وہ میری آواز پہچان نہیں سکے گا، ایسا ہی ہوا۔ ''ہاں سارجنٹ، کہو کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ پچھلی سوموار کو ایلن کی بہن ہیلن اپنی بہن کو تلاش کرتی ہوئی دفتر میں آئی تھی؟''
''نہیں، میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایلن کی کوئی بہن بھی ہے۔''
''شکریہ۔'' میں نے فون بند کر دیا۔
ریستوران سے اپنے آفس پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔
''ہیلو۔'' میں نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی، اس کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز اسی چھوٹے قد کے غنڈے جو کی تھی۔
''جانسن! ایلن جہاں بھی ہے۔ تم ہمیں اس کا پتا بتاؤ گے۔ ہم دس منٹ میں تمہارے آفس پہنچ رہے ہیں۔ کہیں غائب ہوجانے کی کوشش مت کرنا۔ تم ہم سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے ہو، ہمارا انتظار کرو۔''
فون بند ہوگیا اور میں سُن ہو کر رہ گیا اور اسی وقت فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ میں نے بڑی بے دلی سے ریسیور اٹھایا ''ہیلو۔''
دوسری طرف سے ایک غراتی ہوئی آواز آئی۔ میں

نے اس آواز کو بھی پہچان لیا تھا۔ وہ سارجنٹ مرفی تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ ”جانسن تم نے ایلن کی بہن کا نام ہیلن بتایا تھا جو نیویارک میں رہتی ہے۔ تم نے اس کا پتا بھی دیا تھا۔“

”جی جناب۔“

”نیویارک پولیس نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا ہے اور پتا یہ چلا کہ اس نام کی کسی لڑکی کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس پتے پر کوئی ہیلن نہیں رہتی۔ تم نے ایک بار پھر جھوٹ بولا ہے۔ تم اپنے دفتر ہی میں رہنا۔ پولیس کی گاڑی تمہیں لینے آرہی ہے۔ کہیں بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔“

میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ اب کیا ہوگا۔ ایک طرف سے پولیس آرہی تھی اور دوسری طرف وہ کم بخت جو آرہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ان دونوں سے کیسے نمٹوں؟ کیا کہوں؟ اسی دوران فون کی گھنٹی پھر بول اٹھی۔

اب میں فون اٹھاتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

گھنٹی جب مسلسل بجتی رہی تو میں نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی، اس کو بھی میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ ہیلن تھی۔

وہی ہیلن جس کی وجہ سے یہ ہنگامے شروع ہوئے تھے۔

”ہیلو۔“ میں نے کہا۔

”جانسن! مجھے تم سے ضروری ملنا ہے اسی وقت۔“

”مجھے بھی تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر پانچ منٹ میں کیفے مان پہنچ جاؤ۔ تم نے تو دیکھا ہی ہوگا۔ تمہارے دفتر کے پاس ہی ہے۔“

”اتنی جلدی تو آنا مشکل ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیونکہ میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”میں نے کہا نا کہ میرے پاس صرف پانچ منٹ ہیں، ورنہ.....“ اس نے فون بند کر دیا تھا۔

میں ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ اب کیا کروں؟

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ ہیلن ہی سے جا کر ملوں۔ جو اور پولیس والوں سے بعد میں بات ہوسکتی تھی۔

میں نے اپنی گاڑی نکالی اور کیفے مان کی طرف چل دیا۔ وہ کیفے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ہیلن ایک میز پر اکیلی بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے لیے کافی کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔

''مس ہیلن، اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک خوب صورت لڑکی ہو۔'' میں نے بولنا شروع کیا۔ ''لیکن اس کے ساتھ ساتھ تم ایک نمبر کی جھوٹی بھی ہو۔ ہمیشہ غلط بیانی کرتی رہی ہو۔'' میں نے دیکھا۔ ہیلن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ''مسٹر جانسن! میں تم کو اچھی خاصی رقم دے چکی ہوں تاکہ تم میری گمشدہ بہن کو ڈھونڈ سکو۔ اس کے بدلے تم مجھ پر جھوٹ کا الزام لگا رہے ہو۔''

''مس میں نے تمہاری گمشدہ بہن کو ڈھونڈ لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کہاں سے ڈھونڈا، کہاں ہے وہ؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ میرے سامنے بیٹھی ہے۔'' میں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''ایلن گارفیلڈ اور ہیلن گارفیلڈ ایک ہی چہرے کے دو نام ہیں۔ ہیلن نام کی کسی لڑکی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تم جھوٹ بولتی رہی ہو۔''

وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔ ''بتاؤ، تمہیں کتنی رقم چاہیے؟''

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کرسی پر بٹھا دیا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''اب تم مجھے سب کچھ صاف صاف اور سچ بتاؤ گی کہ یہ کیا کہانی ہے۔ تم کیوں اپنی ایک بہن کی کہانی لے کر میرے پاس آئی تھیں۔ تم نے کیوں یہ ڈراما کیا؟''

''نہیں، میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھے بتاؤ گی کیونکہ پولیس مجھے تمہارے چکر میں تلاش کرتی پھر رہی ہے اور وہ آنے ہی والی ہے۔ میں پھنسا تو تم بھی بُری طرح پھنس جاؤ گی۔ اسی لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے سب کچھ بتا دو۔''

ہیلن خاموش رہی۔

''دیکھو مس ہیلن یا ایلن۔ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ اس کے علاوہ دو خطرناک قسم کے بدمعاش بھی تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بینی کو قتل کیا تھا اور کبانہ میں مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔ یاد رکھو، میں وہ واحد آدمی ہوں جو اس موقع پر تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اسی لیے بہتر ہے کہ مجھے سب بتا دو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتی رہی پھر اس نے رونا شروع کیا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہیں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔ میں ایلن گارفیلڈ ہوں۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''بتاتی رہو۔''

''میں اور سوزی ہر ہفتے کبانہ میں ڈانس کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہیں میری ملاقات بینی سے ہوئی۔ جو ایک بہت اچھا ڈرمر تھا۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ میں تقریباً روزانہ کبانہ جانے لگی۔ بینی کو ڈرم بجاتے دیکھا کرتی اور وہیں میں نے ایک بات نوٹ کی۔''

''کون سی بات؟''

''شروع شروع میں تو اس پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ ایک خاص وقت پر روزانہ ہی کلب آیا کرتے ہیں۔''

''کون سے خاص لوگ؟''

اس نے جو حلیہ بتایا وہ اسی لانبے شخص اور اس کے چھوٹے قد کے ساتھی جو کا تھا۔

''ہاں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور جو تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ایک کھوج سی ہو گئی تھی کہ آخر یہ کون ہیں۔ ایک دن میں نے بینی سے بھی پوچھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ میں اس معاملے میں خاموش رہوں۔ وہ دونوں جب آتے تو ان کے پاس بڑے بڑے بیگ ہوتے تھے لیکن واپسی خالی ہاتھ ہوتی تھی۔

''میں نے ایک بار پھر بینی سے پوچھا تو اس نے مجھے کریدنے سے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنی زبان بند ہی رکھوں تو بہتر ہے۔ ایک بار وہ دونوں اتفاق سے اس میز پر جا بیٹھے جس پر میں بیٹھی تھی۔ ان کے پاس معمول کے مطابق بڑے بڑے بیگ تھے۔ اگرچہ میں اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن میرا دھیان ان ہی دونوں کی طرف تھا۔ انہوں نے وہ بیگ کھولے اور میں نے دیکھا کہ دونوں بیگ قیمتی جواہرات اور زیورات سے بھرے ہوئے تھے۔

''میں نے اس شام بینی کو سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بہت دنوں سے جانتا ہے کہ اس کلب میں چوری اور ڈکیتی کی چیزوں کی خرید و فروخت ہوا کرتی ہے۔ تم نے جو زیورات دیکھے شاید ان کا سودا ہو رہا ہوگا۔

''پھر بینی نے ایک پروگرام بنایا کہ کسی طرح کوئی بیگ چرا لیا جائے اور اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں ہے کیونکہ وہ بیگ بھی وہ بدمعاش کہیں سے چرا کر لائے ہوں گے۔ میں نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ اس واردات کے بعد ہم دونوں اس شہر کو چھوڑ کر کہیں دور نکل

جائیں گے۔ طے یہ پایا کہ وہ بیگ میرے اپارٹمنٹ میں چھپا دیا جائے گا۔ موقع مل گیا۔ اتوار کی شام بینی نے ایک بیگ چرا کر میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے اپنے اپارٹمنٹ لے آئی۔ اس میں قیمتی زیورات اور ہیرے بھرے ہوئے تھے۔

دوسرے دن سوموار تھا۔ میں اپنے آفس چلی گئی۔

''آفس ہی میں بینی کا فون آ گیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ ان دونوں کو پتا چل گیا ہے کہ ایک بیگ چوری ہو چکا ہے اور وہ کہیں چھپا دیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں فوراً اپنے اپارٹمنٹ سے نکل جاؤں۔ وہ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں تو میں دفتر سے نکل کر ایک ہوٹل چلی گئی۔ بیگ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔''

''ایک بات بتاؤ، میرے پاس ہیلن کی کہانی کیوں لے کر آئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم میری فرضی بہن کی تلاش میں رہو، اور اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم ان بدمعاشوں تک پولیس کی رہنمائی کر سکو جنہوں نے بینی کا خون کر دیا ہے۔''

''تم نے پہلے ہی مجھے سچ کیوں نہیں بتایا؟''

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ بیگ کی جو دولت مجھے ملی ہے وہ مجھ سے لے لی جائے۔ سچ کی صورت میں وہ بیگ مجھے واپس کر دینا پڑتا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے بعد یہ ہوا کہ اچانک مجھے اس لانبے بدمعاش کا فون آیا۔ اس نے کہا وہ جانتا ہے کہ بیگ میرے پاس ہے۔ اگر زندگی چاہتی ہو تو بیگ واپس کر دو۔ میں نے بینی کو فون کر کے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کہا کہ معاملات الجھ گئے ہیں لیکن ابھی بھی بچنے کی گنجائش ہے۔ اگر ہم دوسری رات وہ بیگ کلب میں واپس جا کر رکھ دیں۔''

''تو تم اسی لیے بیگ لے کر مجھ سے ملنے آئی تھیں؟''

''ہاں کیونکہ مجھے نہ جانے کیوں یہ بھروسا تھا کہ اگر ان دونوں نے مجھ پر حملہ کیا تو تم مجھے بچانے کی کوشش کرو گے۔''

''تمہارے اعتماد کا شکریہ۔ کیا تم اس وقت تک یہ نہیں جانتی تھیں کہ انہوں نے بینی کا خون کر دیا ہے؟''

''ہاں، میں جانتی تھی، اسی لیے بے انتہا خوف زدہ تھی۔''

''اور وہ بیگ ابھی تک تمہارے ہی پاس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اس وقت بھی لے کر آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ اس نے اشارہ کر کے بتایا۔ میز کے نیچے ایک بیگ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس بیگ کو کھول کر دیکھا۔ وہ قیمتی جواہرات اور زیورات سے بھرا ہوا تھا۔

اسی وقت ایلن چیخ اٹھی اور ایک سرد آواز سنائی دی۔

''اب یہ بیگ ہمارے حوالے کر دو۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ چھوٹے قد والا جو کھڑا تھا۔ اپنی بے رحم مسکراہٹ کے ساتھ اور اس سے کچھ فاصلے پر لانبے قد والا تھا۔

میں نے میز کے نیچے سے بیگ نکالا اور جو کی طرف اچھال دیا۔ وہ بیگ کی طرف متوجہ تھا۔ اتنی دیر میں، میں جمپ لگا کر اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

وہ چیخ کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں لانبے کی طرف لپکا۔ لیکن وہ اپنا پستول نکال چکا تھا۔

لیکن اسی وقت میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

لانبا نروس ہو گیا تھا۔ ''کیوں ہنس رہا ہے؟'' اس نے چلا کر پوچھا۔

میرے ہنسنے کی وجہ فوراً اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

سارجنٹ مرفی دو تین پولیس والوں کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ پولیس والے بیک وقت سب پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے مجھے بھی پکڑ لیا تھا۔

''مجرم وہ لوگ ہیں۔'' میں نے اشارہ کیا۔

''سب کو پولیس اسٹیشن چلنا ہے۔'' مرفی نے کہا۔

ہم سب پولیس اسٹیشن میں تھے۔ ہماری کہانیاں سنی گئیں۔ یعنی میری اور ایلن کی۔ اس کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ مجھے اس لیے کہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں اپنے کلائنٹ کو بچانے کے چکر میں پھنستا رہا تھا اور ایلن کو اس لیے کہ اس کی وجہ سے دو خطرناک بدمعاش قابو میں آ گئے تھے اور کبانہ کلب کا راز ظاہر ہو گیا تھا۔

جب ہم وہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو مرفی نے کہا۔ ''یاد رکھو، مسٹر جانسن! کوئی بھی کیس پولیس کی مرضی کے بغیر حل نہیں ہوتا۔ اس لیے پولیس سے کبھی کچھ چھپانے کی کوشش مت کرنا اور ہمیشہ سچ بولنا۔''

میں نے اس کی نصیحت شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ اس کے باوجود میں ایک بات اس سے چھپانے میں کامیاب ہو گیا کہ ایلن بہت جلد میری جیون ساتھی بننے والی ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

طاہر جاوید مغل

انگارے

پینتیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ وبالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی سختی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرزمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرزمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کردی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہورہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پاچکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنوں سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کردیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آچکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسنہ آچکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کردیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ اجنبی چہرے کے ساتھ ہی سیف کے گھر تک آپہنچا تھا۔ اصل مقصد میرا تاجور کا حصول تھا میں اس تک پہنچنا چاہتا تھا اس کے گھر والوں نے داراب فیملی میں اس کا رشتہ طے کردیا تھا مگر اہل خاندان اس سے ناخوش تھے۔ آہستہ آہستہ میں سیف کے گھر والوں کے دل میں جگہ بنا رہا تھا۔ سیف کی موت کا سن کے اس کی ماں اور باپ کا برا حال تھا۔ کچھ دنوں بعد ماں یہ صدمہ جھیل نہ سکی اور خالق حقیقی سے جاملی۔ شاید میری قسمت میں تاجور کا ساتھ نہیں تھا۔ وہ قریب آ کے پھر دور جاچکی تھی۔ انیق کی اچانک عداوت نے میرے خوابوں کی کرچیاں کردیں تاجور نے سیف کے حوالے میں نہ جانے کیا سمجھا اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے دارج فیملی کی بہو بن گئی۔ سجاول کا میری حالت پر برا حال تھا۔ میں نے اسے روکا کچھ بھی کرنے سے۔ پاکستان میں میرے لیے اب کیا بچا تھا۔ میں نے فخر کے ساتھ رختِ سفر باندھا۔ اب ڈیتھ اسکواڈ کی باری تھی۔ اس کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں مسلسل کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی ''موومنٹ'' پر غور کررہا تھا۔ جونہی کیمرے نے دیوار کی طرف سے رخ پھیرا، میں گارڈینا کے پیچھے سے اٹھا اور لپک کر اس آٹھ فٹ اونچی دیوار کی طرف گیا۔ پلک جھپکتے میں دیوار کے پار تھا۔ میں دیوار سے کود کر جس جگہ پنجوں کے بل گرا وہ پختہ زمین نہیں ایک لمبی کیاری تھی۔ گل عباسی کے پودوں نے مجھے ڈھانپ لیا۔ میں نے احتیاطاً بریٹا پسٹل اپنے ہاتھ میں کرلیا تھا اور انگلی لبلبی پر دھرلی تھی۔

مجھے اپنے سامنے ایک کشادہ لان نظر آیا۔ گھاس کو خوب صورتی سے تراشا گیا تھا۔ چاروں طرف ایک باغیچہ تھا جس میں پھل دار اور پھول دار پودے تھے۔ کہیں کہیں گارڈن لائٹس کی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ گھاس کاٹنے والی ایک چھوٹی سی جدید، جیپ نما مشین اس وسیع لان کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے جس منظر پر پڑی، وہ انہی ہم شکل شیطانوں کے ہیولے تھے۔ وہ حسبِ معمول تیز رنگ کے نہایت چست لباسوں میں تھے۔ جیسے جسموں پر کپڑے کے بجائے رنگ کیا گیا ہو۔ فقط ان کے بازو کندھوں تک ننگے تھے۔ ان کے منڈے ہوئے سر گارڈن لائٹس کی دھیمی روشنی میں دمک رہے تھے۔ یہاں ان کی تعداد چار تھی۔ تین تو گھاس کاٹنے والی مشین کے پاس کھڑے تھے ایک باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ باغیچے میں بھاگ دوڑ کررہا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''پکڑو جانے نہ پائے۔'' ایک شتونگڑا کریہہ آواز میں چلّایا۔

دوسرے نے پکار کر کہا۔ ''بس دو منٹ باقی ہیں تمہارے پاس۔''

باغیچے میں بھاگ دوڑ کرنے والے کی رفتار کچھ اور تیز ہوگئی۔ وہ کسی شکاری جانور کی سی پھرتی کے ساتھ کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کررہا تھا اور پھر مجھے وہ چیز بھی نظر آگئی۔ وہ ہرن کا ایک خوب صورت بچہ تھا۔ چند روز پہلے میرے دوست فخر نے مجھے واٹس واۓ اور اس کی دس گیارہ سالہ بچی کی جو تصویریں دکھائی تھیں، ان میں سے ایک تصویر میں ہرن کا یہ بچہ بھی لڑکی کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیتھ اسکواڈ کا سر منڈا شیطان برق رفتاری سے ہرن کو دبوچنے کی کوشش میں تھا۔ ہرن بھی بلا کا پھرتیلا۔ وہ نوخیز بھی تھا۔ چوکڑیاں بھرتا ہوا ایک طرف کے درختوں سے نکلتا تھا اور دوسری طرف کے پودوں میں اوجھل ہوجاتا۔ غالباً یہ کسی قسم کا کھیل تھا جو یہ شیطان زادے آپس میں کھیل رہے تھے۔ دفعتاً ہرن نے برق رفتاری سے بھاگتے بھاگتے تیزی سے اپنا رخ بدلا اور پھسل گیا۔ اس کے پیچھے طوفان کی طرح آتا ہوا شخص جست لگا کر اس کے اوپر جا پڑا۔ بالکل جیسے کوئی جانور اپنے شکار پر چھلانگ لگاتا ہے۔ میں سمجھا کہ یہ کھیل یہیں تک ہے مگر اگلا منظر دل خراش تھا۔ سر منڈے شیطان زادے نے بالکل کسی درندے کی ہی طرح مچلتے ہوئے ہرن کی شہ رگ پر اپنا منہ رکھا اور اسے دانتوں سے بھنبھوڑ دیا۔ گارڈن لائٹ کی مدھم روشنی میں مجھے ہرن کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹتا نظر آیا۔ وہ بری طرح مچلا پھڑ کا مگر لبے تڑنگے خبیث کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے باقاعدہ کسی شیر ہی کی طرح ہرن کی شہ رگ سے منہ پیوست رکھا۔ یقیناً وہ اس کا خون پی رہا تھا۔

گراس کٹر مشین کے پاس کھڑے تینوں ارکان نے اپنے ساتھی کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ خون پیتا ہوا شخص پکار کر بولا۔ ''آجاؤ میرے شیرو۔''

وہ تینوں بھی شیطانی انداز میں چنگھاڑتے ہوئے، نیم جان جانور پر جھپٹے اور چوپایوں کا انداز اختیار کیا پھر وہ بھی باقاعدہ دانتوں سے اس کا گوشت نوچنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کچا گوشت کھاتے ہیں لیکن اس طرح بھی کھاتے ہیں، مجھے علم نہ تھا۔ تب میری نگاہ مور پنکھ کے پودوں کے پاس ایک اور شے پر پڑی۔ میں نے وہاں ایک السیشن کتے کی ہڈیاں دیکھیں، اس کا سر اس کے پنجر کے ساتھ ہی تھا اور اردگرد خون کے لوتھڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ منظر میں اس سے پہلے نہیں دیکھ پایا تھا۔ بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ یہ ڈیتھ اسکواڈ کے ان ہرکاروں کی وحشت کی نشانیاں تھیں۔ جب بھی ان سے واسطہ پڑتا تھا، ان کی کوئی نہ کوئی ''اضافی خوبی'' سامنے آتی تھی۔

چاروں افراد جو یہاں موجود تھے، ہرن کا کچا گوشت کھانے میں معروف تھے۔ میں ان سے پندرہ بیس میٹر کی دوری پر تھا، پھر بھی مجھے ان کے خون میں لتھڑے ہوئے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔ وہ اس ساری صورتِ حال کو انجوائے کررہے تھے اور مست تھے۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ میں اندر عمارت کی طرف جانے کی کوشش کروں۔

موقع دیکھ کر میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور باغیچے کے پودوں کی اوٹ میں جھک کر چلتا ہوا اندرونی عمارت کی طرف بڑھا...... میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ سی سی ٹی وی کیمرے صرف باہر کے آہنی جنگلے اور اندرونی دیوار پر ہی نصب تھے۔ اندر کی عمارت میں کہیں کسی کیمرے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں نے ایک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ وہاں اے سی کی خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ کسی اندرونی کمرے سے موسیقی کی تیز دھنا دھن ابھر رہی تھی۔ کہیں پاس سے ہی باتیں کرنے کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی۔ میں تھوڑا آگے گیا۔ دو افراد مصروفِ گفتگو تھے۔ ان کی آوازیں سن کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ ڈیتھ اسکواڈ کے ''حرامزادے'' ہیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگتا تھا کہ ایول نامی اس ابلیس کے تخم سے جنم لینے والے ان سارے اشخاص کی شکلیں ہی نہیں آوازیں بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ ان میں سے ایک کو شاید نیند آرہی تھی اور دوسرا ایل سی ڈی پر کوئی لچر فلم دیکھنے میں مصروف تھا۔ پہلا بولا۔ ''تمہارے منہ پر پیشاب کے چھینٹے، جاؤ اب دفع بھی ہوجاؤ۔''

دوسرا بولا۔ ''تمہاری اس ماں کا ہنی مون تو دیکھ لوں، پھر جاتا ہوں۔''

پہلے نے شاید اسے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کے ٹوٹنے کی صدا آئی۔ ایک لمحے کے لیے تو لگا کہ شاید وہ گتھم گتھا ہوجائیں گے لیکن پھر معاملہ ٹل گیا۔ ان میں سے ایک بلند آواز میں ہنستا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا جس کے عقب میں، میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک بڑے سیب کو کچر کچر کھاتا ہوا آرہا تھا۔ شاید اگر وہ میرے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پاس سے گزر جاتا تو اس کی زندگی آگے چلتی رہتی مگر وہ گزرا نہیں، دروازے سے نکلتے نکلتے رک گیا۔ غالباً اس کے سونگھنے کی حس بڑی تیز تھی اور اسے اپنے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے سانس روک لی۔ وہ پلٹا اور اس نے دروازے کے پیچھے جھانکا۔ وہاں میں کھڑا تھا اور میرے ہاتھ میں خطرناک نوک والا دندانے دار چاقو تھا۔ ''کون ہو؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ گمبھیر آواز بلند ہوئی۔

میں نے اُسے جواب دیا اور یہ جواب اس چاقو کی شکل میں تھا جو دستے تک اس کے سینے میں گھس گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کریہہ آواز میں چلاتا، میں نے اس کا منہ بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ چاقو دل میں ترازو ہو جانے کے باوجود وہ بُری طرح مچلا اور مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تڑپ کر اپنا گھٹنا میری ناف میں رسید کرنا چاہا۔ میں نے اس کے گھٹنے کو اپنے گھٹنے سے ہی روکا اور چاقو کھینچ کر دوسرا وار اس کی گردن پر کیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ ڈگمگا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے تب تک اس کے منہ سے ہاتھ نہیں ہٹایا جب تک اس کی آنکھیں پتھرا نہیں گئیں اور سیب اس کے ہاتھ سے لڑھک نہیں گیا۔

کسی قریبی کمرے سے اس کا ساتھی پکار کر پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا چارلی، یہ آواز کیسی تھی؟''

تب قدموں کی چاپ ابھری، وہ میری طرف آ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر دروازے کی اوٹ میں چلا گیا۔ چست لباس اور منڈے ہوئے سر والا لمبا تڑنگا شیطان اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی لاش پڑی تھی۔ اس کا ردِعمل حیرت انگیز طور پر برق رفتار تھا۔ وہ واپس پلٹا، مجھے لگا کہ کوئی ہتھیار لینے لپکا ہے۔ میں نے چند قدم بھاگ کر اسے عقب سے جا لیا۔ وہ اوندھے منہ میرے نیچے قالین پر گرا۔ میں نے سب سے پہلے اس کا منہ بند کیا، پھر چاقو کا بھرپور وار اس کی کمر پر دونوں کندھوں کے درمیان کیا۔ میں دوسرا وار بھی کرنا چاہتا تھا مگر دندانے دار چاقو اس کی پسلیوں میں کہیں بری طرح پھنس گیا۔ اس ''ٹیسٹ ٹیوب خبیث'' کے جسم میں حیوانی طاقت تھی۔ اس نے زور لگا کر پلٹنا اور خود کو میرے نیچے سے نکالنا چاہا۔ مگر میں اسے دوبارہ اسی آسن پر لے آیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے اپنا دایاں ہاتھ لمبا کیا ہوا ہے اور اسے پورے زور سے کسی چیز تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن وہ چیز کوئی ہتھیار نہیں تھا...... وہ ایک وارڈروب کے نچلے کنارے پر لگا ہوا ایک چھوٹا سا سفید بٹن تھا۔

میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ یہ ''الارمنگ بٹن'' ہے۔ اس کے دبتے ہی پوری عمارت میں خطرے کے سائرن بج اٹھیں گے۔ مجھے الارمنگ سسٹم کے بارے میں رضوان ٹی پہلے ہی بتا چکا تھا۔ الارمز کے بٹن اور خبیث کی انگلی کے درمیان پانچ چھ انچ کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ ختم ہو جاتا تو پھر کچھ بھی میرے بس میں نہ رہتا۔ چاقو نے تو حریف کے جسم سے باہر آنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں نے چاقو چھوڑ کر خبیث کی وہ کلائی تھام لی جس کی انگلی سفید بٹن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ چند انچ کے فاصلے کی کشمکش تھی اور بڑی شدید تھی۔ فاصلہ مزید کم ہو گیا چار انچ...... تین انچ...... دو انچ...... میں نے اپنی پوری توانائی صرف کی اور حریف کو پلٹ دیا۔ اب وہ اوپر اور میں نیچے تھا لیکن اس کی پشت بدستور میری طرف تھی اور میں نے ہتھیلی کی مدد سے پوری مضبوطی کے ساتھ اس کا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی پشت سے بہنے والا گرم خون میرے سینے اور پیٹ کو بھگو رہا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ اب آزاد تھا۔ اُس کو پتا ہی نہیں چلا کہ میں نے کب اس کی گردن کا کڑاکا نکال دیا۔ یہ ایم ایم اے کا ہنر تھا۔

اس شخص کو وہیں لہولہان چھوڑ کر میں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے موسیقی کی تیز آواز ابھر رہی تھی۔ میں نے بے دھڑک ہو کر دروازہ کھولا۔ اندر ایک لڑکی محوِ رقص تھی اور دروازہ کھلتے ہی موسیقی کی آواز سماعت شکن ہو گئی تھی۔ لڑکی کا رخ دوسری طرف تھا میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ یہ بھی ڈیتھ اسکواڈ کی ایک خطرناک شیطان زادی تھی۔ نہایت چست لباس۔ بوائے کٹ بال اور فولادی جسم۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بلند آواز میں بولی۔ ''کھا آئے ہو کتے اور بلی کا گوشت؟''

موسیقی کے سبب آواز بمشکل میرے کانوں تک پہنچ سکی۔

میں کوئی جواب دیے بغیر عین اس کی پشت پر چلا گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے عریاں کندھوں پر رکھ دیے۔ وہ بدستور ہولے ہولے تھرک رہی تھی۔ موسیقی کی دھنا دھن کے اندر بلند آواز سے پکاری۔ ''آج تمہارے منہ سے السیشین کتے کی بو آئے گی۔ اس لیے اچھا تو یہی ہے کہ چپ کر کے سو جاؤ۔''

فقرہ مکمل کرتے کرتے اُسے کسی انوکھے پن کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

احساس ہو گیا۔ اس نے جیسے تڑپ کر اپنا رخ پھیرا اور میری جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے اور نہ ہی عام سلوک کی مستحق ہے۔ میں نے اس کے جبڑے پر ایک طوفانی مکا رسید کیا۔ یہ نشانے پر لگتا تو اسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھا۔ تاہم وہ غیر معمولی پھرتی سے نیچے جھکی اور میرا یہ راؤنڈ پنچ بھرپور ضرب نہیں لگا سکا۔ اس نے چلّا کر اپنی ٹانگ گھمائی جو میری چھاتی پر لگی۔ ٹانگ کی دوسری ضرب کا میں نے نہ صرف دفاع کیا، بلکہ ٹانگ تھام لی اور اس کی دوسری ٹانگ کو اڑنگا لگا کر اسے نیچے گرا دیا۔ اس نے میری ٹانگوں کے درمیان ہاتھ ڈالنا چاہا مگر منہ کی کھائی، میرے گھٹنے کی ضرب اس کی ناک پر لگی تھی۔ اس ضرب نے اس غیر معمولی ''فی میل فائٹر'' کا دم ختم کر دیا۔

وہ ہیجانی انداز میں پکاری۔ ''مدد...... مدد...... کوئی ہے۔''

اس کی آواز کان پھاڑ موسیقی میں دب کر رہ گئی۔ شاید وہ دوگنا آواز سے بھی چلّاتی تو اپنی آواز باہر نہ پہنچا سکتی۔ اس نے اپنے نکیلے ناخنوں سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ اپنے ٹیسٹ ٹیوب بھائیوں کی طرح وہ بھی عیاری اور سفاکی میں اپنی مثال آپ تھی۔ میں اس سے پہلے ڈنمارک میں بھی اس جیسی ایک آفت زادی سے دو دو ہاتھ کر چکا تھا۔ ایک عجیب سے طیش نے میرے دماغ میں چنگاریاں بکھیر دیں۔ میں نے اس کی صنف کی پروا کیے بغیر ایک دھواں دھار ہاتھ اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ اس مرتبہ وہ اپنا دفاع نہ کر سکی اور نیم بے ہوش ہو گئی۔ اس کا جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے قریب ہی نائیلون کی وہ رسی پڑی تھی جو ورزش کے طور پر پھاندی جاتی ہے۔ میں نے پھرتی سے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے۔ ایک ریشمی اسکارف میں نے اس کے گلے میں کس دیا، لیکن نہ تو اتنی زور سے کسا کہ اس کا سانس رک جائے اور وہ زندگی سے نجات پا جائے اور نہ ہی اتنا ڈھیلا رکھا کہ وہ بچ جائے۔

یہ اسی ڈیتھ اسکواڈ کے سفاکانہ طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا۔ یہ لوگوں کو اذیت دے کر قتل کرتے تھے (ابھی چند روز پہلے ہی تو وہ پاکستان کے شہر گوجرانوالہ میں اس طریق سے ایک کوٹھی کے نوکر پیشہ شخص کی جان لے چکے تھے۔ وہ آزادانہ سانس کے لیے کئی گھنٹے تڑپ کر مر گیا تھا)

آفت زادی نے اب کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر ایک واش روم میں پھینکا اور دروازہ باہر سے لاک کر کے موسیقی کی آواز کچھ اور بلند کر دی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب میں وانس وائے اور اس کی بیٹی سے زیادہ دور نہیں ہوں مگر ان کی صحیح لوکیشن کے بارے میں، میں بس اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظر گھمائی اور مجھے ایک الماری کے اندر جھولتا ہوا چابیوں کا ایک گچھا نظر آ گیا۔ یہ بڑی اسٹائلش اور چمکتی دمکتی چابیاں تھیں۔ میں دس پندرہ قدم آگے گیا۔ اسٹیل کا ایک سلائڈنگ دروازہ دکھائی دیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ راستہ ہے جو مجھے وانس وائے اور اس کی بیٹی کی طرف لے جائے گا۔ میں نے مختلف چابیوں کو دروازے کے بیضی لاک میں آزمانا شروع کر دیا۔ ایک چابی لگ گئی مگر دروازہ پھر بھی کھلا نہیں۔ کسی مائیک سے آواز آنا شروع ہو گئی۔ ''پلیز، اپنی شناخت کرائیں...... پلیز اپنی شناخت کرائیں۔''

تب میں نے دیکھا کہ ایک سائڈ پر چھوٹا سا ''اسکینر'' نظر آ رہا تھا۔ یہ میرے فنگر پرنٹس مانگ رہا تھا، میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ دروازہ بند رکھنے کا پکا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے وہ مناظر یاد آ گئے جب میں نے جاماجی میں ایک گرے فورس کے اہلکار کا انگوٹھا کاٹا تھا اور اس کی مدد سے ''سینسر'' کو دھوکا دے کر علمی کے خاص باڈی گارڈ تک رسائی حاصل کی تھی لیکن یہاں میں نہیں جانتا تھا کہ اس سینسر کو کس کے فنگر پرنٹس درکار ہیں۔

موسیقی کی دھنا دھن نے یہاں بھی قیامت برپا کر رکھی تھی۔ میں نے اپنے پسٹل کا دستہ جھلا کر سینسر پر رسید کیا۔ دوسری تیسری ضرب نے اس ''سینسر'' کو چکنا چور کر دیا لیکن اگر میرا خیال تھا کہ اس طرح دروازہ کھلنے کی راہ نکل آئے گی تو یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس کے بجائے یہ ہوا کہ یکایک عمارت میں بہت سے الارم بج اٹھے اور ایک طویل راہداری میں اور کمروں میں سرخ روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اب کسی طرح کی احتیاط بے کار تھی۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر سلائڈنگ ڈور کے کنٹرول پینل پر اوپر تلے کئی فائر کیے۔ اس بار نتیجہ حسبِ منشا نکلا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں اندھا دھند اندر داخل ہوا۔

میں جانتا تھا میرے پاس وقت کم ہے۔ میں بلند آواز میں وانس وائے کو اس کے مختصر نام سے پکارنے لگا۔ ''وانس کہاں ہو، وانس میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں، وانس میرے سامنے آؤ۔''

میں راہداریوں میں بھاگ رہا تھا۔ دروازوں کو دھکیل رہا تھا اور آوازیں دے رہا تھا۔ دوسری طرف پوری عمارت میں الارم اور بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازوں

نے کہرام مچا دیا تھا۔

اچانک ایک لمبا تڑنگا شخص میرے سامنے آ گیا۔ راہداری نیم تاریک تھی۔ سامنے آنے والے شخص کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی۔ اس نے روشن دائرہ میرے چہرے کی طرف کیا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کون ہو؟''

آواز نے تصدیق کر دی کہ یہی ماضی قریب کا خطرناک ترین گینگسٹر اور یورپی ڈان، وائس وائے ہے۔

میں نے بلاتوقف کہا۔ ''مسٹر واٹ! مجھے اور فخر زماں کو جس شخص نے تمہارے پاس بھیجا ہے، اس کا نام ایسٹرن کنگ ہے اور مجھے یقین ہے تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔''

وائس وائے چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں رہا پھر اس کی ہیبت ناک آواز راہداری میں گونجی۔ ''میں اس بات پر کیسے یقین کرلوں؟''

''ویسے تو میرے پاس اس کے کئی ثبوت ہیں لیکن ... فی الوقت ڈیتھ اسکواڈ والوں کی دو تین لاشیں میری بات کی گواہی دیں گی۔ وہ آس پاس ہی پڑی ہیں۔''

''تت...... تم...... کیسے نکال سکتے ہو ہمیں یہاں سے؟''

''پورا انتظام ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہیں معلوم ہوگا ایسٹرن کسی کام میں کچے ہاتھ نہیں ڈالتا...... بچی کہاں ہے؟''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ لڑکی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''پاپا! کہاں ہو، کیا ہوا؟''

اور پھر وہ سامنے آ گئی۔ وہ ہلکی سی شرٹ اور نیکر میں تھی۔ سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ راہداری کا منظر دیکھ کر وہ ہکابکا رہ گئی۔

بھاگتے قدموں کی آوازیں اب اس سلائڈنگ ڈور کے نزدیک پہنچ چکی تھیں جسے میں نے فائرنگ کر کے کھولا بلکہ توڑا تھا۔ ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مسٹر واٹ! ہمیں دوسرے دروازے سے نکلنا ہوگا۔''

وائس وائے ایک نہایت جہاندیدہ شخص کا نام تھا۔ یقیناً اس کی چھٹی حس بھی کام کر رہی تھی۔ اس نے تیزی سے فیصلہ کیا اور اپنی بچی کا بازو پکڑ کر میرے ساتھ عقبی دروازے کی طرف دوڑا۔ عمارت کا مکمل حدود اربعہ مجھے رضوان کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا۔ ہم جس طرف جا رہے تھے، اُدھر بھی ایک چوبی دروازہ تھا اور دروازے سے آگے اسٹیل کا سلائڈنگ ڈور تھا۔ دونوں دروازوں کے درمیان سات آٹھ فٹ جگہ تھی اور اس جگہ پر بھی ایک مسلح گارڈ کی موجودگی یقینی تھی۔ میں نے اپنے پسٹل سے نیا میگزین اٹیچ کر لیا تھا اور انگلی ٹریگر پر دھرلی تھی۔ چوبی دروازہ کھولنے یا توڑنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ الارمز اور بھاگ دوڑ کی آوازوں نے چوبی دروازے کی دوسری جانب موجود گارڈ کو الرٹ کر دیا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ ہمارے پہنچنے تک اس نے دروازہ کھولا اور راہداری میں جھانکا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا صفاچٹ سر چمکا اور تصدیق ہو گئی کہ یہاں بھی ڈیتھ اسکواڈ کا عیار قاتل موجود ہے۔ اسے کوئی موقع دینا شدید خطرے کو دعوت دینا تھا۔ میں نے بلاتردد اس کی پیشانی پر گولی ماری۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر آیا۔ واٹ کی بچی ڈیزی بے ساختہ چلا اٹھی۔ واٹ نے لپک کر زخمی کو فرش پر گرنے سے روک لیا اور وہ زخمی بھی کہاں تھا۔ اعشاریہ 38 کی گولی نے اس کا بھیجا پھاڑ ڈالا تھا، اس کا شمار مُردوں میں ہو چکا تھا۔ خون تیزی سے اس کے تھوبڑے کو رنگین کر رہا تھا۔ چابیوں کا ایک گچھا اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ وائس وائے نے پھرتی سے یہ گچھا نکالا اور ایک لمبی چابی دروازے کے قفل میں گھمائی۔ میں اس دوران میں نیم مردہ شیطان کو گھسیٹ کر دروازے کے ''سینسر'' کے پاس لے گیا اور اس کی ہتھیلی وہاں پر رکھ دی۔ دروازہ کھل گیا۔

وائس وائے کی تیزی بھی قابلِ ذکر تھی۔ اس نے پلک جھپکنے میں نہ صرف گارڈ کی آٹومیٹک رائفل اس کے کندھے سے اتار لی تھی بلکہ ان لوگوں کی طرف ایک برسٹ بھی جھونک دیا جو دیوانہ وار ہماری طرف لپک رہے تھے۔ اس برسٹ نے بلاشبہ ہمیں بہت فائدہ دیا۔ ہمیں یہ موقع مل گیا کہ ہم سلائڈنگ دروازے سے گزر کر باہر نکل آئے بلکہ دروازے کو بند کرنے والا کھٹکا بھی دبا دیا۔

''دائیں طرف بھاگو۔'' واٹ وائے چلایا۔ وہ اب پوری فارم میں نظر آ رہا تھا۔

ہم ایک چھوٹی سی راہداری سے گزرے۔ وہاں بھی سرخ روشنی کے جھماکے ہو رہے تھے۔ ایک تھائی گارڈ نے ایک اوٹ سے نکل کر مجھ پر فائر کرنا چاہا مگر میں ٹریگر دبانے میں سبقت لے گیا اور وہ بھی جان لیوا طور پر زخمی ہو گیا۔ تاہم وقت بہت کم تھا، ہم اس کی رائفل حاصل نہ کر سکے۔ ایک بغلی دروازہ کھول کر ہم قلعہ نما عمارت کے عقبی احاطے میں آ گئے۔ بچی کا بازو وائس وائے کے ہاتھ میں تھا۔ وہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جوگر ٹائپ جوتے پہنے ہوئے تھی اور تیز رفتاری سے باپ کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ وانس وائے کے رخ سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ تیس چالیس میٹر دور ایک برآمدہ نما جگہ تک پہنچنا چاہتا ہے لیکن اس میں شدید رسک تھا۔ وہاں تک کھلا احاطہ تھا۔ ہم وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نشانہ بن سکتے تھے اور نہ بھی بنتے تو ہمیں اس جگہ گھیرے میں تو ضرور لیا جا سکتا تھا۔ میں نے وانس وائے کا بازو پکڑا اور اسے درختوں کی طرف کھینچا۔

''ادھر کہاں ...... ادھر کھائی ہے۔'' وانس وائے نے دہاڑ کر کہا۔

''مگر ادھر ہی جانا پڑے گا ...... ادھر ہمارے ساتھی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ (ظاہر ہے کہ جھوٹ ہی بولا تھا۔ یہاں میرا واحد ساتھی رضوان تھا)

ہم بھاگتے ہوئے دوسری طرف گئے۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا اسپورٹس کمپلیکس تھا جس میں دو تین درمیانے سائز کے ہال کمرے تھے۔ یہ کمپلیکس اس قلعہ نما عمارت کی باؤنڈری وال کے بالکل ساتھ واقع تھا اور دوسری طرف کوئی ایک ہزار فٹ گہری قدرتی کھائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم اسپورٹس کمپلیکس کے اندر پہنچ جائیں تو یہاں سے بچ نکلنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

''یہ رائفل مجھے دے دو اور یہ لو میرا پسٹل۔'' میں نے وانس وائے کے ساتھ ہتھیاروں کا تبادلہ کیا۔ یہ تبادلہ بھاگتے بھاگتے ہی ہوا تھا۔

ہم مشکل سے کمپلیکس تک پہنچے تھے کہ فائرنگ کی تڑتڑ گونجی اور تاریکی میں ہمارے اردگرد چنگاریاں بکھر گئیں۔ وانس وائے بچی کو لے کر عمارت میں گھس گیا اور میں نے ایک دیوار کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ ہر طرف شعلے سے لپکنے لگے۔ اس ٹرپل ٹو رائفل کے دو فالتو میگزین بھی مجھے دستیاب ہو گئے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر میں احتیاط سے جوابی فائر کروں تو آدھ پون گھنٹے تک ڈیتھ اسکواڈ کے ہرکاروں کو خود سے اور وانس وائے سے دور رکھ سکتا ہوں۔

ڈیڑھ دو منٹ بعد مجھے اپنے عین عقب سے وانس وائے کی گونج دار آواز سنائی دی۔ ''تم نے کیا بکواس کی تھی۔ یہاں کدھر ہیں تمہارے ساتھی؟''

میں نے رائفل سے ایک چھوٹا سا برسٹ چلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی آس پاس ہیں لیکن اصل ہمت تو ہم کو ہی دکھانی پڑے گی۔ میری انفارمیشن کے مطابق یہاں اسپورٹس کمپلیکس میں پیراشوٹ جمپنگ کا سامان موجود ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ انگلش میں پھنکارا۔

''یہاں پیراشوٹ کے ذریعے کھائی میں جمپ لگائے جاتے رہے ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق یہاں اب بھی دو چار پیراشوٹ موجود ہوں گے۔''

وہ دانت پیس کر بولا۔ ''تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں۔ اس اندھیری رات میں ہم اس اندھی کھائی میں چھلانگ لگائیں گے؟''

''چھلانگ نہیں لگائیں گے تو چھلنی ہو جائیں گے۔ چھلانگ لگانے میں پھر بھی کافی چانس ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم چانس لینے کا حوصلہ رکھتے ہو۔''

''بک بک بند کرو۔ میرے ساتھ میری بچی ہے۔ اس نے کبھی دس فٹ سے چھلانگ نہیں لگائی۔''

''آزادی، قیمت مانگتی ہے وانس وائے۔ اور تمہارا دوست ایسٹرن کنگ کہتا تھا کہ تمہیں آزادی کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

اچانک ایک برسٹ آیا اور ہم جس دیوار کے پیچھے کھڑے تھے وہ لرزہ براندام ہو گئی۔ مخالف طرف سے ہونے والی فائرنگ شدید اور خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ میگافون پر کسی طرح کا اعلان بھی کیا جا رہا تھا جس کی ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ فائرنگ کا شور کان پھاڑ دینے والا تھا۔ وانس وائے کی بیٹی سکڑی سمٹی ایک اندرونی دروازے کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اس کے گلے میں ہیڈ فون جھول رہا تھا۔ میں نے وانس وائے سے کہا۔ ''آپ بہت سینئر بندے ہو۔ میں آپ کو ہدایت تو جاری نہیں کر سکتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ یہاں میری جگہ بیٹھ کر کاؤنٹر فائر کرو، میں اندر پیراشوٹ ڈھونڈتا ہوں۔''

وانس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے 222 رمنگٹن رائفل اس کے ہاتھوں میں تھما دی اور خود لڑکی کے سر پر تسلی آمیز تھپکی دے کر اندرونی کمروں کی طرف گیا۔ یہاں بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس وغیرہ کی جگہیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے تیزی سے ہاتھ پاؤں چلائے اور ایک اسٹور روم کی گرد آلود الماری سے پیراشوٹس ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ تعداد میں کل چار تھے لیکن دو کی حالت خاصی پتلی تھی۔ میں نے ان دو میں سے ایک نسبتاً بہتر لے لیا۔ یہ تینوں پیراشوٹس لے کر میں لڑکی ڈیزی کے پاس آیا۔ اسے

لے کر میں پختہ سیڑھیاں چڑھا اور اس وسیع قلعہ نما عمارت کی فصیل پر آ گیا۔ بے شک یہ باؤنڈری وال کسی قدیم فصیل کی طرح ہی تھی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی بُرجیاں بنی ہوئی تھیں۔ جونہی ہم فصیل پر پہنچے، تیز ہوا محسوس ہوئی۔ لڑکی کے سنہری بال اُڑنے لگے۔ میں نے اسے پیراشوٹ پہنانے کی کوشش کی تو وہ ترش لہجے میں بولی۔ ''مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں یہ نہیں پہنوں گی۔''

میں نے کسی طرح بہلا پھسلا کر پیراشوٹ کا ''ہارنس'' اس کی ٹانگوں پر چڑھا دیا اور اس کی دبلی پتلی کمر کے گرد بیلٹ کس دی۔ وہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔ اب میرے پاس دو پیراشوٹ تھے۔ ان میں سے ایک خطرناک حد تک بوسیدہ تھا۔ بہرحال یہ بوسیدہ میں نے اپنے لیے رکھا اور اسے پہن لیا۔ اس دوران میں والس وائے نیچے اپنے ''مورچے'' میں ڈٹا رہا اور جم کر فائرنگ کا جواب دیتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق اب اس کے پاس پندرہ بیس راؤنڈ سے زیادہ نہیں تھے۔

میں نے لڑکی کو وہیں کھڑا رہنے کے لیے کہا اور جھک کر بھاگتا ہوا والس وائے کے پاس پہنچا۔ میں نے اس سے رائفل لے لی اور پیراشوٹ کی پیکنگ اس کی طرف بڑھائی۔ ''اسے پہن لو مسٹر والس...... ڈیزی بھی پہن چکی ہے۔''

وہ کوئی اعتراض کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ اعتراض کا موقع نہیں۔ اس نے پیراشوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے اس کی جگہ سنبھال لی۔

رائفل سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔ میں ڈیتھ اسکواڈ والوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے جوابی فائر کرنے لگا۔ وقفے وقفے سے میں بریٹا پسٹل بھی استعمال کر رہا تھا، اور یہ تاثر دے رہا تھا کہ یہاں دو افراد مزاحمت کر رہے ہیں۔ بریٹا پسٹل کے وافر راؤنڈ میرے پاس موجود تھے۔

والس، پیراشوٹ کے ساتھ مصروف تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ پیراشوٹ جمپنگ کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہے۔ ''مسٹر والس! جلدی کرو۔ یہ سؤر کے بچے ہمیں زیادہ وقت نہیں دیں گے۔ قریب آ رہے ہیں۔''

چند ہی سیکنڈ بعد گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزرنے لگیں۔ میگافون پکار رہا تھا۔ ''ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ اسی جگہ مارے جاؤ گے۔'' یہ وارننگ انگلش کے علاوہ تھائی زبان میں بھی دی جا رہی تھی۔

والس پیراشوٹ پہن چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''مسٹر والس، تم ڈیزی کے پاس دیوار پر چلے جاؤ...... اور چھلانگ لگا دو، میں ان کو یہاں روکتا ہوں۔ موقع ملتے ہی میں بھی چھلانگ لگاؤں گا۔''

''پسٹل مجھے دے دو۔'' والس نے بھنّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے پسٹل کے بجائے رائفل اس کی طرف اچھال دی۔ اس میں اب تین چار راؤنڈ ہی باقی رہ گئے تھے۔

والس الٹے قدموں سیڑھیوں کی طرف گیا اور پھر فصیل نما دیوار پر پہنچ گیا۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

بے شک میں بریٹا پسٹل کے ساتھ تابڑتوڑ فائر کر رہا تھا مگر جانتا تھا کہ میں اس ایک ہتھیار کے ساتھ ڈیتھ اسکواڈ کے ان بدنام زمانہ قاتلوں کو زیادہ دیر خود سے دور نہیں رکھ سکوں گا۔ وہ دیوانگی کی حد تک بے خوف تھے۔ دوسروں کی اور اپنی زندگی کی ان کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ وہ وحشیانہ انداز میں چلا رہے تھے اور قریب تر آتے جا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ میں اپنی جگہ چھوڑ کر دیوار تک پہنچوں اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ پسٹل سے لگاتار کئی راؤنڈ چلانے کے بعد میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اپنے پیچھے میں نے دو دروازے لاک کر دیے تھے۔ جونہی میں تین فٹ چوڑی دیوار پر پہنچا مجھے چلّانے کی آواز آئی۔ ''نہیں پاپا نہیں، میں کہہ چکی ہوں، میں یہ نہیں کر سکوں گی۔'' یہ ڈیزی تھی۔

''ہمت کرو ڈیزی۔'' والس گمبھیر آہنگ میں بولا۔ ''ورنہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' وہ دونوں تاریک کھائی کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے۔

ہمت بڑھانے کے لیے والس نے بیٹی کا سر چوما اور اُسے پھر چھلانگ کی ترغیب دی۔

ڈیزی نے جھک کر تاریک کھائی کی طرف دیکھا اور جھرجھری لے کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ پھر چلّانے لگی۔ ''مجھ سے نہیں ہوگا۔''

میرا پارا چڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''یہ ان چوچلوں کا وقت نہیں۔ چھلانگ لگاؤ۔ ورنہ وہ بھیڑیوں کی طرح پھاڑ ڈالیں گے ہم سب کو۔''

اس نے مجھے دھکا دیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور اس سے پہلے کہ والس کچھ کرتا، میں نے ڈیزی کو دیوار سے نیچے پھینک دیا۔ اس نے جو سُریلی اور دردناک آواز نکالی، وہ بہت طویل تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

واٹس چند ساعتوں کے لیے سکتہ زدہ کھڑا رہا، پھر وہ مجھ پر جھپٹا۔ اس نے پستول کا دستہ گھما کر میرے چہرے پر مارنا چاہا، یہ ضرب لگ جاتی تو ضرور میرے چہرے کا بھرتا بن جاتا۔ اس ادھیڑ عمری میں بھی واٹس میں مجھے غیر معمولی پھرتی اور توانائی نظر آئی تھی۔ اس کا اچٹتا ہوا وار میرے کندھے پر لگا تھا۔ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں، میں دیوار سے ٹکرایا۔ واٹس نے مجھے امریکن گینگسٹروں والی گالی دی۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ پھر مجھ پر جھپٹے گا لیکن پھر اس نے ارادہ بدلا اور پلٹ کر بیٹی کے پیچھے تاریکی میں چھلانگ لگا دی۔

اب سیڑھیوں پر بھاگتے قدموں کی صدا آرہی تھی۔ وہ زہری قاتل کسی بھی لمحے دیوار کے اوپر پہنچ سکتے تھے۔ میرے پاس بھی چھلانگ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لیے اپنے سامنے پھیلے ہوئے تاریک خلا کو دیکھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ خلا کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اس کی تہ میں کیا ہوگا...... اور اگر میں صحیح سلامت اتر بھی گیا تو کس چیز پر لینڈ کروں گا، بس مجھے چھلانگ لگانا تھی اور میں نے لگا دی۔ میرے جسم اور پگھلے ہوئے سیسے کے ملاپ میں بس ایک دو سیکنڈ کا فرق ہی رہ گیا ہوگا۔

جن لوگوں نے کبھی زیادہ بلندی سے چھلانگ لگائی ہو وہ جانتے ہیں کہ ہوا کی کاٹ کیا ہوتی ہے اور وہ کس طرح ہمارے جسم کو کرکٹ کے بال کی طرح ''سوئنگ'' کرتی ہے۔ فری فال کے دوران میں ہوا کی یہی کاٹ کبھی کبھی ''جمپر'' کو اَن چاہی سمت میں موڑ دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہورہا تھا اور اضافی مشکل، گہری تاریکی تھی۔

آخر چند سیکنڈ کی فری فال کے بعد میرا پیراشوٹ کھلا اور ایک طویل ہچکولے کے بعد میرے گرنے کی رفتار کم ہو گئی۔ اوپر چند سوفٹ کی بلندی سے فائرنگ بھی ہوئی مگر یہ فائرنگ ایک اضطراری عمل کی طرح تھی اور بغیر کسی نشانے کے کی گئی تھی، لہٰذا مجھے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکی۔ میں نے دیکھا میری بائیں جانب تاریکی کے سمندر میں بینکاک کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں جانتا تھا میرے نیچے واٹس وائے اور ڈیزی کے پیراشوٹ ہوں گے۔ وہ لینڈ کر چکے ہوں گے یا کرنے والے ہوں گے۔ بہرحال وہ مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔

دفعتاً میرے پیراشوٹ کو ایک اور زوردار ہچکولا لگا اور میرے گرنے کی رفتار پھر بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں گھومنے بھی لگا۔ آخر وہ ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ میرے بوسیدہ پیراشوٹ نے کوئی کام دکھایا تھا۔ تاریکی میں مجھے فقط اتنا ہی نظر آیا کہ پیراشوٹ کا سفید کپڑا ایک جانب سے مسلسل پھڑپھڑا رہا تھا۔ شاید اس کی لائنز آپس میں الجھی تھیں جس کی وجہ سے کنوپی کی ایک سائڈ پر دباؤ بڑھا تھا اور کپڑا پھٹ گیا تھا۔ اس پیراشوٹ میں ایمرجنسی کنوپی بھی موجود نہیں تھی۔ اب جو کچھ ہونا تھا، اس مین کنوپی کے ساتھ ہی ہونا تھا۔

میری رفتار خاصی تیز ہوچکی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کب گروں گا اور کس چیز سے ٹکراؤں گا۔ نیچے صرف چار پانچ مدھم روشنیاں تھیں جن سے تھوڑا بہت اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا یوں لگتا تھا کہ پیراشوٹ صرف بیس تیس فیصد کام کر رہا ہے۔ یہ بے حد خطرناک تھا۔ جان بچ بھی جاتی تو ہڈیاں تو ٹوٹ ہی جانا تھیں۔ دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ پھر مجھ پر یہ تسلی بخش انکشاف ہوا کہ میں کسی درخت کی شاخوں سے ٹکرانے کے بعد پانی میں گرا ہوں۔ میں نے ہیلمٹ تک نہیں پہن رکھا تھا۔ شاخیں ٹکرانے سے سر پر کچھ چوٹ آئی تھی اور کمر پر بھی جلن کا شدید احساس ہوا تھا۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ میں ایک تالاب نما بارشی جھیل میں گرا تھا۔ کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنا بریٹا پسٹل کنارے پر پھینکا تاکہ وہ بھیگنے سے محفوظ رہے۔ پھر تیزی کے ساتھ خستہ حال پیراشوٹ کو اپنے جسم سے جدا کیا اور تیرتا ہوا کنارے کے پام کے پیڑوں کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ کچھ فاصلے پر ڈیزی کے پیراشوٹ پر پڑی۔ وہ شاید چند سیکنڈ پہلے ہی اتری تھی۔ اب اس کا پیراشوٹ گھنے درختوں میں الجھا ہوا تھا۔ سوڈیڑھ سوفٹ اوپر واٹس وائے والے پیراشوٹ کے آثار بھی نظر آئے۔ وہ بھی بس لینڈ کرنے ہی والا تھا۔ حالانکہ اس نے مجھ سے چند سیکنڈ پہلے چھلانگ لگائی تھی لیکن میں چونکہ آخری مرحلے میں تیزی سے نیچے آیا تھا لہٰذا پہلے اتر گیا تھا۔

میں بھاگتا ہوا ڈیزی کے پاس پہنچا، یہ جان کر دھچکا لگا کہ وہ بے ہوش ہے۔ یہ خوف کی وجہ سے تھا لیکن ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں چھلانگ لگانے کے بعد اسے کوئی گولی نہ لگ گئی ہو۔ میں نے تیزی کے ساتھ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ کسی بھی زخم سے محفوظ تھی۔ اسی دوران میں واٹس بھی ہانپتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ڈیزی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بے ہوش ہے۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”یہ ٹھیک تو ہے؟ کوئی فائر تو نہیں لگا؟“

”نہیں، خدا کا شکر ہے صرف ڈر سے بے ہوش ہوئی ہے۔“ میں نے پیراشوٹ کی بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔

”ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ وہ حرام زادے کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے۔“ وانس نے اوپر تاریک بلندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بلند بام کے پیڑوں اور ایک سپاٹ دیوار کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ ایک سطح مرتفع جیسی جگہ تھی۔ زمین کے ایک بڑے قدرتی کٹاؤ نے اس قلعہ نما قدیم عمارت کے عقب میں گہری کھائی کو وجود دے دیا تھا۔ اب یہ کھائی ہمارے لیے فرار کا ذریعہ بنی تھی۔

ڈیزی کو پیراشوٹ سے جدا کرنا کافی دشوار ہو رہا تھا۔ بہرحال ہم کسی نہ کسی طور یہ کام کرگزرے۔ ڈیزی کی بے ہوشی نے وانس کے اوسان خطا کررکھے تھے۔ وہ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے لگا اور اسے جھنجوڑنے لگا۔ ”آنکھیں کھولو ڈیزی، پلیز آنکھیں کھولو۔“ وہ بار بار پکار رہا تھا۔

میں نے وانس کو پیچھے ہٹا کر ڈیزی کو کندھے پر ڈالا اور ہم درختوں سے نکلنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھے۔ وانس کسی وجہ سے لنگڑا بھی رہا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر ہی ہمیں سڑک کے آثار نظر آگئے۔ ہمارے پاس زیادہ سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ روڈلف اور اس کے ہرکارے کسی بھی وقت چکر کاٹ کر ہم تک پہنچ سکتے تھے۔ وانس کو جو رائفل میں نے دی تھی وہ تو وہیں اوپر فصیل پر رہ گئی تھی مگر بریٹا پسٹل میرے پاس موجود تھا اور اس میں گولیاں بھی تھیں۔ جونہی سڑک پر کسی گاڑی کی روشنیاں دکھائی دیں، میں ڈیزی سمیت اس کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور کو بریک لگانا پڑے۔ یہ ایک چھوٹی سی کار تھی اور خستہ حال بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص کچھ سمجھ پاتا، ایک جانب کے درختوں سے وانس جھپٹ کر نکلا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور تھائی ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ وہ قریباً پانچ ساڑھے پانچ فٹ کا شخص تھا گرانڈیل وانس کے سامنے بونا ہی لگا۔ وانس نے ایک ہی طوفانی مکے سے اسے ادھ موا کر کے سڑک کے کنارے نیم تاریکی میں پھینک دیا۔

میں نے ڈیزی کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا اور ڈرائیونگ سنبھال لی۔ وانس میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہی وقت تھا جب بلندی پر واقع قلعہ نما عمارت کے اوپر ایک ہیلی کاپٹر پھڑپھڑاتا محسوس ہوا۔ ہماری تلاش شروع ہو چکی تھی اور یقیناً یہ تلاش صرف فضا تک محدود نہیں رہنا تھی۔ عنقریب اس پورے علاقے کی سڑکوں پر روڈلف کے ہرکاروں نے بھاگ دوڑ کرنا تھی۔ میں نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی کافی بری حالت میں تھی۔ میں ایکسلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا مگر وہ اپنی مرضی سے رفتار پکڑتی تھی اور کبھی نہیں پکڑتی تھی۔ اسی دوران میں دور عقب میں پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ مطلب یہی تھا کہ جس تھائی کو گھونسا مار کر وانس نے سڑک پر پھینک دیا تھا، اسے دیکھ لیا گیا ہے۔

میں جانتا تھا کہ فخر میرے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ اس کے پاس رینٹ کی کار موجود تھی۔ میرا سیل فون تو بھیگ کر ناکارہ ہو گیا تھا۔ تاہم گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے ایک سیل فون برآمد ہوا اور وہ کام کر گیا۔ جونہی فخر سے رابطہ ہوا میں نے پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟“

وہ بولا۔ ”ایف چوک کے پاس، لیکن تم تو خیریت سے ہو۔ ابھی اوپر عمارت کی طرف سے فائرنگ کی بہت زیادہ آواز آئی ہے۔ ایک چاپر بھی اڑ کر گیا ہے۔“

”یہ سارا ”پروٹوکول“ ہمارے لیے ہی تھا۔ ہم اس وقت ایک منحوس عمر رسیدہ گاڑی میں ہیں جو ہمیں مروا کر چھوڑے گی۔ ہم بینکاک روڈ کے پہلے چوراہے کی طرف جا رہے ہیں۔ تم کسی طرح وہاں پہنچو فوراً...... گاڑی کا رنگ سبز ہے اور یہ فوکسی ہے۔“

”او کے، آ رہا ہوں۔“ فخر نے کہا۔

وانس بیٹی کے لیے بے حد پریشان تھا اور بار بار مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ وہ بولا۔ ”ہمیں سب سے پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچنا ہوگا۔ یہ بالکل بے ہوش ہے۔“

میں نے بھی مڑ کر پچھلی نشست کی طرف دیکھا۔ وہ بمشکل گیارہ بارہ سال کی ہوگی۔ چست نیکر پہنے ہوئے تھی۔ جسم دبلا پتلا تھا لیکن نقوش اچھے تھے۔ وہ بلوغت کی پہلی سیڑھی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید ابھی تھوڑی دیر بعد خود ہی ہوش میں آجائے۔ میں نے وانس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”اس طرح کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ٹھیک نہیں ہوگا، میرا خیال ہے کہ ہمیں انتظار کرلینا چاہیے۔“

”چپ رہو۔“ وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ”میرے

لیے اس سے اہم کچھ نہیں، پہلے ہم کو اسپتال جانا ہوگا۔"

میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اسی دوران میں ڈیزی نے کسمسانا شروع کر دیا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑائی۔ "میں مر جاؤں گی۔ مجھے بچا لو...... مجھے بچا لو۔"

وہ بچانے کی التجا کر رہی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ فی الحال تو وہ بچائی جا چکی ہے۔ وہ دشمنی اور انتقام کے اس جال سے نکل آئی ہے جو اس کے باپ کی وجہ سے اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ یہ لوہے کا جال تھا اور مستقبل قریب میں وہ اس کے جسم کو یوں جکڑنے والا تھا کہ اس کو زخم زخم ہو جانا تھا۔

یہی وقت تھا جب فخر نے مجھے فون کر کے بتایا کہ وہ بینکاک روڈ کے پہلے چوراہے پر پہنچ گیا ہے۔ (اپنی چھوا گاڑی، کے ساتھ ہم بھی چوراہے کے پاس ہی تھے) میں نے اطمینان کی طویل سانس لی۔

☆☆☆

ہم فخر کی گاڑی میں سوار ہو کر اسی ہوٹل میں پہنچ چکے تھے جہاں پہلے دن سے ہمارا قیام تھا۔ یہ بینکاک کے ایک گنجان علاقے میں متوسط درجے کا گمنام ہوٹل تھا اور ہم یہاں خود کو بہت محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ میں نے اور فخر نے اپنا مشترکہ کمرا وانس وائے اور اس کی بیٹی کے لیے خالی کر دیا۔

وانس وائے کی بازیابی اور آزادی کی خبر اتنی بڑی تھی کہ انڈر ورلڈ میں ایک تہلکہ مچنے والا تھا۔ بہت سے لوگ تو اسے مردہ تصور کر چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب جان ڈیرک ہی ٹیکساری گینگ کا واحد کرتا دھرتا ہے۔ اب یقینی بات تھی کہ ٹیکساری گینگ کے اندر بھی زبردست ٹوٹ پھوٹ مچنے والی ہے۔ گینگ کے بے شمار لوگ ایسے تھے جن کے دلوں میں اب بھی اپنے اولین باس کی وفاداری موجود تھی۔

میں نے ہوٹل کی لابی میں فخر سے کہا۔ "میں اب وانس کے سامنے زیادہ نہیں آنا چاہتا۔ ابھی تک تو افراتفری کا عالم تھا اور اس نے میری شکل شباہت پر زیادہ توجہ نہیں دی مگر اب وہ غور کرے گا۔"

"یعنی تم اس پر اپنی اصل شناخت نہیں ظاہر کرنا چاہتے؟"

"بہتر تو یہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے کہا۔ "اب تم ہی اس سے رابطہ رکھو۔ میرے بارے میں کہنا کہ میں اب بینکاک میں نہیں ہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"بینکاک میں ہی رہوں گا یار! آس پاس کے دوسرے ہوٹل میں چلا جاتا ہوں۔"

"تمہاری اصلیت یعنی ایسٹرن کنگ کے بارے میں کیا بتانا ہے وانس کو؟"

"وہی جو دوسروں کو معلوم ہے۔ چند ہفتے پہلے میں پاکستان میں ہونے والے ایک حادثے میں "جاں بحق" ہو چکا ہوں۔"

"یار! وہ بڑا خطرناک شخص ہے۔ ایسے لوگ جھوٹ بڑی جلدی پکڑ لیتے ہیں۔ وہ اس سارے معاملے کو ہی کوئی سازش قرار نہ دے دے۔"

"بڑی بیکار بات کر رہے ہو فخری، ہم نے اسے ایک چنگل سے نکالا ہے کہ وہ ساری عمر ہمارا احسان مند رہے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ہمیں کسی بڑے انعام و اکرام سے نوازنے کی کوشش بھی فرمائے۔ بلکہ اب میں تو ویسے ہی سائڈ پر ہو رہا ہوں۔ اب اس کی ہر مہربانی تمہارے حصے میں ہی آئے گی۔"

"اور اگر اس پر کوئی آفت ٹوٹی تو اس میں سے بھی مجھے ہی حصہ ملے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے جان ڈیرک اور روڈلف وغیرہ اتنی آسانی سے باپ بیٹی کا پیچھا چھوڑ دیں گے؟"

"لیکن اب وہ بھی اکیلا تو نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی ایک دو گھنٹے کے اندر اندر وہ گینگ میں اپنے ہمنواؤں سے رابطے کر رہا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کا پہلا ٹکراؤ یہاں بینکاک میں ہی ہو جائے۔"

میں نے صبح نو دس بجے کے لگ بھگ ایک قریبی علاقے پارک لین میں ایک ہوٹل میں کمرا بک کرا لیا۔ فخر بدستور اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرا رہا جہاں ٹیکساری کا عالمی شہرت یافتہ ڈان اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھا۔

وہ بینکاک کی ایک رنگا رنگ شام تھی۔ روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ تفریح گاہیں، نائٹ کلب، کیسینوز اور قحبہ خانے بارونق ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اپنے اپنے کاموں سے واپس آنے والے لوگ اب اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے اور نائٹ لائف کا آغاز ہو رہا تھا...... ہاں یہ اس شہر عشرت میں ایک معمول کی شام تھی مگر اس کے اندر کچھ جدا بھی تھا۔

شام چھ بجے کے قریب مجھے فخر کا پہلا فون آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ وانس وائے نے چار پانچ برس کی مکمل

خاموشی اور لاچاری کے بعد اپنا پہلا سیل فون حاصل کر لیا ہے اور اس کے ذریعے گینگ کے کچھ لوگوں تک یہ خبر پہنچا دی ہے کہ وہ زندہ ہے اور یہاں بینکاک میں موجود ہے۔

آٹھ بجے کے لگ بھگ فخر کا دوسرا فون آیا۔ اس نے کہا۔ ''وہی ہو رہا ہے پیارے! جو ہم سوچ رہے تھے، تہلکہ مچ گیا ہے بلکہ شاید تہلکے مچ گئے ہیں جس عام سے ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں، یہ اس وقت بینکاک کا اہم ترین ہوٹل بن گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تین چار اعلیٰ پائے کے ڈان تو اس وقت بھی یہاں ہوٹل میں موجود ہیں۔ فون بج رہے ہیں، رابطے ہو رہے ہیں۔ ڈنمارک اور لندن تک گھنٹیاں کھڑک چکی ہیں۔ ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں کئی بڑی بڑی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ ابھی تک میڈیا کو کچھ خبر نہیں ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہاں ہجوم ہو جائے۔'' فخر کی آواز میں جوش تھا۔

''ٹیکساری کے لوگ بھی نظر آئے ہیں یا نہیں؟''

''زیادہ تر ٹیکساری کے ہی ہیں اور مجھے یہ بھی لگ رہا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں وائس اپنی بیٹی سمیت یہاں سے کہیں اور منتقل ہو رہا ہے...... یہ دیکھو...... یہ میں ہوٹل کی کھڑکی میں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ کسی سیکیورٹی ایجنسی کے دو ڈھائی درجن مسلح گارڈز ہیں جو یہاں پہنچ گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ گارڈز وائس اور ڈیزی کو اپنی حفاظت میں یہاں سے لے کر جائیں گے۔''

''تم بھی ساتھ جاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''قیاس تو یہی ہے۔ ابھی تک تو مجھے یہاں وی وی آئی پی والا پروٹوکول ہی مل رہا ہے...... وائس صاحب تم سے کافی متاثر نظر آتے ہیں برادرم! اور تمہارے طفیل مجھ پر بھی صدقے واری جا رہے ہیں۔''

''چلو تمہارے لیے اچھا ہی ہے۔''

''بلکہ بہت اچھا ہے۔'' وہ فوراً بولا۔ ''یہ لڑکی تو چھوٹی ہے اگر اس کی کوئی بڑی ہمشیرہ ہوتی تو روشن امکان تھا کہ وائس وائے مجھے اپنی دامادی کا شرف عطا کر دیتا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا...... میں تم دونوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ خاص طور سے تمہارے دوست واکس سے۔''

''واکس؟'' یہ کون ذات شریف ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! تم ہو واکس۔ میں نے اسے تمہارا نام وقاص بتایا تھا، اس نے واکس بنا دیا...... اور ہاں...... اس کو تمہاری اس پیراشوٹ والی بات کا بھی پتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آج صبح مجھ سے کہہ رہا تھا۔ تمہارا وہ ساتھی نر بندہ ہے۔ خطرے مول لینا جانتا ہے۔ اس نے بڑی ہمت دکھائی ہے ہمیں وہاں سے نکالنے میں۔ اس نے بروقت فیصلہ کیا اور ڈیزی کو اٹھا کر پھینک دیا۔ ورنہ دو چار سیکنڈ اور گزر جاتے تو وہ لوگ ہمیں بھون ڈالتے...... اور اس کے علاوہ بھی واکس نے ایک احسان کیا ہے ہم پر۔ دو اچھے پیراشوٹ ہمیں دے کر خود پرانا پیراشوٹ رکھا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں جلد از جلد۔'' فخر نے آخری فقرے میں وائس وائے کی آواز کی ہو بہو نقل اتاری۔

''اسے بتا دیا میری موت کے بارے میں؟'' (یعنی ایسٹرن کنگ کی موت کے بارے میں)

''ہاں، کافی افسردہ ہوا ہے لیکن اس بات پر خوش بھی ہے کہ ایسٹرن کی وجہ سے اسے اور اس کی بیٹی کو آزادی ملی اور واکس اور مجھ جیسے دو عدد نر ساتھی بھی ملے۔ لگتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ہمیں اپنے گینگ میں کسی اہم رتبے پر فائز کرنے کی نیک تمنا رکھتا ہے۔''

''لعنت ہو اس کی تمنا پر اور اس پر بھی۔ ہمارا کام بس اس کو آزاد کرانا تھا اور شکر ہے کہ ہم اس میں کامیاب رہے ہیں۔ اب یہ جائے جہنم میں اور اس کے ہوتے سوتے بھی۔''

''لیکن یار اس چھوٹی بچی کو تو بددعا نہ دو۔ وہ بے گناہ ہے۔ اندیشے لاحق ہیں کہ کہیں وہ بھی ان بدمعاشوں کے ٹاکرے میں جان نہ گنوا بیٹھے۔ مجھے یہاں آثار و حالات اور دیگر مضمرات کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔'' وہ گاڑھی اردو بول رہا تھا۔

فخر سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے پاکستان میں فون کرنے کی ٹھانی۔ میں خورسنہ کی صحت کی طرف سے بھی فکرمند تھا۔ میرا موبائل فون پانی میں گرنے کے بعد بیکار ہو گیا تھا۔ نیا موبائل مجھے ایک قریبی مارکیٹ سے دستیاب ہو گیا تھا اور میں نے اس کو چالو بھی کر لیا تھا۔ چوتھی پانچویں کوشش میں، میں سجاول سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے خورسنہ کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک اسپتال میں ہے لیکن بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ پھر اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اچانک پاکستان سے کیوں غائب ہو گیا ہوں اور اب وہاں تھائی لینڈ میں کیا کرتا

پھر رہا ہوں۔ وہ بہت غصے میں لگتا تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ جان تلی پر رکھ کر وڑ جاؤں اس حرام زادے دارج کے تاج محل میں۔ سیدھی گولیاں ماروں اس کے سر میں اور ساتھ ہی تمہاری اس بے وفا تاجور کے سر میں بھی۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سجاول! اگر تمہیں ایسی باتیں کرنی ہیں تو میں فون بند کر رہا ہوں۔“

”تو پھر کیسی باتیں کروں۔ میرا دل خون ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا مجھ سے۔ تم تو آنکھیں بند کر کے نکل گئے ہو یہاں سے۔ پر میں یہیں پاکستان میں ہوں۔ مجھ تک ساری خبریں پہنچ رہی ہیں۔ وہ کمینے کا تخم بستر پر پڑا ہے پھر بھی اس کو چین نہیں۔ اس نے تاجور کی رخصتی مانگ لی ہے۔ اس کی وہ موٹو ماں دن رات اسلام آباد سے سکھیرا کے چکر لگا رہی ہے۔ کہتی ہے کہ میرے پُتّر کو ضرورت ہے کہ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس ہو۔ خبیث ماں کا خبیث بچہ......“ سجاول نے دانت پیس کر کہا اور گالی دینے سے بمشکل خود کو روکا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”سجاول! مجھے دو باتوں کی زیادہ فکر تھی۔ ایک تو خورسنہ کی اور دوسری انیق کی۔ انیق کے ساتھ تمہاری کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“

”اب گڑبڑ نہیں ہوگی۔ سیدھا قتل ہوگا۔ اس کا یا پھر میرا۔ وہ چوہے کی اولاد چھپا ہوا ہے لیکن زیادہ دیر چھپا نہیں رہنے دوں گا۔ زمین کی ساتویں تہ سے ڈھونڈ نکلوں گا اُسے۔“

میں نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ ابھی تک وہ آمنے سامنے نہیں آئے...... میں اس حوالے سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر سجاول ایک بار پھر تاجور والے موضوع پر آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”مولوی حبیب اللہ جی دار بندہ ہے۔ اب بھی ڈٹا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ اس نے ایک بار پھر برادری کے لوگوں کو اکٹھا کیا ہے۔ کچھ عالم لوگ بھی بلائے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ ایک بھلی مانس گھریلو لڑکی کو ”نکاح“ کے نام پر ایک مانے ہوئے عادی بدکردار کے حوالے کر دینا کسی طور بھی جائز نہیں۔ اس کے خلاف آواز اٹھانا عین نیکی کا کام ہے۔ اس نے تاجور کی ماں کی بات بھی کی اور کہا کہ اولاد کے لیے جو فیصلے کیے جاتے ہیں ان میں ماں کا حق بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا باپ کا......“

وہ اس سلسلے میں مزید بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اس انداز سے فون بند کر دیا جیسے بات کرتے کرتے سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔

ایک عجیب سی بےچینی پھیل جاتی تھی سینے میں، جب میں تاجور کا ذکر سنتا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے جب تیسری بار فخر کا فون آیا۔ اس نے بتایا۔ ”ہم ہوٹل سے منتقل ہو گئے ہیں۔ یہ جنوبی بینکاک میں ایک فارم ہاؤس ہے۔ اردگرد اونچی چار دیواری ہے۔ تھائی لینڈ میں موجود وائس کے کئی ہمنوا یہاں پہنچ چکے ہیں اور کچھ ابھی آ رہے ہیں۔“

”ڈیزی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بچی کے بارے میں ایک اچھی خبر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے حوالے سے وائس کو یہی کرنا چاہیے تھا۔ اس نے اسے پہلی دستیاب فلائٹ سے کہیں روانہ کر دیا ہے۔ اب مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ اسے کہاں بھیجا گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، مجھے حالات سے باخبر رکھو۔ لگتا ہے کہ کسی طرح کی گڑبڑ کرنے والے ہیں یہ لوگ۔“

”بجا ارشاد فرمایا تم نے۔ تاہم ممکن ہے اور ”قرین قیاس“ ہے کہ گڑبڑ ان کی طرف سے نہ ہو، دوسری طرف سے ہو۔ روڈلف اور جان ڈیرک اس بات پر سر پیٹ رہے ہوں گے کہ ان کا بدترین دشمن ان کی قید سے نکل بھاگا ہے۔“

یہی وقت تھا جب مجھے فون پر کسی آٹومیٹک رائفل کے فائر سنائی دیے۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے فخر سے پوچھا۔

”شاید یہ لوگ ٹیسٹ فائر کر رہے ہیں۔“

اسی دوران میں ایک اور طویل برسٹ چلا اور پھر دو تین رائفلوں سے گولیاں چلنے لگیں۔ ”کہیں کام شروع تو نہیں ہو گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جا سکتا۔“ فخر کی آواز میں ارتعاش تھا۔

چند چھناکوں کی آوازیں آئیں جیسے دو چار بڑے شیشے ٹوٹے ہوں۔ فخر تیزی سے بولا۔ ”اچھا، میں دوبارہ فون کروں گا۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جو کچھ ہم چاہ رہے تھے، اس کا آغاز توقع سے بھی جلدی ہو گیا ہے۔

میں تھوڑی دیر تک فخر کے فون کا انتظار کرتا رہا پھر میں نے ٹی وی آن کیا۔ ایک نیوز چینل دیکھا تو وہاں نیوز کاسٹر ہیجان خیز انداز میں بول رہا تھا۔ وہ انگلش میں کہہ رہا تھا۔ ”ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پورے علاقے میں

فائرنگ ہو رہی ہے۔ کچھ راہ گیر نشانہ بن گئے ہیں۔ ایک بس کو بھی آگ لگ گئی ہے۔ لگ یہی رہا ہے کہ نجی فارم ہاؤس میں جو دو مسلح گروہ آپس میں ٹکرائے تھے، ان کی لڑائی پورے علاقے میں پھیل گئی ہے۔''

پھر نیوز کاسٹر نے اپنے فیلڈ رپورٹر سے رابطہ کیا۔

''آپ اس وقت کہاں ہیں مسٹر واٹر تنگ؟''

رپورٹر نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہوں گے۔ وہ دیکھیں وہ میرے پیچھے گاڑی سے دھواں نکل رہا ہے۔ یہ ایک ٹویوٹا کار ہے۔ اس پر اتنی شدید فائرنگ کی گئی ہے کہ اس میں بیٹھے ہوئے تینوں غیر ملکی اندر ہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد پیچھے سے ان کے ساتھی آئے ہیں اور انہوں نے فائرنگ کرنے والوں کو اس سامنے والے پلازا میں گھیر لیا ہے...... یہ دیکھیں ناظرین! آپ کو آوازیں بھی آ رہی ہوں گی۔ اندھادھند گولیاں چل رہی ہیں۔''

نیوز کاسٹر اپنے فیلڈ رپورٹر کا نام لے کر پکارا۔ ''آپ اپنی جان خطرے میں مت ڈالیں، آپ یہاں سے ہٹ جائیں...... یہاں صورتِ حال بڑی مخدوش نظر آ رہی ہے۔''

میں نے ایک اور چینل ٹیون کیا۔ اس نیوز چینل پر بھی سنسنی خیز خبر چل رہی تھی۔ بینکاک کے وسط میں ایک بڑے نائٹ کلب کی دوسری منزل پر آگ لگی ہوئی تھی اور مسلسل فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایمبولینس گاڑیوں اور فائر بریگیڈ والوں کے سائرن گونج رہے تھے اور اس گونج میں سے رپورٹر کی آواز ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ وہ تھائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا...... اور اس کا کیمرا مین نائٹ کلب کے علاوہ ایک قریبی گفٹ شاپ میں لگی ہوئی آگ کو بھی دکھا رہا تھا۔

میں نے پہلے والے چینل پر شفٹ کیا۔ وہاں اب دو تھائی نوجوانوں کو دکھایا جا رہا تھا۔ وہ لبِ سڑک پڑے تھے۔ ان میں سے ایک گولی لگنے سے مر چکا تھا۔ دوسرا زندہ تھا مگر ابھی تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ قریب جا کر اس کی مدد کر سکے۔ فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں یہاں بھی آ رہی تھیں۔ رپورٹر پکار رہا تھا۔ ''یہ دونوں راہ گیر ہیں اور دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آئے ہیں۔ خبروں سے پتا چل رہا ہے کہ متحارب گروہوں کے درمیان ہونے والی یہ لڑائی بینکاک کے کئی علاقوں میں پھیل گئی ہے۔ یہ دو بڑے گینگ ہیں یا شاید ایک ہی بڑے گینگ کے دو گروپ ہیں۔ ان میں سے کچھ ملکی و غیر ملکی شوٹر ٹولیوں کی صورت میں ہیوی بائیکس پر گھوم رہے ہیں اور اپنے مخالفوں کو ٹارگٹ کر رہے ہیں۔ پولیس ابھی تک اس تصادم کو روکنے میں ناکام ہے۔''

مجھے رضوان کی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے فون کیا۔ دوسری تیسری کوشش کامیاب ہو گئی۔ رضوان کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ زیب صاحب! میں اور میڈونا وہاں سے نکل آئے ہیں۔ وہاں حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں کی آپسی لڑائی شروع ہو گئی ہے۔''

''میڈونا کو کیوں لے آئے ہو۔ کیا یہ قابلِ بھروسا ہے؟'' میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''قابلِ بھروسا کا تو پتا نہیں جی...... مگر فی الوقت اسے بھی جان کا اتنا ہی خطرہ محسوس ہو رہا ہے جتنا مجھے۔''

میں نے رضوان کو ہدایت کی کہ کم از کم چوبیس گھنٹے کے لیے تو وہ کہیں چھپ چھپا کر بیٹھ جائے۔ اس نے میری بات کی تائید کی۔

ایک نیوز چینل پر بار بار ایک وڈیو کلپ چل رہا تھا۔ کسی کیسینو میں ہونے والی مار دھاڑ کا ذکر آ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر چونکا یہ وہی کیسینو ''بلیک مون'' تھا جہاں ایک دراز قد حسینہ کا مجسمہ ایستادہ تھا اور لوگوں کو اس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل کر باہر جانا پڑتا تھا مگر اب وہ ہال کمرا اور وہ مجسمہ تباہی کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ ٹیکساری گینگ کے مقامی شوٹرز میں یہاں خوفناک تصادم ہوا تھا...... اور یہ پہلا موقع تھا کہ دستی بم بھی استعمال ہوئے تھے۔ لاکھوں کی کراکری اور کروڑوں کا فرنیچر کباڑ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جوئے کی مشینیں تہس نہس تھیں۔ حسینہ کا نو دس فٹ اونچا مجسمہ اوندھا پڑا تھا اور دونوں ٹانگیں علیحدہ تھیں۔ ہال میں کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں سے ابھی تک دھواں اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ایک عمیق سانس لے کر ٹی وی آف کر دیا۔ دور شہر کے کسی حصے سے لائٹ مشین گن کی ''ریٹ ٹیٹ'' سنائی دی اور ایمبولینس گاڑیوں کے سائرن گونجنے لگے۔ بینکاک کی یہ رنگین جگمگاتی رات، ایک سنگین رات بن چکی تھی اور یہ سب کچھ والس وائے کے تہلکہ خیز فرار کے بعد ہوا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج رات جو کچھ یہاں بینکاک میں ہوا ہے، وہ کئی دیگر انٹرنیشنل شہرت والے شہروں میں بھی ہوگا۔ آج کی رات ٹیکساری گینگ کی بربادی کی شروعات ہو گئی تھی۔ میں اور نخر ایک مدت سے ٹیکساری گینگ کے خلاف جس بریک تھرو کو ڈھونڈ رہے تھے، وہ آج ہمیں مل

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گیا تھا۔

☆☆☆

یہ آس کیسی چیز ہوتی ہے، ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتی۔ مرتے دم تک انسان کے اندر انہونیوں کی امید باقی رہتی ہے۔ شاید یوں ہو جائے...... شاید یوں ہو جائے۔ تاجور پرائی ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک ماں باپ کے گھر میں ہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں پہنچی تھی۔ مولوی حبیب اللہ جیسے لوگ ابھی تک اس کی رخصتی کی مزاحمت کر رہے تھے۔ ذہن میں یہ خیال ابھرتا تھا شاید کوئی ایسی بات ہو جائے جو وہ بے گناہ سزا کے اندھے کنویں میں گرنے سے بچ جائے۔ وہ میری نہیں بنی نہ سہی لیکن اس کی پوری زندگی تو غارت نہ ہو۔

مجھے جو دوسری فکر لاحق تھی، وہ انیق اور سجاول کے حوالے سے تھی۔ وہ دو مختلف مزاجوں کے بندے تھے۔ بے شک وہ جاماجی میں اکٹھے رہے تھے لیکن ان کے درمیان کبھی نہیں بنی تھی۔ اب تو انیق کی وجہ سے حالات بہت سنگین رخ اختیار کر چکے تھے۔ ان حالات کی وجہ سے وہ کسی بھی وقت ایک دوسرے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ سجاول نے تو ٹھیک سے بتایا کچھ نہیں تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں کسی دوسرے کو فون کر کے اس بارے میں معلومات حاصل کروں۔ گھوم پھر کے دھیان پہلوان حشمت کی طرف ہی جا رہا تھا۔ بینکاک سے کال کافی مہنگی پڑ رہی تھی مگر رابطہ ضروری تھا۔ اگلے روز شام کو میں نے ٹرائی کی اور دوسری کوشش میں پہلوان کی بھرائی ہوئی سی آواز سنائی دے گئی۔

”تم کہاں چلے گئے ہو شاہ زیب! یہاں حالات اچھے نا ہیں ہیں۔ کہاں سے بات کر رہے ہو تم؟“

”پاکستان سے باہر ہوں...... لیکن حالات کیوں اچھے نہیں ہیں؟“ میرا دھیان ایک بار پھر آپوں آپ سجاول اور انیق کی طرف چلا گیا۔

وہ بولا۔ ”میرا دل خون کے آنسو بہاوت ہے۔ کل رات...... وہ چلی گئی ہے۔ ہمیشہ کے لیے پرائی ہو گئی ہے۔“

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تاجور کی بات کر رہا ہے۔ آخر ہونی ہو کر رہی تھی۔ فون پر خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لیے پہلوان دکھی آواز میں بولا۔ ”مولانا حبیب کی ساری کوششیں بھی بے کار ہی گئیں۔ طاقت وروں کے سامنے کسی کا زور کب چلت ہے۔ کل تاجور رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر چلی گئی ہے۔“

”شوہر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تین چار دن پہلے تلک تو اسپتال میں تھا خبیث...... اب اپنے گھر میں ہے۔“ پہلوان نے ٹھنڈی سانس لی، پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”مجھے سب سے زیادہ غصہ تاجور کے والد دین محمد پر آوے ہے۔ اس کو تو جیسے تعویذ گھول کر پلا دیے ہیں داراباں نے۔ آخر میں اس نے مولانا کو یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ اگر وہ مخالفت سے پیچھے نہ ہٹے تو دارج کے ایکسیڈنٹ والا کیس بھی ان پر اور ان کے دو قریبی مریدوں پر بنے گا۔“

میں نے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو بمشکل سنبھالنے کے بعد کہا۔ ”مولوی جی کو کوئی انگلی بھی نہیں لگا سکتا۔ چاچا حشمت آپ ان کی طرف سے باخبر رہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً بتائیں۔ ویسے اب وہ کہاں ہیں؟“

تاجور کی رخصتی کے بعد سکھیرا اسے واپس لاہور چلے گئے ہیں۔ وہاں بھی پولیس ان کو جا بے جا تنگ کرت ہے۔“ پہلوان کی آواز میں رنج تھا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ ان کو کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔

پہلوان سے بات ختم کر کے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ سینے میں دل کے اندر جیسے ایک بہت بڑا چرکا لگ گیا تھا اور مسلسل خون رس رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک پچھتاوا سا بھی دل و دماغ کو گھیرتا تھا۔ میں دل ہی دل میں خود سے سوال کرتا تھا۔ ”شاہ زیب! کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے تاجور کو روکنے کے لیے...... اُسے حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش نہ کی ہو۔ نادانستہ طور پر تم سے کوتاہی ہو گئی ہو، غفلت ہو گئی ہو۔“

اس کا جواب اثبات میں نہیں تھا۔ کم از کم میرے نزدیک تو اثبات میں نہیں تھا۔ اس کے جدا ہونے کی اور بھی کئی وجوہات ہوں گی لیکن جو وجہ فوری طور پر اُس کے فیصلہ کن اقدام کا سبب بنی تھی۔ وہ انیق کا جھوٹ ہی تھا۔ انیق نے سیف مرحوم کے حوالے سے وہ زہریلی باتیں تاجور کے کانوں تک پہنچائیں جنھوں نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ دیا۔ اس منظر کی یاد روح فرسا تھی جب میں نے انیق اور تاجور کی باتیں سنی تھیں۔ اس واقعے کے بعد میرا دل چاہا تھا کہ میں تاجور کے سامنے کوئی صفائی پیش نہ کروں لیکن پھر میں یہ بھی کر گزرا تھا۔ اپنے خط (طویل ٹیکسٹ میسج) میں، میں نے سیف کی موت کے حوالے سے ہر بات کھول کر تاجور کے سامنے بیان کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہی کچھ ہوا تھا جو ہونا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں تھا کہ شاید میں نے اسے روکنے کی بھرپور کوشش نہیں کی۔ کانٹوں کا بستر کیا ہوتا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے اور انگاروں پر لوٹنا کسے کہتے ہیں، یہ کچھ انہی کو معلوم ہوتا ہے جن پر ایسی بے مہر راتیں آتی ہیں۔ ماضی کا ایک ایک منظر نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ ایک ایک بات ساعت کو گھائل کرتی رہی۔ اس کا پہلی بار ملنا۔ لاہور میں میرے ساتھ دو دن تک گھومنا پھرنا، پھر اچانک غائب ہوجانا، ایک ہی فون نمبر پر میرا ہزاروں بار فون کرنا...... جدائی کے وہ جاں گسل تین سال جب میں نے ہر ہر پل اس کا انتظار کیا اور دل میں یہ امید زندہ رکھی کہ ہم کم از کم ایک بار تو مزید ملیں گے...... اور پھر اس امید کا پورا ہونا۔ فرح کے ساتھ میرا تاجور کو دیکھنا...... پھر چاند گڑھی کی چاندنی راتیں اور سنہری صبحیں، جن کے ہر ہر پل میں ہریالی کی خوشبو اور محبت کی سرگوشیاں رچی بسی تھیں۔ پھر ملنگی ڈیرے کے طلسمی روز و شب جن میں وہ ہر گھڑی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اسے قریب سے دیکھا تھا اور میرا یہ یقین پختہ ہوا تھا کہ اس کے نقوش میں کوئی ایسی بات ہے جس کے سبب وہ شاید دنیا کی دلکش ترین عورتوں میں شمار ہوسکتی ہے۔ ملنگی ڈیرے کے بعد سجاول کا ٹھکانا اور اس کے بعد جاماجی کا پُرفسوں جزیرہ...... ہاں کہاں کہاں اس کی یادیں نقش نہیں تھیں اور آج ان ساری مشترکہ یادوں کی قبر پر میں تنہا کھڑا تھا...... اس قبر کا وہ کتبہ پڑھ رہا تھا جس پر دائمی جدائی درج تھی۔ شاید اسی لیے تاجور نے اپنی عزیز سہیلی ریشمی کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا۔

درد جگر تے سخت سزاواں عشق دیاں
او کھے پینڈے لمیاں راہواں عشق دیاں

☆☆☆

اس رات بینکاک میں جو ہنگامے ہوئے تھے، ان میں کم و بیش بیس افراد جان سے گئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد سو کے قریب تھی، مالی نقصان اس کے علاوہ تھا۔ ہلاک ہونے والوں میں دس کے لگ بھگ راہ گیر تھے جبکہ دس افراد کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا۔ اب یہ بات کسی کے لیے راز نہیں رہی تھی کہ یہ تصادم بدنام زمانہ ٹیکساری گینگ کے دو گروپس میں ہوا تھا...... اور بات صرف یہیں تک نہیں رہی۔ اب اس واقعے کو تین دن گزر گئے تھے اور کوپن ہیگن اور برمنگھم سے بھی ایسی ہی خونی جھڑپوں کی اطلاع آئی تھیں۔

میرا دل واپس پاکستان جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر پتا نہیں کیوں سجاول اور انیق کے حوالے سے میرے ذہن میں مسلسل برے برے خیالات جنم لے رہے تھے۔ کبھی دل چاہتا تھا پاکستان چلا جاؤں، کبھی چاہتا تھا کہ اس سرزمین کی طرف سے اپنا رخ بالکل موڑ لوں۔ دو تین روز اسی شش و پنج میں گزر گئے، بالآخر میں نے پاکستان کے بجائے یورپ جانے کا فیصلہ کیا، اپنی بدلی ہوئی شکل اور کوائف کے ساتھ میں آزادانہ پھر یورپ میں داخل ہوسکتا تھا، اپنے والدین سے مل سکتا تھا اور اپنے چچا حفیظ کے لیے بھی کوئی مستقل پناہ گاہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ فخر بھی یہی چاہتا تھا کہ میں اب کچھ دیر کے لیے پاکستان سے دور چلا جاؤں۔ وہ مجھے ہر صورت اپنے ساتھ واپس انگلینڈ لے جانے کا خواہاں تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ ہم وہاں رہ کر ٹیکساری گینگ کی بربادی کا تماشا دیکھیں اور حتی المقدور اس بربادی میں اپنا حصہ بھی ڈالیں۔

رضوان کو جب یہ پتا چلا کہ میں یورپ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ بھی بضد ہوگیا کہ میرے اور فخر کے ساتھ جائے گا لیکن میں نے اس کے لیے پاکستان میں ایک اہم کام سوچ رکھا تھا۔ یہ ایک بڑی اہم ذمے داری تھی اور مجھے پتا تھا کہ رضوان یہ نبھا سکتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان میں رہے اور مولانا حبیب اللہ کی حفاظت کی ذمے داری اٹھائے۔ ویسے تو میں نے پہلوان حشمت کو بھی مولانا کے بارے میں باخبر رہنے کا کہہ رکھا تھا مگر پہلوان حشمت ایک حد تک ہی یہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ دارابیوں کی طرف سے مولانا کو کسی اوچھے ہتھکنڈے کا شکار بنایا جائے گا۔ میں نے پوری بات رضوان کو سمجھا دی...... اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ مسجد کے ایک خدمت گار کی حیثیت سے مولانا کے آس پاس رہے گا اور اگر کسی طرح کا کوئی بھی اندیشہ ہو تو فوراً سجاول کو اس سے آگاہ کرے گا۔

میں نے تھائی لینڈ سے ہی مولانا حبیب اللہ کو ایک طویل فون کال بھی کردی جس میں ان سے گزارش کی کہ وہ میرے قریبی اور بااعتماد دوست رضوان کو اپنی خدمت میں قبول کریں۔

جب میں لاہور میں تھا تو میں نے مولانا کو ایک نہایت مشکل صورت حال سے نکالا تھا۔ وہ میری صلاحیت کے معترف تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ میرا ساتھی بھی ان کے لیے ضرور سودمند ثابت ہوگا۔ یوں تو وہ اللہ پر توکل کرنے والے بندے تھے مگر میرے پُرزور اصرار پر انہوں نے رضوان کے سلسلے میں میری بات مان لی اور بس اتنا کہا۔ ”وقاص! موت کا ایک دن مقرر ہے، ہمیں اس پر یقین رکھنا چاہیے۔“

دوسری طرف میں نے سجاول کو بھی فون کردیا کہ وہ میری غیر موجودگی میں مولانا حبیب اللہ سے کسی طرح کی

زیادتی نہیں ہونے دے گا۔ اپنی قانونی مدد تو وہ خود بھی کر سکتے تھے لیکن اگر کوئی اوچھا ہتھکنڈا اُن کے خلاف استعمال ہوتا تو پھر اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیے جانے کی ضرورت تھی۔

رضوان پہلے سے بہت زیادہ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس میں جرأت اور بے خوفی کے ساتھ جہاندیدگی بھی آگئی تھی۔ وہ یہ بات بخوبی سمجھ رہا تھا کہ میں فی الحال اپنی شناخت چھپائے رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید تھی کہ کم از کم رضوان کی وجہ سے تو میرے "حیات" ہونے کا راز فاش نہیں ہوگا۔ میں ایک عجیب طرح کا اعتماد اس پر محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اسے پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ میں مولانا حبیب اللہ سے وقاص کے نام کے ساتھ ہی ملا ہوں اور سکھیرا گاؤں میں میری حیثیت سیف کے والد کے ڈرائیور کی تھی۔

☆☆☆

زندگی تبدیلیوں اور غیر متوقع حالات کا نام ہے جو کچھ سوچا ہوتا ہے، وہ نہیں ہوتا اور جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا، وہ ہم پر وارد ہو جاتا ہے۔ میں فخر کے ساتھ تھائی لینڈ سے ڈنمارک کے لیے پرواز کر گیا۔ تھائی لینڈ سے یورپ کے لیے پرواز کریں تو مشرق سے مغرب کی طرف جانا پڑتا ہے۔ انہی فضاؤں سے گزرنا پڑتا ہے جن کا تعلق ہماری سرزمین سے بھی ہے۔ امارات ائرلائن کے بوئنگ طیارے میں پرواز کرتے ہوئے میں نے نیچے دیکھا تو دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ یہیں کہیں کوئی خطہ تھا، کوئی جگہ تھی جہاں میرا بہت کچھ موجود تھا۔

ڈنمارک کے شب و روز کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، وہ بہت ہیجان خیز دن تھے۔ ہمارے اردگرد ٹیکساری گینگ کے حوالے سے بہت کچھ ہو رہا تھا اور ہمیں مسلسل خبریں بھی مل رہی تھیں۔ حالات اسی رخ پر جا رہے تھے جو ہم نے سوچا تھا۔ اسی دوران میں، میں نے کچھ وقت نکالا اور آسٹریا کے اس دور دراز قصبے "واسٹو" میں گیا جہاں میرے والدین بالکل الگ تھلگ لیکن محفوظ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے ترس رہے تھے لیکن مجھے دیکھ کر بھی پوری طرح نہ دیکھ سکے۔ میں کاسمیٹک سرجری کی آڑ میں تھا۔ بے شک میرا چہرہ تیس پینتیس فیصد سے زیادہ تبدیل نہیں ہوا تھا مگر تبدیلی تو تھی۔ ماں باپ اپنی اولاد کی مجبوریاں بہت جلد سمجھ لیتے ہیں اور تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔ انہوں نے میری مجبوری تسلیم کر لی اور میری بدلی ہوئی صورت کے ساتھ ہی مجھے سینے سے لگا کر اپنے کلیجے ٹھنڈے

کیے۔

اسی دوران میں میری کوشش سے چچا حفیظ کے سفری کاغذات بھی تیاری کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اب امید تھی کہ وہ بھی بہت جلد یہاں اپنے بھائی اور بھابی کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس کے علاوہ اب مجھے کسی کی فکر نہیں تھی۔ میرا اور تھا بھی کون؟ ماں کی نگاہ اپنی اولاد کے اندر بہت دور تک دیکھتی ہے۔ میں نے آج تک اپنی والدہ سے تاجور کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ میرے بتائے بغیر جانتی تھیں کہ پاکستان میں کوئی لڑکی ہے جو میرے دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے۔ والدہ نے مجھ سے بہت پوچھا لیکن میں نے انہیں ایک وقتی تعلق کا کہہ کر ٹال دیا۔ والدہ نے فخر کو گھیرا اور اس کو ہر طریقے سے کریدنے کی کوشش کی مگر وہ بھی میری ہدایت کے خلاف نہیں جاسکتا تھا۔ ایک دن وہ بولا۔ ”یار! پہلے صرف تم پر ترس آتا تھا اب خالہ جان پر بھی آتا ہے۔ پتا ہے پرسوں مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”وہ رو رہی تھیں۔ مجھ سے درخواست کر رہی تھیں کہ میں کسی طرح ایک بار ان کو اس لڑکی سے ملوا دوں، اور کچھ نہیں تو فون پر ہی بات کروا دوں، وہ مجھ سے ملے گی تو میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گی، میں شاہ زیب کو آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اسی لیے تو تجھ سے کہتا ہوں کہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

اور پھر تیسرے ہی روز میں اور فخری آسٹریا کے اس واشونامی پُرفضا قصبے سے واپس آگئے۔

ایک بار پھر کوپن ہیگن ہمارا مسکن تھا۔ کوپن ہیگن میں دس بارہ روز گزارنے کے بعد ہمیں ایمسٹرڈیم جانا پڑا۔ وہی شہر آشوب جہاں زندگی اپنے ہر رنگ میں پوری تابانی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ بظاہر اس شائستہ اور ایڈوانس شہر کی تہ میں بھی انڈر ورلڈ کا وسیع تانا بانا پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ٹیکساری گینگ واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ چکا تھا بلکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے تین گروہ بن چکے ہیں۔ ایک گروہ کو جان ڈیرک لیڈ کر رہا تھا اور دوسرا گروہ جو نسبتاً زیادہ بڑا اور مضبوط تھا، وانس وائے کو اپنا لیڈر مان رہا تھا۔ ان کے نزدیک وانس وائے ہی گینگ کی سربراہی کا اصل حق دار تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ جان ڈیرک نے اپنے باپ کی نافرمانی کرتے ہوئے وانس وائے کو منظر سے ہٹایا اور ایک عرصے تک اسے قید و بند کی تکلیفوں سے دوچار رکھا۔

بے شک ایسے بے رحم جرائم پیشہ افراد کی زندگی سے اخلاقیات کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر بھی ٹیکساری گینگ کے اکثر ارکان کا خیال تھا کہ جان ڈیرک نے وانس وائے کی بچی کے بارے میں جو ارادے باندھ رکھے تھے، وہ بے حد غلط تھے۔ وہ اپنی ضد پوری کرنا چاہتا تھا اور بہت بُری نیت سے اس کے بالغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایمسٹرڈیم میں بھی آئے دن دونوں گروپوں میں جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو قتل کیا جا رہا تھا۔ گینگسٹرز کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ آبرو ریزی کے واقعات ہو رہے تھے۔ ٹیکساری گینگ کا پورا ڈھانچا لرزہ براندام تھا اور ڈ-تھ اسکواڈ کے ہم شکل شیطان بھی اسی ڈھانچے کا حصہ تھے۔

ایک روز میں سٹی سینٹر کے ایک بڑے پب میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ فخر کا فون آیا۔ اس کی آواز میں چہکار تھی۔ بولا۔ ”ٹیکساری کی واٹ لگ گئی ہے۔ برادرم! ہمارے نقطۂ نظر سے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔“

”جان ڈیرک کی لاش کسی گٹر سے ملی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی حالات برقرار رہے تو وہ بھی مل جائے گی.... فی الحال یہ جان لو کہ ڈ-تھ اسکواڈ بھی دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ کم و بیش پچیس عدد شیطان زادے اپنی تمام تر حرامزدگی اور نحوست کے ساتھ وانس وائے سے جا ملے ہیں۔ انہوں نے جہاں اپنے بدمعاش باپ کے ”ڈی این اے“ سے اور بہت سی خباثتیں لی ہیں وہاں یقیناً غداری بھی شامل ہے۔“

☆☆☆

وہ بڑے سنسنی خیز دن تھے۔ دو تین مرتبہ ڈ-تھ اسکواڈ کے شیطانوں سے ہماری مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ ان میں سے ایک مڈبھیڑ بڑی تہلکہ خیز تھی۔ آپس کی ایک خوفناک جھڑپ کے بعد ڈ-تھ اسکواڈ کے پانچ ہم شکل ”جانور“ ہارلم کے قریب ایک جنگل میں جا چھپے تھے۔ ان میں سے دو زخمی بھی تھے۔ میں نے اور فخر نے انہیں جا گھیرا۔ وہ عیاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہم نے ایک زبردست مقابلے کے بعد ان پانچوں کو جہنم واصل کر دیا۔ وہ اتنے خطرناک تھے کہ گھنے جنگل میں خالی ہاتھ بھیڑیے اور جنگلی کتے جیسے جانوروں کا شکار کر کے ان کا گوشت کھاتے رہے تھے۔ اپنے پاس موجود ایمونیشن انہوں نے مخالف گروپ سے مقابلے

کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔

ان دنوں مجھ پر عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ زندگی اور موت میں جیسے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کسی وقت تو جی چاہتا تھا کہ اپنی زندگی سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔ مگر یہ چھٹکارا خودکشی کی صورت میں نہ ہو بلکہ زیرزمین مجرموں کے خطرناک ترین ٹھکانوں میں گھس جاؤں۔ زمین پر سے ان کا جتنا بوجھ بھی کم کرسکتا ہوں کر دوں اور پھر خود بھی کسی جوابی کارروائی کا شکار ہوکر قیدِحیات سے رہائی پالوں، لیکن سیانے شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ موت کا تعاقب کرو تو وہ آگے لگ کر بھاگتی ہے اور آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ ان دنوں بھی آنکھ مچولی جاری تھی اور کبھی کبھی اس کھیل کے دوران میں ایک بجلی سی بھی چمکتی تھی۔ ایک بے مثل چہرے اور ایک مسکراہٹ کی بجلی...... اس قیام کے دوران میں ایک مرتبہ ڈاکٹر کرنل احرار سے بھی ملاقات ہوئی۔ میری ٹھوڑی کے اردگرد جلد میں تھوڑی سی سرخی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ کاسمیٹک سرجری کا ہی ایک عمومی ری ایکشن تھا۔ کرنل احرار نے میری اس شکایت کو بخوبی دور کردیا۔

اسی طرح قریباً پانچ ماہ گزر گئے۔ میں نے فخر کو منع کر رکھا تھا کہ وہ پاکستان سے آنے والی کوئی خبر مجھ تک نہیں پہنچائے گا۔ میں نے اپنا سیل نمبر بھی ایک بار پھر تبدیل کرلیا تھا مگر ہونی ہوکر رہتی ہے۔ ایک دن ایک ایسی اطلاع مجھ تک پہنچی کہ میں بُری طرح تھرا گیا...... اور مجھے ایک بار پھر نہ چاہنے کے باوجود پاکستان کا رخ کرنا پڑا۔ میں اور فخر مکس مارشل آرٹ کے مقابلے دیکھنے کے لیے ایمسٹرڈیم کے ایک بڑے کلب میں پہنچے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ چیلنج مقابلے ان چند کھلاڑیوں کی یاد میں منعقد ہورہے تھے جو پچھلے پانچ چھ برسوں میں مقابلوں کے دوران میں یا ویسے ہی راہیِ ملکِ عدم ہوئے تھے۔ میں بھی ان میں "شامل" تھا۔ "مرحومین" کی بڑی بڑی تصویروں میں میری تصویر بھی نمایاں جگہ پر نظر آرہی تھی۔ اپنی اس تصویر سے صرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر میں خود بھی اپنے دوست فخر کے ساتھ موجود تھا۔

مقابلوں کے دوران میں ریفریشمنٹ کے لیے ایک گھنٹے کا وقفہ تھا۔ میں اور فخر ایک فوڈ سینٹر میں جا بیٹھے۔ فخر مجھے کچھ افسردہ نظر آرہا تھا۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ اس کی افسردگی کی وجہ سیل فون سے جڑی ہوئی ہے۔ شاید اسے کوئی تازہ کال یا میسج آیا تھا۔

میرے استفسار پر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے مجھے پابند کررکھا ہے کہ میں پاکستان سے ملنے والی کوئی اطلاع تم تک نہ پہنچاؤں لیکن میں نے تم سے کہا تھا کہ کوئی بہت ضروری اطلاع ہوئی تو میں خود کو باز نہیں رکھ سکوں گا۔"

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے گہری سانس لی۔ "اچھا اب بول ہی پڑے ہو تو پھر بک دو۔"

وہ بولا۔ "میں مولانا حبیب اللہ کی طرف سے پریشان ہوں۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ انہیں داراب والوں کی طرف سے خطرہ ہے۔"

"کیا کوئی بات ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ہو بھی جائے تو پھر ہمارا ردِعمل کیا ہوگا؟"

"صاف بات کرو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم نے رضوان کو مولوی صاحب کے آس پاس رہنے کا کہا تھا۔ بے شک وہ باہمت لڑکا ہے مگر تمہارا کیا خیال ہے وہ مولوی جی کو درپیش خطروں کا مقابلہ کرسکتا ہے؟"

"خطروں کا مقابلہ اکیلے اس کو نہیں کرنا۔ اس نے سجاول سیالکوٹی کو اطلاع پہنچائی ہے اور میرے خیال میں سجاول کسی معمولی بندے کا نام نہیں۔"

"لیکن جناب عالی! یہ غیر معمولی بندہ اگر دستیاب ہو تو پھر ہے ناں، وہ تو موجود ہی نہیں ہے۔ اپنی دشمنیاں چکانے کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔"

"فخری! پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ اصل بات بتاؤ۔ مولوی صاحب کے ساتھ کچھ ہوا ہے؟"

"ہاں، وہ سخت زخمی ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ایک عقیدت مند کی گاڑی میں لاہور سے باہر جارہے تھے۔ ایک سڑک پر ایک مشتعل گروہ نے ان کا راستہ روکا۔ پہلے ان کی گاڑی پر شدید پتھراؤ کیا اور شیشے توڑ دیے۔ پھر ان پر حملہ کردیا۔ ان کو "چندہ خور" اور چور جیسے القابات دیے گئے۔ مولوی حبیب اللہ کی حفاظت کرتے ہوئے ان کے ایک مرید نے جان دے دی اور کئی ایک زخمی ہوئے۔ پولیس کی آمد پر حملہ آور بھاگ گئے۔ مولوی صاحب کے ایک بازو اور پسلیوں پر شدید چوٹیں آئی ہیں۔"

"اوہ گاڈ!" میں نے سر پکڑلیا۔ "پاکستان سے روانہ ہوتے وقت مجھے اسی طرح کا اندیشہ تھا۔ دلدج داراب جیسے لوگ انتقام کو بھولتے نہیں اور خود پس منظر میں رہ کر بدلہ لینے کے ان کے پاس اَن گنت طریقے ہوتے ہیں۔"

فخر بولا۔ "بات یہیں پر بس نہیں ہوئی ہے۔ جب مولانا کو اسپتال پہنچایا گیا تو وہاں بھی کچھ لوگوں نے اسپتال سے باہر ہنگامہ کیا، ہوائی فائرنگ کی اور حملہ آور ہونے کی

کوشش کی۔"

"یہ سب کچھ تمہیں رضوان نے بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، اس نے کہا ہے کہ سجاول صاحب سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ دو روز سے ان کا فون مسلسل بند جا رہا ہے۔"

"تم کہہ رہے تھے کہ سجاول اپنی دشمنیاں چکانے میں لگا ہوا ہے؟"

"ہاں اس کو تم دوسری بُری خبر کہہ سکتے ہو شاہی! وہی ہو رہا ہے جس کا تمہیں اندیشہ تھا۔ وہاں سانپ اور نیولے کا کھیل جاری ہے۔ انیق اور سجاول میں ٹاکرا ہوا ہے۔ سجاول کو کھوج ملا تھا کہ انیق کوہاٹ اور ٹل سے آگے قبائلی علاقے میں کہیں موجود ہے۔ وہ اس کے پیچھے وہاں پہنچا ہوا ہے۔"

واقعی، میرے لیے یہ دونوں خبریں تشویش ناک تھیں۔ خاص طور سے مولانا حبیب اللہ والے واقعے نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ بے شک دارابیوں جیسے لوگ معاف کرنا نہیں جانتے۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا تھا جو کر سکتے تھے مگر اب بھی ان کا انتقام باقی تھا۔ یقینی بات تھی کہ مولانا حبیب اللہ کے خلاف جو مہم چلائی جا رہی ہے، اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں دارج داراب یا اس کے باپ کا ہاتھ موجود ہوگا۔ انہوں نے اس واقعے کی خوب مذمت بھی کی ہو گی۔ مجرموں کو جلد پکڑنے اور کیفر کردار تک پہنچانے کے دعوے بھی کیے ہوں گے مگر خود کو پکڑنا آسان تو نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو کون ہتھکڑیاں لگاتا ہے۔ خانہ پُری کے لیے کسی بے گناہ کی گردن ماردی جاتی ہے یا اسے سلاخوں کے پیچھے زندہ درگور کردیا جاتا ہے۔

اس رات میں نے فیصلہ کرلیا کہ پاکستان جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ مولانا حبیب اللہ صاحب کے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک آگ کی طرح تھا۔ میں اس آگ سے دور رہنا چاہتا تھا مگر آگ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے مولانا کی نورانی صورت گھوم رہی تھی اور اس جدوجہد کا نقشہ تھا جو انہوں نے اپنی بھانجی کو دارابیوں کے چنگل سے بچانے کے لیے کی تھی۔ یقیناً ان کو اسی کی سزا مل رہی تھی۔

☆☆☆

میں اور فخر زماں اب ایک بار پھر پاکستان میں تھے۔ (میں اب وقاص کے نام سے ہی سفر کرتا تھا اور یہ نام میری شناخت بنتا جا رہا تھا) میں جانتا تھا، یہ لاہور ہے۔ یہ ایک طرح سے داؤد بھاؤ کے گلی کوچے بھی تھے۔ یہاں ہر چپّے چپّے پر اس کے گماشتے موجود رہتے تھے اور اپنی عقابی نگاہوں سے لوگوں کی آمدورفت پر نگاہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دارابیوں کا شہر بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ائرپورٹ کے اندر اور باہر ان کے کئی ہرکارے موجود ہوں گے، اس کے علاوہ پولیس بھی جسے بدستور میری تلاش تھی مگر میں اپنے ان سارے چاہنے والوں کی نظروں میں آئے بغیر آزادانہ لاہور میں وارد ہو گیا تھا۔ ہم مال روڈ کے ایک معروف ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی شام میں مولانا حبیب کی خبرگیری کے لیے ان کے گھر جا پہنچا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے مولانا حبیب کی رہائش گاہ مسجد کے بالکل ساتھ ہی واقع تھی۔ جب ان پر پہلی بار مشتعل لوگوں سے حملہ کرایا گیا تھا تو میں اتفاقاً یہاں موجود تھا اور میں نے خود کو ان کے سامنے ڈھال بنایا تھا۔ اس واقعے نے مجھے بحیثیت وقاص، مولانا کی نظروں میں ایک اہم مقام دے دیا تھا۔

میں شام کے بعد مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں مزاج پُرسی کے لیے آنے والوں کا ہجوم تھا۔ ظاہر ہے کہ سب تو اندر نہیں جا سکتے تھے۔ مولانا کے برادرِ نسبتی میزبانی کر رہے تھے۔ بہرحال تھوڑے سے انتظار کے بعد مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک کشادہ کمرے میں مولانا بستر پر نیم دراز تھے۔ ان کا ایک بازو پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ پسلیوں پر بھی بینڈیج نظر آ رہی تھی مگر ان کے چہرے پر ہمیشہ نظر آنے والا اطمینان اور آنکھوں سے چھلکنے والی آسودگی اپنی جگہ موجود تھی۔

میں نے ان کا حال احوال دریافت کیا۔ انہوں نے "شکر ہے یا اللہ" سے بات شروع کی اور "شکر ہے یا اللہ" پر ختم کی۔ پھر پوچھنے لگے۔ "اتنی دیر کہاں رہے ہو وقاص، بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے؟"

"بس لاہور میں نہیں تھا جناب! ورنہ ضرور حاضر ہوتا رہتا۔ آپ ہی تو فرماتے ہیں کہ جہاں کا دانہ پانی ہوتا ہے وہاں بندہ ضرور پہنچ جاتا ہے۔"

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور مجھے رضوان ٹی کی شکل نظر آئی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی جو اس کے وجیہہ چہرے پر خوب جچتی تھی۔ وہ ٹرے میں ایک گلاس کے اندر ہلدی ملا دودھ لے کر آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"سلام وقاص بھائی۔"

میں نے سلام کا جواب دیا۔ رضوان نے گلاس مولانا کے پاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔

مولانا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''اس بندے کو بھیج کر تم نے میرے ساتھ بڑی بھلائی کی ہے۔ چوبیس گھنٹے کا مستعد خدمت گار دے دیا ہے مجھے۔ میں ہزار بار کہتا ہوں اللہ کے بندے اپنی نیند پوری کیا کر، مگر مجال ہے جو اس پر اثر ہو۔''

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں جی۔'' رضوان نے کہا۔

''آپ کو تو مجھ جیسے سیکڑوں عقیدت مند مل جائیں گے لیکن مجھے آپ جیسا محترم کہاں ملے گا۔''

مولانا کی دوا کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ رضوان نے انہیں دوا کھانے میں مدد دی اور پھر اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

دیکھا جاتا تو مولانا پر اوپر تلے دو دفعہ قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ سڑک پر اور چند گھنٹے بعد اسپتال میں۔ لیکن وہ بالکل مطمئن نظر آتے تھے۔ میں نے پورے یقین سے کہا۔ ''مولانا! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر اس کے پیچھے انہی لوگوں کا ہاتھ ہے جن کی مخالفت آپ نے رشتے کے سلسلے میں کی تھی۔''

''نہیں وقاص، ہمیں بغیر ٹھوس ثبوت کے کسی پر الزام نہیں دھرنا چاہیے۔ یہ بہتان کے زمرے میں آتا ہے اور اللہ رب العزت نے اس کی سخت سزا رکھی ہے۔''

''ایسے لوگ ثبوت کہاں چھوڑتے ہیں حضرت! یہی تو ان کا ہنر ہوتا ہے۔''

''پولیس تفتیش کر رہی ہے ناں، ایک دو بڑے اچھے افسر ہیں۔ مجھے امید ہے وہ فرض شناسی سے کام کریں گے۔''

''گستاخی معاف، یہ کبھی بھی نہیں ہو گا۔ زیادہ ہوا تو کسی مرغے کو پھانس کر اس پر دفعہ 302 لگا دی جائے گی...... اصل ذمے دار اپنے سائے کو بھی نہیں چھونے دیں گے۔''

''اچھا چھوڑو اِن باتوں کو۔'' انہوں نے ٹوپی سر سے اتار کر اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''تم نے پچھلی دفعہ اس لڑکی کا ذکر کیا تھا جس سے عقد کرنا چاہتے تھے۔ اس کا کیا بنا؟''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں مولانا کو کیا بتاتا کہ وہ آپ کی وہی بھانجی تو ہے جو اس وقت اسلام آباد کے کسی ''اونچی دیواروں والے محل'' میں نو بیاہتا کے روپ میں موجود ہے۔ میں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''آپ ٹھیک ہی کہتے تھے حضرت! ایک مرضی انسان کی ہوتی ہے اور ایک رب کی...... اور ہوتا وہی ہے جو رب چاہتا ہے۔ وہ لڑکی بھی اپنے والد کی من مانیوں کے سامنے بند نہیں باندھ سکی۔ اس کی شادی ہو گئی ہے...... آپ میرے لیے صبر اور حوصلے کی دعا کیجیے۔''

مولوی حبیب صاحب کے چہرے پر افسردگی کی جھلک دکھائی دی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ مزید تفصیل پوچھی...... پھر بولے۔ ''وقاص بیٹا! ایک جنت دوزخ اگلی زندگی میں ہے اور ایک جنت دوزخ اس دنیا میں بھی موجود ہے۔ ہم اپنے اعمال کے سبب اس جنت دوزخ کا مزہ بھی چکھتے ہیں۔ صبر کرنے والے اور اللہ کی رضا کے ساتھ اپنی رضا کو ملا لینے والے اس دنیا میں بھی صلہ پاتے ہیں اور ان کی زندگی میں جنت کی ہوائیں داخل ہوتی ہیں۔ دیر ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔ بندے کو اس کے رنج و غم اور تکلیفوں کا صلہ یہاں اس دنیا میں بھی ضرور ملتا ہے۔ میں اللہ پاک سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس محرومی کے بدلے کوئی ایسی عطا تمہیں کرے جو تمہارے دکھوں کا مداوا کر دے۔ کوئی ایسا تمہاری زندگی میں آئے جو تمہارے رنج و غم کو پائیدار خوشی میں بدل دے۔''

میرے دل پر چوٹ لگ رہی تھی۔ میں اُن کے سامنے کیسے وضاحت کرتا کہ میں ایک عشق کا اسیر ہوں اور ایسے لوگوں کے لیے تو ان کا غم ہی راحت بن جائے تو بن جائے ورنہ وہ غم سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ بہرحال مولانا کی باتوں نے میرے بہت سے جلتے زخموں پر ٹھنڈک بھرا مرہم رکھا اور مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔

میں نے مولانا کو بتایا کہ اب میں لاہور آ گیا ہوں اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا رہوں گا۔ میں مولانا سے تو نہیں کہہ سکتا تھا مگر مجھے شدید اندیشہ تھا کہ مولانا کے مخالفین انہیں کسی نہ کسی طریقے سے پھر نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

اگلے روز ہوٹل میں رضوان بھی آیا۔ اس کی دوست میڈونا واپس یورپ جا چکی تھی تاہم فون پر اس سے رابطہ کرتی رہتی تھی (اور ممکن تھا کہ اُس سے جھاڑیں بھی سنتی رہتی ہو) رضوان نے مجھے اور فخر کو یہاں کے حالات سے مکمل آگاہی دی۔ سجاول کے بارے میں اسے بس اتنا ہی پتا تھا کہ تین چار روز سے اس کا فون بند ہے۔ اطلاعات کے مطابق لالہ موسیٰ کے ایک بازار میں سجاول نے کسی بندے سے سخت مار پیٹ کی تھی اور اس کے بعد اسے انیق کا کچھ کھوج ملا تھا۔ وہ اس کھوج کے سلسلے میں ہی کرم ایجنسی کی

طرف گیا تھا۔

میرے پاس خورسنہ کا نمبر موجود تھا مگر یہ نمبر بھی بند جارہا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ سجاول کے قریبی ساتھی ''یونس پمپ والا'' سے رابطہ کیا جائے۔ یونس پمپ والا، مجھے وقاص کی حیثیت سے ہی جانتا تھا۔ یونس سے رابطہ ہوگیا مگر اس سے بھی بس اتنی ہی بات معلوم ہوسکی کہ بازار میں سجاول نے کسی بندے کو پکڑا تھا اور مکا مار کر اس کے ناک کی ہڈی کا چورا کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو ڈھونڈنے پشاور کی طرف نکل گیا تھا۔ یونس پمپ والا نے بتایا۔ ''بھابی خورسنہ اب تندرست ہیں اور اپنے بچے کے ساتھ لالہ موسیٰ شہر میں ہی موجود ہیں۔''

میں یونس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خورسنہ سے میری بات کرائے، بہرحال یونس سے بات کر کے خورسنہ اور بچے کی خیریت کے حوالے سے تسلی ہوگئی۔

رضوان عجیب لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی، مولانا صاحب اپنی بھانجی صاحبہ کی طرف سے بہت فکرمند رہتے ہیں۔'' میں نے چونک کر رضوان سے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔ ''شاید وہ اپنے گھر میں سکھی نہیں ہیں۔ پچھلے دنوں کسی صحافی نے اندرخانے کی خبر دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بیماری کی وجہ سے دارج داراب صاحب بہت چڑچڑے ہوچکے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بھی متاثر ہوئی ہے بلکہ اس صحافی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ دارج صاحب اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔''

رضوان کی بات سن کر میرے اندر جیسے بھک سے ایک شعلہ بھڑک اٹھا۔ وہ میری محبت تھی، میرا عشق تھی، اس کو پہنچنے والی ذرا سی تکلیف مجھے بے قرار کر دیتی تھی۔ کوئی اس کے چہرے کی طرف گستاخ نظر اٹھاتا تھا تو بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کہاں یہ کہ اس کو منکوحہ بنا کر اپنے قبضے میں کرنے والا شخص اس پر تشدد کرتا۔

میں نے تفصیل پوچھی تو رضوان نے وہی بات بتائی جو مجھے اس سے پہلے بھی معلوم ہوچکی تھی۔

اس نے کہا۔ ''میں نے آپ سے مائیکل نامی صحافی کے مضمون کا ذکر کیا تھا ناں...... اسے پاکستان سے باہر بھی کافی شہرت ملی ہے۔ صحافی نے ملنگی ڈیرے پر اپنے کیمرے کو زوم کر کے تاجور صاحبہ کی دو تین تصویریں بھی اتاری تھیں...... اور ساتھ ہی یہ لکھا تھا کہ حسن کے مقابلوں میں شریک ہونے والی خوب صورتی اور دیہات میں خودرو پھولوں کی طرح پرورش پانے والی خوب صورتی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں یہی مضمون انگلینڈ کے ایک میگزین میں بھی شائع ہوا۔ داراب فیملی میں سے کسی کی نظر اس مضمون پر پڑ گئی۔ بس اسی کا بتنگڑ بنایا گیا۔ بھن تاجور صاحبہ کے شوہر نے اس کا غصہ اتارا اور الزام لگایا کہ تاجور صاحبہ نے خود یہ تصویریں اتروائی ہیں اور یہ کوئی اکیلی بات نہیں ہے۔ ایسی کئی چھوٹی موٹی باتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ شخص اپنے گھریلو معاملات میں بہت تلخ رہتا ہے۔''

میرے سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ وہی کچھ ہورہا تھا جس کی دارج جیسے اوباش سے توقع تھی۔ وہ تاجور سے محبت کا دعوے دار تھا اور یہ ''محبت'' چار پانچ ماہ میں ہی اپنی اصلیت دکھانے لگی تھی۔ ابھی تو وہ بدبخت پوری طرح صحت مند نہیں ہوا تھا ورنہ نہ جانے اس کا کیا حشر کرتا۔

میں کمرا بند کر کے دیر تک چپ چاپ لیٹا رہا۔ خاموشی کی زبان میں تاجور سے یہ سوال کرتا رہا کہ اس نے مجھے اور خود کو اتنی بڑی سزا کیوں دی؟ کیوں جان بوجھ کر خود کو ایک جانور کے حوالے کر دیا؟ کیا اُسے وہ نظر نہیں آرہا تھا جو اس کے والد کے علاوہ باقی اور سب کو نظر آرہا تھا۔ اسے کیوں نظر نہیں آرہا تھا؟ کیا یہ وہی خود اذیتی تھی جس کے لیے کبھی کبھی مشرقی عورت کو موردِ الزام بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔

اسی روز رات کو میں نے وہ خبر بھی پڑھی جو پاکستانی صحافی کی چھان بین کا نتیجہ تھی۔ اس نے بڑے یقین سے یہ بات کہی تھی کہ چند ماہ پہلے دارج داراب کی بڑی دھوم دھام سے ہونے والی شادی اب تلخ حالات کو جنم دے رہی ہے۔ اس نے نوبیاہتا جوڑے کے قریبی ذرائع سے بتایا تھا کہ بیماری کے سبب دارج داراب صاحب چڑچڑے ہوگئے ہیں...... ان کا زیادہ تر وقت گھر میں ہی گزرتا ہے۔ انہوں نے اپنا آفس بھی گھر میں منتقل کرلیا ہے۔ ان کی بیوی جس کا تعلق درمیانے درجے کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ اپنی آنکھوں میں نجانے کیا کیا سپنے سجا کر اسلام آباد کے ایک ایکڑ پر پھیلے محل نما گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن اب ''اسٹیٹس کو'' کی اصل تلخیاں اس کے سامنے آرہی ہیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق کچھ دن پہلے ازدواجی جھگڑے کے نتیجے میں مسز تاجور دارج اپنے گاؤں سکھیرا چلی گئی تھیں لیکن عید کے موقع پر دارج داراب صاحب نے اپنے رویّے پر نظرثانی کی اور صلح کرلی مگر یہ سب کچھ عارضی تھا۔ اب پھر وہی سب کچھ ہورہا ہے جو پہلے تھا......

خبر کے متن میں آگے جا کر ایک جگہ لکھا تھا۔ ''دارج داراب صاحب کے ایک نہایت قریبی ذریعے سے یہ معلوم

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوا ہے کہ شام کے بعد دارج صاحب اکثر ہوش میں نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں مسز دارج کے بارے میں یہ خبر آئی تھی کہ وہ اپنے گھر کے ''ڈوراسٹیپس'' پر پھسل گئی تھیں، غلط تھی، ان کی اس چوٹ کی وجہ بھی کچھ اور تھی......''

مجھ سے یہ ساری خبر نہیں پڑھی گئی اور میں نے اخبار رول کر کے ایک طرف پھینک دیا۔ وہ تکلیف دہ...... آتشیں راتوں میں سے ایک اور رات تھی۔

دوسرے روز میں پھر مولانا حبیب اللہ کی تیمارداری کے لیے پہنچا۔ ہم نے رینٹ اے کار سے ایک سفید رنگ کی ہنڈا اسٹی حاصل کر لی تھی اور اس پر آمدورفت کر رہے تھے۔ میں اسی پر مولانا کی رہائش گاہ پر آیا۔ وہ مجھ پر خصوصی نوازش کرتے تھے اور مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس روز ہلکی بوندا باندی کی وجہ سے ویسے بھی رش نہیں تھا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ رضوان مجھے لے کر اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر ابھی ابھی مولانا کو دیکھ کر گیا تھا۔ وہ قدرے بہتر نظر آ رہے تھے۔ تسبیح اُن کے دائیں ہاتھ میں گردش کر رہی تھی۔ وہ خوش دلی کے ساتھ مجھ سے ملے اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

انہوں نے میرے لیے قہوہ منگوایا اور رضوان کے حوالے سے ایک بار میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا۔ ''مولانا! آپ کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں تو خود کو ملامت کرتا ہوں کہ جس وقت آپ کو میری ضرورت تھی، میں آپ کے اردگرد موجود کیوں نہیں تھا، کتنا اچھا ہوتا کہ آپ کا دفاع کرتے ہوئے جو شخص جان سے گیا ہے، وہ میں ہوتا...... یا کم از کم میں ان میں شامل ہوتا جو اس موقع پر زخمی ہوئے ہیں۔''

مولانا نے مجھے منع کیا کہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خدا سے خیر مانگنی چاہیے، اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

دو چار ملاقاتی اور بھی باہر بیٹھے تھے۔ مولانا نے رضوان سے کہا کہ ان کا شکریہ ادا کر کے ان سے معذرت کر لی جائے۔ وہ کل کسی وقت آ جائیں۔

مولانا نے مجھ سے کہا کہ میں اب کھانا کھا کر ہی جاؤں۔ وہ مجھ سے میرے حالات پوچھنے لگے کہ میں پچھلے چند ماہ کہاں رہا ہوں......

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ایک مسلح گارڈ اجازت لے کر اندر آیا۔ (یہ گارڈز مولانا کے عقیدت مندوں نے ہی یہاں متعین کر رکھے تھے) گارڈ نے جھک کر مولانا کے کان میں کچھ کہا اور اپنا سیل فون مولانا کے کان سے لگا دیا۔ مولانا نے دوسری طرف سے آنے والی آواز سنی اور مجھے ان کے چہرے پر تغیر کے آثار نظر آئے۔ ''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے کہا۔ گارڈ نے فون مولانا کے کان سے ہٹا لیا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

مولانا چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہے، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بیٹا وقاص! ایک ضروری مہمان آئے ہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ذرا دیر کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ، ابھی قہوہ آتا ہے وہ پیو...... پھر ہم کھانا کھاتے ہیں۔''

''نہیں جناب! آپ تکلف کر رہے ہیں۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں، کل پھر حاضر ہو جاؤں گا، آپ اطمینان سے......''

''نہیں، نہیں...... ایسے نہیں، تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔''

انہوں نے رضوان سے کہا، وہ مجھے ساتھ لے کر اندرونی دروازے میں داخل ہوا اور ایک قریبی کمرے میں لے آیا۔ یہاں قالین پر گاؤ تکیے رکھے تھے۔ الماریوں میں دینی کتب نظر آ رہی تھیں۔ میں بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد رضوان خوشبودار قہوہ اور مصری کی ڈلیاں لے آیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کون آیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''کوئی پردہ دار عورت ہے، برقع میں ہے۔ ویسے نوجوان ہی لگتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا کی کوئی عزیزہ ہو یا پھر عقیدت مند۔''

''عزیزہ ہوتی تو پھر زنانے میں چلی جاتی۔'' میں نے کہا۔

رضوان باہر چلا گیا اور میں قہوہ کی چسکیاں لینے لگا۔ یہ عربی طرز کا ذرا کڑوا لیکن خوشبودار قہوہ تھا۔ مولانا کے کمرے کی طرف سے باتوں کی مدھم بھنبھناہٹ سی سنائی دیتی تھی۔ اچانک میرے دماغ میں روشنی کا ایک تیز جھماکا سا ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس وقت جو مولانا کے کمرے میں موجود ہے، وہ کوئی خاص الخاص مہمان ہے۔

میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ تھی تو غیر مناسب اور معیوب بات لیکن میرا تجسس اتنا زیادہ تھا کہ میں اٹھنے پر مجبور ہو گیا۔ قالین پر ننگے پاؤں چلتا میں ساتھ والے کمرے سے گزرا اور پھر اس دروازے کے عین سامنے پہنچ گیا جو مولانا کے اس کمرے میں کھلتا تھا۔ دائیں بائیں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازے سے کان

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لگائے۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ آواز میرے کانوں میں پہنچی جس کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا کہ اس آواز کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بندھی ہوئی تھیں، یہ تاجور تھی۔

وہ دکھی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں نے کہا ہے ناں ماموں جان! میں خود کو یہاں آنے سے روک نہیں سکی۔ میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ آپ کا حال پوچھنا چاہتی تھی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔''

''مگر یہ غلط ہے تاجور، اگر دارج کو پتا چل جائے تو کتنا بُرا ہو۔''

''نہیں پتا نہیں چلے گا ماموں جان! وہ بہت مصروف ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے دوست کی شادی ہے۔ وہ رات گئے تک یاروں دوستوں میں گھرے رہیں گے۔ اپنے طریقے سے تفریح وغیرہ کرتے رہیں گے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے تاجور کے لہجے میں ہلکی سی اداسی محسوس ہوئی۔ غالباً تفریح سے اس کی مراد وہی پینے پلانے کا شغل تھا۔

مولانا حبیب کی آواز میرے کانوں تک پہنچی وہ ذرا حیرت سے بولے۔ ''لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ بستر پر ہوتا ہے یا وہیل چیئر پر؟''

''ہاں جی، یہاں بھی وہیل چیئر پر ہی ہیں مگر دوستوں میں گھر کر ان کا موڈ بدل جاتا ہے۔''

''تمہاری ساس بھی ساتھ آئی ہیں؟''

''نہیں وہ ابھی اسلام آباد میں ہی ہیں۔ کل برات سے پہلے پہنچیں گی۔''

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر مولانا کی ذرا بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''جو ہونا تھا، وہ ہو گیا بیٹی، لیکن اب جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہارا گھر بن گیا ہے اب اس گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کی زیادہ ذمے داری بھی تم پر ہی آتی ہے۔ میں جانتا ہوں تم ہمارے خاندان کی سمجھ دار ترین بچی ہو، تم آہستہ آہستہ ان حالات کو اپنے حق میں کر سکتی ہو۔ پانی کا قطرہ پتھر پر گرتا رہے تو اس میں سوراخ کر دیتا ہے، انسانی رویّہ تو پانی کے قطرے سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔''

''م...... میں پوری کوشش کر رہی ہوں ماموں جان...... لیکن...... کچھ لوگ شاید پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ کسی وقت تو شاید......'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی، شاید اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

چچ چچ کی آواز آئی۔ مولانا اسے پچکار رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے پھر تاجور کی اشک بار آواز ابھری۔

''میں بہت کمزور ہوں ماموں! میرے لیے بہت زیادہ دعا کریں...... بہت زیادہ۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا میری بچی...... بس تم گھبرانا نہیں۔ بندہ جب خدا کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کو سکون کی دولت عطا ہوتی ہے...... اور وہ اپنے حالات کو سدھارنے کے لیے جو کوششیں کرتا ہے، وہ کامیاب ہوتی ہیں۔''

''وہ...... میرا خیال تو رکھتے ہیں مگر غصے میں کچھ بھی اُن کے بس میں نہیں رہتا۔ روز بروز چڑچڑے بھی ہوتے جا رہے ہیں۔''

''چڑچڑے پن کی ایک وجہ شاید اس کی بیماری بھی ہے۔''

''لیکن ماموں جان! وہ اپنی بیماری کی وجہ بھی مجھ کو ہی سمجھتے ہیں۔'' تاجور کی روہانسی آواز ابھری۔ ''ان کا خیال ہے کہ میں اور ان کی بیماری ایک ساتھ ان کی زندگی میں آئے ہیں۔''

اچانک میں بُری طرح چونکا۔ مجھے اپنے قریب ہی قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے خود کو دروازے سے پیچھے ہٹایا اور مڑ کر دیکھا۔ آنے والا مجھے دیکھ چکا تھا لیکن وہ کوئی اور نہیں رضوان تھا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ وہ الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر دروازے سے کان لگایا۔ تاجور اب بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''دیکھیں ماموں! میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ آپ کا حال پوچھنے آئی ہوں اور اپنی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہوں۔ یقین کریں ماموں! جس دن مجھے آپ کے زخمی ہونے کی خبر ملی، مجھے ایسے لگا کہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔ سارا دن روتی رہی، کوئی دکھ بانٹنے والا بھی تو نہیں تھا۔ نہ ہی یہ پتا چل رہا تھا کہ آپ کی حالت اب کیسی ہے۔ پھر میری منت ساجت پر دارج نے یہاں لاہور فون کیا اور پتا چلا کہ آپ ہوش میں آ گئے ہیں۔''

''اللہ نے بڑا کرم کیا ہے...... اور اللہ آئندہ بھی کرے گا۔ وہ اپنے بندوں کے امتحان ضرور لیتا ہے مگر ان امتحانوں میں بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتا۔''

تاجور نے دکھی آواز میں کہا۔ ''ماموں جان! آپ کچھ دنوں کے لیے کہیں چلے کیوں نہیں جاتے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ لاہور میں رہیں گے تو آپ کو...... کوئی نہ کوئی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پریشانی ہوتی رہے گی.....''

ماموں بھانجی میں باتیں جاری تھیں۔ پتا نہیں کیوں میں تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا، میں نے کی ہول میں جھانکنے کی کوشش کی، کھڑکی کی طرف بھی گیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ ماموں کی مزاج پرسی کے بعد تاجور اب جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مولانا حبیب اس سے پوچھ رہے تھے۔ ''آئی کس طرح ہو؟''

''ٹیکسی کار پر...... وہ باہر ہی کھڑی ہے۔ اسی پر واپس چلی جاؤں گی۔''

''لیکن...... مجھے یہ سب کچھ مناسب نہیں لگا تاجور...... آئندہ تم ایسا نہیں کرنا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ماموں جان۔ بس ایک دفعہ کی معافی دے دیں۔''

وہ اب جس طرح باتیں کر رہی تھی، اندازہ ہو رہا تھا کہ دو چار منٹ میں یہاں سے نکل جائے گی۔ میرے سینے میں ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ میں تیزی سے اٹھا اور رضوان کو لے کر باہر سڑک پر آ گیا۔ اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں مجھے سامنے ہی ٹیکسی کے طور پر چلنے والی ٹویوٹا گاڑی نظر آ گئی۔ نشست پر ڈرائیور بیٹھا تھا جس نے سرخ رنگ کی پی کیپ پہن رکھی تھی۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا، وہ بس دو تین منٹ کے اندر ہی ہو گیا۔ رضوان، ڈرائیور کو اس سفید ہنڈا سٹی میں لے آیا تھا جس پر میں یہاں مولانا کے پاس پہنچا تھا۔ اب ڈرائیور بے ہوش تھا اور امید یہی تھی کہ وہ ایک گھنٹے سے پہلے اپنے حواس میں واپس نہیں آئے گا...... اور اگر آ بھی جاتا تو رضوان ٹی اسے سنبھالنے کے لیے یہاں موجود تھا۔ ڈرائیور کی جیب سے گاڑی کی چابی وغیرہ نکالنے کے بعد اور اس کی دھاری دار قمیص اتارنے کے بعد، رضوان نے اسے پچھلی نشست پر نیم دراز کر کے اس پر گاڑی کا غلاف ڈال دیا تھا۔ ڈرائیور کی گردن پر زوردار چوٹ لگا کر اسے بے ہوش کرنا مجھے اچھا تو نہیں لگا تھا مگر مجبوری تھی۔ اس کی اس چوٹ اور اس کے وقت کے زیاں کا ازالہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس شخص کی وجہ سے مجھے جو موقع ملا تھا وہ بہت قدر و قیمت رکھتا تھا۔

ڈرائیور کی دھاری دار شرٹ میں نے اپنی شرٹ کے اوپر سے ہی پہن لی۔ اس کی ٹوپی سر پر رکھ کر میں ٹیکسی کار کی ڈرائیونگ نشست پر بیٹھ گیا۔ اپنا زاویہ ایسا رکھا کہ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی براہِ راست چہرے پر نہ پڑے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سیاہ برقع میں لپٹی لپٹائی مولانا کی رہائش گاہ سے نکلی۔ نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر ٹیکسی کار کی پچھلی نشست پر آ بیٹھی اور بولی۔ ''چلو ڈرائیور۔''

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ اب رات کے قریباً ساڑھے نو کا وقت تھا۔ لاہور کی سڑکوں پر رش تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ مجھے کس طرف جانا ہے، بس اندازے سے ہی گلبرگ کی سمت جا رہا تھا۔ گاڑی نہر کے کنارے دوڑ رہی تھی، ہاں وہی جگہ جہاں ہم پہلے پہلے ملے تھے۔ وہی خاموشی سے بہتا پانی، وہی پاپولر کے دراز درخت وہی مدھر ہوا...... لیکن اس نہر کے پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ نہ وہ تاجور رہی تھی...... نہ وہ میں رہا تھا۔

میں نے گاڑی ایک ہوٹل کی پارکنگ میں روکی تو وہ بُری طرح چونک گئی۔ ''یہاں کیوں رکے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں ہوں تاجور...... لیکن گھبرانا نہیں میں صرف دو منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ جیسے سکتہ زدہ سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ بالکل صُمٌ بُکمٌ...... چند لمحے کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ وہ ابھی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے گی اور اسے کھول کر گاڑی سے نکل جائے گی۔ مڑ کر میری طرف دیکھے گی بھی نہیں، لیکن پھر شاید اس نے خود کو سنبھالا تھا اور اس عمل سے باز رہی تھی۔ (ویسے میں نے احتیاطاً پچھلے دروازوں کے چائلڈ لاک لگا دیے تھے)

میں نے ٹھہری آواز میں کہا۔ ''تاجور! میں اپنی حد اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تمہارے وقت میں سے چند منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا پھر تمہیں چھوڑ آؤں گا جہاں تم چاہتی ہو۔''

خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ ''اس گاڑی...... کا ڈرائیور کہاں ہے؟''

''وہ بالکل خیریت سے ہے، تمہیں تمہاری منزل پر چھوڑ آؤں گا تو گاڑی اس کو واپس مل جائے گی اور پورا کرایہ بھی۔ تم اس بارے میں فکر نہ کرو۔''

''ایسا کیوں کیا آپ نے؟'' تاجور کی آواز میں دکھ، غصہ، حیرت، مایوسی، سب ہی کچھ شامل تھا۔

''تم سے صرف یہ پوچھنے کے لیے...... کہ مجھے کس غلطی کی اتنی بڑی سزا دی ہے تم نے؟''

یہ فقرہ بالکل بے ساختہ ہی میری زبان سے نکلا تھا اور اس میں اتنا درد شامل ہو گیا تھا کہ خود مجھے بھی تعجب ہوا۔

اس نے نقاب کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور پھر پلکیں جھکا کر بولی۔ ''ان باتوں سے اب کوئی فائدہ نہیں شاہ زیب...... میں نے پہلے بھی آپ سے معافی مانگی تھی، اب پھر مانگتی ہوں۔ میرے بس میں کچھ نہیں رہا تھا۔''

''تمہیں وہ ''خط'' مل گیا تھا جو میں نے فردوس کے ذریعے بھیجا تھا؟''

وہ ایک گمبھیر توقف کے بعد بولی۔ ''ہاں...... لیکن...... تب......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ شاید کہنا چاہتی تھی کہ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

''تاجور! تم نے سیف کے بارے میں میری صفائی تسلیم کی یا نہیں؟'' میرے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔ میں نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ ''تاجور! اگر میری صفائی نہیں مانو گی تو میں زندگی کی آخری سانس تک خود کو لعنت ملامت کرتا رہوں گا۔ تمہاری جدائی کے بعد یہ دوسری بڑی تکلیف ہو گی جو مجھے ملے گی۔''

اس کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''انیق نے ایسا جھوٹ کیوں بولا۔ وہ ایسا نہیں تھا۔ کبھی بھی نہیں تھا۔''

''تاجور! اس نے صرف یہ ایک جھوٹ ہی نہیں بولا ہے، اس نے اور بھی بہت کچھ ایسا کیا ہے جس کی توقع ہم ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔ میں تمہیں کیا کیا بتاؤں تاجور۔''

کچھ دیر کار میں مہیب سناٹا طاری رہا۔ پھر وہ عجیب لہجے میں گویا ہوئی۔ ''شاہ زیب! میں ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ اس کے علاوہ آپ سے ایک منت بھی کرنی ہے۔ اب ہم...... ایک دوسرے سے بہت دور ہی رہیں تو ہمارے لیے اچھا ہے...... پلیز میری یہ بات مان لیں۔ لوگ مر بھی تو جاتے ہیں۔ آپ سمجھ لیں کہ میں اب نہیں ہوں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

اس نے نقاب ذرا سا نیچے کھسکایا اور چھوٹی انگلی سے اپنی آنکھوں کے نچلے کنارے صاف کیے۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ ایک ایسے چاند کا منظر تھا جس کا نصف حصہ بدلی میں چھپا ہوا تھا۔ خوب صورت چہرے تو بہت سے ہوتے ہیں لیکن...... کوئی ایسی بات تھی...... ہاں کوئی ایسی بات سی اس کے نقوش میں جو طلسماتی اثر رکھتی تھی اور اسے سب سے جدا کرتی تھی۔ میں نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں۔

اس نے اپنی طلائی رسٹ واچ کی طرف دیکھا اور بے چینی سے پہلو بدلا...... باہر ہونے والی بوندا باندی اب رک چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! کبھی وقت مجھے شک ہوتا ہے کہ جو لوگ مولانا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی ڈوریاں پیچھے کہیں داراب فیملی کے ہاتھ میں ہیں۔''

وہ جیسے کانپ گئی۔ ''نہیں، ایسا مت سوچیں شاہ زیب! اور...... دارج کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں۔ وہ دل کے بہت اچھے ہیں۔ تھوڑے سے سخت لگتے ہیں مگر اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔ بہت ہمدرد...... بہت خیال رکھنے والے۔''

''تمہارا بھی خیال رکھتے ہیں؟'' میں نے دفعتاً پوچھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر پلکیں گرا کر بولی۔ ''بہت زیادہ...... مم...... میں تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں چلی جاؤں تو بہت پریشان ہو جاتے ہیں...... اب بھی بڑی مشکل سے ان سے اجازت لے کر آئی ہوں۔''

''وہ خود کیوں نہیں آیا تمہارے ساتھ؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اللہ ان کو صحت دے۔ فی الوقت تو وہیل چیئر پر ہیں۔ آنا جانا ان کے لیے مشکل ہے۔'' اس نے بات گول کی۔ اس کے لہجے سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ دل و جان سے شوہر پر فدا ہے۔

حقیقت میں نے قریباً ایک گھنٹا پہلے جان لی تھی اور اس سے پہلے بھی میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ وہ دارج کے ساتھ جتنی خوش تھی وہ میرے لیے راز نہیں رہا تھا۔

اچانک اس کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اپنے بیش قیمت شولڈر بیگ میں سے آئی فون نکالا اور اسکرین چیک کی۔ اس نے کال تو ریسیو نہیں کی لیکن ایک دم بے قرار نظر آئی۔ کال کا میوزک ختم ہوا تو وہ بولی۔ ''وہ کال کر رہے ہیں، مجھے جلد جانا ہو گا، ان کی دوا کا وقت بھی ہو رہا ہے۔''

اس کے لہجے کے نیچے چھپی ہوئی تشویش اور بے قراری مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل پڑا۔ کار میں ایک گمبھیر اور دلدوز خاموشی طاری ہو گئی۔ وہی کیفیت جب الفاظ تو بے شمار ہوتے ہیں لیکن زبان گنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تاجور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے کہا کہ مجھے وارابیوں کی طرف سے اندیشہ ہے۔ وہ مولانا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

میں نے تاجور سے کہا کہ مجھے اس سے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا ہوں۔ اب میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ یہ سمجھ لے کہ میں نے آج سے اپنے ہونٹ سی لیے ہیں لیکن اگر کبھی کسی بھی حوالے سے اسے میری مدد کی ضرورت پڑے تو وہ مجھے آواز دے سکتی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں مولانا حبیب صاحب کے حوالے سے خاموش تماشائی بنا نہیں رہ سکتا۔ میں فی الحال ان کے آس پاس موجود رہوں گا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ کسی اور کیفیت میں تھی۔ میں نے گردن کو ذرا لمبا کر کے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ مجھے لگا کہ نقاب کے نیچے وہ اپنے ہونٹوں کو مسلسل حرکت دے رہی ہے۔ وہ خوف کی حالت میں تھی اور یقیناً کچھ پڑھ رہی تھی۔

یہ خوف وارج کے علاوہ کس کا ہو سکتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو۔ میں اس کا گریبان پکڑ لوں اور اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک اس کا سارا غرور، ساری سفاکی اور بیدردی اس کے ناک منہ اور جسم کے دیگر راستوں سے بہہ نہ جائے۔

تاجور کی ہدایت کے مطابق میں نے اسے ڈیفنس کے ایک نہایت پوش علاقے کے اندرونی چوراہے پر اتار دیا۔ یہاں چاروں طرف چار چار کنال کی شاندار کوٹھیاں نظر آتی تھیں...... اترنے سے پہلے اس نے فقط اتنا کہا۔ ”چاچا بشیر اور چاچی شفقت کے بچے اب بالکل بے آسرا ہیں۔ ہو سکے تو ان کا خیال رکھیے گا۔“ (وہ سیف کی بہنوں کا ذکر کر رہی تھی)

پھر وہ مجھے ”اللہ حافظ“ کہہ کر چلی گئی۔ خاموشی کے ساتھ...... بغیر کوئی الوداعی کلمہ کہے، بغیر مڑ کر دیکھے ہوئے...... ایسے کسی کو خاموشی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھنا کتنا جاں گسل ہوتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت، جب جانے والا آپ کی زندگی کا حاصل ہو۔

میرا دل چاہا کہ میں ٹیکسی کار آگے بڑھا کر اس شادی والے گھر کے سامنے چلا جاؤں جہاں وارج ٹھہرا ہوا تھا۔ شاید ابھی کچھ دیر میں سہمی ہوئی تاجور کو میری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ لیکن پھر مجھے خود ہی اپنا یہ خیال بیکار اور بچکانا لگا۔ مدد تو اس کی ہو سکتی ہے جس کو مدد درکار ہو۔ میں نے ایک گہری سانس بھر کر یوٹرن لیا اور واپس مولانا کی رہائش گاہ کی طرف رخ کر لیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈرائیور ہوش میں آ چکا ہوگا یا آنے والا ہوگا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے گاڑی کے اندر سنبھالنے میں رضوان کو کافی دشواری پیش آ سکتی تھی۔ مولانا کی تشویش بھی یقینی تھی کہ میں انہیں بتائے بغیر ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

مجھے انیق اور سجاول کی طرف سے بہت زیادہ فکر لاحق تھی۔ آخری اطلاعات کے مطابق سجاول کو انیق کا کوئی سراغ ملا تھا اور وہ اس کے پیچھے ٹل سے آگے قبائلی علاقے کی طرف گیا تھا۔ میں مسلسل سجاول سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا مگر ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ یونس پمپ والا کی کوششیں بھی ناکام تھیں۔ ذہن میں وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ انیق ایک نہایت عیار اور موقع شناس شخص کا نام تھا۔ ایک طرح سے اس کی تیزی طراری اور پھرتی کا مقابلہ سجاول کے تجربے، بے خوفی اور طاقت سے تھا۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انیق اپنا پرانا فون نمبر ترک کر چکا تھا۔ اس کے نئے رابطے کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ آجا کے اب داؤد بھاؤ ہی رہ جاتا تھا جو انیق کے موجودہ رویّے اور حالات کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔

تیسرے روز کی بات ہے، میں نے فخر سے کہا۔ ”یار! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں داؤد بھاؤ سے ملنا چاہیے۔“

”تو مل لو۔“ وہ بولا۔

”لیکن اس کے لیے تو میں ”وفات“ پا چکا ہوں، اب یہ کام تم کو کرنا ہوگا۔“

”وہ کس طرح؟“

”میرے قریبی دوست کی حیثیت سے اس سے ملو۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں کسی موقع پر اس سے تمہارا غائبانہ تعارف بھی کرا چکا ہوں۔ وہ تمہیں پہچان لے گا۔ تھوڑی دیر تک میری ”موت“ کے حوالے سے دکھ درد کا اظہار کرے گا، تم بھی کرنا۔ پھر اس سے انیق کے بارے میں سن گن لینا...... کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے؟“

”میں داؤد بھاؤ کو کیا بتاؤں گا کہ اس تک کیسے پہنچا ہوں...... اور کیا پتا کہ وہ اپنی سیکیورٹی کے پیشِ نظر مجھ سے ملنے سے ہی انکار فرما دے۔“

”میں اپنے ہاتھ سے تمہیں اس کا ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر دے دیتا ہوں اور اس پر کوئی ایسی تاریخ ڈال دیتا ہوں جب میں ”زندہ“ تھا۔ وہ میری تحریر اچھی طرح پہچانتا ہے۔“

میں نے اس سلسلے میں فخر کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور اسے داؤد بھاؤ کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے لاہور کی ایک معروف سیکیورٹی ایجنسی سے رابطہ

کیا...... اور اس ایجنسی سے دو ایسے چوکس گارڈز حاصل کیے جو سادہ کپڑوں میں مولانا حبیب کے آس پاس رہ کر ان کی حفاظتی نگرانی کر سکتے تھے۔

فخر اپنے کام پر لگ چکا تھا۔ داؤد بھاؤ سے اس کی ملاقات اسنوکر کلب والے ٹھکانے پر ہو چکی تھی۔ میں بے تابی سے اس کی ''رپورٹ'' کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ ''رپورٹ'' مجھے دوسرے روز شام کے بعد مل گئی۔ فخر ہوٹل پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے تو داؤد بھاؤ کا قصیدہ بیان کیا بولا۔ ''یار شاہ زیب! کبھی کبھی تم بڑے سفاک ہو جاتے ہو۔ داؤد بھاؤ جیسا دبنگ دوست تمہیں لاہور شہر کے بیچوں بیچ ملا ہوا ہے اور بجائے اس کے کہ تم اس سے فائدہ اٹھاتے...... اس کے لیے مرحوم بن گئے ہو۔ وہ تمہارے لیے بہت دکھی تھا۔''

''اس کے دکھ کا شکریہ...... مگر ابھی تو مجھے وہی کرنا ہے جو میرے لیے بہتر ہے۔ اسے میرے ''مرحوم'' ہونے کے حوالے سے کسی طرح کا شک تو نہیں ہے؟''

''شک تو شاید کئی ایک کو ہے مگر تمہاری ''موت'' کا ڈراما کافی تگڑا تھا۔ اس میں شبہے کی گنجائش کم کم ہی ہے۔''

''کیا کہتا ہے داؤد بھاؤ؟''

''وہ دکھی اور پریشان نظر آتا تھا۔ ایک وجہ تو یقیناً تمہاری والی ہے۔ دوسری وجہ اس کے ایک اور قریبی ساتھی مختار جھارا کی موت ہے...... اور تیسری وجہ انیق ہے۔ وہ بھی انیق کے حوالے سے بہت زیادہ مایوس اور کافی حد تک غصے میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے زمانے کی ہوا کچھ زیادہ ہی لگ گئی ہے۔ اسے شک ہے کہ ایک بڑے جرائم پیشہ گروہ سے اس کا تعلق بن گیا ہے لیکن وہ بڑے ''مردمار'' قسم کے لوگ ہیں۔ بندے کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیتے ہیں۔''

''تم نے انیق اور سجاول کی لڑائی کا ذکر بھی کیا؟''

''بالکل کیا۔ لیکن داؤد بھی اس کی اصل وجہ بتانے سے قاصر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ گوجرانوالہ کے واقعے کے بعد اس خبیث (انیق) سے اس کا کوئی رابطہ ہی نہیں ہو سکا ہے۔ وہ بالکل ایک باغی جیسا کردار ادا کر رہا ہے۔ بہت غلط لوگوں کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ نقصان اٹھائے گا۔ انیق کی بات کرتے ہوئے داؤد بھاؤ کا چہرہ تمتما جاتا تھا۔ وہ نیٹ وِسکی بھی غٹاغٹ چڑھا رہا تھا۔''

''داؤد کی پریشانی اور مایوسی کی ایک وجہ اس کی محبوبہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی ''روبی نام کی یہ رکھیل'' گوجرانوالہ والے واقعے میں ماری گئی تھی۔'' میں نے فخر کو بتایا۔

''ہاں اس نے تھوڑا سا ذکر اس لڑکی کا بھی کیا تھا۔ اسے بھی معلوم ہے کہ اس لڑکی اور مختار جھارا کے علاوہ ''تمہارے'' قاتل بھی ایک ہی ہیں...... یعنی ٹیکساری گینگ والے۔ میں نے اسے گینگ کے حوالے سے اچھی خبر سنا کر تھوڑا سا مطمئن کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے اسے بتایا ہے کہ ایک پرانے گینگسٹر کے رہا ہونے کی وجہ سے ٹیکساری گینگ دو بلکہ تین گروہوں میں بٹ گیا ہے اور اب یہ لوگ بڑے خوفناک طریقے سے خود ہی ایک دوسرے کا بینڈ بجا رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ داؤد بھاؤ سے ملاقات ہونے کے باوجود تمہارا یہ سارا ایڈونچر ٹائیں ٹائیں فش رہا ہے۔ انیق کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔''

''تم کہہ سکتے ہو مگر ایک چھوٹی سی بات کا پتا چلا ہے۔ میں نے انیق کا بیک گراؤنڈ جاننے کی کوشش میں تھوڑا سا رستہ نکالا ہے۔ پتا چلا ہے کہ پیچھے سے وہ کراچی کا نہیں بلکہ رحیم یار خاں کے قریب ایک گوٹھ موراناں کا رہنے والا ہے۔''

''یہ کس نے بتایا؟''

''داؤد بھاؤ نے ہی۔ دراصل وہ بھی سخت پریشان ہے کہ انیق ہاتھ کیوں نہیں آ رہا۔ اس کے بندوں نے پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں بھاگ دوڑ کی اور پتا چلا کہ انیق کی اصل بنیاد کراچی کی نہیں بلکہ رحیم یار خاں کے کسی گوٹھ موراناں کی ہے۔ یہ لوگ گوٹھ موراناں تک پہنچے مگر اس ساری کوشش کا نتیجہ ابھی تک تو صفر ہی ہے۔ گوٹھ موراناں تو مل گیا ہے وہاں انیق نام کے ایک کے بجائے .... دو بندے بھی مل گئے ہیں مگر ان میں اصلی انیق نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ گوٹھ موراناں والا یہ کھوج غلط تھا۔''

''ابھی تک تو یہی لگ رہا ہے۔ ویسے میں نے داؤد بھاؤ کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ اس کے بندے اس گوٹھ موراناں کے آس پاس کے علاقے میں بھی انیق یا اس کے کسی رشتے دار کو ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''تو کیوں ناں ہم بھی کوشش کریں......''

''ہاں...... وہ کیا شعر ہے کہ کیا ضروری ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔ آؤ ناں ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔'' فخر نے فٹ ادبی رنگ اختیار کیا۔

میں نے کہا۔ ''مگر میرا خیال ہے کہ اس کام کے لیے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں اکیلا ہی جاؤں تو ٹھیک ہے۔ تم داؤد بھاؤ اور اس کے آدمیوں کی نظر میں آچکے ہو۔ رحیم یار خاں کے اس علاقے میں گئے تو ان کے ''ریڈار'' پر آجاؤ گے۔''

''تو یہ بندۂ ناچیز یہاں بیٹھ کر ہیر پڑھے گا؟''

''ہیر پڑھ سکتے ہو اور چاہو تو شام کے وقت انارکلی اور لبرٹی وغیرہ میں ہیریں دیکھ بھی سکتے ہو، مگر......''

''پاکستان اور یورپ کا فرق ملحوظ خاطر رکھنا۔'' فخر نے جلدی سے میرا فقرہ مکمل کیا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''یہ نصیحت نامہ میں پہلے بھی کئی بار سن چکا ہوں مگر یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ''رسک'' لیے بغیر کچھ بھی حاصل وصول نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو پھر تم بڑے بڑے رسک کیوں لیتے؟''

''کیا مطلب؟''

فخر نے ایک بار پھر اس بوسیدہ پیراشوٹ کا ذکر چھیڑ دیا جو والس وائے کے فرار کے وقت میں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ فخر کے نزدیک یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ میں نے بمشکل اس ذکر سے پیچھا چھڑایا۔

لاہور سے رحیم یار خاں تک کا سفر کافی طویل ہے۔ میں نے اس میں فضائی سفر کا سہارا لیا اور رحیم یار خاں پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک پرائیویٹ مہران کار رینٹ پر لے کر گوٹھ موراناں تک پہنچنا کافی دشوار عمل ثابت ہوا مگر میں کسی نہ کسی طرح اس علاقے میں پہنچ گیا۔ ان علاقوں میں درجۂ حرارت بھی کچھ بڑھا ہوا تھا، گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ بہاولپور کا رہائشی ہوں اور فارم بنانے کے لیے یہاں کوئی مناسب زرعی رقبہ تلاش کر رہا ہوں۔

میں نے موراناں نامی اس بڑے گاؤں میں قریباً چوبیس گھنٹے گزارے۔ وہاں کے مکھیا، ہیڈ ماسٹر اور دو چار زمینداروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا یہ شک بھی رفع کیا کہ کہیں یہ لوگ یہاں انیق کی موجودگی کو چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔ یہاں رہنے والا ایک انیق، درمیانی عمر کا کریانہ فروش تھا۔ اس سے بھی گپ شپ رہی۔ زرعی رقبے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں لیکن اصل مقصد یہی تھا کہ مجھے انیق کا کوئی کھوج کھرا ملے۔ انیق کے بارے میں جاننے کے لیے تجسس بڑھتا جا رہا تھا مگر اس تجسس کو انجام تک پہنچانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

عین ممکن تھا کہ موراناں نامی اس گوٹھ میں یا اس کے آس پاس داؤد بھاؤ کا کوئی کارندہ بھی موجود ہو مگر مجھے کوئی ایسی شکل نظر نہیں آئی۔

دوسرے روز سہ پہر کے وقت میں نے اس زمیندار سے اجازت لی جس نے مجھے اپنے ڈیرے پر مہمان ٹھہرایا ہوا تھا۔ میں سفید مہران کار پر سوار موراناں سے نکل رہا تھا جب ایک جگہ ایک چیز دیکھ کر ٹھٹکا۔ یہ کیکر کے درختوں اور جنتر کی جھاڑیوں کے درمیان لگا ہوا لوہے کا ایک پرانا سا بورڈ تھا جس پر موراناں لکھا ہوا تھا...... مگر موراناں کے آگے بھی کچھ لکھا تھا، جو بورڈ کے زنگ آلود ہونے کی وجہ سے مٹ چکا تھا۔ میں نے گاڑی روک کر ذرا دھیان سے دیکھا...... یہ لفظ ''خاص'' تھا جو امتدادِ زمانہ سے مٹ چکا تھا۔ یعنی موراناں کا پورا نام ''موراناں خاص'' تھا۔

مجھے یہ نکتہ اہم محسوس ہوا۔ پاس سے ہی دو اونٹنیاں گزر رہی تھیں جن کے آگے آگے سندھی طرز کی ٹوپی والا ایک ادھیڑ عمر شخص مہار پکڑے چل رہا تھا۔ میں نے اسے روکا اور علیک سلیک کے بعد پوچھا۔ ''بھائی صاحب! آپ کا یہ گاؤں موراناں ہے یا موراناں خاص؟''

وہ بولا۔ ''اس کو موراناں ہی کہتے ہیں، لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''یہ دیکھیں، اس پرانے بورڈ پر کسی نے موراناں کے بجائے موراناں خاص لکھا ہوا ہے۔ کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی اور موراناں بھی موجود ہے؟''

وہ اپنی نیم سفید مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ''اس کا تو پتا نہیں...... پر یہ بورڈ کئی سال پہلے وڈے پوسٹ ماسٹر صاحب نے لگوایا تھا۔ اب تو وہ بھی مرکھپ چکے ہیں۔''

میرے ذہن میں شک کا جو بیج بویا گیا تھا، وہ مجھے واپس گاؤں میں لے گیا، میں نے ایک رات مزید زمیندار کے ڈیرے پر گزاری، نئے پوسٹ ماسٹر اور چند دیگر افراد سے بھی ملا کوئی اور گوٹھ بھی موجود ہو سکتا ہے۔ گئے وقت میں اگر پرانے پوسٹ ماسٹر صاحب نے ایسا بورڈ لگوایا تھا تو اس کے پیچھے کوئی وجہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ ان کے علم میں کوئی ایسی بات آئی ہو مگر علاقے کے لوگوں نے اسے پذیرائی نہ دی ہو۔

اگلے روز میں نے فخر کو بھی رحیم یار خاں بلا لیا۔ ہم نے ایک اور مہران کار رینٹ پر حاصل کر لی اور خاموشی سے تلاش میں لگ گئے۔

کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی ملتا ہے۔ پانچ چھ روز کی مسلسل تگ و دو کے بعد ایک روز اچانک فخر کو انیق کا کھوج مل گیا۔ رحیم یار خاں سے قریباً 60 کلومیٹر دور تحصیل صادق آباد کے علاقے میں ہمیں موراناں کلاں کے نام سے

ایک اور بستی ملی۔ یہ بڑی خوش آئند کامیابی تھی۔

☆☆☆

میں نے اپنی گاڑی رحیم یار خاں میں ہی چھوڑ دی۔ بس اور تانگے کے طویل سفر کے ذریعے اس موراناں نامی گاؤں جا پہنچا۔ فخر اپنی گاڑی پر یہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ ہمارے پاس بہانہ وہی زرعی رقبے کی تلاش والا تھا اور یہ کافی کارگر بہانہ تھا۔ موراناں میں پہنچنے کے صرف ایک گھنٹے بعد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ لاہور کے نامی گرامی گینگسٹر داؤد بھاؤ کے چہیتے دستِ راست انیق کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔ یہ بڑا سنسنی خیز انکشاف تھا۔ ایک طرح سے جو کام داؤد بھاؤ کے کارندے کوششِ بسیار کے باوجود نہیں کر سکے تھے وہ ہم نے کرلیا تھا۔

مقامی پٹواری اشرف خاں اپنے پٹوار خانے میں چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ہم بھی ایسے ہی بیٹھے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہاں جی چنگا منڈا ہے۔ پہلے دو تین سال تو گوٹھ سے قریباً غائب ہی رہا ہے۔ اب جب سے پکی سڑک بنی ہے مہینے دو مہینے بعد گوٹھ کا چکر لگا لیتا ہے۔ سنا ہے پنجاب میں کسی کے ساتھ مل کر مرغی خانے کا کام کرتا ہے۔ اس کی پھوپی بھی بڑی چنگی زنانی ہے۔ اپنی اولاد کی طرح سمجھتی ہے اُسے...... پر تم لوگ کیسے جانتے ہو نیئے کو؟“

”بس، لاہور میں ہی ایک دفعہ جان پہچان ہوئی تھی۔ اس نے گوٹھ کا نام بھی بتایا تھا۔ کہا تھا کہ اگر کبھی ادھر آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملنا۔“

”پر اب تو مجھے لگتا ہے کہ پچھلے دو تین ہفتے سے وہ گوٹھ میں نہیں ہے، پھر بھی میں پتا کرا دیتا ہوں۔“ اس نے کسی بچے کو آواز دی۔ تیرہ چودہ سالہ بچہ اسکول کی نیلی شلوار قمیص میں دوڑتا ہوا آیا۔ پٹواری اشرف نے کہا۔ ”جا اوئے مزمل! انیقے کے گھر جا اور اس کی پھوپی سے پوچھ کہ وہ گوٹھ آیا ہوا ہے یا نہیں۔“

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا، مگر اس سے پہلے کہ وہ تیزی سے نکل جاتا، میں نے اسے روکا۔ میں نے اشرف خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”چلو ہم بھی چلے جاتے ہیں، اس کا گھر بھی دیکھ لیں گے۔ باہر ہی کھڑے ہو کر اس کی پھوپی سے بات بھی کرلیں گے۔“

اس سے پہلے کہ اشرف خاں کوئی اور تجویز پیش کرتا، میں اور فخر چٹائی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے، ہم لڑکے کے ساتھ موراناں کی گلیوں سے گزرے، کافی وسیع گاؤں تھا، ہائی اسکول، ڈاک خانہ اور مویشیوں کا اسپتال وغیرہ یہاں موجود تھا۔ زیادہ تر مکان اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ ہم نیم پختہ گلیوں سے گزرتے ہوئے انیق کے گھر کی طرف جا رہے تھے، گزرے ڈیڑھ دو سال میں، میں نے کئی دفعہ انیق سے اس کے آبائی علاقے اور عزیزوں وغیرہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے ہمیشہ گول مول بات ہی کی تھی اور صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کراچی کا رہنے والا ہے اور اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ آج ایک عرصے بعد مجھے پتا چلنے والا تھا کہ اس کی اصل کیا ہے۔ وہ شخص جو نوجوانی میں ہی ایک خطرناک گینگسٹر کا روپ دھار کر انڈر ورلڈ میں پہچان پیدا کر چکا ہے، حقیقت میں کیا ہے۔

دیہاتی لڑکے کی رہنمائی میں ہم بالآخر ایک پختہ مکان کے سامنے پہنچے۔ یہ دو منزلہ مکان اچھی حالت میں تھا۔ مکان کے ساتھ ہی تین چار دکانیں تھیں اور ان کے اوپر بھی رہائشی جگہ تھی۔ دروازے پر کوئی نیم پلیٹ وغیرہ نہیں تھی۔ لڑکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور اسّی بیاسی سال کے ایک مدقوق سے باریش بزرگ نے دروازہ کھولا۔

”بابا جی! یہ لوگ شہر سے ملنے آئے ہیں۔“ لڑکے نے بزرگ سے ہمارا مختصر تعارف کرایا اور اُڑن چھو ہو گیا۔

بزرگ نے بجھی بجھی آنکھوں سے بغور ہمیں دیکھا۔ اسی دوران میں اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ ”کون ہے تایا جی؟“

اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔ چند لمحے بعد قریباً پچاس سال عمر کی ایک چادر پوش خاتون دکھائی دی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی انیق کی پھوپی ہے۔ ”جی بیٹا جی! کس سے ملنا ہے؟“ خاتون نے ہم دونوں کو سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا مختصر تعارف کرایا اور خاتون کو بتایا کہ ہم انیق سے ملنے آئے تھے۔ انیق کا نمبر مسلسل بند جا رہا ہے ورنہ اُسے بتا دیتے۔

عورت نے ایک دو سوال پوچھے جن کا میں نے بڑا مناسب جواب دیا۔ عورت بااخلاق لگتی تھی۔ اسے یہ مناسب نہیں لگا کہ ہمیں یوں دروازے سے ہی لوٹا دے۔ اس نے ہمارے لیے بیٹھک کا دروازہ کھلوا دیا۔ ہم اندر چلے گئے۔ یہ بیٹھک دیہاتی انداز میں لیکن سلیقے سے سجائی گئی تھی۔ ایک طرف ایک بڑی سی فریم شدہ تصویر تھی۔ یہ یقیناً انیق کے والد مرحوم کی تھی۔ چند اور تصویریں بھی ایک کارنس پر آویزاں تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر میں چودہ پندرہ سالہ

انیق شاید بقرعید کے موقع پر ایک بجے سجائے دنبے کی رسی پکڑے کھڑا تھا۔ ہمارے رسمی انکار کے باوجود انیق کی نیک صورت پھوپو ہمارے لیے چائے پانی کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ یہ دیہاتی مہمان نوازی کی ایک اچھی مثال تھی۔ عمر رسیدہ بزرگ ہمارے پاس ہی بیٹھے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ انیق اور اس کی پھوپو کے کوئی دور کے رشتے دار تھے اور ان کے ساتھ رہتے تھے۔

میری نگاہ بیٹھک کی ادھ کھلی کھڑکی سے گزر کر ایک طویل برآمدے میں گئی۔ یہاں بہت سی کرسیاں اور صوفے وغیرہ رکھے تھے۔ مجھے آٹھ دس خواتین بھی نظر آئیں۔ وہ سب کھاتے پیتے گھرانوں کی چودھرانیاں لگتی تھیں۔ کچھ نے چادریں لے رکھی تھیں اور کچھ یونہی بے تکلفی سے ننگے سر بیٹھی تھیں لیکن وہ سب کی سب مؤدب نظر آتی تھیں۔ ایک دو کے ہاتھ میں تسبیح بھی نظر آئی۔

بزرگ نے اٹھ کر ادھ کھلی کھڑکی بند کر دی اور وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''یہ بی بی صاحبہ کی محفل ہے۔ ایک دن چھوڑ کر شام کے وقت ہوتی ہے۔''

''بی بی صاحبہ کون ہیں؟'' فخر نے پوچھا۔

بزرگ نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ یہ انیق کی پھوپو کی کوئی پرانی دوست ہیں۔ بہت ''اللہ والی'' ہیں۔ لوگوں کو ان سے بڑا فیض پہنچتا ہے۔ آج کل انیق کی پھوپو سے ملنے یہاں آئی ہوئی ہیں۔

اسی دوران میں انیق کی پھوپو بھی آگئیں۔ وہ چائے، بسکٹ اور نمکو وغیرہ لائی تھیں۔ کافی خوش گفتار بھی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ''انیقے سے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار ہے مجھے۔ جب اس کے ماں باپ نہ رہے تو پھر مجھے لگا کہ میں ہی اس کی ماں ہوں۔ وہ بھی سگے پتروں کی طرح خیال رکھتا ہے میرا۔ اب تو خیر آتا جاتا رہتا ہے، پر جب مرغی خانے کا کام نیا نیا شروع کیا تھا، مہینوں تک اسے آنے کا ٹائم نہیں ملتا تھا، تب بھی ہماری پوری خبر رکھتا تھا اور کسی طرح کی کوئی کسر نہیں لگنے دیتا تھا۔''

''بالکل جی، بڑا پیار ہے اُسے آپ لوگوں سے۔ ہم سے بھی اکثر اس نے آپ کا ذکر کیا ہے۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

''اللہ اسے لمبی حیاتی دے۔ بڑے دکھ دیکھے ہیں وچارے نے۔ اور اس آخری دکھ نے تو ہم سب کو نچوڑ کر ہی رکھ دیا تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔ خاتون کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ انہوں نے اوڑھنی کے پلو سے آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے بات بدلی اور کہنے لگیں۔ ''پچھلے چار پانچ دن سے ہمارے ساتھ بھی اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ کئی دفعہ جب کام زیادہ ہوتا ہے تو پھر فون بند کر دیتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی عادت ہے اُس کی۔''

''جی بالکل ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

میں اس سادہ لوح خاتون کو کیسے بتاتا کہ اس کا پیارا بھتیجا مرغی خانے کے کاروبار میں مصروف نہیں، وہ مرغیاں ذبح کرنے کے کام میں مصروف ہے۔ اور یہ مرغیاں وہ انسان ہیں جو اس کے ہتھے چڑھتے ہیں...... یا جن کی وہ سپاری پکڑتا ہے۔ وہ اس کا دکھیارا انیقا نہیں ہے...... وہ وسطی پنجاب کا ایک خطرناک گینگسٹر ہے اور آج کل تو اپنی آئی پر آیا ہوا ہے۔ بیس تیس منٹ کی گفتگو میں ہی ادھیڑ عمر خاتون ہمیں اپنوں کی طرح لگنے لگی تھیں۔ وہ بھی بڑی اپنائیت سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہم نے انہیں بھی یہی بتایا کہ ہم بہاولپور سے کوئی زرعی رقبہ ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔

خاتون نے ہمیں پیشکش کی کہ اگر ہم رات رہنا چاہتے ہیں تو ساتھ والی دکانوں کے اوپر ایک رہائشی پورشن خالی پڑا ہے۔ چارپائیاں اور بستر بھی ہیں۔ ہم رہ سکتے ہیں۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ رسمی انکار کے بعد ہم نے ایک رات کے لیے یہ آفر قبول کر لی۔ فخر نے خاتون سے پوچھا۔ ''یہ دکانیں آپ کی ہیں؟''

وہ بولیں۔ ''میرا کچھ نہیں پتر! میں تو ایک، ڈھائی مرلے کے گھر سے اٹھ کر یہاں آئی تھی۔ یہ سب کچھ میرے بچے انیقے کا ہی ہے۔ اس نے میرے اور میری بچی کے لیے بڑا اچھا انتظام کر رکھا ہے۔ ان دکانوں اور اوپر والے کوارٹروں کے کرائے سے ہمارا گھر بڑی چنگی طرح چلتا ہے بلکہ رب سوہنے کے فضل سے کچھ بچت بھی ہو جاتی ہے۔''

اسی دوران میں دروازے کے پیچھے سے کسی نوجوان لڑکی نے آواز دی۔ ''امی جی! آ جائیں۔''

خاتون ٹھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہم سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ''تم لوگ بیٹھو، تایا جی کے ساتھ گل بات کرو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں خالہ جی، اب ہم بھی ذرا گاؤں کا راؤنڈ لگاتے ہیں۔ پٹواری صاحب نے ایک دو زمین کے ٹکڑوں کا بتایا ہے، وہ دیکھ آتے ہیں۔''

وہ بولیں۔ ''تایا جی کو بھی ساتھ لے جائیں۔ یہ آپ کو چنگے مشورے دے سکتے ہیں۔''

"یہ تو اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔

برآمدے کی طرف سے آنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ وہاں گہما گہمی کچھ بڑھ گئی ہے۔ کسی عورت کے رونے کی آواز بھی آرہی تھی، شاید وہ کوئی مریضہ تھی جو علاج کے لیے یہاں لائی گئی تھی۔

ہم بزرگ کے ساتھ اٹھ کر باہر آگئے اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیے۔ دور کھجور کے درختوں اور لہلہاتے کھیتوں کے پیچھے دن بھر کا تھکا ہوا سورج افق کی طرف جھکتا چلا جارہا تھا۔ مجھے اندیشہ صرف ایک ہی تھا، اگر انیق کی پھپھو کا ٹیلی فونک رابطہ کہیں انیق سے ہو جاتا تو ہمارا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا، تاہم اس کا امکان پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔

زمینیں دیکھنے کا تو بہانہ ہی تھا۔ ہم شام کے طویل ہوتے سایوں میں گاؤں کے مضافات کی سیر کرتے رہے اور محترم بزرگ سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ اس گفتگو سے ہمیں کافی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ انیق کے والدین اس کے بچپن میں ہی ایک سیلابی ریلے کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ترکے میں ایک مکان اور اس کے پیچھے ایک کافی بڑا احاطہ چھوڑا تھا۔ انیق کی پھپھو رضیہ ایک قریبی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور دو بچیاں تھیں۔ وہ تیرہ چودہ سالہ انیق کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس آگئیں اور اپنی بچیوں سمیت یہیں رہنے لگیں۔ سچی محبت دل پر اثر کرتی ہے۔ پھپھو کی محبت نے بھی انیق پر اثر کیا، وہ ان کو سگی ماں کا درجہ دینے لگا۔ پھپھو کی بڑی بیٹی سدرہ اسے بچپن سے اچھی لگتی تھی۔ خاندان کے بڑوں کے مشورے سے دونوں کی منگنی ہوگئی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے لیکن پھر ایک حادثے نے سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ انیق اپنی منگیتر سدرہ اور اس کی چھوٹی بہن فاطمہ کے ساتھ ایک قریبی گاؤں میں لگنے والے میلے سے واپس آرہا تھا کہ سڑک پار کرتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ایک موڑ پر ایک انتہائی تیز رفتار کار ان پر چڑھ دوڑی۔ انیق اور فاطمہ کو تو فقط چوٹیں آئیں مگر خوبرو سدرہ وہیں سڑک پر اپنی جان ہار گئی۔ میلے پر جانے کے لیے اس نے چمکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور ہاتھوں پر مہندی لگا رکھی تھی، یہ سب کچھ خون میں لت پت ہو گیا۔

جس گاڑی سے سدرہ ٹکرائی تھی، اسے علاقے کا ایک بارسوخ شخص چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایم این اے کا برادر نسبتی تھا اور جس وقت ایکسیڈنٹ ہوا، وہ نشے میں چور تھا۔ گاڑی بھی اَن رجسٹرڈ تھی مگر وہی ہوا جو ایسے معاملوں میں ہوتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ وہ دو گھنٹے کے لیے بھی تھانے میں نہیں رہا۔

اس واقعے نے انیق کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے قصوروار کو سزا دلانے کے لیے اپنے طور پر بھاگ دوڑ کی۔ گاؤں کے کچھ معتبر لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دیا لیکن کچھ نہیں بنا۔ الٹا انہیں ڈرایا دھمکایا جانے لگا۔ آخر یہ معاملہ سرد خانے میں چلا گیا۔ کچھ لوگ غم کا شکار ہوتے ہیں تو دنیا سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ نوجوان انیق کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اپنی محبوب منگیتر کی جدائی نے جیسے اسے ہر چیز سے بیزار کر دیا تھا۔ وہ عام لوگوں سے جھگڑے کرنے لگا۔ مار پیٹ شروع کر دی۔ سگریٹ نوشی کی عادت اپنالی لیکن ان حالات میں بھی وہ اپنی غم گسار پھپھو اور ان کی چھوٹی بیٹی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ انہی دنوں اس کے دماغ میں یہ خیال سمایا کہ اپنے مکان کے پیچھے واقع ڈیڑھ دو کنال کا احاطہ بیچ دے۔ یہ احاطہ بیچ کر اس نے چند دکانیں بنائیں۔ دکانوں کے پیچھے اور اوپر چار پانچ رہائشی پورشن بنائے۔ یوں اس نے اپنی پھپھو کے لیے ان کے اخراجات کا مستقل انتظام کر دیا۔ اس کے بعد وہ جنوبی پنجاب سے وسطی پنجاب چلا گیا اور پھر لاہور میں کہیں "مرغبانی" شروع کر دی۔

گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ بزرگوار میرے پہلو میں بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "اس بندے کا کیا بنا تھا جس کی گاڑی سے انیق کی منگیتر ٹکرائی تھی؟"

وہ بولے۔ "پتر جی! اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ شاید انیقے نے تمہیں بتایا نہیں۔ ایم این اے کا وہ رشتے دار پکا شرابی تھا۔ ایک ڈیڑھ سال بعد ہی اس کے دماغ کی نس پھٹ گئی۔ اس کو فالج ہو گیا۔ فالج کے بعد پندرہ دس دن کے اندر ہی وہ مر گیا۔"

اردگرد کی زمینوں کا جائزہ لے کر ہم شام پڑے موراناں گاؤں واپس آگئے۔ دکانوں کے اوپر ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ہمارے لیے دو چارپائیوں پر بستر بچھا دیے گئے تھے۔ میرا ذہن مسلسل انیق کے حالات میں الجھا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے سہ پہر کے وقت انیق کی پھپھو رضیہ نے اس آخری دکھ کا ذکر کیا تھا جس نے ان سب کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ دکھ یقیناً وہی ایکسیڈنٹ تھا جس نے انیق کی پھپھو سے اس کی بیٹی اور انیق سے اس کی منگیتر چھینی تھی۔

"یہ اسٹوری تو ساری دکھی کرنے والی ہے برادر۔" فخر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور ایک شعر بھی پڑھا۔

میں نے کہا۔ "لیکن کچھ لوگ اپنے دکھ میں سے "کچھ بہت اچھا" نکال کر دکھا دیتے ہیں لیکن کچھ ایسا نہیں کر سکتے۔

انیق بھی دوسری طرح کے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے سدرہ کے مجرم سے انتقام لینے کے لیے ہی یہ راستہ اختیار کیا ہو۔ اس کا مجرم تو شراب نوشی کا شکار ہو کر اپنی موت آپ مر گیا مگر انیق جس راستے پر چل پڑا تھا، وہ اسے آگے لے گیا۔"

"بلکہ بہت آگے لے گیا۔ بعید از قیاس اور خارج از امکان حالات تک۔" فخر نے ہنکارا بھرا۔

"خاص طور سے وہ اب جو کچھ کر رہا ہے یہ تو سراسر بے وفائی، عیاری اور عیاشی کے زمرے میں آتا ہے۔ ماضی کا کوئی بھی دکھ یا واقعہ اس کے موجودہ کردار کا جواز نہیں بن سکتا۔ اس نے ایک جھوٹ کے ذریعے تاجور کو ورغلانے کی کوشش کی۔ مجھے کئی طرح سے نقصان پہنچایا، سجاول کو بیوی بچے سمیت خون میں نہلانے کی منصوبہ بندی کی۔ اس کے علاوہ بھی پتا نہیں کہ کیا کچھ کیا ہوگا۔"

اچانک میرے سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ میں اسکرین دیکھ کر چونکا۔ یہ یونس پمپ والا کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ بولا۔ "آپ کہاں ہو وقاص بھائی؟" اس کی آواز میں ہیجانی کیفیت تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے وقاص بھائی! ایک بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ آزاد کشمیر کی طرف...... وہ خبیث انیق یونہی قبائلی علاقے کی طرف نہیں نکلا۔"

"کھل کر بات کرو۔" میں نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"سجاول صاحب کی خالہ اور بھتیجی کوٹلی والے ڈیرے سے نکل کر کسی شادی والے گھر گئی تھیں۔ انیق اور اس کے ساتھیوں نے سجاول صاحب کی بھتیجی کو گاڑی میں سے گھسیٹا اور اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ گن مین اور ڈرائیور نے مزاحمت کی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ انیق اور اس کے ساتھیوں کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے ایک سجاول صاحب کی خالہ کو جا لگی۔ وہ طبی امداد پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ گزرنے والا ہر دن انیق کے حوالے سے کوئی بری سے بری خبر لے کر ہی آتا تھا۔ وہ سب حدوں کو پار کر رہا تھا۔ یونس نے بتایا کہ جب سجاول کی بھتیجی کو اغوا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، اس کے کپڑے پھٹ گئے اور وہ سڑک پر ہی قریباً برہنہ ہو گئی۔ میری نگاہوں کے سامنے اس تیز طرار خوبرو لڑکی کا سراپا گھوم گیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں کوٹلی والے ڈیرے پر دوسروں کے علاوہ اسے بھی اچھی طرح بھگت چکا تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا یونس، لگتا ہے کہ اب اس انیق اور سجاول میں سے کوئی ایک ضرور مرے گا۔"

"بالکل یہی لگتا ہے۔" یونس نے تائید کی۔ "جو خبر مجھے ملی ہے، اس کے مطابق تو ٹل شہر کے قریب ایک قبائلی ملک کے ڈیرے پر دونوں میں ٹاکرا بھی ہوا ہے، گولیاں چلی ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک بندہ بھی مرا ہے......" یونس مجھے اس واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ میرا دماغ جیسے گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا جو کچھ ہو رہا تھا، نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بالکل نہیں۔ کسی وقت مجھے انیق سے زیادہ سجاول کی فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ یونس کو بھی سجاول اور انیق کی درست لوکیشن کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا، وہ کوشش میں لگا ہوا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ہمیں بہترین دیہاتی ناشتا دیا گیا۔ ناشتے کے بعد میں اور فخر ایک بار پھر گاڑی پر سوار بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ ہم مقامی لوگوں پر اپنا یہ تاثر برقرار رکھنا چاہتے تھے کہ فارم ہاؤس کے لیے زمین دیکھ رہے ہیں۔ ہماری گاڑی سرسبز لہلہاتے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کے یاد آنے کے ہزار بہانے تھے۔ جتنا بھولنا چاہتا تھا، اتنا ہی وہ ذہن پر مسلط ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ شاید اس کے گاؤں چاند گڑھی کو بھی اس کے نام سے نسبت تھی۔ وہ ایک بے مثل...... بے داغ چاند تھا اور اس کا گاؤں "چاند گڑھی" تھا۔ ہاں...... اس کے یاد آنے کے ہزار بہانے تھے۔ صبح سویرے، اوس سے بھیگے سرسبز کھیتوں کے درمیان گھومتے ہوئے بھی وہی یاد آئی۔ وہ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر کھڑی تھی، وہ سنہری گندم کے خوشوں میں مسکرا رہی تھی، وہ ٹیوب ویل کے چمکیلے پانیوں میں اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں کس کس منظر سے اپنی آنکھیں بند کرتا...... کس کس آواز کو اپنی سماعت تک پہنچنے سے روکتا۔

میں نے یونس پمپ والا سے بھی مسلسل ٹیلی فونک رابطہ رکھا ہوا تھا اور اسے کہا ہوا تھا کہ جونہی سجاول یا انیق کے بارے میں کوئی خبر ملے، وہ مجھے آگاہ کرے۔

دوپہر کو انیق کی پھپھو کے تایا، اصرار کر کے ہمیں پھر گھر لے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ واپس جانے سے پہلے وہ ہمیں گھر میں کھانا کھلائیں۔ ہم بیٹھک میں بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ برآمدے کی طرف سے آج بھی خواتین کے بولنے چالنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ محترم بزرگ آج پہلی بار کچھ افسردہ نظر آئے۔ ان کی افسردگی کا

تعلق اپنے نواسے انیق عرف انیقے کے حوالے سے تھا۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے کہا۔ ''پترو! تم دونوں اس کے یار بیلی ہو، کیا کسی ویلے وہ تم کو بدلا بدلا سا نہیں لگتا؟''
''بدلنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھا۔
وہ اپنی سفید داڑھی کھجا کر بولے۔ ''اکھڑا اکھڑا سا۔ پریشان سا۔ بات کوئی اور کر رہا ہوتا ہے، دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ کسی وقت سوچتا ہوں شاید کاروبار میں کوئی بڑا نقصان ہو رہا ہے جس کی وجہ سے گھبرایا ہوا ہے۔''
میں بزرگوار کو کیا بتاتا کہ کس طرح کے کاروبار کر رہا ہے وہ...... اور کس طرح کے نقصان ہو رہے ہیں اُسے۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''دراصل مجھے اس سے ملے ڈیڑھ دو مہینے ہو گئے ہیں، اب تازہ صورتِ حال کیا ہے، مجھے اس کا پتا نہیں۔''
وہ التجائیہ لہجے میں بولے۔ ''تم لوگ مجھے دل کے چنگے لگتے ہو۔ وہ تمہارا دوست بھی ہے۔ اس سے ضرور ملو اور اس کی پریشانی جاننے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں ہی کچھ بتا دے۔ کسی وقت...... کسی وقت......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔
چند لمحے توقف کے بعد بولے۔ ''کسی وقت تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس پر کسی نے تعویذ ڈال دیے ہیں۔ بالکل گم صم سا ہو گیا ہے۔ نہ جاگا ہوا، نہ سویا ہوا۔ کبھی کبھی تو مجھے ترس بھی آتا ہے اُس پر۔ میں رضیہ (انیق کی پھپھو) سے بات کرتا ہوں۔ وہ بھی نہیں سنتی۔ پتا نہیں دونوں پر ہی تعویذ ہو گئے ہیں۔'' محترم بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلایا۔
برآمدے میں سے ابھرنے والی آوازیں اب بڑھ گئی تھیں۔ لگتا تھا کہ آج شام کے بجائے دوپہر کو ہی محفل ہو رہی ہے۔ میں نے بزرگوار سے پوچھا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی۔ بولے۔ ''بی بی صاحبہ اس بار ڈھائی تین مہینے کے وقفے سے آئی ہیں اس لیے ان سے ملنے والے بہت زیادہ ہیں، رش کم کرنے کے لیے وہ منگل اور جمعرات کو دوپہر کے وقت بھی دم وغیرہ کرتی ہیں۔ بہت اللہ والی ہیں۔ میں نے تو انیقے کو بھی دم کرایا تھا۔ ایک تعویذ بھی لکھوایا ہوا ہے پر وہ ناشکرا، ناقدرا، کہیں میرے ہتھے چڑھے تو تب ہے ناں، پتا نہیں کہاں بھاگا پھر رہا ہے۔ اب تو کئی دن سے فون بھی بند کیا ہوا ہے بے شرم نے۔''
اسی دوران میں اندر سے کسی لڑکی نے آواز دی۔ ''ناناجی...... ناناجی...... ذرا بات سن جائیں۔'' محترم بزرگ گھٹنوں پر زور دے کر اٹھے اور ''ابھی آیا'' کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔
برآمدے سے ابھرنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ کم و بیش دو درجن خواتین تو وہاں موجود ہوں گی۔ اگربتیوں کی مدھم خوشبو بھی ہم تک پہنچ رہی تھی لیکن یہ عام اگربتیاں نہیں تھیں۔ بڑی منفرد اور ''سنسنی خیز'' قسم کی خوشبو تھی۔
فخر نے آنکھوں سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں آج بھی ایک چھوٹی سی جھری موجود تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اٹھ کر جھری سے آنکھ لگائی۔ تھوڑی سی کوشش کے ساتھ مجھے رنگین پایوں والی وہ شاندار کرسی نظر آ گئی جو ذرا بلندی پر رکھی تھی۔ اس کرسی پر ایک چادر پوش، گرانڈیل عورت براجمان تھی۔ اس نے سیاہ شیشوں والی عینک پہن رکھی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور مجھے یوں لگا کہ کائنات کی گردش تھم گئی ہے اور میں بھی اپنی جگہ پتھرا گیا ہوں۔ اپنی نگاہوں پر یقین نہیں ہوا۔ لیکن سامنے نظر آنے والی حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ میرے سامنے کرسی پر جزیرہ جاپاجی کی خطرناک ترین عورت ''مادام ہاناوانی'' براجمان تھی۔ وہی ہاناوانی جسے ہم نے قسطینا اور فارس جان کے ساتھ مل کر شکستِ فاش دی تھی اور ایک نہایت کاری زخم لگایا تھا...... اس کے بدکار بیٹے رائے زل کو جہنم واصل کیا تھا۔ جاپاجی کے اس زہریلے حاکم کا سر سجاول نے اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔
ہاں، یہ وہی تھی...... اور یہ یہاں پہنچ گئی تھی۔ ذہن اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ وہ جاپاجی سے ہزاروں میل دور یہاں رحیم یار خاں کے اس گمنام گاؤں موراناں میں موجود ہے...... اور اس دیہی مکان کے ایک برآمدے میں، ایک گول شیشوں والی رنگین کرسی پر براجمان ہے۔ دفعتاً میرے ذہن میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ میرے پورے جسم میں برقی لہریں دوڑ گئیں اور اعضا تڑخ گئے۔ میرا خیال سیدھا انیق کی طرف گیا...... یہ انیق کا گھر تھا...... اور آنکھوں کے ذریعے مسحور کرنے والے فن کی یہ بدنام ترین ''ماہرہ'' یہاں اس گھر میں موجود تھی، میرا دل بے ساختہ پکار اٹھا...... انیق سخت خطرے میں ہے......

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

انوکھا ہتھیار

نسرین منصور

والدین کا سایہ اور ساتھ ہر اولاد کے لیے نعمتِ بے بہا ہوتا ہے... ماں باپ جو کچھ کرتے ہیں، اپنی اولاد کے سکھ آرام کے لیے کرتے ہیں... جب یہی اولاد بڑی ہو جاتی ہے تو وقت کا پہیا الٹا چلنا شروع ہو جاتا ہے... پانی کا بہاؤ کتنا ہی تیز ہو... مگر وہ کبھی مخالف سمت میں نہیں چلتا... وہ آگے کی طرف ہی بڑھتا ہے...

اس باپ کی معاملہ فہمی جس نے خطرے کو وقت سے پہلے بھانپ لیا تھا

"وہ سب میری قبر پر شیمپئن انڈیلیں گے۔" راجر کولن نے اس انداز سے کہا جیسے وہ اپنے ساتھ گولف کھیلنے والے دوستوں کی شکایت کر رہا ہو جن پر وہ ہمیشہ بے ایمانی کرنے کا الزام لگاتا تھا لیکن اس بار اس کے مشتعل ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی بلکہ اس کا اشارہ اپنی اولاد کی جانب تھا۔

"میں ان تینوں کی بات کر رہا ہوں۔ انہیں اس وقت خوشی ہوگی جب میں زمین کے نیچے چلا جاؤں گا۔"

انگر اینڈ انگر کے روحِ رواں کے ایل انگر نے اپنی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اسے دیکھا اور بولا۔ ”اپنے بچوں کے بارے میں اس طرح کہنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”تم جانتے ہو انگر کہ میں سوچ سمجھ کر بات کرتا ہوں۔“

وہ جمعے کی ایک روشن دوپہر تھی۔ سڑک پر گھر جانے والوں کی وجہ سے ٹریفک بڑھ گیا تھا۔ انگر نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے امید تھی کہ وہ دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے کولن کی وصیت مکمل کرلے گا جو ستر سال کی عمر میں بھی اپنے معاملات خود ہی سنبھال رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے اختیار کو چیلنج کرے۔

”لگتا ہے کہ تمہارے گھریلو معاملات کافی پیچیدہ ہو گئے ہیں؟“ وکیل نے محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”پیچیدہ بہت چھوٹا لفظ ہے۔“ کولن منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو اپنی ماں کے مرنے کے بعد سے ہی مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کررہے ہیں۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔“

وہ دونوں ایک بڑی میز پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور درمیان میں ایک معاون بیٹھا وصیت کے کاغذات تیار کررہا تھا۔ انگر کی بیوی بھی اس فرم میں اس کی پارٹنر تھی اور انگر چاہتا تھا کہ وہ بھی اس موقع پر موجود ہوتی لیکن اس نے اس روز اتفاق سے چھٹی کرلی تھی۔

”بظاہر سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔“ کولن نے کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ کہاں دستخط کرنے ہیں؟“

یہ کہہ کر اس نے ان صفحات پر دستخط کرنا شروع کر دیے جس کی نشاندہی معاون وکیل نے کی۔ ”وہ ناشکرے آئے ہوئے ہیں اور ان کا قیام میرے گھر پر ہی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جلدی مکمل ہوجائے۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو سوموار تک میری موت واقع ہوجائے گی۔“

ایک لمحے کے لیے انگر کو لگا جیسے اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے گو کہ اس سے پہلے بھی کولن اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کے بارے میں اشارہ کرتا رہتا تھا لیکن اس وقت اس نے جو کہا وہ ایک طرح سے بدشگونی تھی۔ انگر کو یہ بات اچھی نہ لگی اور اس نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔ ”ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ شاید تم قتل کی بات کررہے ہو۔“

”اس کے علاوہ میں کیا بات کرسکتا ہوں۔“ کولن نے دوبارہ کاغذات کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے طور پر حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں لیکن وہ بہت چالاک ہیں۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور میرے معاملات کی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔“

ان دونوں کی ملاقات اتفاقاً ایک میلے میں ہوئی تھی۔ جہاں قدیم نوادرات فروخت ہورہے تھے۔ کولن وہاں اپنی بیوی کے لیے ایک خاص تحفہ خریدنے گیا تھا۔ اس سلسلے میں انگر نے اس کی مدد کی اور یہیں سے ان کے درمیان تعلقات قائم ہوگئے اور کولن نے اسے اپنی جائداد کے لیے قانونی مشیر مقرر کرلیا۔ انگر نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔ ”کیا تم اب بھی ڈاکٹر زینگلر کے زیرِ علاج ہو؟“

”مجھے کسی ماہرِ نفسیات کی ضرورت نہیں۔“ کولن کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔ ”وہ مجھے ایسی دوائیں دے رہا تھا جن سے مجھے سکون ملے، ڈپریشن نہ ہو اور مجھے نیند آجائے لیکن ان نشہ آور گولیوں کی وجہ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت متاثر ہورہی تھی۔ اس لیے میں نے نیند کی گولیوں کے سوا باقی دوائیں کئی ماہ پہلے ہی چھوڑ دی تھیں کیونکہ میری عمر کے آدمی کے لیے رات کی نیند بہت ضروری ہے۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکٹر زینگلر کے مشوروں کو نظرانداز کرنا عقل مندی ہے؟“

”ہاں، میں نے یہی مناسب سمجھا۔ اس طرح کی صورتِ حال میں آدمی کا ذہن مستعد اور چوکس ہونا چاہیے۔ یہ میری بقا کا معاملہ ہے۔“

انگر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی تو ممکن تھا کہ تم کسی بہانے ان کی یہاں آمد ملتوی کرسکتے تھے۔“

”نہیں۔ ہم ہر سال ان کی ماں کی برسی پر اکٹھے ہوتے ہیں۔“ وہ افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کی روح بھی یہ دیکھ کر بے چین ہورہی ہوگی۔“

سات سال پہلے جوڈی کولن کی برسی کے موقع پر انگر اس کے غم زدہ بچوں سے ملا تھا۔ سب سے بڑی بیٹی ڈیزی ماہر فزیشن تھی۔ بڑا بیٹا گراہم سوفٹ روبوٹکس پر اہم ریسرچ کرچکا تھا جبکہ سب سے چھوٹے بیٹے فوسٹر نے اپنے آپ کو تاریخی عمارتوں کے تحفظ کے لیے وقف کردیا تھا۔

”میرا خیال تھا کہ وہ تینوں اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔“ انگر نے کہا۔

”میری نظر میں ان کے پیشے مضحکہ خیز ہیں۔“ کولن نے بیزاری سے کہا۔ ”انہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں۔ ایک

طرح سے انہوں نے میرے منہ پر تھوک دیا ہے۔"
"تم نے تو اپنی طرف سے بہترین کوشش کی راجر۔" انگر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ایک آدمی یہی کچھ کرسکتا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" کولن نے قلم میز پر رکھا اور دونوں ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے بولا۔ "میرے مرنے کے بعد انہیں حصہ مل جائے گا۔"
معاون وکیل نے آخری صفحے پر مہر لگائی۔ تمام کاغذات اکٹھے کیے اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ ان دونوں نے بھی کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ انگر بولا۔ "امید کرنی چاہیے کہ وہ وقت اتنی جلدی نہیں آئے گا۔"
"میں اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتا۔" کولن پلکیں جھپکتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہ رہے ہیں تو وہ اس پر ضرور عمل کریں گے۔"
"تم انہیں ہوٹل میں کیوں نہیں منتقل کر دیتے؟" انگر نے تجویز پیش کی۔ "اس طرح تمہارا خوف کم ہوجائے گا۔"
"ٹھیک ہے۔" کولن نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے میں کیا بہانہ بناؤں گا۔ ویسے بھی میں نے ایسا بندوبست کر رکھا ہے کہ کوئی نہ کوئی میرے آس پاس موجود رہے۔ خدمت گار، ہاؤس کیپر اور بٹلر کتوں سے زیادہ وفادار ہیں۔ وہ عاطور پر اتوار کو چھٹی کرتے ہیں لیکن اس ویک اینڈ پر نہیں جائیں گے۔"
انگر نے لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ "یقیناً وہ تمہاری پریشانی کی وجہ سے محتاط ہو گئے ہوں گے۔"
کولن نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ یہ لوگ نصف شب کے بعد کوئی کارروائی کریں گے جب میں گہری نیند سو رہا ہوتا ہوں۔"
"ایسی صورت میں تو تمہیں خواب آور گولیاں نہیں لینی چاہئیں۔"
"میں رات بھر جاگ کر اپنی صحت خراب نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے بیڈ روم کی حفاظت کا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ پورے ہال میں خفیہ کیمرے نصب ہیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں میں حفاظتی تالے لگے ہوئے ہیں۔ مجھے کتا پالنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے میری بلی وسکر ہی کافی ہے۔"
انگر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "لگتا ہے کہ تم نے ہر چیز کے بارے میں اچھی طرح سوچ لیا ہے، اپنا خیال رکھنا۔"

☆☆☆

اتوار کی سہ پہر انگر جالی دار جھولے میں نیم دراز 'دا ایڈونچرز آف شرلاک ہومز' پڑھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ دوسری طرف سے ایک زنانہ آواز نے کہا۔
"کیا میں مسٹر انگر سے مخاطب ہوں؟"
"ہاں، میں انگر ہی ہوں۔"
"میں سراغ رساں ایسویل بول رہی ہوں مسٹر انگر۔"
"کیا مسئلہ ہے؟"
"اس کا تعلق راجر کولن سے ہے۔ اس کی بٹی ڈیزی نے بتایا ہے کہ تم مسٹر کولن کی جائداد کے معاملات دیکھتے ہو۔"
"اس نے ٹھیک ہی بتایا۔ میں کئی برسوں سے یہ کام کر رہا ہوں۔"
"مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ مسٹر کولن انتقال کر گئے ہیں۔"
"اوہ، کب؟"
"وہ چند گھنٹے قبل اپنے بستر میں مردہ حالت میں پائے گئے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اتوار کو دیر تک سوتے رہتے تھے اور اگر انہیں ڈسٹرب کیا جائے تو ناراض ہو جاتے تھے۔"
"ہاں، اسے دیر تک سونے کی عادت تھی۔"
"جب بہت دیر ہو گئی تو خدمت گار نے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو دروازہ توڑنا پڑ گیا۔ مجھے کچھ سوالات کرنا ہیں اگر تم تیار ہو۔"
"بالکل۔" انگر نے گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا، تم نے موت کی وجہ نہیں بتائی۔"
"ہم وہی جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسٹر کولن کی ڈائری کے مطابق تم دونوں کی ملاقات جمعے کی سہ پہر ہوئی تھی۔"
"ساڑھے چار بجے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹا جاری رہی۔"
"اس ملاقات کا مقصد کیا تھا؟"
"اس نے حال ہی میں مجھ سے وصیت میں تبدیلی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ہم اسی سلسلے میں کاغذی کارروائی مکمل کر رہے تھے۔"
"کیا اس روز کولن نے کوئی غیر معمولی بات کہی یا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''وہ دستاویزات مکمل کرنے کے لیے جلدی کر رہا تھا۔''
''کیوں؟ تم اس کی وجہ جانتے ہو؟''
انگر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ بچے اس کے خلاف کوئی اسکیم بنا رہے ہیں۔''
''کیسی اسکیم؟''
''کولن کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کے بچے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔''
''کیا اس نے یہ کہا تھا؟''
''ہاں، واضح طور پر۔''
''کیا تم نے اس کی بات کو سنجیدگی سے لیا؟''
''شاید نہیں۔ راجر کو شک کرنے کی عادت تھی۔''
''کیا اس نے اس مبینہ خطرے کا ذکر تفصیل سے کیا تھا؟''
''اس نے صرف یہ توقع ظاہر کی تھی کہ وہ لوگ اختتام ہفتہ ایسی کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور اس نے احتیاطی تدابیر اختیار کر لی ہیں۔''
''ہاں ہم نے بھی ان میں سے کچھ کا نوٹس لیا ہے۔ جب تک میں تم سے دوبارہ رجوع نہ کروں۔ برائے کرم کسی اور سے اس کا ذکر مت کرنا۔''
''میری بیوی اس فرم کی سینئر پارٹنر ہے۔ وہ ضرور اس بارے میں جاننا چاہے گی۔''
''ٹھیک ہے، لیکن اس کے سوا کسی اور سے نہیں۔''

☆☆☆

یہ عظیم الشان اور قیمتی مکان راجر کو ورثے میں ملا تھا۔ اس سے پہلے انگر کو صرف ایک مرتبہ یہاں آنے کا اتفاق ہوا جب وہ جوڈی کولن کے انتقال پر قانونی مشاورت کے سلسلے میں راجر سے ملنے آیا تھا اور ایک بار پھر اسے کولن کی وصیت کے کاغذات اور اس کے قیمتی سامان کی وارثوں میں تقسیم کے لیے آنا پڑا۔
ایک ڈپٹی کی معیت میں وہ ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں اس کی ملاقات بٹلر کی وردی میں ملبوس چوراسی سالہ ہربرٹ پال سے ہوئی۔ تبھی اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ ''مسٹر انگر، تم صحیح وقت پر آئے ہو۔''
انگر نے نظریں اٹھا کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ وہاں ایک دلکش خدوخال والی سیاہ فام عورت ریلنگ کا سہارا لیے ہوئے کھڑی تھی۔ اس نے نیوی کلر کا پینٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور سینے پر سراغ رساں کی پلیٹ چمک رہی تھی۔
''میں ایسویل ہوں۔'' اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ''مجھے تمہاری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔''
وہ سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آئی اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ وہ اس کی توقع سے زیادہ جوان اور پُرکشش تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا سینئر پارٹنر کسی نئے کیس کی تفتیش میں مصروف ہے۔ اس لیے اسے یہاں آنا پڑا۔
''تم کاغذات لے کر آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔
انگر نے بریف کیس کھولا اور کولن کی وصیت کی نقل اس کے حوالے کر دی۔ سراغ رساں نے تجویز پیش کی کہ وہ ماسٹر بیڈ روم سے قیمتی ساز و سامان کی فہرست بنانا شروع کر سکتا ہے کیونکہ فارنسک ٹیم اپنا کام ختم کر کے واپس جا چکی ہے۔ انگر مسکرا کر رہ گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اسے تمام کمروں کے سامان کی گنتی کرنی ہے۔
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سراغ رساں نے اسے اب تک کی تحقیقات کے بارے میں بتایا۔ ''ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق کولن کی موت سانس لینے میں تکلیف اور دل بند ہونے کے باعث ہوئی۔ تاہم ابھی زہر کے ٹیسٹ کی رپورٹ آنا باقی تھی۔ ذاتی خدمت گار ایمری جانگ کا کہنا ہے کہ کولن ہر رات سونے سے پہلے وہسکی کے کئی گلاس چڑھانے کے بعد نیند کی گولیاں لیا کرتا تھا جو ایک خطرناک بات تھی۔
''اوہ میرے خدا۔'' انگر نے کہا۔
''گزشتہ ہفتہ جانگ نے اس کی بیٹی کو یہ بات بتائی تو اس نے بھی باپ کو یہ گولیاں لینے سے منع کیا لیکن اس نے بیٹی کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب تک وہ ڈاکٹر زینگلر کو بتاتی، بہت دیر ہو چکی تھی۔''
''تم سوچ رہی ہو کہ اس کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی؟'' انگر نے پوچھا۔
''فی الحال مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔'' سراغ رساں زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''جب تک زہر کے ٹیسٹ کی رپورٹ نہیں آجاتی، میرے لیے قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔''
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انگر نے ریلنگ کا سہارا لیا تو اسے ایک ستون ڈگمگاتا ہوا نظر آیا۔ وہ بولا۔ ''کسی زمانے میں یہ بہت خوب صورت مکان ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے۔''
''جہاں تک میں سمجھتی ہوں، اس کی بیوی مکان اور

نوکروں پر نظر رکھتی تھی۔ اس کی موت کا صدمہ کولن سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ واپس معمول کی زندگی کی طرف نہ آسکا۔''

کولن کے بیڈروم میں پہنچ کر سراغ رساں بولی۔ ''چانگ کے دروازہ توڑنے کے بعد گھر میں موجود تمام افراد یہاں جمع ہو گئے۔ اس لیے ہمیں انگلیوں کے نشانات اور ڈی این اے کے نمونوں سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ اس سے پہلے ہفتے کی شب چانگ نے کولن کو بستر پر لٹایا تھا۔ اس کے بعد گھر کا کوئی فرد اور ملازم یہاں نہیں آیا۔ سوائے اس کی بلی اور ایک دو کاکروچوں کے۔''

''تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ اس دوران یہاں کوئی نہیں آیا تھا؟''

اس نے اوپر لگے ہوئے خفیہ کیمروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پارٹنر نے ویڈیو دیکھی ہے۔ نصف شب کے کچھ دیر بعد کولن نے بلی کے اندر آنے کے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے بعد صبح تک خاموشی چھائی رہی جب ہاؤس کیپر صفائی کرنے کے لیے آیا۔''

''اوہ...... میرا دھیان کیمروں کی طرف نہیں گیا۔''

''اس کے بچے اسی فلور پر اپنے اپنے کمروں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چانگ کا کوارٹر پہلی منزل اور پام کا کوارٹر گراؤنڈ فلور پر ہے۔''

''یہاں صرف چانگ اور پام ہی ہیں۔ کوئی شیف نہیں؟''

''وہ پچھلے مہینے کام چھوڑ کر چلا گیا۔ اب چانگ اور مسز پام مل کر کھانا پکاتے ہیں۔''

وہ بیڈروم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم تیار ہو؟''

انگر نے سر ہلایا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی انگر نے سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا۔ فرش کے بیشتر حصے پر ایک انڈین اسٹائل کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بیش قیمت اور نایاب پینٹنگز آویزاں تھیں اور آتش دان پر ایک نوجوان عورت کی فریم شدہ تصویر رکھی ہوئی تھی۔

''جوڈی کولن۔'' ایسویل نے انگر کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تصویر اس وقت لی گئی جب ان کا معاشقہ چل رہا تھا۔''

''کیا خوب صورت مسکراہٹ ہے۔'' انگر نے کہا۔

سراغ رساں نے گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ممکن ہے کہ اسے پہلے ہی زہر دے دیا گیا ہو یا کسی نے سوتے میں اس کا گلا گھونٹ دیا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ قاتل کیمرے کی نظر میں آئے بغیر اندر کیسے آ گیا؟''

انگر نے آتش دان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بظاہر احمقانہ بات لگتی ہے۔''

''کیا؟''

''شاید کسی کیڑے نے چمنی کے ذریعے اندر آنے کا راستہ بنالیا ہو۔ مثال کے طور پر کوئی زہریلا سانپ؟ جب تم نے مجھے اتوار کو فون کیا تھا۔ اس وقت میں شرلاک ہومز کا ایک کارنامہ پڑھ رہا تھا۔''

''اوہ، وہ مشہور سراغ رساں؟''

''اس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح ایک زہریلا سانپ روشن دان کے ذریعے اندر آیا اور اس نے ایک نوجوان عورت کو سوتے میں کاٹ لیا۔''

''مسٹر کولن کے جسم پر ایسا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ ہم نے انگیٹھی کے ہوادان کا بھی معائنہ کیا جسے کئی برس پہلے حفاظتی وجوہات کی بنا پر بند کردیا گیا تھا اور اس کمرے میں کوئی روشن دان نہیں ہے۔''

''یہ تو بہت ہی پیچیدہ معاملہ لگ رہا ہے۔''

''بالکل نہیں۔ میں اس سے بھی زیادہ عجیب کیس بھگتا چکی ہوں۔''

انگر نے مہاگنی سے بنے ہوئے بستر کو دیکھا جس پر راجر کولن نے زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔ اس پر بچھی ہوئی چادر شکنوں سے بے نیاز تھی اور لحاف کا کچھ حصہ بستر سے نیچے لٹک رہا تھا۔

''وہ خاموشی سے مرگیا۔'' ایسویل نے اس کا ذہن پڑھتے ہوئے کہا۔ ''کسی جدوجہد کے آثار نہیں ملے۔ ہم نے ممکنہ حد تک کوشش کی کہ کم سے کم چیزوں کو چھیڑا جائے۔''

انگر نے سر ہلایا۔ پھر اسے ایسی آواز آئی جیسے کوئی تیزی سے دوڑ رہا ہو۔

''چوہے ہیں۔'' سراغ رساں نے وضاحت کی۔ ''انہوں نے دو چھتی میں ٹھکانا بنایا ہوا ہے۔ ہم نے انہیں بھگا دیا تھا لیکن شاید پھر واپس آ گئے۔''

انگر ایک بار پھر سر ہلا کر رہ گیا۔ ''اب یہاں سے چلیں۔'' ایسویل نے پوچھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''ضرور۔''

ایسویل میٹنگ کا انتظام کرنے نیچے چلی گئی اور انگر تیسری منزل پر ہی چکر لگاتا رہا۔ اس کی سہولت کے لیے ہاؤس کیپر نے تمام کمرے کھول دیے تھے تاکہ وہ سامان کی فہرست بنا سکے۔ بہت جلد اسے اندازہ ہوگیا کہ ہر کمرے سے قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ وہ اتنی چھوٹی تھیں کہ انہیں کسی کے علم میں لائے بغیر لے جایا جاسکتا تھا یا پھر اس میں کئی لوگ شامل تھے۔

کولن کی اسٹڈی میں اسے سیاہ اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہوئی لکھنے کی میز ملی جس پر اٹھارویں صدی کے زمانے کا طلائی کام بنا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ کا ٹیبل لیمپ کہیں نظر نہیں آیا۔ اسی طرح آئل پینٹ سے بنی ہوئی ماں اور بچے کی تصویر بھی غائب تھی۔ دستاویزات کے مطابق جوڈی کولن نے ذاتی طور پر وہ تصویر وہاں رکھی تھی تاکہ اس کا شوہر کام کے دوران اسے دیکھتا رہے۔ اب اس کی جگہ ایک عام سی تصویر رکھ دی گئی تھی۔ انگر اپنی بے چینی پر قابو پانے کے لیے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کولن کے گھر سے قیمتی اشیا ہٹا لی گئی تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ چوری ہوئیں یا انہیں اسٹور میں رکھ دیا گیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق راجر کولن کی موت سے ہو۔

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے شیشوں سے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کی کار وہاں آکر رکی۔ ڈرائیور نے باہر آکر پہلے چھتری اور پھر پیچھے کا دروازہ کھولا۔ اسکرٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ عورت باہر آئی۔ اس کے پیچھے دو آدمی اور تھے۔ ان میں ایک نسبتاً لمبا دبلا اور داڑھی والا تھا جبکہ دوسرا کلین شیو اور لڑکوں جیسا حلیہ بنائے ہوئے تھا۔ انگر کو انہیں پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ کولن کی اولاد ڈیزی، گراہم اور فوسٹر تھے۔

تیز ہوا کی وجہ سے بارش کے قطرے کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر آرہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی بند کرتا۔ ایمری جانگ نے پیچھے سے آکر کھڑکی بند کردی۔ انگر نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ''اوہ میرے خدا! تم اتنی خاموشی سے کیسے اندر چلے آئے؟''

''میں شروع سے ہی تمہارے ساتھ ہوں جب تم مسٹر کولن کی چیزوں کا معائنہ کررہے تھے۔''

''تمہارا مطلب ان چیزوں سے ہے جو باقی رہ گئی ہیں۔'' انگر نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہاں کوئی کام ہے؟''

''میں ہر روز سہ پہر میں اس کمرے کو ٹھیک کرنے آتا ہوں جب مسٹر کولن گالف کھیلنے جاتے ہیں۔''

''لیکن اب تو وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''کسی کے معمولات یا تابعداری اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتی۔''

''تمہارا جذبہ قابلِ قدر ہے۔'' انگر نے کہا۔ ''اب مجھے اجازت دو۔ میں نیچے جارہا ہوں۔''

جب وہ جانے کے لیے مڑا تو جانگ نے اس کی کلائی پکڑ لی اور بولا۔ ''مسٹر انگر، کچھ باتوں کو ظاہر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔''

''لیکن بعض اوقات ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔'' انگر نے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے کہا۔

شمالی حصے کی طرف جاتے ہوئے انگر نے ایک عورت کو دیکھا جس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ وہ مختلف کمروں میں آجارہی تھی۔ اس نے ماسٹر بیڈروم کو نظرانداز کردیا اور ہال کے سامنے والے کمرے میں داخل ہوگئی۔ انگر نے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا۔ وہ کھڑکیاں بند کررہی تھی۔

''مسز پال؟'' اس نے اندازے سے کہا۔

وہ رک گئی اور حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، بولو کیا بات ہے؟''

انگر نے اپنا تعارف کروایا تو وہ بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم کون ہو۔ مجھ سے کوئی کام ہے؟''

''ہاں، تم سے ایک دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن ذرا جلدی کرو۔ لگتا ہے طوفان آنے والا ہے۔''

انگر نے پوچھا کہ وہ کتنے عرصے سے یہاں کام کررہی ہے۔ تو وہ بولی۔ ''میری آدھی زندگی یہاں گزر گئی۔''

''مالکوں کا رویہ کیسا ہے؟''

''مسز کولن کی زندگی تک بہت بہتر تھا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتی اور معقول معاوضہ دیتی تھی۔ اس کا شوہر بہت مہربان شخص تھا۔ اسی لیے میں نے کسی اور جگہ جانے کا نہیں سوچا۔''

''اور بچے؟''

''انہوں نے کبھی مجھ پر انگلی نہیں اٹھائی۔''

''اسی لیے تم اور مسٹر پال اتنے عرصے سے یہاں رہ رہے ہو؟''

''اس عمر میں ہم اور کہاں جاسکتے ہیں؟''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"میں سمجھ گیا مسز پال۔ کیا ہفتے کے روز نصف شب سے پہلے یا اس کے بعد تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی؟"

"میں پہلے ہی لیڈی سراغ رساں کو اس کا جواب دے چکی ہوں۔"

انگر نے ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔"کوئی ایسی بات جو تم سے نظرانداز ہوگئی ہو؟"

"ہاں، ایک چھوٹی سی بات تھی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔"میں اپنا کام محنت سے کرتی ہوں... اس لیے ایسی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"اتوار کے دن مہمانوں کے آنے کے بعد ہمارا کام بڑھ گیا... اس لیے مجھے سب سے پہلے صفائی کرنا تھی۔ میں نے ویکیوم کلینر کے بجائے جھاڑو استعمال کی تاکہ مسٹر کولن کی نیند خراب نہ ہو۔ تبھی میری نظر ایک کاکروچ پر گئی۔ مجھے ان چیزوں سے نفرت ہے جبکہ وہ کاکروچ جسامت میں بھی بڑا تھا۔ بے اختیار میری چیخ نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے پاؤں سے کچلتی..."

"اس کے باوجود مسٹر کولن کی آنکھ نہیں کھلی؟"

"نہیں، البتہ اس کا بڑا بیٹا گراہم اپنے کمرے سے باہر آگیا۔ میں نے اس سے معذرت کی لیکن اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ بس نیچے پڑے ہوئے مردہ کیڑے کو دیکھتا رہا۔ شاید اسے بھی میری طرح ان چیزوں سے نفرت ہے۔"

دور کہیں سے بادلوں کی گرج سنائی دی۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بولی۔"برا مت ماننا۔ ابھی مجھے دوسرے کمرے بھی دیکھنے ہیں۔"

انگر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوسری جانب مڑ گیا۔ اس کا ارادہ نیچے جانے کا تھا لیکن ماسٹر بیڈروم کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ایک بار پھر اس شاہانہ میز پر گئی اور وہ بے اختیار کمرے میں چلا گیا۔

وہ میز وکٹورین عہد کا نادر شاہکار تھی۔ انگر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تاہم اس کی توجہ اپنے کام پر تھی۔ اس نے دائیں جانب کی دراز کھولی۔ اس میں سماجی تقریبات کے دعوت نامے، تھیٹر میگزین کے پرانے شمارے، اوپیرا کے پروگرام اور کولن کے بچوں کی تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ دراز بند کرنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر پیچھے کی جانب ایک خانے پر گئی۔ وہ اس قدیم طرز کی میز میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا تجسس مزید بڑھ گیا جب اس نے وہاں تین فائلیں دیکھیں۔ ہر فائل پر کولن کی تحریر میں اس کے بچوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔

اس نے سب سے پہلے ڈیزی کی فائل کھولی۔ اس میں اس کی تعلیمی قابلیت اور پیشہ ورانہ کامیابیوں کے بارے میں تفصیلی مواد موجود تھا۔ دوسری فائل گراہم کی تھی جس نے بائیو مکینکس میں پی ایچ ڈی کیا تھا اور اسی یونیورسٹی میں پروفیسر لگ گیا جہاں سے انگر نے قانون کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تیسری فائل فوسٹر کی تھی جس میں اس کے تاریخی ورثے کے تحفظ کی کوششوں کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ وہ کولن ہاؤس کو بھی قومی ورثے کے طور پر رجسٹر کروانا چاہ رہا تھا۔

وہ ان فائلوں کو اپنی جگہ پر رکھنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر ایک پیکٹ پر گئی یہ جوڈی کولن کے ہاتھ سے لکھے گئے پیغامات تھے جو اس نے شادی کے ابتدائی سالوں میں اپنے شوہر کو بھیجے۔ اس نے باری باری انہیں پڑھنا شروع کیا۔ ان سب کا موضوع کم و بیش ایک جیسا تھا۔ اس نے شوہر سے اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ التجا بھی کی تھی کہ وہ اس کا مزید وقت اور توجہ چاہتی ہے۔ ایک پیغام کے آخر میں لکھا تھا 'اگر میرے لیے نہیں تو کم از کم ہمارے بچوں کے لیے ہی سہی۔'

پیاسا

بتیاں گل کر کے اس نے بیٹے کو سو جانے کی ہدایت کی۔ کچھ ہی دیر بعد بچے نے ہانک لگائی۔"ابو...... پانی!"

"سو جاؤ...... اب کچھ نہیں ملے گا...... بار بار باتھ روم جاؤ گے!"

بچے نے توقف سے دوبارہ پھر التجا کی مگر باپ نے سختی سے انکار کر دیا۔

جب بچے نے چوتھی بار پانی مانگا تو باپ غرایا۔

"اب تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو آ کر زوردار تھپڑ لگاؤں گا۔"

"ابو! پیاس لگ رہی ہے۔ جب تھپڑ مارنے آئیں تو آدھا گلاس پانی بھی لیتے آئیں!"

جاوید کاظمی، میامی، امریکا

"کیا پڑھا جارہا ہے؟" انگر نے چونک کر دیکھا۔ وہ فوسٹر تھا۔ جو نرم مزاج ہونے کے باوجود اپنے غصے کو نہ چھپا سکا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں جاسوسی تو نہیں کر رہا۔" انگر نے دراز بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تمہارے لیے کولن ہاؤس کو زوال پذیر ہوتے دیکھنا تکلیف دہ ہوگا۔"

"مجھے ہمیشہ کسی پرانی عمارت کو تباہ ہوتے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔"

"تم اس کے تحفظ کے لیے قانونی اقدامات کرتے رہے ہو۔"

"کیا تم اس کی اہمیت نہیں سمجھتے؟"

"تمہارے والد اس پر خوش نہیں تھے۔"

"اگر وہ اپنے راستے پر چلتے رہتے تو اب تک یہ جائداد کئی ٹکڑوں میں بٹ کر تقسیم ہو چکی ہوتی۔"

"راستے پر چلتے رہتے...... یا زندہ ہوتے؟"

دونوں کی نظریں ملیں۔ فوسٹر نے کہا۔ "ان میں اس مکان کی دیکھ بھال کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ بدحواس اور بے عقل ہو چکے تھے۔ نوکر کئی برسوں سے چیزیں چرا رہے تھے لیکن انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔"

"تم نے غور کیا ہوگا کہ کچھ چیزیں غائب ہیں؟"

"بالکل، ان میں بہت سی میری ماں کی پسندیدہ تھیں۔" فوسٹر نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کمرے سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔"

"کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔" اس نے مبہم انداز میں اس کا جملہ دہرایا جیسے اس کا دماغ کہیں اور ہو۔

فوسٹر نے کہا۔ "ہاں، میرا یہی مطلب تھا۔"

انگر نے کئی بار پلکیں جھپکائیں پھر اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولا۔ "دوسرے لوگوں کو بتا دو کہ میں تھوڑی دیر میں نیچے آرہا ہوں۔"

فوسٹر کے جانے کے بعد اس نے پھر ایک فائل میز سے نکالی۔ اس کے بعد اس نے اپنے اسمارٹ فون سے تین کالز کیں۔ ایک اپنی بیوی، دوسری اس یونیورسٹی کو جہاں سے اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی اور تیسری کولن کے اکاؤنٹنٹ کو۔ اس کام میں اسے بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے لیکن اس وقت ایک ایک منٹ کی اہمیت تھی۔

سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اسے ایک بار پھر بادلوں کے گرجنے اور بجلی کڑکنے کی آواز سنائی دی۔ ابھی اس نے نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اس کی بیوی ابی گیل کا فون آگیا۔ اس نے انگر کے خدشات کی تصدیق کر دی۔ اس نے بیوی کا شکریہ ادا کیا اور توقع ظاہر کی کہ وہ ڈنر گھر پر ہی کرے گا۔

سراغ رساں ایسوبیل آخری سیڑھی کے پاس کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انگر نے تاخیر سے آنے پر معذرت کی اور بتایا کہ وہ اوپر کیا کر رہا تھا۔ سراغ رساں نے اس کی تیز فہم ہونے کی تعریف کی اور اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگی کہ اس کی نظروں سے یہ سب کیوں اوجھل رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ خود بھی خفیہ کیمروں کی ویڈیو دیکھ سکتی۔

سب لوگ ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ وہاں کا نقشہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ جگہ کسی عجائب گھر کا منظر پیش کر رہی تھی جہاں اس خاندان کی بیش قیمت اور نادر اشیا رکھی ہوئی تھیں لیکن انگر کی دلچسپی پینٹنگز میں تھی۔ اس کے علاوہ سونے کے فریم میں جڑی کولن خاندان کے مردوں اور عورتوں کی تصاویر بھی اس کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔

اس نے ایسا ہی طرزِ عمل کولن کی اولاد میں بھی محسوس کیا۔ وہ سب پہلے سے ایک بڑی میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں پر براجمان تھے۔ پُرکشش چہرے اور جسم کی مالک ڈیزی نے عمدہ تراش خراش کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ کوئی بھی مرد اسے دیکھ کر پاگل ہو سکتا تھا۔ شکل سے ہی جھگڑالو اور چڑچڑا نظر آنے والا گراہم اضطراب کے عالم میں اپنی داڑھی کے بال نوچ رہا تھا جبکہ فوسٹر کے چہرے پر بیزاری تھی اور وہ لاتعلق بنا بیٹھا تھا۔ مسز پال نے بھی اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا جبکہ پال ہمیشہ کی طرح اونگھ رہا تھا اور اس کی گردن بار بار ایک طرف ڈھلک جاتی تھی۔ ایمری چانگ حسبِ معمول پُرسکون تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ شیرف کے نائبین اب باہر جانے والے راستے پر تعینات تھے۔

ایسوبیل نے ایک طرف ہٹتے ہوئے انگر کو درمیانی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "سب سے پہلے میں تم لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ اتنا صبر کیا۔"

"یہ تکلفات چھوڑو۔" ڈیزی نے جوابی وار کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ہمیں پہلے ہی بہت انتظار کروایا ہے۔"

"بہرحال۔" انگر نے بریف کیس سے کولن کی وصیت کی کاپیاں نکالیں اور انہیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"پہلے میں چند حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے باپ کی موت کیسے ہوئی؟"

"یہ سراغ رساں ایسویل کا کام ہے۔" گراہم بولا۔

"تم سراغ رساں نہیں بلکہ ہمارے باپ کے وکیل کی حیثیت سے یہاں آئے ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں لیکن....."

"یہ درخواست نہیں ہے۔" ڈیزی بولی۔ "اب یہ مکان ہماری ملکیت ہے اور تم ہماری وجہ سے یہاں نظر آرہے ہو۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو، ایسا نہیں ہے۔"

"معاف کرنا۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"تمہارے باپ کے مرنے کے بعد یہ مکان تم میں سے کسی کی ملکیت نہیں ہے۔"

یہ چونکا دینے والا انکشاف سن کر سب حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر حیرت کی جگہ تجسس نے لے لی۔ یہاں تک کہ ہربرٹ پال بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔

"یہ صریحاً بکواس ہے۔" ڈیزی پُراعتماد انداز میں بولی۔ "میں نے خود ماں کے مرنے کے بعد وصیت کے کاغذات دیکھے تھے۔ اس میں سب کچھ ہم تینوں کے حصے میں آیا تھا۔"

"اس نے ہمیں اس سے محروم کرنے کی دھمکی دی تھی۔" فوسٹر بولا۔ "وہ کوشش کررہا تھا کہ ہمیں اس کی جائداد میں سے کچھ نہ ملے لیکن وہ اس پر عمل نہ کرسکا۔"

"اس بار وہ کامیاب ہوگیا۔ جتنے کی سہ پہر وہ میرے دفتر آیا تھا۔" انگر نے کاغذات ایسویل کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ تاکہ وہ سب کو دکھا دے۔ "ماسٹر کولن نے تمہاری ماں کے نام پر ایک فاؤنڈیشن اور وصیت کی رو سے کولن ہاؤس اور ملحقہ جائداد اس کے نام کردی۔ اب یہ جوڈی کولن پارک کہلائے گا جبکہ اس گھر کو ان لوگوں کے لیے ڈے کیئر سینٹر میں تبدیل کیا جارہا ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ کولن ہاؤس کا سارا سامان نیلام کرکے اس کی رقم فاؤنڈیشن کے فنڈ میں جمع کردی جائے گی۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" گراہم بولا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

انگر نے اپنی کاپی اٹھائی اور اس کے ایک نشان زدہ صفحے کو پڑھتے ہوئے بولا۔ "اس نے مجھے ان لفظوں کا اضافہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ "اگر میری اولاد میں سے کوئی چاہے تو وہ اس فاؤنڈیشن میں رضاکارانہ طور پر خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔ مثلاً گھر کی صفائی یا زمین کی دیکھ بھال وغیرہ۔"

مسز پال خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔"

"نان سینس۔" ڈیزی اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "ہم مقابلہ کریں گے۔ تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔"

گراہم بھی اس کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اس کے نقد اثاثوں اور سرمایہ کاری کے بارے میں کیا لکھا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ اس نے کچھ زیادہ نہیں چھوڑا۔ تمہارے باپ نے حالیہ برسوں میں بہت نقصان اٹھایا ہے۔ تاہم تمہاری ماں نے مرنے سے پہلے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا تاکہ اس گھر کے ملازمین ریٹائرمنٹ کے بعد آرام وہ زندگی گزار سکیں۔"

"ان کا کسی چیز پر کوئی حق نہیں بنتا۔" ڈیزی نے انہیں تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جنہوں نے اسے بے دردی سے لوٹا اور اس گھر کو برباد کردیا۔"

"اپنی زبان بند رکھو۔" مسز پال بولی۔ "اب تمہارا پہلے کی طرح یہاں راج نہیں ہے۔"

"یہ سچ ہے کہ کئی قیمتی چیزیں غائب ہیں۔" انگر نے کہا۔ "لیکن ان میں سے کوئی بھی چوری نہیں ہوئی۔"

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔" فوسٹر بولا۔

"جب میں اوپر کی منزل پر کمرے دیکھ رہا تھا تو مجھے کچھ شبہ ہوا۔ میں نے اپنی بیوی کو فون کرکے کہا کہ وہ اس بارے میں معلومات کرے۔ اس نے ایک ایسے شخص سے رابطہ کیا جو آرٹ اور نوادرات کا ماہر ہے۔ اس نے تصدیق کی ہے کہ تمہارے والد اپنے طور پر یہ چیزیں ایک ایک کرکے فروخت کرتے رہے تاکہ قرض خواہوں کو مطمئن کرسکیں اور ایک کامیاب انسان کے طور پر ان کا بھرم قائم رہے۔"

"میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔" مسز پال بولی۔ "حالانکہ پورے گھر کی صفائی میں ہی کرتی ہوں۔"

"اس کے باوجود اسے تم پر بھروسا تھا کہ اپنی زبان بند رکھو گی اور وہ تمہارا شکر گزار تھا کہ تم اس کا ساتھ دے رہی ہو۔ کیوں مسٹر چانگ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"وہ اپنی انا کی وجہ سے ان چیزوں کو کھلے عام فروخت نہیں کرسکتا تھا۔ حالات چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس عمر میں لوگ اپنی عزت اور وقار کے معاملے میں زیادہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حساس ہو جاتے ہیں۔ ہم تینوں اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“

ڈیزی نے انگر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا اور غیر ضروری اقدامات کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بیڈروم کو قلعے میں بدل دیا تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ جس وقت اس نے یہ وصیت لکھوائی۔ تب بھی اس کی ذہنی کیفیت درست نہیں تھی۔“

”بالکل۔“ گراہم بولا۔ ”اس میں کوئی شبہ نہیں۔“

”تمہارے والد جھگڑالو طبیعت کے مالک تھے۔“ انگر نے کہا۔ ”اور ان کے کچھ خیالات عجیب سے لگتے تھے لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ ایک درست وصیت تیار کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔“

”اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے۔“ ایسویل نے انگر کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے باپ کی موت بھی اس کی دُور بینی کی گواہی دیتی ہے۔“

”بہت خوب۔“ ڈیزی بولی۔ ”کورونر نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کی موت دم گھٹنے اور دل بند ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس سے معلوم ہو کہ یہ قتل کا کیس ہے۔“

”یہ مسٹر انگر کے آنے سے پہلے کی بات ہے۔“ سراغ رساں نے وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر انگر؟“

انگر اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ مسٹر راجر کولن کو قتل کیا گیا ہے۔ اس کے لیے بہت ہی انوکھا ہتھیار استعمال کیا گیا اور یہ کہ قاتل اس وقت بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔“

انگر کو توقع تھی کہ وہاں موجود کم از کم ایک یا دو لوگوں کے لیے یہ انکشاف پریشان کن ہوگا لیکن اس کے برعکس مکمل خاموشی چھائی رہی تو اس نے مختصر الفاظ میں اپنا نظریہ بیان کرنے کی کوشش کی۔ ”جب فوسٹر کو معلوم ہوا کہ اس کا باپ کولن ہاؤس کو فروخت کرنے والا ہے تو اس نے اپنے بہن بھائیوں کو ہوشیار کر دیا جو مختلف وجوہات کی بنا پر اسے اپنا نقصان سمجھتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ایمری چانگ نے ڈیزی کو مطلع کیا کہ اس کا باپ بے خوابی کی وجہ سے شراب میں خواب آور گولیاں ملا کر لے رہا ہے۔ اس نے مداخلت کرنے کا وعدہ کیا لیکن جانتی تھی کہ وہ اسے جھڑک دے گا۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا منصوبہ بنایا جس سے اس کے باپ کی موت جلد واقع ہو جائے۔

”وہ ایک تربیت یافتہ ماہر نباتات ہے اور ایسے زہر کے بارے میں جانتی ہے جس سے سانس لینے میں رکاوٹ اور دل کی بندش ہو سکتی ہے۔ پوسٹ مارٹم کے دوران اس کا بہ آسانی پتا نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے باوجود پہلے اسے چانگ اور مسز پال پر شک ہوا جو کولن کے لیے کھانا بناتے تھے۔“

”اب تمہیں زہر کی بھی پہچان ہو گئی؟“ ڈیزی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”مجھے باغبانی سے دلچسپی ہے اور ناگ پھنی کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔“

انگر نے دیکھا کہ ڈیزی کے چہرے پر ہلکا سا کھنچاؤ آیا لیکن وہ فوراً ہی نارمل ہو گئی۔

”یہ ایک خوب صورت نارنجی رنگ کا پھول ہے۔“ انگر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”لیکن اس میں موجود پانی زہرِ قاتل ہے۔ یہ ایک خودرو پودا ہے اور ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ آج میں یہاں پہنچا تو باہر سب پودے ہٹا دیے گئے تھے۔“

”ہماری ماں نے تاکید کی تھی کہ ان پودوں سے دور رہیں۔ مالی کو بھی سختی سے ہدایت کر دی گئی تھی کہ جیسے ہی یہ پودے سر اٹھائیں، انہیں صاف کر دیا جائے۔“ فوسٹر نے بتایا۔

”حالیہ برسوں میں ایسا نہیں ہوا۔“ انگر نے کہا۔

”کیونکہ مستقل مالی کے جانے کے بعد بے پروائی برتی گئی۔“

”لیکن ہم سب نے اس رات انہی پلیٹوں میں کھانا کھایا اور اس کے بعد ہمارے باپ نے کمرا اندر سے بند کر لیا۔“

”اسی لیے تمہاری بہن کو گراہم کی مدد کی ضرورت پیش آئی۔ وہ روبوٹ بنانے کا ماہر ہے۔“

یہ سنتے ہی گراہم کا رنگ زرد ہونا شروع ہو گیا۔ انگر نے ایک فائل کھولی اور اس میں سے پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے سوفٹ روبوٹ کیڑوں اور بغیر مہروں والے جانوروں سے متاثر ہو کر بنائے گئے۔ ان کی تیاری میں لچک دار پولیمر استعمال کیا گیا۔ ان میں بھی بڑے روبوٹ کی طرح کیمرے اور حساس آلات نصب تھے جن کی مدد سے انہیں مطلوبہ جگہ تک پہنچایا جا سکتا تھا پھر کوشش کی گئی کہ ان رینگنے والے کیڑوں کے روبوٹ کو ان کے اصلی سائز کے مطابق بنایا جائے۔“

''تم نے کیا کہا۔ کون سا کیڑا؟'' پال نے اپنے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کاکروچ۔'' انگر نے جواب دیا۔ ''یہ ایک غیر معمولی کیڑا تھا اور یہ وہ کاکروچ نہیں جسے دیکھ کر اتوار کی صبح مسز پال ڈر گئی تھی اور وہ گراہم کے بیڈروم کی طرف واپس بھاگ گیا تھا بلکہ وہ کاکروچ کا روبوٹ تھا جو عام کاکروچ سے تھوڑا سا بڑا تھا۔ وہ دروازے کے نیچے سے رینگتا ہوا کولن کے بستر تک گیا اور اپنی زہر میں بجھی ہوئی چونچ اس کے نتھنوں میں گھسیڑ دی۔ ناگ پھنی کا زہریلا مادہ جب آنتوں تک پہنچتا ہے تو دم گھٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ زہر دینے کا یہ ایک انوکھا اور شاندار ذریعہ تھا۔ گراہم، تمہیں پریشانی تو ہوئی ہوگی جب تم نے اپنے قیمتی کیڑے کو تباہ ہوتے دیکھا ہوگا۔''

''بالکل بے معنی بات ہے۔'' گراہم نے یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''تم جس روبوٹ کی بات کر رہے ہو وہ دروازے کے نیچے سے نہیں گزر سکتا۔''

''اس کے برعکس تم دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اچھی طرح جانتے ہو کہ کاکروچ میں اپنی ٹانگیں پھیلانے اور اپنے جسم کو ایک تہائی تک سکیڑنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے باوجود اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آتی اور وہ تنگ جگہوں سے بھی آسانی سے گزر جاتا ہے۔''

سراغ رساں ایسویل تینوں بہن بھائیوں کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی اور اس نے مسز پال سے پوچھا۔ ''اس تباہ شدہ کیڑے کا کیا ہوا؟''

''اسے میں نے ڈسٹ بن سے اٹھا کر کچرے میں پھینک دیا۔''

''کیا اس کے بعد کچرا اٹھایا گیا؟''

''نہیں، کل کچرے والی گاڑی آئے گی۔''

''پھر تو ہم اسے وہاں سے اٹھا سکتے ہیں۔''

''میں ابھی ڈسٹ بن لے آتی ہوں۔''

''تم اسے ہاتھ مت لگانا۔ یہ کام دوسرے لوگوں پر چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک ڈپٹی کو اشارہ کیا جو ہاؤس کیپر کے ساتھ باہر چلا گیا۔ ''مجھے حیرت ہوگی اگر اس کی باقیات کا ڈی این اے، گراہم اور اس کے باپ سے میچ نہ کرے۔ مزید ثبوت ویڈیو کو غور سے دیکھنے پر مل جائے گا۔''

ڈیزی نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کبھی ایسی احمقانہ کہانی نہیں سنی جس میں ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ایک زہر سے بھرے ہوئے مصنوعی کاکروچ کو قتل کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ عدالت بھی اس پر یقین نہیں کرے گی۔''

''چپ ہو جاؤ ڈیزی۔'' گراہم میز پر جھکتے ہوئے بولا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ رکھا تھا۔ ''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ایک خطرناک منصوبہ ہے۔''

''لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟'' فوسٹر یقین نہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ''تم دونوں کے پاس بہت کچھ ہے۔ ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بچپن سے جو چاہا وہ ہمیں ملا۔''

''اس کے باوجود تم اس سے کیا چاہتے تھے؟'' انگر نے پوچھا۔

یہ سنتے ہی ڈیزی غضبناک ہوگئی۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''وہ ساری زندگی پیسا کمانے اور عورتوں کا پیچھا کرنے میں لگا رہا۔ ہم اور خاص طور پر ہماری ماں اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد یہ گھر اور اس کی ہر چیز پر ہمارا بھی برابر کا حق ہے۔ میں اسے برباد کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔''

''جہاں تک راجر کے بڑے بیٹے کا تعلق ہے۔'' انگر نے کہا۔ ''اسے اپنی ریسرچ کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی، اس کی تصدیق متعلقہ یونیورسٹی سے ہوگئی ہے۔''

گراہم نے اپنا سر اٹھایا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے کبھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس کی مجھ سے کیا توقعات ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ فوسٹر اس منصوبے میں شامل نہیں تھا؟''

گراہم نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ صرف اس گھر کو بچانا چاہ رہا تھا۔''

ایسویل نے دونوں مشتبہ افراد کو ان کے حقوق پڑھ کر سنائے اور جب اس نے انہیں ہتھکڑی لگائی تو ڈیزی تلخ لہجے میں بولی۔ ''اور تمہیں اس ساری محنت کا کیا صلہ ملا مسٹر انگر! مجھے یقین ہے کہ تم نے ہمارے باپ کے قابلِ بھروسا وکیل ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہوگا۔''

''میں نے اپنی فیس جوڈی کولن فاؤنڈیشن کو عطیہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''البتہ تمہارے باپ کی خواہش تھی کہ اس کے مرنے کے بعد میں اس کی پالتو بلی کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مکّار

شاکر لطیف

مجرم کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو... منصوبہ بندی نہایت شاندار اور باریک بینی سے کی گئی ہو... اس کے باوجود کہیں نہ کہیں ایک نشان رہ جاتا ہے... وہ بھی شاطر تھا... بلا کا منصوبہ ساز تھا... سدا کا بھوکا اور پیاسا تھا... اس کی بھوک صرف انسانی وجود سے پوری ہوتی تھی...

ایک مہافنکار کا قصہ جس کی فنکاری دھری کی دھری رہ گئی تھی

فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی نے نیند میں ڈوبے مورس کو بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی بیوی فیری کی جانب دیکھا۔ وہ بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ فیری انتہائی گہری نیند سونے کی عادی ہے اس لیے اس کے نہ اٹھنے پر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل فون اٹھا لیا۔ تاہم نمبر دیکھتے ہی وہ کسل مندی سے انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور اتنی صبح ایڈرسن کی کال نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ایڈرسن اس کا ماتحت تھا۔ جبکہ مورس خود پولیس میں سارجنٹ کے عہدے پر فائز تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''سر! اس وقت ڈسٹرب کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔ تاہم معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے آپ کو فون کرنا پڑا۔''

''کیا ہوا؟'' مورس نے سوال کیا۔

''قتل۔'' ایڈرسن نے مختصراً کہا۔

''تفصیل بتاؤ؟'' مورس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''سر، قتل رابرٹ نامی ایک بوڑھے شخص کا ہوا ہے جو اسی شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں اپنے گھر میں تنہا رہائش پذیر تھا۔ اب تک کی معلومات کے مطابق، اس کی بیوی وفات پا چکی ہے جبکہ تین بیٹے مستقل طور پر کینیڈا اسکونت اختیار کر چکے ہیں۔ رابرٹ نامی یہ شخص اس شہر کی مشہور شخصیت لارڈ جوناتھن کے ہاں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی موت کے بارے میں اس وقت پتا چلا جب ایک ہمسائے نے اس کے گھر سے بدبو آنے پر پہلے رابرٹ کے گھر کی گھنٹی بجائی تاہم کافی دیر تک دروازہ نہ کھلنے کے بعد پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس نے آ کر چیک کیا۔ دروازہ اندر سے بولٹ تھا۔ دروازہ توڑا گیا تو ڈرائنگ روم میں سے رابرٹ کی لاش برآمد ہوئی۔ رابرٹ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ جائے وقوعہ سے دیگر شواہد بھی اکٹھے کیے جا رہے ہیں۔ ویسے تو موت کا وقت پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا مگر میرا خیال ہے کہ رابرٹ کی لاش کم از کم تین دن پرانی ہے کیونکہ اس کی موت کے بارے میں اس وقت پتا چلا جب گھر سے تعفن اٹھنا شروع ہوا۔ آس پاس کے ہمسایوں سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ رابرٹ خاصا تنہائی پسند واقع ہوا تھا اور بہت کم کسی سے ملتا جلتا تھا۔ فنگر پرنٹس کے لیے ٹیم پہنچنے والی ہے۔ اس کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا جائے گا۔ بظاہر یہ قتل کی ایک سیدھی سادی سی واردات ہے مگر ایک ایسی بات ہے جسے میں کافی غور کے بعد بھی کہیں ایڈجسٹ نہیں کر پایا۔'' ایڈرسن تیزی سے تفصیل بتاتے ہوئے رکا۔

''کون سی بات؟'' مورس نے چونک کر سوال کیا۔

''سر! مقتول کے جسم کے مختلف حصوں کو کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا اُسے مارنے کے بعد کیا گیا ہے ورنہ رابرٹ کی چیخیں آس پاس کے ہمسایوں کو ضرور متوجہ کرتیں۔ گولی چلنے کی آواز بھی کسی نے

نہیں سنی مگر مقتول کے سینے میں موجود سوراخ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اسے گولی سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ میرے خیال میں قاتل نے سائلنسر لگا پسٹل استعمال کیا ہے۔''

کچھ ہی دیر میں وہ اپنی کار میں ایڈرسن کے بتائے ہوئے پتے کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ اسے مطلوبہ جگہ پر پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگا۔ رابرٹ نامی مقتول کے گھر کے سامنے اس وقت لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ تاہم گھر کے سامنے چند باوردی اہلکار موجود تھے۔ شاید یہ کسی غیر متعلقہ شخص کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے تھے۔ موریس نے کار ایک سائڈ پر روکی اور پھر جیسے ہی کار لاک کر کے باہر نکلا ایک جانب سے ایڈرسن سامنے آگیا اور پولیس کے مخصوص انداز میں سیلیوٹ کیا۔

''کیا فنگر پرنٹس ٹیم پہنچ گئی ہے؟'' موریس نے پوچھا۔

''یس سر۔'' ایڈرسن نے مؤدبانہ جواب دیا۔ ''اندر فنگر پرنٹس اٹھائے جا رہے ہیں، اس کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کیا جائے گا، آپ چاہیں تو لاش کا معائنہ کر سکتے ہیں۔''

''آؤ۔'' موریس نے کہا تو ایڈرسن سر ہلاتے ہوئے مقتول رابرٹ کے گھر کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا مگر جیسے ہی وہ دروازے کے پاس پہنچا اس نے بے اختیار اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ تعفن زدہ لاش کی بو واقعی میں ناقابلِ برداشت تھی۔

''سر! ماسک پہن لیں۔'' اسی لمحے ایڈرسن نے موریس کی جانب ایک ماسک بڑھا دیا اور خود بھی ماسک پہن لیا۔ موریس نے سر ہلاتے ہوئے ماسک پہنا اور ایڈرسن کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گیا۔

رابرٹ نامی مقتول کی قدرے پھولی ہوئی لاش سامنے صوفے پر پڑی ہوئی تھی۔ موریس نے پہلی ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا کہ رابرٹ نامی اس شخص کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو گھسیٹ کر صوفے پر ڈالا گیا ہے۔ دروازے سے لے کر صوفے تک فرش پر موجود خون کی لکیروں سے بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا۔ لاش سے اٹھنے والی بو سے یہ بات بھی قرینِ قیاس معلوم ہوتی تھی کہ یہ قتل دو تین دن پہلے کیا گیا تھا مگر کس نے اور کیوں؟ اس سوال کا جواب موریس کو تلاش کرنا تھا۔ لاش کے جسم سے باقاعدہ گوشت کاٹ کر ساتھ لے جایا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ معاملہ مزید اُلجھ گیا تھا۔ قاتل نے ایسا کیوں کیا تھا۔ موریس فوری طور پر اس کی کوئی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تاویل پیش کرنے سے قاصر تھا۔ اندر فنگر پرنٹس ٹیم کے افراد خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔

”گھر کا سامان وغیرہ چیک کیا؟“ موریس نے ایڈرسن سے پوچھا۔

”یس سر۔“ ایڈرسن نے کہا۔”اور میرا خیال ہے کہ گھر سے کچھ چوری نہیں کیا گیا۔ رابرٹ کی الماری میں دو ہزار ڈالر بھی موجود ہیں۔ یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ چوری یا ڈکیتی کی واردات نہیں ہے جس میں قاتل نے مزاحمت پر مقتول کو قتل کر دیا ہو اور پھر کسی ڈکیت کو مقتول کا گوشت کاٹ کر ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ لاش کے پاس کافی بڑی تعداد میں کاغذات بھی بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں بھی قبضے میں لے لیا گیا ہے۔“

”ہر قتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو یونہی قتل نہیں کر دیتا۔“ موریس نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔”آس پاس کے ہمسایوں سے تفصیلی پوچھ گچھ کرو۔ ممکن ہے رابرٹ کی کسی سے دشمنی وغیرہ ہو۔“

”یس سر۔“ ایڈرسن نے جواباً اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

”رابرٹ کے ورثا سے رابطہ ہوا؟“ موریس نے پوچھا۔

”یس سر، انہیں فون پر اطلاع دے دی گئی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ پہلی ملنے والی فلائٹ سے یہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ بھی اپنے والد کی کسی سے دشمنی یا عداوت کے بارے میں لاعلم ہیں۔“ ایڈرسن نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ موریس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”فنگر پرنٹس ٹیم اپنا کام ختم کر لے تو لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دینا۔“ موریس نے کہا اور پھر باہر کی جانب بڑھ گیا۔ ایڈرسن بھی اس کے ہمراہ تھا۔

”تم نے بتایا تھا کہ رابرٹ، لارڈ جوناتھن کے ہاں ملازمت کرتا تھا۔“ باہر نکلتے ہی موریس نے اپنے چہرے پر موجود ماسک اتارتے ہوئے کہا۔ ایڈرسن نے بھی اس کی تقلید کی۔

”جی ہاں اب تک کی معلومات تو یہی ہیں۔“ ایڈرسن نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔”ویسے لارڈ جوناتھن اس شہر کی خاصی مشہور شخصیت ہیں۔ سماجی خدمت کے کاموں میں اکثر ان کا نام اخبارات کی زینت بنا رہتا ہے۔“

”نام تو ان کا میں نے بھی سن رکھا ہے۔“ موریس نے کہا۔”میرے خیال میں ان سے بھی ایک ملاقات ہونی چاہیے۔ ممکن ہے وہ رابرٹ کی کسی سے دشمنی کے بارے جانتے ہوں۔ تم کل کے لیے ان سے ملاقات کا وقت لے لینا، ہمیں اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں کسی بھی پہلو کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔“

”یس سر۔“ ایڈرسن نے جواب دیا۔”میں لارڈ صاحب سے ملاقات کا وقت لے لوں گا۔“

”او کے۔“ یہ کہتے ہوئے موریس اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے آفس کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایڈرسن باقی معاملات سنبھال لے گا۔ وہ ایسے معاملات میں بے حد تیز تھا اور اس نے موریس کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن موریس اپنے دفتر پہنچا تو اس نے آفس میں داخل ہوتے ہی ایڈرسن کو طلب کر لیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ رابرٹ کے قتل کے سلسلے میں کوئی مزید پیش رفت ہوئی ہے یا نہیں؟ کچھ ہی دیر میں ایڈرسن اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

”مسٹر رابرٹ کے سلسلے میں مزید کیا پیشرفت ہوئی ہے؟“ موریس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایڈرسن بیٹھتے ہوئے بولا۔”ابھی تک ایسا کوئی کلیو ہاتھ نہیں آسکا جس سے رابرٹ کے قاتل تک پہنچنے میں مدد مل سکے۔ ابھی تک ایسی کوئی معلومات بھی نہیں مل سکیں جن سے ظاہر ہوتا کہ رابرٹ کی کسی سے چپقلش وغیرہ چل رہی تھی۔“

”میں نے تمہیں لارڈ جوناتھن سے ملاقات کا وقت لینے کا کہا تھا۔“ موریس نے ایڈرسن کا جواب سننے کے بعد کہا۔

”یس سر، میں نے وقت لے لیا ہے۔ لارڈ نے ہمیں آج دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔“ ایڈرسن نے کہا۔

”ہم وہاں ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں جا رہے ہیں کسی دعوت میں شرکت کرنے نہیں۔“ موریس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ موجودہ حالات کے تناظر میں اسے کھانے کی دعوت خاصی عجیب لگی تھی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ایڈرسن تفہیمی لہجے میں بولا۔”لارڈ سے وقت لیتے ہوئے میں نے بھی یہ بات عرض کی تھی مگر ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کا خاندانی رواج ہے کہ اگر کوئی ان سے ملنے آئے تو اسے کھانے کے بغیر واپس نہیں جانے دیا جاتا۔ لارڈ بڑے آدمی ہیں۔ اگر ملاقات سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انکار کر دیتے تو فوری طور پر ہمارے پاس ایسا کوئی قانونی اسپیس موجود نہیں ہے جس کے تحت ہم انہیں ملنے پر مجبور کر سکتے اسی لیے میں نے بھی ہامی بھر لی۔''

''قانون سے تعاون کرنا ہر امریکی شہری کا فرض ہے۔'' مورس نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''ویسے کیا تمہاری لارڈ جوناتھن سے براہِ راست بات چیت ہوئی تھی؟''

''یس سر، میری لارڈ جوناتھن سے موبائل فون پر بات چیت ہوئی تھی۔'' ایڈرسن نے جواب دیا۔

''ہونہہ۔'' مورس نے ہنکارا بھرا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے بیٹھا خالی خالی نگاہوں سے ایڈرسن کا چہرہ تکتا رہا اور پھر پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''لارڈ پیلس میں اور کون کون رہتا ہے؟''

''لارڈ کے ملازمین کے علاوہ ان کے دو غیر شادی شدہ بیٹے ہیں۔ لارڈ کی بیوی کافی عرصے پہلے وفات پا چکی ہے۔'' ایڈرسن نے کہا۔

''فنگر پرنٹس رپورٹ آگئی ہے؟'' مورس نے چونک کر ایسے کہا جیسے اسے اچانک یہ خیال آیا ہو۔

''یس سر، مگر اس میں بھی کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ رابرٹ کے سوا کسی اور کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے۔ شاید رابرٹ سے کوئی ملنے آتا ہی نہیں تھا۔ آس پاس کے ہمسایوں سے بھی یہی معلومات ملی ہیں کہ رابرٹ خاصا تنہائی پسند انسان واقع ہوا تھا اور بہت کم ہی کسی سے ملاقات کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے کچھ ہمسایوں کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی تو وہ کسی ہمسائے کی آمد پر دروازہ ہی نہیں کھولتا تھا۔ اس کی اسی عادت کی وجہ سے اس کے ہمسایوں نے اس کے ہاں جانا تقریباً ترک کر رکھا تھا۔'' ایڈرسن نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مگر رابرٹ نے قاتل کے لیے دروازہ کھولا تھا۔'' مورس پُرزور لہجے میں بولا۔ ''جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رابرٹ کے لیے وہ شخص اجنبی نہیں تھا۔ فنگر پرنٹس نہ ملنے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قاتل نے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے ہوں گے مگر یہ سوال واقعی میں ایک معما ہے کہ قاتل مقتول کے جسم سے باقاعدہ گوشت کاٹ کر لے گیا ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''فوری طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید وہ کوئی نیم پاگل یا جنونی شخص تھا۔ ممکن ہے یہ کوئی اور ہی معاملہ ہو۔''

''قاتل انسانی گوشت کا کیا کرے گا؟''

''سر یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل نے رابرٹ کے جسم سے گوشت محض پولیس کو اُلجھانے کے لیے کاٹا ہو۔'' ایڈرسن نے رائے پیش کی۔

''اگر واقعی میں ایسا ہے تو پھر ہمارا واسطہ ایک انتہائی شاطر اور مکار قاتل سے پڑا ہے جس نے اپنے پیچھے کوئی ایسا کلیو نہیں چھوڑا جس کی مدد سے اس تک پہنچا جا سکے۔ میرے خیال میں اگلا لائحہ عمل لارڈ سے ملاقات کے بعد ہی طے کریں گے۔ ویسے مجھے لارڈ سے بھی کوئی خاص معلومات ملنے کی امید نہیں ہے۔ یہ لارڈ ٹائپ کے لوگ اپنے ملازمین کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ متجسس نہیں ہوتے مگر پھر بھی ہم وہاں جائیں گے شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے سر تو پھر ہم مقررہ وقت پر روانہ ہوں گے۔'' ایڈرسن نے کہا تو مورس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مورس بارہ بجے تک اپنے آفس کے دیگر فوری امور نمٹاتا رہا اور پھر تقریباً بارہ بجے کے قریب اپنی کار میں لارڈ جوناتھن کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایڈرسن بھی اس کے ہمراہ تھا۔ لارڈ جوناتھن اس شہر کی ایک معزز شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کا شمار اس شہر کے چند امیر اور بارسوخ افراد میں ہوتا تھا۔ مورس نے ان کا نام تو بہت مرتبہ سنا تھا مگر ملاقات کا شرف پہلی دفعہ حاصل ہو رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ لارڈ پیلس پہنچ گئے۔ لارڈ پیلس، مورس کی توقع سے بھی زیادہ پُرشکوہ اور وسیع و عریض تھا۔ مورس نے اپنی کار ایک سائڈ پر روکی اور پھر لارڈ پیلس کے مین گیٹ کی جانب بڑھ گئے جہاں لارڈ کے باوردی مسلح گارڈز موجود تھے۔ ایڈرسن نے گیٹ پر اپنا تعارف اور آمد کا مقصد بتایا تو کچھ دیر کے انتظار کے بعد انہیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

لارڈ پیلس جتنا باہر سے خوب صورت نظر آ رہا تھا اندر سے اس سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ لان میں موجود رنگ برنگے اور خوشبودار پھولوں نے لارڈ پیلس کی خوب صورتی کو دوبالا کر دیا تھا۔ خوب صورت موسمی پھولوں کی مہک سے طبیعت میں فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ ایک طرف جدید گاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ شاید یہ لارڈ کی ذاتی گاڑیاں تھیں۔ مورس تحسین آمیز نگاہوں سے لارڈ پیلس کا جائزہ لینے لگا۔ اسی لمحے پینٹ کوٹ اور ٹائی میں ملبوس ایک نوجوان ان کے پاس پہنچ گیا۔

''مسٹر مورس اینڈ ایڈرسن۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے مورس کی جانب دیکھا تو مورس نے جواباً سر ہلاتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''مجھے ڈکسن کہتے ہیں۔'' اس نوجوان نے مورس اور ایڈرسن سے مصافحہ کرنے کے بعد اپنا تعارف کرایا۔ ''میں لارڈ جوناتھن کے انتہائی قریبی اور بااعتماد ملازمین میں سے ہوں۔ لارڈ جوناتھن اس وقت مونٹیری کے ساتھ لارڈ پیلس کے عقبی لان میں موجود ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہیں لیے چلتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' مورس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہم لارڈ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ ہمیں بس ان سے ان کے ملازم رابرٹ کے بارے میں کچھ بات چیت کرنی ہے۔ ہم رابرٹ کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کررہے ہیں۔''

''آپ میرے ساتھ آئیں۔'' ڈکسن نے کہا اور پھر ایک جانب چل دیا۔

مورس اور ایڈرسن بھی اُس کے پیچھے چل دیے۔ ''آپ نے بتایا کہ لارڈ اپنے گھر کے عقبی لان میں مونٹیری کے ساتھ موجود ہیں۔ غالباً یہ ان کا بیٹا ہے؟'' مورس نے ڈکسن کے پیچھے چلتے ہوئے سوال کیا۔

''جی نہیں۔ مونٹیری لارڈ کے بیٹے کا نہیں پالتو شیر کا نام ہے۔'' ڈکسن کا جواب سن کر مورس اور ایڈرسن لحہ بھر کے لیے چونک کر ٹھٹک گئے۔

''آپ گھبرائیے نہیں۔'' انہیں ٹھٹکتے دیکھ کر ڈکسن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مونٹیری نامی یہ شیر مضبوط آہنی سلاخوں میں بند ہے اور ان مضبوط آہنی سلاخوں کے پار صرف لارڈ صاحب ہی جاسکتے ہیں اور کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ ایک پالتو درندے کے اتنا قریب چلا جائے۔''

ڈکسن کی بات سن کر مورس اور ایڈرسن کے چہروں پر اطمینان کے تاثرات نمایاں ہوگئے اور وہ سر ہلاتے ہوئے دوبارہ ڈکسن کے ساتھ چل پڑے۔

''مونٹیری بالکل بچہ تھا جب لارڈ صاحب اسے لارڈ پیلس میں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اس جانور کو بڑی محبت سے پالا ہے۔ اب وہ ایک جوان شیر کا روپ دھار چکا ہے اور لارڈ صاحب سے بہت مانوس ہے۔ لارڈ صاحب کے سوا کوئی بھی اس کے پاس نہیں جاتا۔ اسے خوراک وغیرہ دینے کا کام بھی سلاخوں کے درمیان سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔'' ڈکسن نے دونوں کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ چلتے ہوئے وہ تینوں اب لارڈ پیلس کے عقبی حصے میں پہنچ گئے تھے۔

مورس نے دیکھا کہ عقبی جانب موجود لان کا ایک بڑا حصہ مضبوط آہنی سلاخوں سے کور کیا گیا تھا۔ یعنی اس پالتو شیر کو آزادانہ نقل و حرکت کے لیے خاصی جگہ فراہم کی گئی تھی۔ سلاخوں کے پار وہ جوان شیر ایک بوڑھے شخص کے ساتھ بالکل اس طرح ٹہل رہا تھا جیسے شیر نہ ہو اس کا پالتو کتا ہو۔ بوڑھے کو دیکھتے ہی انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہی لارڈ جوناتھن ہے۔ لارڈ نے بھی شاید انہیں دیکھ لیا تھا۔

''مونٹیری یہاں بیٹھ جاؤ اب میرے پیچھے مت آنا۔'' اس نے کرخت لہجے میں مونٹیری کو حکم دیا تو وہ دم ہلاتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا جبکہ لارڈ جوناتھن باوقار انداز میں چلتے ہوئے سلاخوں میں نصب اکلوتے آہنی دروازے کی طرف آگیا جو شاید اندر سے بند تھا۔ لارڈ نے دروازہ کھولا اور پھر باہر آگیا۔ اسی لمحے مونٹیری نامی شیر یک لخت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر تیزی سے دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آیا گویا وہ ان آہنی سلاخوں کے وسیع و عریض پنجرے سے باہر نکلنا چاہتا ہو مگر اس سے پہلے کہ وہ کامیاب ہوتا ڈکسن نے انتہائی پھرتی سے دروازہ بند کرکے مقفل کردیا۔

مونٹیری کی اس حرکت پر ایک لمحے کے لیے مورس اور ایڈرسن کے دل اچھل کر حلق میں آگئے مگر ڈکسن کے عین وقت پر آہنی دروازہ بند کرنے پر ان کے چہروں پر اطمینان مترشح ہوگیا۔ ان کی تشویش بجا تھی۔ مونٹیری نامی شیر اگرچہ لارڈ کا پالتو تھا مگر تھا تو ایک خطرناک درندہ ہی جو کسی اجنبی کو دیکھ کر بپھر بھی سکتا تھا۔

''مونٹیری آج کل بہت شرارتی ہوتا جارہا ہے۔'' لارڈ نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے پالتو شیر کی اس حرکت کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ شاید اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ مورس نے لارڈ کا جائزہ لیا۔ وہ تقریباً ساٹھ سے پینسٹھ برس کی عمر کا ایک صحت مند بوڑھا تھا۔ تاہم اس کے سر پر بال تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ قریب آنے پر اس نے مورس اور ایڈرسن سے مصافحہ کیا اور پھر انہیں ایک طرف موجود کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لارڈ جوناتھن خود بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا جبکہ ڈکسن ان کے پاس ہی مؤدبانہ کھڑا ہوگیا۔

''سر، ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ مجھے سارجنٹ مورس کہتے ہیں اور یہ میرے ماتحت افسر ایڈرسن ہیں۔ آپ سے فون پر ملاقات کا وقت بھی ایڈرسن نے ہی لیا تھا۔ ہم مسٹر رابرٹ کے قتل کی تفتیش کررہے ہیں اور اسی سلسلے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں آپ کے پاس آئے ہیں۔'' موریس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''رابرٹ میرا بہت مخلص اور بااعتماد آدمی تھا۔'' جواب دیتے ہوئے لارڈ کے لہجے میں افسردگی عود کر آئی۔ ''مجھے اس کی موت کا سن کر شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ مجھے علم ہوا ہے کہ ابھی پولیس نے اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اپنے قبضے میں لے لی ہے، جب اس کی باڈی واپس آجائے گی تو میں اس کی آخری رسومات میں ضرور شرکت کروں گا۔ اس کی یہاں غیر حاضری پر میں یہ سمجھتا رہا تھا کہ شاید وہ علیل ہے۔''

''ہم ابھی تک اس کیس کی تفتیش میں کوئی قابلِ ذکر سراغ نہیں لگا پائے۔ کوئی ایسا سرا ہی ہاتھ میں نہیں آرہا جس سے تفتیش آگے بڑھ سکے۔ اس کیس میں بہت سے معاملات اُلجھے ہوئے ہیں۔ کیا آپ رابرٹ کی کسی سے دشمنی کے بارے میں واقف تھے؟'' موریس نے لارڈ سے سوال کیا۔

''میرے سامنے اس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے ظاہر ہوتا کہ اس کی کسی سے دشمنی یا عداوت تھی اور پھر میں اپنے ملازمین کے ذاتی معاملات کے بارے میں کبھی متجسس نہیں رہا۔ رابرٹ سے بھی میرا تعلق لارڈ پیلس میں اس کی زمینداریوں تک ہی محدود تھا۔ تاہم پھر بھی میں وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ رابرٹ دشمنیاں پالنے والا شخص نہیں تھا اور پھر وہ کسی سے دشمنی کیا کرتا وہ تو عام طور پر کسی سے ملنا جلنا ہی پسند نہیں کرتا تھا۔'' لارڈ نے بتایا۔

''تو پھر کسی نے اُسے کیوں قتل کر ڈالا؟'' موریس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قتل ایک بھیانک جرم ہے۔ کوئی یونہی اس حد تک نہیں چلا جاتا۔ رابرٹ کے گھر سے کوئی قیمتی سامان اور نقدی وغیرہ بھی نہیں لوٹی گئی اور پھر قاتل نے رابرٹ کے جسم سے گوشت کس مقصد کے لیے کاٹا؟''

''یہ بات مجھے آپ سے معلوم ہو رہی ہے۔'' لارڈ نے کہا۔ ''ممکن ہے قاتل کوئی جنونی قسم کا نفسیاتی مریض ہو۔ ورنہ میں نے آج پہلی بار سنا ہے کہ قاتل نے مقتول کے جسم سے گوشت کاٹا ہو۔''

''لارڈ پیلس میں رابرٹ کیا کام کرتا تھا؟'' موریس نے پوچھا۔

''آپ اُسے میرا منیجر کہہ سکتے ہیں۔'' لارڈ نے جواب دیا۔ ''میرے کاروباری معاملات سے لے کر بینک اکاؤنٹس کا حساب رکھنا سب اسی کی ذمے داری تھی۔ وہ میرے بہت کام کا آدمی تھا۔ اس کی وجہ سے میں اپنے بینک کے کھاتوں کے حساب کتاب سے خاصا بے فکر ہو گیا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ اس جیسا آدمی مجھے دوبارہ مل سکے گا۔''

''آپ کا وقت دینے کا بہت بہت شکریہ۔'' موریس نے کہا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ لارڈ سے مزید کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوگی۔

''قانون سے تعاون کرنا ہر امریکی شہری کا فرض ہے۔'' لارڈ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے ایک ضروری بزنس میٹنگ میں جانا ہے۔ اس لیے میں آپ کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ کھانا کھائے بغیر ہرگز نہ جائیے گا۔ یہ ہمارا خاندانی رواج ہے کہ لارڈ پیلس میں پہلی دفعہ آنے والے کو کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جانے دیا جاتا۔''

''آپ بے فکر رہیں......'' موریس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ ہمیں اسی شرط پر ملاقات کی اجازت ملی تھی۔''

''مجھے آپ سے یہی امید تھی۔'' لارڈ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ موریس اور ایڈرسن بھی احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ لارڈ نے ان دونوں سے مصافحہ کیا اور پھر جاتے جاتے قریب کھڑے ڈکسن کو ہدایت کی کہ ان کے لیے کھانے کا انتظام کرے۔ اس کے علاوہ لارڈ پیلس کے جس ملازم سے بھی رابرٹ کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں ملنا چاہیں، انہیں ملنے دیا جائے اور تمام ملازمین کو بھی سختی سے تاکید کی جائے کہ ان سے پورا تعاون کیا جائے۔'' لارڈ جوناتھن یہ حکم نامہ جاری کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا اور میزبانی کے فرائض ڈکسن نے... سنبھال لیے۔

موریس اور ایڈرسن نے مزید چار گھنٹے لارڈ پیلس میں گزارے۔ انہوں نے کھانا کھانے کے بعد لارڈ پیلس کے کافی ملازمین سے بات چیت بھی کی مگر کوئی ایسی بات معلوم کرنے میں ناکام رہے جس سے رابرٹ کے قتل کی تفتیش کو آگے بڑھایا جا سکتا۔ بالآخر انہوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ انہیں لارڈ پیلس کے مین گیٹ تک رخصت کرنے بھی ڈکسن ہی آیا۔

''رابرٹ کی موت پر لارڈ پیلس کے سبھی ملازمین افسردہ نظر آرہے ہیں۔'' موریس نے ڈکسن سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل۔'' ڈکسن نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔ ''رابرٹ ہمارا بہت پرانا ساتھی تھا، اگرچہ وہ مجھ سے عمر میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خاصا بڑا تھا مگر اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست تھے۔''

''کیا اس نے آپ سے کبھی ذکر کیا کہ اس کی کسی کے ساتھ عداوت یا ناچاقی چل رہی ہے؟'' موریس نے ڈکسن سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' ڈکسن نے رسانیت سے جواب دیا۔ ''ویسے بھی وہ خاصا خاموش طبع آدمی تھا۔ زیادہ تر دوسروں کی باتیں سن کر مسکراتا رہتا تھا۔ بولتا ذرا کم ہی تھا۔ آپ کی بات ٹھیک ہے اس کی موت پر لارڈ پیلس میں کام کرنے والا ہر فرد غمگین ہے ماسوائے مارٹی اور جورڈی کے۔''

''مارٹی اور جورڈی۔'' موریس نے استفسار طلب نگاہوں سے ڈکسن کی جانب دیکھا۔ شاید وہ روانی میں یونہی بات کر گیا تھا مگر اس کی بات نے موریس اور ایڈرسن کو بیک وقت چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ رابرٹ کے قتل کی تفتیش کررہے تھے اور ان کے لیے یہ بات معنی خیز تھی کہ لارڈ پیلس میں دو ایسے افراد بھی موجود تھے جنھیں رابرٹ کی موت کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اور ایسا اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب ان کی مقتول رابرٹ کے ساتھ کوئی رنجش یا عداوت ہوتی۔

''غالباً آپ لارڈ کے بیٹوں کی بات کررہے ہیں؟'' ڈکسن کے جواب دینے سے پہلے ایڈرسن بول پڑا۔

''جی ہاں۔'' ڈکسن نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''بہرحال اس بات کو چھوڑیں، میں نے تو یونہی بات کردی تھی۔''

''مسٹر ڈکسن، بہتر ہے کہ آپ کھل کر بات کریں۔'' موریس نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ ایک پولیس افسر تھا اور اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ بعض اوقات کوئی معمولی سی بات بھی کسی بڑے کیس کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

''سارجنٹ موریس...... میں چھوٹا آدمی ہوں۔'' ڈکسن نے ایک بار پھر اس موضوع سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہی۔

''مسٹر ڈکسن۔'' موریس کا لہجہ مزید سخت ہوگیا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ ہم یہاں ایک قتل کی تفتیش کرنے کے لیے آئے ہیں اور بطور ایک شہری آپ کا فرض ہے کہ ہم سے مکمل تعاون کریں اور کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ قانون سے عدم تعاون بھی سنگین جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' ڈکسن نے کمزور لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ موریس کے سخت لہجے نے اس کو خاصا نروس کردیا تھا۔ ''یہ بات میرے علاوہ بھی لارڈ پیلس کے کافی ملازمین جانتے ہیں کہ لارڈ جوناتھن کے بیٹے مارٹی اور جورڈی مقتول رابرٹ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ دونوں رابرٹ سے سخت نفرت کرتے تھے۔''

ان کی رابرٹ سے نفرت کی کوئی وجہ تو ہوگی؟'' موریس نے کہا۔

''ممکن ہے بہت سی وجوہات کی بنا پر وہ دونوں رابرٹ کے لیے اپنے دل میں کینہ رکھتے ہوں کیونکہ میں نے ان دونوں کو کبھی رابرٹ سے ہنستے نہیں دیکھی۔'' ڈکسن تھکی لہجے میں بولا۔ ''لیکن ان دنوں یہ مخاصمت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ رابرٹ اور لارڈ کے بیٹوں میں کئی دفعہ تلخ کلامی بھی ہوچکی ہے۔ مارٹی اور جورڈی نے اپنے باپ سے چھپ کر اُن کے کاروبار میں کچھ گھپلے کیے تھے اور رابرٹ کو اس بارے میں علم ہوگیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو وارننگ دی تھی کہ اگر انہوں نے گھپلوں سے حاصل کی گئی رقم واپس نہ کی تو وہ اس بارے میں لارڈ جوناتھن کو مطلع کردے گا۔ مارٹی اور جورڈی اپنے والد کی سخت اور اصول پسند طبیعت سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ آگاہ ہونے پر کہیں وہ بطور سزا ان کے اخراجات ہی بند نہ کردیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں پہلے رابرٹ کی منت سماجت کی مگر جب وہ راضی نہ ہوا تو پھر اسے قتل کردینے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔''

''کیا؟'' موریس، ڈکسن کی بات سن کر اچھل پڑا۔ ایڈرسن کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات عیاں ہوگئے تھے۔

''کیا واقعی میں ان دونوں نے رابرٹ کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی تھیں؟'' موریس نے معنی خیز نگاہوں سے ایڈرسن کی طرف دیکھتے ہوئے ڈکسن سے پوچھا۔

''یہ بات لارڈ پیلس کے بہت سے افراد جانتے ہیں مگر مارٹی اور جورڈی کے خوف سے کسی نے آپ سے بات نہیں کی کیونکہ لارڈ پیلس کا ہر ملازم ان دونوں کی کینہ پرور فطرت سے بخوبی آگاہ ہے۔ رابرٹ، لارڈ کے ملازمین میں سے وہ واحد آدمی تھا جو اُن دونوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا مگر قسمت نے اسے موقع ہی نہ دیا۔'' بات کرتے ہوئے ڈکسن کے لہجے میں افسردگی عود کر آئی۔

''آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ مسٹر ڈکسن۔''
مورس نے کہا اور پھر لارڈ پیلس کے مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ایڈرسن نے بھی اس کی تقلید کی۔
کچھ ہی دیر میں وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔ ''سر! ڈکسن کا کہنا ہے کہ رابرٹ، مارٹی اور جورڈی کے کاروباری کھیلوں کے بارے میں لارڈ جوناتھن کو آگاہ کرنے والا تھا مگر قسمت نے اسے موقع ہی نہ دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رابرٹ کو یہ موقع مارٹی اور جورڈی نے ہی نہ دیا ہو؟'' مورس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ایڈرسن پُرخیال لہجے میں بولا۔
''تمہاری بات خارج از امکان نہیں ہے۔'' مورس نے جواب دیا۔ ''مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر واقعی میں یہ سب لارڈ کے بیٹوں کا کیا دھرا ہے تو بھی ابھی تک ہمارے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں جس کی بنا پر ہم ان دونوں کو گرفتار کر سکیں اور پھر یہ سوال اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ اگر یہ قتل ان دونوں بھائیوں نے ہی کیا ہے تو انہیں رابرٹ کے جسم سے گوشت کاٹ کر ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کا مقصد تو محض رابرٹ کی موت سے ہی حل ہو جاتا؟ یہ بات تو مضحکہ خیز ہوگی کہ قاتل آدم خور تھا۔''
''سر، میں اب بھی اپنی اسی رائے پر قائم ہوں کہ یہ کام محض پولیس کو ذہنی طور پر اُلجھانے کے لیے کیا گیا ہے۔'' ایڈرسن ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ''بادی النظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک بے سروپا حرکت ہے۔''
''قاتل چاہے کوئی بھی ہو مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ عیار و مکار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے مضبوط اعصاب کا بھی مالک ہے۔'' مورس سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ایسی کسی بھی صورتِ حال میں قاتل کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ جائے واردات سے جلد از جلد فرار ہو جائے۔ پکڑے جانے کا خوف اس کے تمام خیالات پر حاوی ہوتا ہے اور قتل کرنے کے بعد اس کی پہلی ترجیح فرار ہونا ہی ہوتی ہے مگر اس کیس میں صورتِ حال معمول کے برعکس ہے۔ قاتل نے رابرٹ کو قتل کرنے کے بعد اطمینان سے دروازہ اندر سے مقفل کیا۔ رابرٹ کے جسم سے کسی تیز دھار آلے کی مدد سے گوشت کاٹا اور پھر اس گوشت کو ساتھ لے کر کھڑکی کے راستے فرار ہو گیا۔ بہرحال ڈکسن سے ہمیں کافی اہم معلومات مل گئی ہیں۔ رابرٹ کی موت کا فوری فائدہ مارٹی اور جورڈی کو ہی ہوا ہے۔ تم رابرٹ کے قتل والے دن کی مارٹی اور جورڈی کی موبائل فون لوکیشن نکلواؤ، اگر وہ اس دن رابرٹ کے علاقے میں موجود تھے تو پھر اُن پر شک کیا جا سکتا ہے۔ محض معمولی جھگڑے کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قتل ان دونوں بھائیوں نے کیا ہے۔''
''یس سر، میں یہ کام آج ہی کرلوں گا۔'' ایڈرسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''رابرٹ کے گھر سے جو کاغذات وغیرہ ملے تھے۔ کسی فارغ وقت میں ان کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔'' مورس نے کہا۔
''وہ تمام کاغذات ایک فائل کی صورت میں پولیس کے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں چیک کرلوں گا۔'' ایڈرسن نے جواب دیا تو مورس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔
لارڈ جوناتھن کے ہاں جانا بے فائدہ نہیں رہا تھا۔ ان کے بااعتماد ملازم ڈکسن نے ایک کام کی بات اُگل دی تھی کہ مقتول رابرٹ اور لارڈ کے بیٹوں کے درمیان کسی کاروباری معاملے کو لے کر تنازع چل رہا تھا اور اس وجہ سے مارٹی اور جورڈی نے رابرٹ کو قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ مورس کا خیال تھا کہ ممکن ہے رابرٹ نے ان دونوں کی شکایت لارڈ سے بھی کی ہو مگر لارڈ نے دانستہ اس بات کا ذکر مورس کے سامنے نہ کیا ہو۔ پولیس کے سامنے ایسی کوئی بات وہ کیسے کر سکتے تھے جس سے پولیس ان کے بیٹوں سے ہی مشکوک ہو جاتی۔
اگلے دن تک مورس کو رابرٹ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی مل گئی۔ رپورٹ کے مطابق موت کی وجہ دل پر لگنے والی گولی ہی تھی۔ ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کے دن کا حتمی تعین نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم قیاس کیا گیا تھا کہ لاش دستیاب ہونے سے دو یا تین دن پہلے رابرٹ کو قتل کیا گیا تھا۔ مورس جانتا تھا کہ تفصیلی رپورٹ میں موت کے حتمی وقت کا تعین ہو جائے گا۔ اس کے حکم کے مطابق ایڈرسن نے لارڈ جوناتھن کے بیٹوں کا ایک ہفتے کا موبائل ڈیٹا اور لوکیشن بھی حاصل کر لی تھی جس کے مطابق وہ دونوں پچھلے ایک ہفتے میں اس علاقے میں نہیں گئے تھے جہاں رابرٹ قتل ہوا تھا معاملات اب مزید اُلجھ گئے تھے۔
مورس اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا ایڈرسن کے ساتھ اسی بارے میں تبادلہ خیال کر رہا تھا۔
''سر! یہ بھی ممکن ہے کہ قتل کے وقت مارٹی اور جورڈی اپنے موبائل فون ساتھ لے کر ہی نہ گئے ہوں۔ کوئی بھی ہوشیار قاتل یہ جانتا ہے کہ پولیس موبائل لوکیشن کے ذریعے مشکوک افراد کو چیک کر سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ

بھی ہوسکتی ہے کہ مارٹی اور جورڈی نے اس کام کے لیے کسی کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کی ہوں۔'' ایڈرسن نے اپنے ذہن میں پہنچنے والے مفروضے کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

''تیسری صورت یہ بھی تو ہوسکتی ہے کہ مارٹی اور جورڈی کا رابرٹ کے قتل سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔'' مورس نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔''اگرچہ حالات وواقعات نے انہیں مشکوک بنادیا ہے مگر پھر بھی حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہی دونوں قاتل ہیں اور بالفرض وہی دونوں رابرٹ کی موت کے ذمّے دار ہیں تو بھی ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی تک ہماری ساری تفتیش مفروضوں اور اندازوں کے سہارے ہی آگے بڑھ رہی ہے۔''

ایڈرسن شاید جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اسی لمحے ٹیبل پر موجود دفتری فون کی گھنٹی بج اٹھی تو وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

مورس نے کریڈل سے ریسیور اٹھا لیا اور پھر دوسری طرف سے کسی کی آواز سن کر بولا۔''ہاں میں سارجنٹ مورس بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا تو مورس بے اختیار کرسی سے اچھل پڑا۔ ایڈرسن خاموشی سے اس کی حرکات وسکنات اور چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ تاہم وہ نہیں جانتا تھا کہ دوسری طرف لائن پر کون ہے۔

''میں آرہا ہوں۔'' مورس نے ریسیور کریڈل پر تقریباً پٹختے ہوئے کہا۔''آؤ ایڈرسن، ہمیں لارڈ جوناتھن کے گھر پہنچنا ہے۔''

''مگر سر، ہوا کیا ہے؟'' ایڈرسن نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ڈکسن کا فون تھا۔ میں نے اُسے آفس کا نمبر دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ اگر مارٹی اور جورڈی کے بارے میں مزید کوئی مشکوک بات معلوم ہو تو مجھے فون کرے مگر اس نے فون کرکے ایک عجیب خبر دی ہے۔ لارڈ جوناتھن پر اُن کے پالتو شیر نے حملہ کردیا ہے جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے ہیں۔ لارڈ کے بیٹے نے مونٹیری نامی اس شیر کو بھی گولی مار کر ہلاک کردیا ہے۔'' مورس نے مختصر طور پر ایڈرسن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''اوہ نو سر، یہ سب کیسے ہوگیا؟'' اس کی بات سن کر ایڈرسن نے بے اختیار کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔''مونٹیری تو لارڈ کا پالتو شیر تھا۔''

''ڈکسن سے اتنی ہی بات ہوسکی ہے۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی خاصا گھبرایا ہوا ہے۔ بہرحال آؤ باقی کی تفصیل وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگی۔ مونٹیری لارڈ کا پالتو شیر ہی تھا مگر تھا تو ایک خطرناک درندہ ہی......'' یہ کہتے ہوئے مورس دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ایڈرسن نے بھی اس کی تقلید کی۔

کچھ ہی دیر میں ان کی کار سڑک پر تیز رفتاری سے رواں دواں تھی۔ ایڈرسن اس بارے میں مورس سے مزید بات کرنا چاہتا تھا مگر مورس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بے حد اُلجھا ہوا ہے۔ اس لیے وہ بھی ہونٹ بھینچے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

لارڈ پیلس کو باہر سے دیکھنے پر بظاہر حالات نارمل ہی لگ رہے تھے۔ شاید ابھی تک مورس کے سوا یہ خبر کسی کو نہیں دی گئی تھی۔ ورنہ مورس جانتا تھا کہ اب تک باہر میڈیا کے نمائندوں کی لائن لگ جاتی۔ لارڈ جوناتھن کا شمار اس شہر کی چند بڑی سماجی شخصیات میں ہوتا تھا اور ان کی موت کو کوئی معمولی واقعہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لارڈ پیلس کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس بار بھی ڈکسن نے ہی ان کا استقبال کیا۔''آپ آجائیں، عقبی حصے میں لارڈ کے دونوں بیٹے بھی موجود ہیں۔'' اس نے کہا تو مورس اور ایڈرسن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے ہولیے۔ لارڈ پیلس کے عقبی حصے میں لارڈ کے ملازمین کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان سب کے چہروں پر گہرے رنج وغم کے تاثرات نمایاں ہورہے تھے۔ لارڈ کی اچانک اور غیر متوقع موت نے سبھی کو غمگین کردیا تھا۔

ان ملازمین سے قدرے ہٹ کر دو نوجوان کھڑے تھے۔ ان کے قیمتی لباس دیکھتے ہی مورس کو اندازہ ہوگیا کہ یہی لارڈ جوناتھن کے بیٹے مارٹی اور جورڈی ہوسکتے ہیں۔ لارڈ جوناتھن کی طرح ان کے دونوں بیٹے بھی خاصی پُروقار اور جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے ملازمین کی طرح ان دونوں کے چہروں پر بھی رنج وغم کے تاثرات نمایاں تھے۔ ایک طرف لارڈ جوناتھن کی لاش پڑی تھی جبکہ آہنی سلاخوں کے پیچھے مونٹیری نامی شیر بھی مردہ حالت میں موجود تھا۔ مورس سمجھ گیا کہ لارڈ کی لاش کو مونٹیری سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ شاید ایسا لارڈ کے بیٹوں کے حکم پر کیا گیا تھا۔ مورس، لارڈ کی لاش کے قریب جاکر بغور اس کا جائزہ لینے

لگا۔ گردن پر گہرے گھاؤ دیکھتے ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ یہ شیر کے دانتوں سے پڑے ہیں اور شاید لارڈ کی موت کی وجہ بھی یہی بنی تھی۔ کپڑوں پر بھی خون لگا ہوا تھا جبکہ جسم کے ایک حصے سے باقاعدہ گوشت غائب تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ شیر نے صرف لارڈ کو مارا ہی نہیں تھا بلکہ انہیں کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ بات موریس کے لیے باعث حیرت تھی۔ حملے کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر باقاعدہ لارڈ کو کھانا شروع کر دینا ایسا تو صرف آدم خور شیر ہی کرتے تھے جبکہ یہ شیر تو اس وقت سے لارڈ کے پاس تھا، جب وہ بچہ تھا اور پھر اس شیر کو بھوکا بھی نہیں رکھا جاتا تھا اسے وافر مقدار میں خوراک فراہم کی جاتی تھی۔ جائزہ لینے کے بعد حلق سے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے وہ لاش سے دور ہوگیا۔ ''لاش پر کوئی کپڑا وغیرہ ڈلوا دو۔'' اس نے ڈکسن سے کہا اور خود لارڈ کے بیٹوں کی جانب بڑھ گیا۔

''مجھے سارجنٹ موریس کہتے ہیں۔'' اس نے مارٹی اور جورڈی کے قریب جا کر باقاعدہ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے جورڈی کہتے ہیں اور یہ میرا چھوٹا بھائی مارٹی ہے۔ ڈکسن ہمیں آپ کا تعارف پہلے ہی کروا چکا ہے۔ غالباً آپ کے ساتھی کا نام ایڈرسن ہے؟'' دونوں نوجوانوں میں سے ایک نے کہا۔ تو موریس نے بس اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

''سارجنٹ موریس، میرے خیال میں یہ پولیس کیس نہیں ہے۔'' جورڈی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک سیدھا سادہ سا حادثہ ہے۔ میں نے ڈیڈ سے کتنا کہا تھا کہ اس جانور کو کسی جنگل میں چھوڑ دیں، کسی درندے کا بھلا کیا بھروسا؟ مگر انہوں نے کبھی میری بات کو اہمیت نہ دی۔''

''بھروسا تو انسان کا بھی نہیں ہے مسٹر جورڈی۔'' موریس نے ذومعنی لہجے میں جواب دیا۔ ''ویسے آپ کی بات ٹھیک ہے کہ بظاہر یہ ایک حادثہ ہی معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی میں اپنا اطمینان کرنا چاہوں گا۔ ویسے آپ کو کب اور کیسے معلوم ہوا کہ لارڈ جوناتھن پر ان کے پالتو شیر نے حملہ کر دیا ہے اور پھر اس شیر کو گولی کس نے ماری تھی؟''

''موذی کو گولی میں نے ماری ہے۔'' جورڈی نے کہا۔ ''مارٹی اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی پہنچا ہے۔ میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ میرا کمرا لارڈ پیلس کے عقبی جانب ہی واقع ہے اس لیے چیخوں کی آوازیں سن کر میں فوراً ہی اس جگہ پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی میری نگاہوں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ شیر نے میرے والد کو نیچے گرا کر ان کے کندھے کو دبوچ رکھا ہے اور میرے والد مدد کے لیے چلا رہے ہیں۔ اسی لمحے شیر نے میرے والد کا کندھا چھوڑ کر گردن دبوچ لی اور ان کے چیخنے کی آوازیں معدوم ہوگئیں۔ میں فوراً دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا، اپنی گن اٹھائی اسے لوڈ کیا اور واپس لارڈ پیلس کے عقبی حصے میں آ گیا۔ شیر نے اس دوران میرے والد کو ہلاک کر دیا اور اب باقاعدہ انہیں کھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سلاخوں کے درمیان سے شیر کے سر پر گولی چلائی تو وہ موقع پر ہی ڈھیر ہوگیا۔ اس اثنا میں لارڈ پیلس کے کچھ ملازمین اس جانب آ گئے تھے۔ میرے حکم پر انہوں نے ڈیڈ کی لاش کو وہاں سے اٹھا کر ادھر رکھا۔ ان کی موت واقع ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے انہیں اسپتال لے جانا ضروری نہیں سمجھا۔ کیونکہ اب دیر ہو چکی تھی۔ ویسے تو یہ ایک حادثہ ہی تھا مگر پھر بھی میں نے پولیس کو انفارم کرنا بہتر سمجھا۔ ڈکسن نے میرے کہنے پر ہی آپ کو فون کیا تھا۔''

''آپ نے ٹھیک کیا۔'' موریس نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''لارڈ جوناتھن کی باڈی کا پوسٹ مارٹم بہت ضروری ہے۔''

''پوسٹ مارٹم کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' جورڈی کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''جب یہ بات ثابت ہے کہ میرے ڈیڈ کی موت ایک حادثے کے تحت ہوئی ہے۔''

جورڈی کے ساتھ اس کا بھائی خاموشی سے کھڑا تھا۔ اس نے ابھی تک گفتگو میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ خاموش طبیعت کا مالک تھا یا پھر اپنے بڑے بھائی کی موجودگی میں بولنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ بات جو بھی تھی اس نے ابھی تک موریس اور جورڈی کی گفتگو میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی تھی۔

''مسٹر جورڈی۔'' اس کے سخت لہجے پر موریس نے بھی جواباً سخت لہجہ اختیار کر لیا۔ ''بہتر ہے کہ آپ پولیس کی تفتیش میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کریں۔ میں جانتا ہوں کہ معاملات اتنے سیدھے نہیں ہیں جتنے آپ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ رابرٹ کے قتل کا معاملہ بھی کسی نہ کسی طرح لارڈ پیلس سے جڑا ہوا ہے اور پھر اگر یہ ایک حادثہ ہے تو پھر آپ کو فکر کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا سارجنٹ۔'' جورڈی نے فوراً ہی سرنڈر کر دیا۔ شاید موریس کے لہجے نے اسے ہوش دلا

دیا تھا۔

''مجھے امید ہے کہ آپ قانون کے ساتھ تعاون کریں گے۔'' موریس نے بھی اسے ہلکا پڑتے دیکھ کر لہجہ نرم کر لیا اور پھر وہ ایڈرسن کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''پولیس کے دیگر عملے اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کا بندوبست کرو۔''

''یس سر۔'' ایڈرسن نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور پھر اپنا موبائل فون نکال لیا جبکہ موریس شیر کے مردہ جسم کی جانب بڑھ گیا۔ موریس کچھ دیر تک بہ غور اس درندے کی باڈی کا جائزہ لیتا رہا۔ لارڈ جوناتھن نے اسے کس قدر محبت اور توجہ سے پالا تھا۔ یہ بات تو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ وہ اپنی ہی موت کی پرورش کر رہے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے موریس کے چہرے پر ہلکی سی افسردگی کے تاثرات عود کر آئے۔

''ایڈرسن۔'' کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد موریس نے اسے آواز دی تو وہ اس کے پاس آ گیا۔ اب وہ دونوں لارڈ کے ملازمین اور بیٹوں سے اتنی دور ہو گئے تھے کہ ان تک ان دونوں کی بات چیت کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔

''ایڈرسن تم نے ایک دفعہ مجھے اپنے ایک رشتے دار پروفیسر تھامسن کے بارے میں بتایا تھا جو جانوروں کی نفسیات کے بہت بڑے ماہر ہیں۔'' موریس نے استفسار کیا۔

''یس سر۔'' ایڈرسن نے اپنی عادت کے مطابق جواب دیتے ہوئے گفتگو کا آغاز ''یس سر'' سے ہی کیا۔

''پروفیسر تھامسن میرے دور کے عزیز ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ساؤتھ امریکا کے جنگلات میں جانوروں پر ریسرچ کرتے ہوئے گزارا ہے۔ امریکا واپس آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ریسرچ جاری رکھی ہے۔ اب تو حکومتی سطح پر بھی ان کی خدمات کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے جانوروں پر تجربات کے سلسلے میں اپنی ایک ذاتی لیبارٹری بھی بنا رکھی ہے۔ ان کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی مضامین اکثر اوقات اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔''

''کیا تمہارے پاس ان کا سیل نمبر ہے؟'' موریس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ایڈرسن نے مختصر سا جواب دیا۔

''میری اُن سے بات کراؤ۔'' موریس پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس شیر نے اچانک لارڈ جوناتھن پر کیوں حملہ کر دیا جو بچپن سے اُن کے ساتھ تھا؟''

موریس کی بات سن کر ایڈرسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پروفیسر تھامسن کا نمبر ملا دیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کا رابطہ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک پروفیسر سے خود بات کرتا رہا اور پھر اس نے موبائل فون موریس کی جانب بڑھا دیا۔

''ہیلو پروفیسر تھامسن! میرا نام سارجنٹ موریس ہے۔'' اس نے موبائل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ایڈرسن نے آپ کو آگاہ تو کر ہی دیا ہے کہ میں آپ سے کیوں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ بظاہر تو یہ ایک حادثہ ہی ہے مگر پھر بھی میں اپنے کچھ شکوک و شبہات دور کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے موریس نے تفصیل سے پروفیسر تھامسن کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''آپ نے خاصا عجیب سا واقعہ بیان کیا ہے۔'' پروفیسر تھامسن نے لارڈ جوناتھن کی ہلاکت کے بارے میں تمام تفصیلات سننے کے بعد کہا۔ ''حملے کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ کوئی بھی درندہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو کر ایسا کر سکتا ہے مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نے لارڈ کو مارنے کے بعد باقاعدہ کھانا کیوں شروع کر دیا۔ ایسا تو صرف بھوکے آدم خور شیر ہی کرتے ہیں جبکہ یہ درندہ تو آپ کے بقول لارڈ کا پالتو تھا۔''

''ہاں۔'' موریس نے رسانیت سے کہا۔ ''یہ شیر لارڈ کے پاس اس وقت سے تھا جب یہ بالکل بچہ تھا۔''

''پھر تو یہ معاملہ خاصا اُلجھا ہوا ہے۔'' پروفیسر تھامسن کی پُرسوچ آواز ابھری۔ ''ایسا ہی ایک واقعہ چند سال پہلے ہمارے شہر میں بھی پیش آیا تھا۔ آپ نے کیلی نامی نوجوان کے بارے میں تو اخبارات میں پڑھا ہی ہوگا جس کے پالتو شیر نے اچانک اس پر حملہ کر دیا تھا۔ تاہم وہ زندہ بچ گیا تھا مگر شاید لارڈ اتنے خوش قسمت ثابت نہیں ہو سکے۔''

''اوہ، ہاں۔'' پروفیسر تھامسن کی بات سن کر موریس چونک پڑا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس نے اس بارے میں اخبار میں پڑھا تھا۔ کیلی نامی یہ نوجوان امریکا میں خاصا مقبول تھا اور ماڈلنگ کے شعبے سے منسلک تھا۔ اس نے بھی لارڈ جوناتھن کی طرح ایک شیر پال رکھا تھا جس نے اس پر حملہ کر کے اسے زخمی کر ڈالا تھا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب وہ اپنے شیر کے ہمراہ ایک پبلک پلیس پر فوٹوگرافرز سے تصاویر بنوا رہا تھا کہ اس کے پالتو شیر نے اچانک اس کی ٹانگ پر اپنے دانت گڑا دیے تھے۔ تاہم کیلی کی چیخ سن کر

شیر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس موقع پر پولیس کے افراد بھی موجود تھے جنہوں نے بپھرے ہوئے شیر کو خطرہ جان کر شوٹ کر ڈالا۔ کیلی انہیں روکتا ہی رہ گیا۔ بعد میں کیلی نے پولیس کے خلاف اپنے شیر کو شوٹ کرنے پر کیس بھی دائر کیا تاہم عدالت میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ عدالت نے پولیس کے اس موقف کو تسلیم کیا کہ شیر نے بپھر کر اپنے مالک پر حملہ کیا تھا۔ وہ قابو سے باہر ہو گیا تھا اور ایسی حالت میں وہ کسی دوسرے شخص کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اسی لیے پولیس کے افراد نے کوئی چانس لیے بغیر اسے شوٹ کر ڈالا۔

''پروفیسر مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا ہے۔'' مورس نے کہا۔

''لارڈ جوناتھن کا کیس بھی اسی طرز کا ہے۔'' پروفیسر تھامسن نے تفہیمی لہجے میں کہا۔ ''اس مردہ شیر کا بعد میں ماہرین نے معائنہ کیا تھا تو ایک بات سامنے آئی۔ اس شیر کا ایک دانت بُری طرح سے خراب تھا۔ ماہرین کے خیال میں دانت کے درد کی وجہ سے ہی شیر ہیجان میں مبتلا ہو کر کیلی پر حملہ آور ہو گیا تھا مگر جیسے ہی اس نے کیلی کی چیخ سنی اسے ہوش آ گیا اور اس نے کیلی کو چھوڑ دیا۔ شاید لارڈ جوناتھن کا شیر بھی کسی جسمانی درد کی وجہ سے ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوا ہو...... مگر لارڈ کو کھانے والا معاملہ میں کہیں ایڈجسٹ نہیں کر سکا۔ بہرحال میں پورے وثوق سے تبھی کوئی بات کر سکوں گا جب خود اس شیر کے مردہ جسم کا معائنہ کر لوں گا۔ اس کا معدہ بھی چیک کرنا پڑے گا۔ مبادا اس نے کچھ غلط کھا لیا ہو۔ اگر آپ اس شیر کے مردہ جسم کو مجھ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں تب میں حتمی رائے دے سکوں گا۔ ویسے بھی میں مردہ جانوروں پر مختلف قسم کے تجربات کرتا رہتا ہوں۔ اس لیے اس شیر کا مردہ جسم بھی میرے کام کا ہے۔ میری ذاتی لیبارٹری میں ہر قسم کی سہولت موجود ہے حتیٰ کہ میں ان جانوروں کا ڈی این اے بھی جانچ سکتا ہوں۔''

''میرے خیال میں یہ زیادہ مشکل کام نہیں۔'' مورس نے جواب دیا۔ ''میں شیر کے مردہ جسم کو آپ تک پہنچانے کا انتظام کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس شیر نے لارڈ پر غیر متوقع طور پر حملہ کیوں کیا؟ میں انتظام کرواتا ہوں۔ آپ کے تعاون پر میں دلی طور پر مشکور ہوں۔ آپ سے دوبارہ بات ہو گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر کے ایڈرسن کو واپس کر دیا۔

''ایڈرسن، لارڈ جوناتھن کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کے بعد اس شیر کی باڈی کو پروفیسر تھامسن کے پاس پہنچانے کا انتظام بھی کرو۔'' مورس نے ایڈرسن سے کہا اور ایک بار پھر اسی جگہ آ گیا جہاں مارٹی اور جورڈی کھڑے ہوئے تھے۔

''ابھی کچھ ہی دیر میں لارڈ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کیا جائے گا اور ساتھ ہی پولیس آپ کے شیر کی باڈی کو بھی لے جائے گی۔'' مورس نے ان سے کہا۔

''مگر شیر کی باڈی کا آپ کیا کریں گے؟'' خاموش طبع مارٹی پہلی بار بولا۔

مورس کی بات سن کر جورڈی اور قریب کھڑے ڈکسن کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''آخر آپ کو اس مردہ شیر کے جسم کو ٹھکانے لگانا ہی ہے تو میں نے سوچا کہ یہ کام بھی پولیس ہی انجام دے دے۔'' مورس نے گول مول سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اب جا رہا ہوں باقی کا کام میرا ماتحت ایڈرسن سنبھال لے گا۔ مسٹر ڈکسن کیا آپ مجھے گیٹ تک چھوڑنے نہیں جائیں گے؟'' اس نے ڈکسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی، کیوں نہیں۔'' ڈکسن چونکتے ہوئے بولا۔ ''آئیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مورس کے ہمراہ مین گیٹ کی جانب چل پڑا۔ جورڈی اور مارٹی نے اس سے مزید کوئی بات نہ کی۔ وہ دونوں بس ہونٹ بھینچے اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ تاہم اُن کے چہروں پر رنج و غم کے ساتھ ساتھ ناگواری کے تاثرات بھی عیاں ہو رہے تھے۔

''مسٹر ڈکسن! لارڈ کی موت بڑے عجیب و غریب حالات میں ہوئی ہے۔'' گیٹ کے قریب پہنچ کر مورس نے ڈکسن سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کی موت کی ٹائمنگ میرے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل ہے۔'' ''ہم رابرٹ کی موت کی تحقیقات کر رہے تھے مگر اسی دوران لارڈ ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔''

''رابرٹ اور لارڈ کی موت میں ایک واضح فرق ہے۔'' ڈکسن نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ''رابرٹ کو قتل کیا گیا ہے جبکہ لارڈ حادثاتی طور پر موت کا شکار ہوئے ہیں۔ مجھے لارڈ کی موت پر بے حد افسوس ہے نہ جانے مادام لوسیا پر اس خبر کو سن کر کیا گزرے گی۔''

''کون مادام لوسیا؟'' مورس نے بُری طرح چونکتے ہوئے کہا۔

''مادام لوسیا، لارڈ جوناتھن کی دوست ہیں اور یہ بات لارڈ پیلس کا تقریباً ہر فرد جانتا ہے کہ وہ دونوں جلد ہی

شادی کرنے والے تھے۔ ان دنوں لارڈ پیلس میں یہ چہ میگوئیاں بھی ہو رہی تھیں کہ لارڈ اسی مہینے میں مادام لوسیا سے شادی کرنے والے ہیں مگر قسمت کے آگے کسی کا زور کہاں چلتا ہے۔ لارڈ سے ان کی زندگی نے وفا ہی نہ کی۔'' بات کرتے ہوئے ڈکسن کے لہجے میں افسردگی عود کر آئی۔ وہ خاصا سادہ لوح انسان دکھائی دیتا تھا اور مورس ایسے انسانوں کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مادام لوسیا کے بارے میں بھی اس نے یونہی بات کر دی ہے۔ مگر مورس ایک پولیس افسر تھا۔ وہ ہر معاملے کو باریک بینی سے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس کے لیے یہ بات اہمیت کی حامل تھی کہ لارڈ کی موت اس وقت واقع ہوئی جب وہ جلد ہی شادی کرنے والے تھے۔

''مارٹی اور جورڈی کو تو اس شادی پر سخت اعتراض ہو گا؟'' مورس نے ڈکسن سے استفسار کیا۔

''جی بالکل......'' ڈکسن سر ہلاتے ہوئے سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''اس شادی سے مادام لوسیا بھی لارڈ کی جائداد میں حصے دار بن جاتیں اور یہ بات مارٹی اور جورڈی بھلا کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ وہ تو ہمیشہ سے خود کو لارڈ کی جائداد کا بلاشرکتِ غیرے مالک سمجھتے آئے ہیں۔''

''کیا آپ کے پاس مادام لوسیا کا سیل نمبر ہے؟'' مورس نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' ڈکسن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''تاہم میں اُن کی رہائش گاہ کا پتا جانتا ہوں۔ وہ ایک سابق امریکی ماڈل ہیں اور کسی دور میں خاصی شہرت یافتہ ماڈل تھیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مورس کو مادام لوسیا کا پتا بھی بتا دیا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ ڈکسن......'' مورس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

وہ اپنی کار میں روانہ ہوا تو ذہنی طور پر خاصا اُلجھا ہوا تھا۔ بظاہر لارڈ کی موت حادثہ ہی لگ رہی تھی مگر ٹائمنگ نے اسے مشکوک بنا دیا تھا۔ رابرٹ کے قتل کے چند دن بعد ہی لارڈ کی ہلاکت مورس کو کسی صورت بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ان دونوں اموات کا فائدہ صرف اور صرف مارٹی اور جورڈی کو ہی جاتا تھا۔ رابرٹ اور ان کے درمیان چپقلش چل رہی تھی۔ رابرٹ کو کسی نے اس کے گھر میں گھس کر قتل کیا تھا۔ دروازہ کہیں سے ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ اندر سے مقفل تھا۔ ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یقیناً قاتل اس کھڑکی کے راستے فرار ہوا تھا۔ ایڈرسن نے آس پاس کے ہمسایوں سے جو معلومات حاصل کی تھیں۔ ان کے مطابق رابرٹ تنہائی پسند انسان تھا اور کبھی کبھی تو کسی کی آمد پر دروازہ ہی نہیں کھولتا تھا مگر اس کا قاتل گھر کے اندر ہوا تھا۔ یعنی اُس نے قاتل کے لیے خود دروازہ کھولا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ رابرٹ اس شخص کو اچھی طرح سے جانتا تھا اور اسے اتنی حیثیت بھی دیتا تھا کہ اس کی آمد پر دروازہ کھول دیا ورنہ ہمسایوں کی آمد پر تو وہ دروازہ ہی نہیں کھولتا تھا۔ رابرٹ کی موت سے مارٹی اور جورڈی کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کے کاروباری گھپلوں کے بارے میں لارڈ کو خبر نہ ہو سکی اور لارڈ کی موت کا یہ فائدہ ہوا کہ اب مادام لوسیا جائداد میں حصے دار نہیں بن سکتی تھیں۔ ابھی تک کے حالات و واقعات مارٹی اور جورڈی کی طرف ہی اشارہ کر رہے تھے مگر ان سب باتوں کے باوجود مورس اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھا کہ اگر ان دونوں اموات کے پیچھے مارٹی اور جورڈی کا ہاتھ ہے تو بھی ابھی تک اس کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا جس کی بنا پر انہیں گرفتار کیا جا سکتا۔

آج وہ خاصی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے واپس آفس جانے کے بجائے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایڈرسن باقی کے معاملات سنبھال لے گا۔ آج اسے ذہنی اُلجھاؤ کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے گھر جا کر آرام کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح نو بجے کے قریب مورس آفس جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوا مگر اس کی گاڑی کا رخ آفس کی جانب نہیں تھا۔ آفس جانے سے پہلے اس نے مادام لوسیا سے ایک ملاقات کرنا ضروری سمجھا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کسی بھی کیس میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس نے مادام لوسیا سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ ڈکسن کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ مادام لوسیا کا گھر دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ بھی خاصی دولت مند خاتون ہیں۔ اس نے اپنی کار ایک سائڈ پر روکی اور پھر کار سے اتر کر مادام لوسیا کے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ گھر کے مین گیٹ پر ایک باوردی سیکیورٹی گارڈ موجود تھا۔

''مادام لوسیا سے کہو سارجنٹ مورس اُن سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے گارڈ کے قریب جا کر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''مگر مادام لوسیا تو اس وقت سو رہی ہیں۔'' سیکیورٹی گارڈ نے جذبذب لہجے میں کہا۔

''میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور ایک مرڈر کی تفتیش کر رہا ہوں۔'' مورس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اس لیے میڈم کو بیدار کرو۔''

''یس سر۔'' سیکیورٹی گارڈ نے اس کا سخت لہجہ سنتے ہی سرنڈر کر دیا اور پھر سارجنٹ مورس کے تعارف نے اسے پہلے ہی مرعوب کر دیا تھا۔ اس نے گیٹ کے ایک سائڈ پر لگے انٹرکام کے ذریعے کچھ دیر تک اندر کسی سے بات کی اور پھر مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''آپ اندر جا سکتے ہیں۔''

''شکریہ۔'' مورس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ توقع کے مطابق وہ مادام لوسیا تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

مین گیٹ کراس کرتے ہی ایک چالیس سالہ خاتون نے اس کا استقبال کیا مگر اس کا لباس دیکھتے ہی مورس کو اندازہ ہو گیا کہ یہ مادام لوسیا کی کوئی ملازمہ ہے۔

''آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیں۔ مادام لوسیا کچھ ہی دیر میں تشریف لا رہی ہیں۔'' اس خاتون نے کہا تو مورس سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ ہولیا۔ ملازمہ نے اسے ایک خوب صورت اور پُرشکوہ ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور پھر خود وہاں سے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ دوبارہ آئی اور اس نے مورس کے سامنے موجود ٹیبل پر مشروب کا گلاس رکھا اور ایک بار پھر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔

مورس نے مشروب کا گلاس اٹھا لیا اور مشروب کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ تعریفی نظروں سے ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی اس نے مشروب کا گلاس ختم کر کے سامنے ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ نفیس لباس زیب تن کیے ایک خاتون اندر داخل ہوئیں۔ خاتون کا لباس دیکھتے ہی مورس کو اندازہ ہو گیا کہ یہی مادام لوسیا ہیں۔

''ہیلو سارجنٹ۔'' مادام لوسیا نے اس کے قریب آ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تو مورس نے بھی باقاعدہ کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ نرمی سے تھاما اور پھر چھوڑ دیا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کسی مرڈر کی تفتیش کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہیں؟'' مادام لوسیا نے سائڈ صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' مورس جو مادام لوسیا کے احترام میں کھڑا ہو گیا تھا دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں لارڈ جوناتھن کے منیجر رابرٹ کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ ویسے آپ کو لارڈ جوناتھن کی موت کے بارے میں بھی علم ہو چکا ہو گا؟''

''جی ہاں۔'' مادام لوسیا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لارڈ جوناتھن کی موت تو ایک حادثہ ہے جبکہ رابرٹ کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ لارڈ کے بزنس کے معاملات دیکھتا تھا۔ میں لارڈ کے ملازمین کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا نہیں خیال کہ میں رابرٹ کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں گی۔ ویسے بھی میرا لارڈ پیلس سے تعلق لارڈ ہی کی بدولت تھا اور وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں ان کی آخری رسومات میں شریک ہونا چاہتی ہوں مگر ساتھ ہی میں مارٹی اور جورڈی سے خوف زدہ بھی ہوں، معلوم نہیں وہ مجھے لارڈ کی آخری رسومات میں شریک ہوتے دیکھ کر کس قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کریں گے؟ ان دونوں سے اچھائی کی توقع تو کی نہیں جا سکتی۔''

''کیا آپ اور لارڈ جوناتھن شادی کرنے والے تھے اور کیا مارٹی اور جورڈی کو اس شادی پر اعتراض تھا۔'' مورس نے مادام لوسیا سے استفسار کیا۔

''میں اور لارڈ اسی مہینے شادی کرنے والے تھے۔ یہ بات لارڈ پیلس کے کافی ملازمین جانتے ہیں۔ مارٹی اور جورڈی کو بھی علم ہو چکا تھا۔ انہوں نے تو میرے گھر آ کر مجھے لارڈ سے شادی کرنے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔'' مادام لوسیا نے بتایا تو مورس بُری طرح چونک پڑا۔

''کس قسم کے سنگین نتائج؟'' اس نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''یہ تقریباً دس دن پہلے کا واقعہ ہے۔'' مادام لوسیا نے کہا۔ ''وہ دونوں میرے گھر آئے اور ملاقات کی اجازت چاہی۔ کیونکہ وہ لارڈ کے بیٹے تھے اس لیے میں نے اجازت دے دی مگر وہ دونوں تو انتہائی بدزبان اور بدتمیز انسان واقع ہوئے۔ انہوں نے اندر آتے ہی میرے ساتھ بدتمیزی شروع کر دی جس پر میں نے اپنے سیکیورٹی گارڈ سے کہہ کر انہیں گھر سے باہر نکلوا دیا۔ وہ جاتے ہوئے بھی مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ یہ شادی کسی صورت بھی نہیں ہونے دیں گے۔''

''تو پھر آپ نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں

کروائی؟'' مورس نے پوچھا۔

''لارڈ جوناتھن کی وجہ سے۔'' مادام لوسیا نے تفہیمی لہجے میں کہا۔ ''میں نے لارڈ کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں مارٹی اور جورڈی کی طرف سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ وہ دونوں بس باتوں کے ہی شیر ہیں۔ عملی طور پر کوئی غیر قانونی حرکت کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔''

''آپ کا وقت دینے کا بہت بہت شکریہ۔'' مورس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں قانون سے تعاون کرنا میرا فرض تھا۔'' مادام لوسیا نے بھی اٹھتے ہوئے کہا تو مورس سر ہلاتے ہوئے ڈرائنگ روم کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ مادام لوسیا اسے مین گیٹ تک چھوڑنے ساتھ آئیں۔

مورس آفس کی جانب روانہ ہوا تو ڈرائیونگ کے دوران بھی اس کا ذہن خیالات کے جال میں اُلجھا رہا۔ مادام لوسیا سے ہونے والی ملاقات میں بھی مارٹی اور جورڈی کا نام ہی سامنے آیا تھا۔ مورس کو اب یقین ہونے لگا تھا کہ اگر لارڈ کی موت حادثہ نہیں تو پھر رابرٹ اور لارڈ کی موت میں مارٹی اور جورڈی کا ہی ہاتھ ہے۔ تاہم مورس اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ بعض اوقات پسِ آئینہ حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ وہ ایک پولیس افسر تھا اور اس نے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے کیس دیکھے تھے جن میں پولیس جن افراد پر کسی کیس کے سلسلے میں شک کر رہی ہوتی تھی وہ بے گناہ ثابت ہوئے تھے اور اصل مجرم کوئی اور ہی نکلا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ مارٹی اور جورڈی کا بھی رابرٹ کے قتل سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ لارڈ جوناتھن حادثے کا شکار ہوئے تھے یا نہیں اس بارے میں کوئی حتمی رائے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے آنے پر ہی قائم کی جاسکتی تھی اور پھر بطور پولیس افسر اسے رابرٹ کے قتل کے سلسلے میں کسی کو بھی گرفتار کرنے سے پہلے اس کے خلاف ٹھوس شواہد حاصل کرنے تھے۔ ورنہ ملزم عدالت سے بہ آسانی بری ہو جاتا۔ کیونکہ عدالت ٹھوس شواہد کے بغیر کسی کو سزا نہیں سنا سکتی۔

وہ اپنے آفس پہنچا تو ایڈرسن اس کا منتظر تھا۔ ''سر، لارڈ جوناتھن کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے۔'' مورس کے بیٹھتے ہی ایڈرسن نے اسے مطلع کیا۔

''اتنی جلدی پوسٹ مارٹم رپورٹ کیسے مل گئی؟'' مورس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''سر! میں نے پولیس کی طرف سے پوسٹ مارٹم رپورٹ جلدی بنانے کی استدعا کی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے پتا چلا ہے کہ لارڈ کے بیٹوں نے بھی اس سلسلے میں اپنا اثر رسوخ استعمال کیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں لارڈ جوناتھن کی ڈیڈ باڈی جلدی مل جائے تاکہ وہ ان کی آخری رسومات ادا کر سکیں۔''

''تو پھر ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا کہتی ہے؟'' مورس نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''سر! لارڈ کی موت شیر کے حملے سے ہی ہوئی ہے۔ شیر نے ان کی گردن دبوچ کر گردن کی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔ موت کی وجہ بھی ہڈی کا ٹوٹنا ہی ہے۔'' ایڈرسن نے جواب دیا۔

''تو پھر اس کا مطلب ہے لارڈ کی موت ایک حادثہ ہی ہے۔'' مورس پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''ورنہ مادام لوسیا سے ہونے والی ملاقات نے مارٹی اور جورڈی پر میرے شک کو تقویت دی تھی۔''

''یہ مادام لوسیا کون ہیں؟'' ایڈرسن نے حیرت بھرے لہجے کہا۔

''کل جب ڈکسن مجھے مین گیٹ تک چھوڑنے آیا تو اسی نے مادام کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔'' پھر مورس نے تفصیل سے ایڈرسن کو اپنی اور ڈکسن کی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔

''سر! اگرچہ تمام حالات مارٹی اور جورڈی کی جانب ہی اشارہ کر رہے ہیں مگر ابھی تک ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لارڈ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پالتو شیر کے حملے میں مارے گئے ہیں۔ اس لیے یہ معاملہ تو صاف ہوا مگر رابرٹ کے قتل کا معاملہ ابھی باقی ہے اور ابھی تک ہمیں جو معلومات ملی ہیں اُن کے مطابق مارٹی اور جورڈی کو اس سے پرخاش تھی۔'' مورس سے مادام لوسیا کے بارے میں تفصیل سننے کے بعد ایڈرسن پُرخیال لہجے میں بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مورس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ لارڈ کی موت میں بھی کوئی نہ کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔''

''نہیں سر۔'' ایڈرسن نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے کے بعد کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔''

''مگر اُن کے پالتو شیر نے لارڈ پر حملہ کیوں کیا؟'' مورس اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس شیر کا مردہ

بھجم" پروفیسر تھامسن کے پاس پہنچانے کا کہا تھا کہ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

"میں نے اس شیر کی باڈی کو پروفیسر تھامسن کے پاس پہنچا دیا تھا۔" ایڈرسن نے کہا۔ "ویسے مجھے امید نہیں کہ پروفیسر سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے گی۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ دیں گے کہ شیر ایک درندہ ہے جو کسی بھی وقت ہیجان میں مبتلا ہو کر اپنے مالک پر حملہ آور ہو سکتا ہے اگر صرف اکیسویں صدی کی تاریخ دیکھ لی جائے تو ہمارے مشاہدے میں ایسے بہت سے واقعات آئیں گے جن میں پالتو جانوروں نے اپنے مالکان پر حملہ کیا ہے۔ اس واقعے کو بھی انہی واقعات میں سے ایک تصور کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا تمہاری پروفیسر سے دوبارہ بات ہوئی ہے؟" موریس نے پوچھا کیا۔

"جی ہاں میری آپ کی آمد سے پہلے فون پر اُن سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے اس مردہ شیر کا معائنہ کرنا شروع کر دیا ہے تاہم ان کا کہنا ہے کہ انہیں کوئی حتمی رائے قائم کرنے کے لیے مزید ایک دن درکار ہے۔ وہ اپنی لیبارٹری میں شیر کے دانتوں سے حاصل ہونے والے گوشت کے باریک ریشوں کا معائنہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"گوشت کے یہ باریک ریشے یقیناً لارڈ جوناتھن کے ہوں گے۔" موریس پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "شیر نے لارڈ کو مارنے کے بعد باقاعدہ انہیں کھانا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال وہ کاغذات لے آؤ جو رابرٹ کے قتل کے بعد اس کے گھر سے ملے تھے۔ میرا خیال ہے ذرا ان کا بھی مطالعہ ہو جائے۔"

"وہ کاغذات کا خاصا بڑا پلندا ہے۔" ایڈرسن نے کہا۔ "میں نے ان کا سرسری سا جائزہ لیا ہے مگر کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ کاغذات لارڈ کے کاروباری معاملات سے متعلق ہیں پھر بھی میں لے آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ایڈرسن روم سے باہر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک موٹی سی فائل تھی۔ اس نے وہ فائل موریس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔

"کیا مقتول رابرٹ کی باڈی ورثا کے حوالے کر دی گئی ہے؟" موریس نے ایک خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

"یس سر۔" ایڈرسن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "آج چار بجے اس کی آخری رسومات ادا کی جائیں گی۔ اس کے بیٹے بھی کینیڈا سے آچکے ہیں۔"

"بہتر ہے کہ تم بھی رابرٹ کی آخری رسومات میں شرکت کر لو۔" موریس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "وہاں رابرٹ کے بہت سے رشتے دار بھی آئے ہوں گے۔ تم اُن سے کریدنے کی کوشش کرنا کہ رابرٹ کی کسی سے دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے سر، میں چلا جاؤں گا۔" ایڈرسن نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور پھر موریس کو کاغذات کی فائل اٹھاتے دیکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ کافی عرصے سے موریس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اس لیے خاصی حد تک اس کا مزاج آشنا بھی ہو چکا تھا۔ اسے فائل اٹھاتے دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اب یکسوئی کے ساتھ ان کاغذات کا جائزہ لینا چاہتا ہے اسی لیے مزید کوئی بات کیے بغیر وہ آفس سے باہر نکل گیا تھا۔

موریس نے کاغذات کی فائل اٹھائی اور پھر ایک ایک صفحے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک گھنٹے تک ان کاغذات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر ایک صفحے پر پہنچتے ہی وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے اس پورے صفحے کا بغور مطالعہ کیا اور پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے اس صفحے کو علیحدہ کر کے اس پر پیپر ویٹ رکھ دیا جبکہ فائل کو دراز میں رکھ کر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کے چہرے پر شکنوں کا ایک جال سا پھیل گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ آج اسے جلدی واپس جانا تھا۔ کیونکہ فیری اور اس نے ایک ساتھ لنچ کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ فائل سے نکالا گیا کاغذ اس نے پیپر ویٹ کے نیچے ہی پڑا رہنے دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کوئی نہیں چھیڑے گا۔ فیری انتظار کر رہی ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ قدرے دیر سے آفس پہنچا۔ آج خلافِ معمول ایڈرسن بھی لیٹ تھا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت کو کہا۔ "جیسے ہی ایڈرسن آئے اسے میرے پاس فوراً بھیج دینا۔" اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں ایڈرسن اس کے آفس میں داخل ہوا۔

"ایڈرسن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں کبھی تم سے پہلے آفس پہنچا ہوں۔" موریس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چلیں سر، اچھا ہوا اس طرح آج آپ کو ایک نیا تجربہ ہو گیا۔" ایڈرسن نے جواب دیا تو موریس کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ تمہارے اندر حسِ مزاح بھی موجود ہے۔“ مورس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بہرحال اب کام کی بات کی طرف آتے ہیں۔ میں نے کل تمہیں مقتول رابرٹ کی آخری رسومات میں شرکت کرنے کا کہا تھا؟“

”میں گیا تھا۔“ ایڈرسن نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے مقتول رابرٹ کے کافی رشتے داروں سے بات چیت کی مگر کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ سب کا کہنا یہی ہے کہ رابرٹ تنہائی پسند آدمی تھا اور اپنے رشتے داروں سے بھی بہت کم ملتا جلتا تھا۔ وہ سب بھی رابرٹ کی کسی سے دشمنی یا ناچاقی کے بارے میں لاعلم ہیں۔“

”ابھی تک ہم رابرٹ کے قتل کے سلسلے میں کوئی واضح کلیو حاصل نہیں کرسکے۔“ مورس سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”اگرچہ اس سلسلے میں لارڈ کے دونوں بیٹے مشکوک ٹھہرتے ہیں مگر اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید یہ کوئی دوسرا ہی معاملہ ہے۔ ذرا یہ دیکھو۔“ اس نے پیپر ویٹ کے نیچے دبا کاغذ نکال کر ایڈرسن کی جانب بڑھا دیا۔ ”یہ مجھے کاغذات کے اس پلندے میں سے ملا ہے جو رابرٹ کی لاش کے پاس سے اکٹھے کیے گئے تھے۔“

”یہ تو غالباً کوئی وصیت نامہ ہے۔“ ایڈرسن نے کاغذ تھامتے ہوئے کہا اور پھر اسے بغور پڑھنے لگا۔

”سر یہ بالکل نئی بات ہے جو ہمارے علم میں آئی ہے۔“ ایڈرسن نے پورا صفحہ پڑھنے کے بعد اسے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری اب تک کی تفتیش لارڈ کے بیٹوں کے گرد ہی گھوم رہی تھی مگر اب ہمیں تفتیش کا دائرہ کار بڑھانا پڑے گا۔“

”ہاں۔“ مورس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”اس وصیت کے مطابق لارڈ جوناتھن اپنی سابقہ وصیت کالعدم قرار دے رہے ہیں جس میں انہوں نے اس شخص کے نام کچھ زمین کی تھی اور اس میں لکھا ہے کہ لارڈ ایسا کرنے کا قانونی حق رکھتے ہیں کیونکہ پچھلی وصیت میں بھی انہوں نے یہ حق اپنے نام پر تفویض کروایا تھا۔“

”مگر سر! اگر بالفرض اس شخص کو قاتل سمجھ لیا جائے تو پھر یہ اس وصیت کو وہاں چھوڑ کر ہی نہ جاتا۔“ ایڈرسن نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”اس کی پہلی ترجیح اس تبدیل شدہ وصیت کو غائب کرنا ہی ہوتی۔“

”ممکن ہے اسے اس بارے میں علم ہی نہ ہوا ہو۔“ مورس نے جواب دیا۔ ”کاغذات کے اتنے بڑے پلندے میں یہ صفحہ ہمیں بھی بغور جائزہ لینے کے بعد ہی نظر آیا ہے۔ بہرحال ضروری نہیں کہ رابرٹ کے قتل میں یہی شخص ملوث ہو۔ تاہم پھر بھی یہ مارٹی اور جورڈی کے بعد مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہوچکا ہے۔ تم سب سے پہلے اس شخص کی رہائش گاہ کے بارے میں پتا کرو۔ وہاں اس کے علاوہ کون کون رہتا ہے۔ اگر ممکن ہوسکے تو اس کے گھر کی خفیہ طور پر تلاشی بھی لے لو۔ اگر رابرٹ کے قتل میں یہی ملوث ہے تو پھر امید کی جاسکتی ہے کہ اس نے آلۂ قتل اپنے گھر میں ہی چھپا کر رکھا ہوگا۔ کیونکہ اسے یقیناً یہ زعم ہوگا کہ اس پر کسی صورت بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔ رابرٹ یہ وصیت تیار کر رہا تھا۔ ابھی اس پر لارڈ کے دستخط نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے اس میں جس پرانی وصیت کا ذکر ہے قانونی طور پر اسے ہی تسلیم کیا جائے گا۔ لارڈ کی موت سے اس شخص کو بھی فائدہ ہوا ہے۔“

”مگر سر پھر رابرٹ کی موت سے اسے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟“ ایڈرسن نے کہا۔ ”وصیت کالعدم قرار دینے کا معاملہ تو لارڈ کسی اور کے سپرد کرسکتے تھے۔ کیا مارٹی اور جورڈی کی طرح اس کی بھی رابرٹ کے ساتھ کوئی پرخاش تھی؟ رابرٹ کو مار کر اسے کیا حاصل ہوسکتا تھا۔ اسے اصل فائدہ تو لارڈ کی موت سے ہوتا مگر لارڈ کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہ شیر کے حملے میں ہی ہلاک ہوئے ہیں۔ انہیں کسی نے قتل نہیں کیا۔“

”معاملات بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔“ مورس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لارڈ کی موت کے بغیر نہ مارٹی اور جورڈی کو کوئی فائدہ ہوسکتا تھا اور نہ ہی اس شخص کو۔ بہرحال تم کوشش کرو کہ اس کی رہائش گاہ یا فلیٹ وغیرہ کی خفیہ تلاشی لی جاسکے۔ اس کے علاوہ یہ معلومات بھی حاصل کرو کہ کیا اس شخص نے کبھی کوئی لائسنس یافتہ اسلحہ وغیرہ خریدا ہے یا نہیں۔“

”ٹھیک ہے سر، میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔“ ایڈرسن نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ اسی لمحے ایڈرسن کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ”پروفیسر تھامسن کا فون ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون اٹینڈ کرلیا۔ ”ہیلو پروفیسر تھامسن کیسے ہیں آپ؟“ اس نے پروفیسر کی خیریت دریافت کی اور پھر کچھ دیر تک دوسری طرف سے بات سننے کے بعد بولا۔ ”جی ہاں، میں اس وقت سارجنٹ مورس کے پاس ہی موجود ہوں۔ آپ اُن سے بات کرسکتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے.... موبائل فون مورس کی جانب بڑھا دیا۔ مورس نے موبائل ہاتھ میں لیتے ہی لاؤڈر کا بٹن بھی پریس کردیا تاکہ ایڈرسن بھی اس کی اور

پروفیسر کی بات چیت سن سکے۔

''ہیلو پروفیسر کیسے ہیں آپ؟'' موریس نے نرم لہجے میں کہا۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں اور میرے پاس آپ کے لیے ایک چونکا دینے والی خبر ہے۔'' پروفیسر تھامسن نے کہا تو موریس اور ایڈرسن چونک پڑے۔

''کیسی خبر؟'' موریس نے استفسار کیا۔

''میں نے شیر کی باڈی کا مکمل پوسٹ مارٹم کرلیا ہے اور میرے خیال میں لارڈ جوناتھن کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئے بلکہ انہیں ایک انتہائی گہری سازش کے تحت ہلاک کیا گیا ہے۔'' پروفیسر تھامسن نے انکشاف کیا۔

''آپ نے یہ نتیجہ کس بنا پر اخذ کیا؟'' موریس نے پوچھا۔

''بہت سی وجوہات ہیں جس کی بنا پر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس شیر کے دانتوں سے حاصل ہونے والے گوشت کے باریک ریشے مختلف قسم کے ہیں۔ ایک تو کسی جانور کا گوشت ہے جو غالباً اس شیر کو بطور خوراک دیا جاتا رہا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کے دانتوں میں انسانی گوشت کے بھی دو مختلف نوعیت کے ڈی این اے کے ذرات پائے گئے ہیں۔ وہ شیر لارڈ سے پہلے بھی انسانی گوشت کے ذائقے سے آشنا تھا اور اسے کئی دنوں سے انسانی گوشت خوراک میں شامل کر کے دیا جارہا تھا۔ آسان لفظوں میں یہ سمجھ لیں کہ اس شیر کو جانتے بوجھتے آدم خور بنایا جارہا تھا۔ اس کے معدے کے معائنے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اسے خوراک میں مخصوص ممنوعہ کیمیکل دیا جارہا تھا جو کسی بھی درندے کو ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اس طرح کا کیمیکل شیر تو کیا اگر کسی کتے کو بھی کھلایا جائے تو وہ بھی اپنے مالک پر حملہ آور ہوجائے گا۔''

''مگر پروفیسر تھامسن، پھر اس شیر کی خوراک میں انسانی گوشت شامل کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے، اگر کوئی لارڈ جوناتھن کو سازش کے تحت ہلاک کرنا چاہتا تھا تو اس کا مقصد تو محض کیمیکل کے استعمال سے ہی حل ہو جاتا تھا۔'' موریس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''اسی لیے تو میں نے کہا کہ بہت گہری سازش کے تحت لارڈ کو ہلاک کیا گیا ہے۔ قاتل ہر صورت لارڈ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں کوئی چانس نہیں لینا چاہتا تھا۔ محض کیمیکل کے اثرات سے شیر وقتی طور پر ہیجان میں مبتلا ہو کر لارڈ پر حملہ آور تو ہو جاتا مگر یہ ممکن تھا کہ اپنے مالک کی چیخیں سن کر اُسے ہوش آجاتا اور وہ اسے چھوڑ دیتا مگر چونکہ اس کے منہ کو انسانی گوشت کا ذائقہ لگ چکا تھا اس لیے اس نے لارڈ کو چیخنے کے باوجود نہیں چھوڑا۔ انسانی خون و گوشت میں نمک ہوتا ہے اور جس جانور کو اس کا چسکا لگ جائے اسے کسی دوسرے جانور کے گوشت میں دلچسپی نہیں رہتی۔ لارڈ کو مارنے کی پلاننگ کرنے والا شخص یہ بات بخوبی جانتا تھا۔ اس لیے اس نے پہلے سے ہی اس شیر کے منہ کو انسانی گوشت کا چسکا لگا دیا تھا اور اسی لیے مونٹیری نامی شیر نے لارڈ پر حملہ کرنے کے بعد انہیں اپنا شکار سمجھ کر مار ڈالا اور پھر باقاعدہ کھانا شروع کر دیا۔ کیونکہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو کر اس نے جیسے ہی لارڈ کے جسم میں دانت گڑائے اس کی آدم خوری کی جبلّت جاگ اٹھی۔'' پروفیسر نے اس بار پوری تفصیل سے موریس کو اپنی بات سے آگاہ کر دیا۔

''پروفیسر! کیا آپ مجھے مونٹیری پر اپنی ریسرچ کے بارے میں ایک رپورٹ بنا کر دے سکتے ہیں؟ آپ کی خدمات کو حکومتی سطح پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کی دستخط شدہ رپورٹ سے مجھے یہ ثابت کرنے میں آسانی ہو جائے گی کہ لارڈ جوناتھن حادثاتی طور پر ہلاک نہیں ہوئے بلکہ انہیں مارنے کی باقاعدہ پلاننگ کی گئی تھی۔''

''جی بالکل، میں قانون سے پورا پورا تعاون کروں گا۔'' پروفیسر نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''پروفیسر، لارڈ جوناتھن کے پالتو شیر کو کس قسم کا ممنوعہ کیمیکل دیا جارہا تھا۔ کیا یہ مارکیٹ میں عام فروخت ہوتا ہے؟'' موریس نے پوچھا۔

''اگر یہ عام مارکیٹ میں فروخت ہوتا تو پھر ممنوعہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' پروفیسر نے جواب دیا۔ ''یہ خطرناک کیمیکل ہے اور بعض غیر قانونی کاروبار کرنے والے اسے نشہ آور اشیا میں ملا کر بھی فروخت کرتے ہیں۔ نشے کی تاثیر کو بڑھانے کے لیے۔ تاہم میری معلومات کے مطابق اب حکومتی سطح پر اس کی فروخت کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات اٹھائے گئے ہیں جس کی وجہ سے اس کیمیکل کی عام خرید و فروخت تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ تاہم یہ کچھ جگہ اب بھی فروخت ہوتا ہے اور اس کی قانونی اجازت بھی موجود ہے۔ اس کیمیکل کو بڑی بڑی تجرباتی لیبارٹریز میں فراہم کیا جاتا ہے۔''

''مگر یہ لیبارٹریز اس کیمیکل کو کہاں سے خریدتی ہیں؟'' موریس نے سوال کیا۔ ''اس شہر میں کتنے ایسے ڈرگز اسٹور ہیں جن کے پاس اس کیمیکل کو فروخت کرنے کی

قانونی اجازت موجود ہے۔"

"میرے خیال میں یہ صرف ایک ہی جگہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس شہر میں صرف ایک ایسا ڈرگ اسٹور ہے جہاں پر یہ دستیاب ہے۔ مجھے بھی اپنی لیبارٹری میں تجربات کے دوران اس کیمیکل کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس لیے میں نے حکومت سے اس کی خریداری کی قانونی اجازت لے رکھی ہے۔" پروفیسر نے وضاحت کی۔

"مگر یہ کیمیکل اس شخص کو کیسے مل سکتا ہے جس نے اسے لارڈ کے پالتو شیر کی خوراک میں شامل کیا ہے۔ جبکہ یہ ممنوعہ کیمیکل ہے اور اس کی عام خرید و فروخت کی اجازت نہیں ہے۔" مورس نے سوال کیا۔

"آپ کی بات درست ہے۔" پروفیسر نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ "مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ملک میں بہتیرے ایسے لوگ موجود ہیں جو پیسے کے لیے کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر پیسا خرچ کیا جائے تو بظاہر ناممکن نظر آنے والے کام بھی آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں جس شخص نے اس کیمیکل کو لارڈ کے پالتو شیر کی خوراک میں شامل کیا ہے اس نے بھی کچھ رقم خرچ کر کے اسے حاصل کیا ہو گا۔ ممنوعہ کیمیکل بیچ کر فروخت کنندہ نے غیر قانونی کام کیا ہے۔ اس لیے وہ شاید اس کا اعتراف بھی نہ کرے۔"

"پروفیسر آپ مجھے اس کیمیکل کا نام اور اس ڈرگز اسٹور کا نام بتا دیں جہاں یہ فروخت ہوتا ہے۔" مورس نے کہا تو پروفیسر نے دونوں نام بتا دیے۔

"آپ کے بے لوث تعاون کا بے حد شکریہ پروفیسر تھامسن۔" مورس نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

"شکریے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ قانون سے تعاون کرنا میرا فرض ہے۔" پروفیسر نے انکساری سے جواب دیا تو مورس نے انہیں گڈ بائے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

"میرے خیال میں اب ہم اصل مجرم تک پہنچ جائیں گے۔" اس نے ایڈرسن کا موبائل فون اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "میں آج ہی اس ڈرگز اسٹور کا چکر لگاؤں گا اور براہِ راست اس کے مالک سے ملوں گا۔ اگر مونیٹری کی خوراک میں استعمال ہونے والا کیمیکل اسی کے ڈرگز اسٹور سے خریدا گیا ہے تو پھر وہ آسانی سے نہیں اُگلے گا اس سے سختی کے ساتھ باز پرس کرنا پڑے گی۔ کل صبح لارڈ پیلس کے کچھ ملازمین کو پولیس اسٹیشن بھی بلاؤ۔ اگرچہ میں لارڈ پیلس میں بھی ان سے پوچھ گچھ کر چکا ہوں مگر میرا خیال ہے لارڈ پیلس میں وہ سب ذہنی دباؤ کے تحت اپنا بیان ریکارڈ کرواتے رہے تھے اور پھر اس بار میں ان سے ذرا سختی کے ساتھ نمٹنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر! اس دن لارڈ پیلس میں وہاں کے ملازمین سے پوچھ گچھ کے دوران ان کے ایڈریس بھی نوٹ کر لیے گئے تھے۔ ان سے آج ہی رابطہ کر لیا جائے گا اور انہیں پولیس کی طرف سے باقاعدہ حکم دیا جائے گا کہ کل لارڈ پیلس میں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے یہاں پیش ہوں۔" ایڈرسن نے کہا۔

"پروفیسر سے بہت اہم معلومات مل گئی ہیں اگر ممنوعہ کیمیکل واقعی میں اس ڈرگز اسٹور سے خریدا گیا ہے تو پھر وہاں پر لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی مدد سے اس کی شناخت بھی ہو جائے گی۔ اس ڈرگز اسٹور میں کیمرے ضرور نصب ہوں گے۔" مورس پُرخیال لہجے میں بولا تو ایڈرسن نے اس طرح سر ہلا دیا جیسے وہ مورس کی بات سے سو فیصد متفق ہو۔

☆☆☆

وہ دن اور اگلا دن مورس نے خاصی مصروفیت میں گزارا۔ اس نے لارڈ پیلس میں کام کرنے والے کافی ملازمین سے پولیس اسٹیشن میں پوچھ گچھ بھی کی۔ ان میں زیادہ تر وہی افراد تھے جن سے وہ لارڈ پیلس میں پہلے بھی پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ وہ پروفیسر تھامسن کے بتائے ہوئے ڈرگز اسٹور پر بھی گیا تھا اور اس کے مالک سے مل کر اس سے بہت کچھ اگلوانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

اس وقت شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ جب مورس، ایڈرسن اور دیگر پولیس فورس کے ہمراہ لارڈ پیلس پہنچا۔ لارڈ جوناتھن کے خاص ملازم ڈکسن نے ان کا استقبال کیا۔ مورس نے اپنے ساتھ ایڈرسن اور تین پولیس والوں کو لیا اور لارڈ پیلس کے اندر داخل ہو گیا جبکہ اس نے پولیس کا دیگر عملہ باہر گاڑیوں کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ اس کے ساتھ دیگر پولیس والوں کو دیکھ کر ڈکسن کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے تھے۔ تاہم اس نے کسی قسم کے اعتراض کا اظہار نہیں کیا تھا۔

مورس نے ڈکسن سے فون پر بات کر کے اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی اور ساتھ ہی اسے متنبہ بھی کر دیا تھا کہ مارٹی اور جورڈی کو کہہ دے کہ اس کی آمد پر گھر پر ہی موجود رہیں اسے بہت اہم بات کرنی ہے۔

"کیا مارٹی اور جورڈی موجود ہیں؟" اس نے اندر

داخل ہوتے ہی ڈکسن سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" ڈکسن نے تفہیمی لہجے میں سر ہلایا۔ "میں نے انہیں آپ کا پیغام دے دیا تھا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے آپ کا انتظار کررہے ہیں۔ ویسے وہ آج صبح سے ہی گھر میں موجود ہیں۔ آج لارڈ جوناتھن کی نعش ملنی تھی مگر اب اس میں بھی ایک دن کی تاخیر ہوگئی ہے۔"

"اس طرح کے معاملات میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ بہرحال آؤ۔" اس نے کہا تو ڈکسن سر ہلاتے ہوئے ان کے آگے ہولیا جبکہ موریس، ایڈرسن اور ساتھ آئے تینوں پولیس والے اس کے پیچھے چل پڑے۔

ڈرائنگ روم میں مارتی اور جورڈی نے ان کا استقبال کیا۔ "کیا بات ہے سارجنٹ موریس! ڈکسن نے بتایا کہ آپ نے اپنی آمد کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے خصوصی طور پر تلقین کی تھی کہ ہم دونوں لارڈ پیلس میں موجود رہیں۔" جورڈی نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے میری درخواست قبول کرلی جس کے لیے بہت بہت شکریہ۔" موریس نے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "دراصل رابرٹ کے قاتل کا سراغ مل گیا ہے اور لارڈ جوناتھن بھی کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئے بلکہ انہیں انتہائی گہری پلاننگ کے تحت قتل کیا گیا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" مارتی اور جورڈی کے حلق سے بیک وقت اضطراری آواز نکلی۔

"جی ہاں۔" موریس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہی حقیقت ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے۔" جورڈی حیرت سے بولا۔ "میں نے مونٹیری کو اپنی آنکھوں سے لارڈ پر حملہ آور ہوتے دیکھا تھا اور اسے شوٹ بھی میں نے خود کیا تھا۔ اسے حادثے کے بجائے قتل کیسے کہا جاسکتا ہے؟"

"بہت گہری اور پیچیدہ پلاننگ کے تحت لارڈ جوناتھن کو مارا گیا ہے۔" موریس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے لارڈ کی لاش کے ساتھ اس مردہ شیر کی باڈی کو بھی اٹھانے کا انتظام کیا تھا۔"

"جی ہاں، آپ نے کہا تھا کہ اس کو کہیں ٹھکانے لگا دیں گے۔" جورڈی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں نے اس مردہ شیر کی باڈی کو معائنے کے لیے ایک ماہر پروفیسر کے پاس بھجوایا تھا۔" موریس نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "اور تبھی یہ انکشاف ہوا کہ لارڈ جوناتھن کو ایک گہری سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے موریس نے مارتی اور جورڈی کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی اور پروفیسر تھامسن کی گفتگو سے آگاہ کردیا۔

"لارڈ جوناتھن اور رابرٹ کا قاتل ایک ہی شخص ہے۔" موریس اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مونٹیری نامی شیر آدم خور نہیں تھا بلکہ اسے دانستہ آدم خور بنایا گیا تھا۔ اس کی خوراک میں انسانی گوشت شامل کرکے۔ جب رابرٹ کو قتل کیا گیا تو اس کے جسم سے گوشت کاٹ کر علیحدہ کیا گیا تھا اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہی گوشت وقتاً فوقتاً مونٹیری کی خوراک میں شامل کیا گیا تھا۔ قاتل جب رابرٹ کو مارنے گیا تو اس وقت وہ لارڈ جوناتھن کو مارنے کی پلاننگ بھی کرچکا تھا۔ رابرٹ کے جسم سے گوشت کاٹ کر ساتھ لے جانا اس کی پلاننگ کا ہی حصہ تھا۔"

"مگر ہمارے ڈیڈ کو کس نے اور کیوں قتل کرڈالا؟"

"ڈکسن تم کہاں جارہے ہو؟" اسی لمحے موریس نے بلند آواز میں کہا تو سبھی چونک پڑے۔

"وہ میں ذرا باہر جارہا تھا۔" ڈکسن جو غیر محسوس طریقے سے ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب کھسک رہا تھا کھسیانے انداز میں بولا۔

"ایڈرسن، مسٹر ڈکسن کی مدد کرو۔" موریس نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو ایڈرسن نے آگے بڑھ کر ڈکسن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں جبکہ وہاں موجود دیگر پولیس اہلکاروں نے آگے بڑھ کر دونوں اطراف سے ڈکسن کو مضبوطی سے پکڑلیا۔

"اس کا کیا مطلب سارجنٹ موریس؟" جورڈی نے متحیر لہجے میں کہا۔

"مطلب بڑا صاف اور سیدھا ہے۔" موریس ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "رابرٹ اور لارڈ جوناتھن کو ڈکسن نے ہی مارا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" ڈکسن پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "مجھے بھلا رابرٹ اور لارڈ کی موت سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟"

"فائدہ تو تمہیں تھا ڈکسن۔" موریس پُرزور لہجے میں بولا۔ "اس طرح وہ زمین تمہارے نام پر ہی رہتی جو لارڈ نے تمہاری خدمات کے صلے میں تحفتاً تمہارے نام کی تھی۔ لارڈ تمہیں ایک ایماندار اور سچا انسان سمجھتے تھے مگر رابرٹ نے لارڈ پیلس کے اخراجات میں ہونے والی مالی بے ضابطگیوں کے بارے میں لارڈ کو آگاہ کردیا۔ لارڈ پیلس میں ہونے

والے اخراجات کا حساب کتاب تمہارے ذمے تھا اور تم کافی عرصے سے اس حساب کتاب میں گڑبڑ کر رہے تھے۔ تمہیں اس بات کا بھی شدید قلق تھا کہ رابرٹ نے لارڈ پیلس کے اخراجات میں کیے جانے والے تمہارے گھپلوں کے بارے میں لارڈ کو آگاہ کر دیا ہے اسی وجہ سے تم رابرٹ کے لیے اپنے دل میں کینہ رکھے ہوئے تھے اور پھر یہ بات بھی تمہارے علم میں آگئی کہ لارڈ جوناتھن نے تمہاری حقیقت جاننے کے بعد تمہارے نام کی گئی زمین واپس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم ان تمام باتوں کا ذمے دار رابرٹ کو سمجھتے تھے اور اس وجہ سے ایک بار اس سے تمہارا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ میں نے لارڈ پیلس میں یہاں کام کرنے والوں سے پوچھ گچھ کی تھی مگر کیونکہ اس وقت تم بھی ہمارے ساتھ موجود تھے اس لیے کسی نے تمہارے اور رابرٹ کے جھگڑے کے بارے میں ہمیں آگاہ نہیں کیا مگر جب میں نے انہیں پولیس اسٹیشن بلا کر ان سے بازپرس کی تو بہت سے نئے حقائق بھی سامنے آگئے۔ رابرٹ نے لارڈ پیلس میں کام کرنے والے کئی افراد سے ذکر کیا تھا کہ لارڈ جوناتھن اپنی وصیت میں تمہارے نام کی گئی زمین واپس لینا چاہتے ہیں۔ وہ ایسا کر سکتے تھے کیونکہ پہلی وصیت میں انہوں نے یہ حق اپنے لیے تفویض رکھا تھا۔ کیونکہ تم یہ سمجھتے تھے کہ لارڈ کے اس فیصلے میں رابرٹ کا ہاتھ ہے۔ اس لیے تم نے انتقاماً اسے مارنے کا فیصلہ کر لیا مگر تمہارا مسئلہ صرف رابرٹ کی موت سے حل نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے تم نے لارڈ جوناتھن کو بھی مارنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے ایک انتہائی شاطرانہ پلان تیار کیا۔ اپنے پلان کے مطابق تم سائلنسر لگا ریوالور لے کر رابرٹ کے گھر گئے۔ دستک دینے پر رابرٹ نے تمہارے لیے دروازہ کھول دیا۔ تم نے بغیر وقت ضائع کیے اسے فوراً ہی شوٹ کر دیا۔ دل پر لگنے والی گولی نے اسے زیادہ تڑپنے کی بھی مہلت نہ دی۔ اس کے بعد تم نے دروازہ اندر سے مقفل کیا اور پھر رابرٹ کی لاش کو گھسیٹ کر صوفے پر ڈال دیا۔ اور کھڑکی کے راستے باہر نکل گئے۔ اب یہاں سے تمہارا لارڈ جوناتھن کو مارنے کا پلان شروع ہوتا ہے۔ تم انہیں رابرٹ کی طرح نہیں مار سکتے تھے۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے اور ان کے قتل پر بہت اعلیٰ پیمانے پر تحقیقات کا آغاز ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ تم نے لارڈ کو ختم کرنے کا ایک فول پروف منصوبہ بنایا تھا۔ رابرٹ کے جسم سے گوشت کاٹ کر ساتھ لے جانا بھی اسی منصوبے کا حصہ تھا۔ لارڈ کے پالتو شیر کی خوراک وغیرہ تمہاری نگرانی میں ہی تیار ہوتی تھی۔ تم نے رابرٹ کے جسم سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا گوشت بھی اسی خوراک میں وقتاً فوقتاً شامل کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ مخصوص کیمیکل بھی۔ انسانی گوشت کی مخصوص مہک اور اس کیمیکل نے تمہاری توقع کے مطابق اپنا اثر دکھایا اور ایک دن لارڈ کے پالتو شیر نے اچانک ان پر حملہ کر کے انہیں ہلاک کر ڈالا۔ تمہارا پلان کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ سب لارڈ کی موت کو ایک حادثہ ہی سمجھتے رہے جس وقت تم نے رابرٹ کو مارا وہ لارڈ کی نئی وصیت پر کام کر رہا تھا۔ شاید تمہیں اس بارے میں علم نہیں تھا ورنہ تم اس وصیت کو بھی لے اُڑتے۔ بہرحال اس وصیت کے ملنے کے بعد ہی ہمیں تم پر شک گزرا تھا اور ہم نے تمہارے بارے میں اپنی تحقیقات کا آغاز کر دیا۔ تم ایک انتہائی مکار و عیار شخص ہو۔ ہم جب پہلی بار رابرٹ کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں لارڈ پیلس آئے تو تم نے انتہائی چالاکی سے ہماری توجہ مارٹی اور جورڈی کی جانب مبذول کروا دی جبکہ لارڈ کی موت پر تم نے کمالِ ہوشیاری سے مجھے مادام لوسیا کی ٹپ دے دی۔ تم یہ بات جانتے تھے کہ مارٹی اور جورڈی نے مادام لوسیا کے گھر جا کر انہیں لارڈ سے شادی کرنے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی ہیں اور مادام لوسیا نے اس بارے میں لارڈ کو بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اس لیے تمہیں یقین تھا کہ میں جب مادام لوسیا سے ملنے جاؤں گا تو وہ مارٹی اور جورڈی کی دھمکیوں کے بارے میں مجھے ضرور آگاہ کریں گی اور اس طرح میرا ان پر شک یقین میں بدل جائے گا۔ تم نے مارٹی اور جورڈی کی جانب میری توجہ مبذول کروائی۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ وہ لارڈ کے بیٹے تھے اس لیے ممکن تھا کہ لارڈ کی وصیت میں تمہارے نام کی گئی زمین پر معترض ہوتے اور اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کر لیتے۔ تاہم اگر وہ رابرٹ یا لارڈ جوناتھن کے قتل کے الزام میں دھر لیے جاتے تو تمہارا راستہ از خود صاف ہو جاتا۔ تم بہت مکار انسان ہو ڈکسن۔ تم نے ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''تمہاری کہانی اچھی ہے سارجنٹ موریس۔'' ڈکسن نے اس بار بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر تم اپنی اس کہانی کو عدالت میں ثابت کیسے کرو گے۔ کیا میرے خلاف ایک بھی چشم دید گواہ موجود ہے یا پھر کوئی ایسا ثبوت جس کی بنا پر عدالت یہ تسلیم کر لے کہ میں نے رابرٹ کو قتل کیا ہے اور لارڈ کی موت کا ذمے دار بھی میں ہی ہوں۔ تمہاری ساری باتیں مفروضوں اور اندازوں پر مشتمل ہیں۔''

''تم واقعی میں خاصے مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔'' موریس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال میں بھی

ایک پولیس افسر ہوں اور کسی کے اعصاب چٹخانے میں مہارت رکھتا ہوں۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرے پاس عدالت میں تمہیں قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی مواد موجود ہے۔ سب سے پہلے تو میں تمہیں بتانا چاہوں گا کہ تمہارے فلیٹ کی خفیہ تلاشی کے دوران وہ سائلنسر لگا ریوالور برآمد کر لیا گیا ہے جس سے تم نے رابرٹ کو قتل کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ریوالور کی فرانزک رپورٹ سے بھی یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ رابرٹ کے قتل میں یہی ریوالور استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ تم نے رابرٹ کو مارتے وقت ربر کے دستانے استعمال کیے تھے مگر اپنے فلیٹ میں تم نے بغیر دستانوں کے بھی اس ریوالور کو چھوا تھا اس لیے اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ثبت ہیں۔ انگلیوں کے نشانات سے مجھے عدالت میں یہ ثابت کرنے میں آسانی رہے گی کہ یہ ریوالور تمہارے استعمال میں رہا ہے اور فرانزک رپورٹ سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ اسی ریوالور سے رابرٹ کو مارا گیا ہے۔ تم پر شک ہوتے ہی میں نے ایڈرسن کو تمہاری رہائش گاہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کہہ دیا تھا اور جب ہمیں پتا چلا کہ تم غیر شادی شدہ ہو اور اپنے فلیٹ میں تنہا رہتے ہو تو ہمارا کام آسان ہو گیا اور ہم نے آسانی سے تمہارے فلیٹ کی خفیہ تلاشی لے ڈالی۔ ریوالور پر موجود انگلیوں کے نشانات اور فرانزک رپورٹ سے عدالت میں تمہیں رابرٹ کا قاتل ثابت کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔“

بات کرتے ہوئے مورس نے لمحہ بھر کے لیے وقفہ لیا۔ اس کے دلائل سن کر ڈکسن کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور جسم پر ہلکی سی کپکپاہٹ بھی طاری ہو گئی تھی۔ وہ مورس کی پہلی ہی یلغار میں ٹوٹ گیا تھا۔ ”اب میں لارڈ جوناتھن کے قتل کی جانب آتا ہوں۔“ ڈکسن کے چہرے پر شکست خوردگی کے تاثرات دیکھ کر مورس بولا۔ ”پروفیسر تھامسن نے مونٹیری نامی اس شیر کا پورا معائنہ کیا ہے۔ اس شیر کے دانتوں میں معمول کی خوراک کے علاوہ انسانی گوشت کے دو مختلف ڈی این اے کے ذرات پائے گئے۔ ایک تو لارڈ ہی کا ہو سکتا ہے جبکہ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ دوسرا ڈی این اے رابرٹ کے ڈی این اے سے میچ کر جائے گا۔ تم نے رابرٹ کو مارنے کے بعد اس کے جسم کے مختلف حصوں سے گوشت کاٹا تھا۔ عدالت کے لیے یہ بات معنی خیز ہوگی کہ شیر کے دانتوں سے انسانی گوشت کے جو باریک ذرات ملے ہیں، ان میں سے ایک کا ڈی این اے وہی ہے جو رابرٹ کا ہے۔ اس کے بعد عدالت کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ رابرٹ کے ساتھ ساتھ لارڈ جوناتھن کو بھی قتل کیا گیا ہے اور یہ کام تم نے ہی کیا ہے۔ پروفیسر تھامسن کی رپورٹ کے مطابق لارڈ کے پالتو شیر کو ہیجان میں مبتلا کرنے کے لیے ایک مخصوص کیمیکل دیا گیا تھا۔ اس شہر میں صرف ایک ڈرگز اسٹور ایسا ہے جو اس کیمیکل کو فروخت کرتا ہے۔ میں اس کے مالک سے مل چکا ہوں۔ شروع میں اس نے کسی کو بھی ایسے ممنوعہ کیمیکل کی فروخت سے یکسر انکار کر دیا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اگر اس نے اعتراف کیا تو وہ خود قانون کے شکنجے میں پھنس جائے گا مگر مجھے اس کی باتوں سے ہی شک ہو گیا تھا۔ میری سخت باز پرس پر اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے چند دن پہلے چار گنا زائد قیمت پر یہ ممنوعہ کیمیکل ایک شخص کو فروخت کیا تھا۔ میرے اس وعدے پر کہ میں اس پر ممنوعہ کیمیکل کی فروخت کے سلسلے میں کوئی مقدمہ درج نہیں کروں گا۔ اس نے مجھے اپنے اسٹور میں لگے کیمروں کی سی سی ٹی وی ریکارڈنگ بھی فراہم کر دی۔ اس ریکارڈنگ میں تمہیں مارک کر لیا گیا ہے۔ تم ہی نے چند دن پہلے وہ کیمیکل وہاں سے خریدا تھا۔ سی سی ٹی وی ریکارڈنگ میں تمہاری تصویر بڑی واضح ہے۔ کیا اب بھی تم یہ کہو گے کہ میرے پاس تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے؟“ مورس نے اپنے آخری الفاظ طنزیہ لہجے میں کہے۔

ڈکسن نے جواباً کچھ نہیں کہا بس خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ شاید اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔

”ڈکسن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر گھٹیا انسان ہو۔“ جورڈی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ بیٹھے مارٹی کے چہرے پر بھی غصے کے تاثرات موجود تھے۔ تاہم وہ اپنی عادت کے مطابق خاموش تھا۔

”گھٹیا ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شخص بہت مکار اور شاطر بھی ہے۔“ مورس ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ”مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ مکار سے مکار مجرم سے بھی دوران جرم ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ ڈکسن بھی ایک مکار شخص ہے مگر آخرکار قانون کے شکنجے میں آ ہی گیا ہے۔“

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

قسط نمبر: 49

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
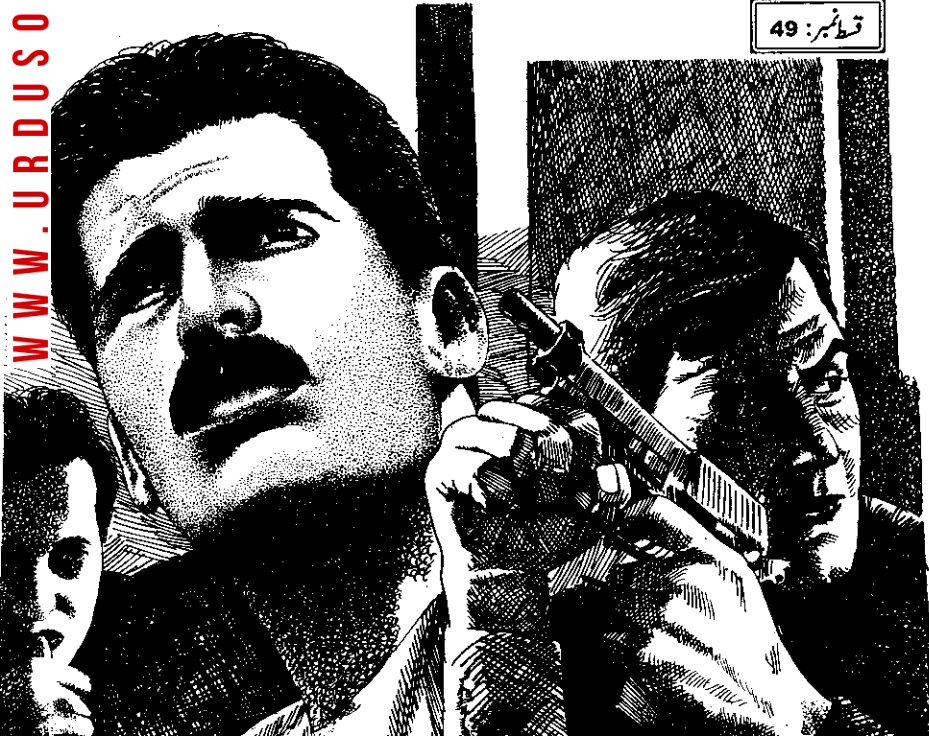
شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید ساہنی والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور گبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور گبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے گبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپا کو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ وزیر خان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپا کو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپا کو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپا کو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور بروجیٹ کو زخمی کر کے نیلا پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہاں کاسپا کو کے ہرکارے اپنی گرفت میں لینے کے لیے موجود تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ بری تصاب سے جی کوہارا تھا۔

اس خطرناک اور سفاک درندے کا یوں اچانک اور غیر متوقع انداز میں سامنے آنا، بلاشبہ میرے لیے ایک ''شاک'' سے کم نہ تھا۔ اس شاک میں اندیشوں کی تشویش تھی اور نفرت و انتقام کا غیظ و غضب بھی۔

یہ انسان نما درندہ جس سے میری بے آف بنگال کے گہرے پانیوں سے لے کر انڈیمان کے پُرخطر جنگلات اور سنگلاخ ویرانوں میں بڑی خوں ریز جنگ رہی تھی۔ کبھی یہ مجھ پر حاوی رہتا تو کبھی میں اس پر غلبہ حاصل کر لیتا تھا لیکن یہ حقیقت بلکہ ایک طرح کی شکست مجھے تسلیم تھی کہ میں لولوش کے اس خونی ہرکارے سے ابھی تک معصوم بشام چھلگری کا بدلہ نہیں لے سکا تھا۔

ہاں! وہی بشام چھلگری جو محب وطن تھا جس نے وطن عزیز کی ایک نہایت بیش قیمت امانت طلسم نور ہیرے کی خاطر اپنی جان قربان کر ڈالی تھی۔ اسے سے جی کوہارا...... نے بڑی بیدردی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا تھا۔ تب سے ہی میں نے اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سے بشام چھلگری کی موت کا بدلہ ضرور لوں گا۔

یہ سب پل کے پل میرے ذہن کی اسکرین پر جیسے کسی یادگار منظر کی طرح ''ری وائنڈ'' ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا ''اندر'' پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ میرا دشمن دیرینہ ایک بار پھر میرے سامنے تھا اور میں اس سے ایک پرانا حساب چکانے کے لیے بے چین تھا۔

''ہاہا...... ہاہا...... تم مجھے بھولے تو نہیں ہو گے شہزی......!''

سے جی کوہارا اچانک ایک بدمست قہقہہ خارج کرتے ہوئے بولا۔ اس کی بھاری آواز میں رعونت اور طاقت کا وہی نشہ تھا۔ وہ بڑی تیز اور چبھتی نظروں سے میری جانب دیکھنے کے بعد ایک اچٹتی سی نگاہ روڈلف پر ڈالتے ہوئے جب یاسمین خانم پر اس کی نظریں پڑیں تو جیسے وہیں جم کر رہ گئیں۔

تب ہی اس کی ازلی وحشت بھری آنکھوں میں گرسنہ چمک ابھر آئی تھی۔ اس کے بدہیئت موٹے ہونٹ معنی خیز انداز میں لحہ بھر کو سکڑے تھے۔

میرے اندر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں اس کی یہاں موجودگی کو سمجھ تو سکتا تھا لیکن ...... یوں اچانک اس کا اس طرح حسبِ سابق خوں ریز انداز میں دوبارہ نمودار ہونا، سمجھ سے باہر تو نہ تھا لیکن غیر متوقع ضرور تھا۔

یاسمین خانم کے حسین اور ملکوتی سراپا پر اس کی گہری اور ہوس زدہ نظریں گویا پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر اسے شاید میرا خیال آیا۔ وہ میری ہک دک سی کیفیات سے حظ اٹھانے کے انداز میں جملہ پورا کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری آنکھوں سے چھلکتا ہوا خوف اور رنگ بدلتا چہرہ بتا رہا ہے کہ مجھے یوں اچانک اور غیر متوقع انداز میں دیکھ کر تمہاری سکھ اور چین کی زندگی تمام ہوئی۔''

''کاش! تمہاری زبان مبارک ہوتی کہ مجھے سکھ اور چین نصیب ہوتا۔'' میں نے بھی رسن بستہ ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس لیے کہ مجھے آج تک ان دونوں چیزوں سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ ہاں! تمہیں دیکھ کر دل کو طمانیت اور سکون ضرور ملا ہے کہ انڈیمان میں تمہیں خاک چٹوانے کے بعد اب میں تمہیں یہاں منیلا کی چمکتی سڑکوں پر بھی رگیدوں گا۔ تم سے اب ایک آخری حساب بھی چکتا کر کے رہوں گا، بشام چھلگری کی دردناک موت اور اس کی فریاد ابھی تک میری سماعتوں کو چھلنی کیے ہوئے ہے۔ یہ تب ہی ختم ہوں گی جب میں تمہیں بھی اسی طرح موت کے گھاٹ اتاروں گا۔''

میری بات پر سے جی کوہارا کے چہرے پر غیظ کی سرخی ابھری۔ آنکھوں میں خوں خوار چمک کے ساتھ اس کے جبڑے اس قدر بھینچ گئے کہ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

وہ طیش میں آ کر ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ بھی کر سکتا تھا۔ وہ ایسا ہی درندہ تھا لیکن اپنی فطرت سے میں بھی مجبور تھا۔ ایسے خونخوار اور بدترین دشمن کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میں اپنے جوش کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔

''شاید تم وہ سب بھلا بیٹھے ہو جب میں نے تمہارے ننگے، چھلے ہوئے زخموں پر مچھلی جھینگوں والا مصالحہ ڈالا تھا اور تم میرے پیروں میں گرے پڑے تھے۔ اب کون کس کو یہاں خاک چٹواتا ہے، یہ وقت خود بتائے گا۔'' کوہارا نے دانت پیس کر کہا۔

صاف لگتا تھا کہ وہ میری جوابی لفاظی پر اندر سے بری طرح کھول رہا ہے۔ مگر کسی مجبوری کے سبب ضبط سے کام لینے پر مجبور تھا۔

''اور...... شاید تم بھی یہ بھول رہے ہو کوہارا کہ اس کے بعد میں نے تمہاری لگژری یاٹ (yacht) سمیت تمہارے ساتھیوں اور تمہارا کیا حشر کیا تھا۔'' میں نے بھی اسے یاد دلا دیا۔ ''لیکن ...... یاد رکھو اس بار تمہارا میرے ہاتھوں بُرا حشر ہونے والا ہے۔'' کوہارا حیرت انگیز طور پر

اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ میں نے اب بھی محسوس کیا تھا کہ وہ بار بار ہراساں ہرنی کے مانند کھڑی یاسمین خانم کی طرف گھور لیتا ہے۔

''یہ تمہاری ساتھی بہت حسین ہے، بالکل اس انڈین لڑکی سوشیلا...... کی طرح......'' اس نے بحث مباحثے اور لاف وگزاف سے ہٹ کر یاسمین کی طرف دوبارہ ہوسناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سوشیلا کے ذکر پر میرا دل اسے یاد کر کے تھوڑا رنجور ہوا تھا۔ وہ میری انڈیمان کی پُرخطر مہم کی اچھی ساتھی رہی تھی۔ اب نجانے وہ بے چاری، کہاں اور کس حال میں تھی؟ تاہم ایڈوانی اور بلراج سنگھ کے جہنم واصل ہونے کے بعد مجھے امید تھی کہ وہ جہاں ہوگی خوش اور مطمئن ہی ہوگی۔

''یہ میری ساتھی نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کے ساتھ اور یاسمین سے بالکل ہی اجنبیت برتتے ہوئے کہا۔

''اچھا......!'' میری بات پر سے جی کوہارا نے طنزاً اور سوالیہ انداز میں اپنی چنگیزی مارکا بھویں اچکائیں۔ ''تو پھر اگر میں اسے اپنے ساتھ رکھوں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا مالِ غنیمت ہے۔''

یہ کہنے کے بعد اس نے اپنے ہمراہ مستعد کھڑے اسلحہ پوش ہرکاروں کی طرف دیکھ کر تحکمانہ انداز میں کچھ کہا۔

وہ جیسے یکایک چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آ گئے۔ ہمیں دبوچا اور اس بھاری بھرکم جیپ کی طرف گھسیٹنے کے انداز میں لے چلے۔

روڈلف اور یاسمین خانم کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ تاہم مجھے اور سے جی کوہارا...... کو اس طرح جانے پہچانے انداز میں باتیں کرتے پا کر روڈلف کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے تھے۔ ساتھ ہی اس کی یاسمین خانم کے بارے میں آخری بات پر روڈلف اور یاسمین کے چہروں پر تاریکی سی اتر آئی تھی۔

روڈلف شاید پچھتا رہا تھا کہ اس نے اب تک یاسمین کے سلسلے میں مجھے اعتماد میں نہ لے کر بڑی غلطی کی تھی۔

بہرکیف ہم تینوں ہنوز رسن بستہ تھے۔ ہمیں جیپ کی درمیانی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ایک ہرکارہ ہماری عقبی سیٹ پر اسٹین گن سنبھالے بیٹھ گیا۔ کوہارا نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سنبھالی تھی۔ باقی ہرکارے نیچے ہی تھے۔ پھر میں نے انہیں کیپٹن رانسے اور اس کے ڈرائیور کی خون میں لت پت لاشوں کو سنبھالتے دیکھا۔ وہ انہیں اسی کی کار کی طرف اٹھائے چل دیے۔

میں کھڑکی سے بہ غور ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس بدبخت سے جی کوہارا نے طیش و غضب میں آ کر اپنے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی یہاں منیلا میں ایک بڑی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

ایک پولیس آفیسر کا یوں بہیمانہ قتل اور وہ...... جن کے ہم ساتھ تھے، پورے منیلا میں سب سے پہلے ہماری ڈھنڈیاں پڑ سکتی تھی۔

دوسرے ہی لمحے ایک امید افزا خیال بھی یہی کچھ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کیپٹن رانسے خود ہی اپنی بددیانتی کے باعث اس خفیہ ڈیل کے نتیجے میں ''اندھیروں'' میں مارا گیا تھا جس کے لیے مجھے بلیک میل کر کے زبردستی اس کے لیے تیار کیے ہوئے تھا۔

مجھے یاد تھا کہ کاسپاکو کے ہاتھوں اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے بعد پولیس آفیسر کیپٹن رانسے ہمیں چور راستے سے، آرنائن اسٹریٹ پر واقع اسی مکان پر پہنچانا چاہتا تھا جہاں بہ قول اس کے اگلے دن کی فلائٹ سے کاسپاکو بھی بینکاک سے منیلا پہنچنے والا تھا، یوں کیپٹن رانسے اس سے اپنی ''راتب خوری'' کا حق ادا کرتے ہوئے ہمیں اپنی سرکاری گاڑی کے بجائے کسی پرائیویٹ کار میں لے کر نکلا تھا۔

یوں کیپٹن رانسے سے اپنی یہ شرط منوا کر میں نے بلاشبہ دانش مندی کا ثبوت دیا تھا کہ پہلے مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر سے پوری طرح بری الذمہ کروایا جائے، کیونکہ سینئر آفیسر بوائڈ نے ہمیں رہا کرنے کا باضابطہ حکم دے دیا تھا۔

اس کے بعد ہی میں اس کی (کیپٹن رانسے کی) بات مان سکتا ہوں۔ اس طرح یہ خفیہ ڈیل خود کیپٹن رانسے کے لیے اندھیروں کی موت مارے جانے کے مترادف ثابت ہوئی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ کیپٹن رانسے نے یہ سب مجھے ڈرانے دھمکانے کے لیے کہا تھا تاکہ میں اس کی بات مان لوں۔ اس نے کوئی ردوبدل نہیں کی ہوگی نہ ہی وہ ایسا کر بھی سکتا تھا، کیونکہ سینئر آفیسر بوائڈ...... نے ہماری باضابطہ رہائی پر اپنی ''حادثاتی'' موت سے پہلے ہی عمل درآمد کروا دیا تھا۔

کیونکہ پاؤلا کوئینی کے سامنے میری شناختی پریڈ کرانے کے بعد بوائڈ میری طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ پاؤلا کوئینی اپنے ساتھی ایجنٹ سارجنٹ ایملائے کی اندوہناک ہلاکت کے بعد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی، تاہم ان کا خیال تھا کہ واقعے سے منسلک

مجرم افراد کو وہ پہچانتے ہی چیخ اٹھے گی، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، ورنہ کیپٹن رانسے اتنا بے وقوف نہ تھا کہ ''قیدیوں'' کو یوں پولیس ہیڈکوارٹر سے خفیہ طریقے سے پرائیویٹ گاڑی میں لے کر ایک مجرمانہ ڈیل کے لیے روانہ ہوتا۔ اسی لیے میں نے بھی اس پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ کیونکہ میں خود بھی سوچے ہوئے تھا کہ موقع ملتے ہی کیپٹن رانسے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

بہرحال مجھے تسلی تھی کہ اب جو کچھ ہونے جارہا تھا، وہ سب پسِ پردہ تھا۔ میری کوشش تھی کہ کوہارا جیسی موذی مصیبت سے چھٹکارا پاتے ہی فیلا سے بہ خیر و عافیت فوراً کوچ کر جاؤں۔

لاشوں کو کار کی پچھلی سیٹ پر پھینکنے کے بعد ایک ہرکارہ ہماری جیپ کی طرف بڑھا اور اپنے ساتھی کے ساتھ سوار ہو گیا جبکہ ان کا تیسرا ساتھی کار اسٹارٹ کر کے دور افتادہ بنجر ویرانے کی طرف نکل گیا۔ وہ شاید دونوں لاشوں کو کار سمیت ٹھکانے لگانے گیا تھا۔

جیپ اسٹارٹ تھی۔ ڈرائیور نے کوہارا کے اشارے پر اسے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

روڈلف بار بار گردن موڑ کے میرے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ شاید مجھ سے اس نئی مصیبت سے جی کوہارا کے بارے میں پوچھنے کے لیے بے چین تھا، کیونکہ اس نے اب تک میری اور کوہارا کی گفتگو سے اندازہ لگالیا تھا کہ میں اسے اور وہ یعنی کوہارا ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ اس کی وجہ بھی جاننے کے لیے بے قرار ہوگا کہ آخر یہ اچانک کیسے ٹپک پڑا تھا؟

اگرچہ مجھے بھی اسی بات کی حیرت تھی تاہم میں سمجھ سکتا تھا کہ لولوش کا خاص گماشتہ ہونے کے سبب سے جی کوہارا کو لولوش نے اپنے دو ''بڑوں'' اسٹاربک اور جوشوا کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد اسے میدان میں اتارا ہوگا۔ سے جی کوہارا یوں بھی مجھ سے ایک دیرینہ مخاصمت کے حوالے سے میرے لہو کی بُو سونگھتا پھر رہا تھا۔ جزائر انڈیمان کی جاں گسل مہم کے بعد وہ میرے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کے بعد برما کوچ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

بہرکیف میں ابھی روڈلف کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ جبکہ میں خود ابھی اس نئے انداز کی پرانی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی فکر میں تھا۔

ہمارا یہ سفر نامعلوم منزل کی جانب خاموشی سے جاری تھا۔ تب میں نے کوہارا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کوہارا...... ! کیا تم میری خاطر برما سے یہاں آئے ہو؟''

کوہارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شاید مجھ پر خاصا جھنجلایا ہوا تھا۔ میں نے چند سیکنڈوں تک اس کے جواب کا انتظار کیا پھر اس بار استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''کمال ہے، تمہارا شکار بندھا بندھایا تمہیں مل گیا اور تم پھر بھی خود کو میرے سامنے بے بس اور مجبور محسوس کررہے ہو۔''

میرے لفظوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، اس کے حلق سے غراہٹ سے مشابہ آواز برآمد ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے نے اس نے اپنا پستول نکالا اور سیدھے ہاتھ میں پکڑ کر نصف بدن کے پیچھے کی طرف موڑ کر پستول کی نال میری پیشانی پر رکھ دی۔

یاسمین خانم کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ سی برآمد ہوئی۔ خود میں بھی سے جی کوہارا کے اس آتش فشانی رویے پر ایک لمحے کے لیے گنگ سا ہو گیا۔ تاہم میری نظریں اس کے لال بھبھوکا چہرے پر جمی رہی تھیں۔ اس کے بدہیئت ہونٹوں کی باچھوں سے شدتِ غیظ تلے رال لکیروں کی صورت بہے نکلی تھی۔ وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

''کاش! ماسٹر لولوش نے مجھے تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دیا ہوتا تو میں تمہیں بہت پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیتا۔''

''اچھا!'' میں باز نہ آیا۔ ''کیوں اپنی بے بسی اور لاچاری کو چھپانے کی ناکام کوشش کررہے ہو کوہارا...... ! مت بھولو کہ کئی مواقع پر تم مجھے ہلاک کرہی چکے تھے، مگر عین وقت پر میں تم پر غلبہ پالیتا تھا۔ ورنہ تم نے مجھے جان سے مارنے کی بھی کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی تھی۔''

میری اس لفظی دھنا دھن پر کوہارا کی آنکھوں میں لحہ بھر کو روایتی سی خوں ناک خوارا ابھری تھی مگر دوسرے ہی لمحے ماند پڑ گئی۔ اس نے معاً اپنے حلق سے ایک قہقہہ اُگلا اور پستول کی نال میری پیشانی سے ہٹادی، پھر سیدھا ہو کے بیٹھ رہا۔ اس کا قہقہہ مارنے والا انداز بھی سفاکیت سے بھرپور تھا۔

''شہزی! تم میرے واحد دشمن ہو جس کے مقابلے میں مجھے چوہے بلی کے کھیل جیسا لطف آتا ہے اور طیش بھی۔ انڈیمان سے فرار ہونے کے بعد میں تمہارے پیچھے جانا چاہتا تھا۔ تاکہ موقع نکال تمہیں ہلاک کرکے اپنے سینے میں جلتی انتقام کی آگ ٹھنڈی کرسکوں، کیونکہ ماسٹر لولوش نے مجھے اس حد تک تمہارے سلسلے میں فری ہینڈ تو دے رکھا ہے

کہ جان پر آجائے تو میں تمہیں بلا دریغ موت کے گھاٹ اتار دوں، مگر افسوس! چیف ماسٹر نے مجھے واپس میانمار (برما) پہنچنے کا حکم دے دیا اور میں ماسٹر کے حکم پر جان دیتا ہوں۔"

"ہوم......" میں نے اسی طمانیت سے اس کی لاف و گزاف سننے کے بعد اپنے حلق سے آواز برآمد کی۔

"مزہ تو مجھے بھی یہی کھیل کھیلتے ہوئے تمہارے ساتھ آتا ہے کوہارا......! تو پھر تم مجھ سے "ڈیول" کیوں نہیں کر لیتے؟ میں ہلاک ہو گیا تو اپنے ماسٹر سے کہہ دینا تمہاری جان پر بن آئی تھی۔ اگرچہ تم ایک ایسا مقابلہ پہلے بھی میرے ساتھ کر چکے ہو جس میں، میں نے تمہیں خاک چٹا دی تھی۔"

میں بدستور اُسے طیش دلاتا رہا۔ اس کے حلق سے دوبارہ بھیڑیے جیسی غراہٹ برآمد ہوئی۔ مگر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

"بہت خوش فہمی ہے تمہیں شہزی! لیکن میں چیف ماسٹر سے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ اس کا حکم میرے لیے زندگی اور موت کا درجہ رکھتا ہے۔"

"چلو چھوڑو یہ باتیں، وقت بتا دے گا کون کتنے پانی میں ہے۔" میں نے اپنے مقصد کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "اتنا تو بتا دو نا یار......! یہ تم اچانک میانمار سے یہاں کیسے آن ٹپکے؟ کیا میری وجہ سے......؟"

"ہرگز نہیں......" اس نے فوراً کہا۔ اس کے لہجے سے رعونت مترشح تھی۔ "میں بہت پہلے سے ہی یہیں ہوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ تم بھی اِدھر ہی اپنی خرمستیاں جاری رکھے ہوئے ہو، مجھے بہت خوشی ہوئی تھی یہ سن کر اور یہ یقین بھی تھا کہ بالآخر چیف ماسٹر...... تمہیں ٹھکانے لگانے کا مشن بھی مجھے ہی سونپے گا کیونکہ تم کسی کے ہاتھ آنے والے کہاں تھے۔ اور یوں میری یہ خواہش پوری ہوگی۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ "کوہارا! میں تمہارے ہاتھ بھی کہاں آسکا ہوں اب تک......؟" لیکن میں نے اسے اس قسم کی "مطفلیات" میں مبتلا رہنے دیا۔ میرا سوال سب سے زیادہ اہم تھا۔ میرا شبہ درست نکلا تھا کہ وہ یہاں منیلا میں کسی اہم مشن پر تھا۔

اسپیکٹرم ایک آکٹوپس کا نام تھا۔ اس کے کارپرداز اس وقت بھی دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے مجرمانہ مقاصد کی تکمیل و حصول کے لیے خفیہ طور پر مصروف تھے۔ اسپیکٹرم کی آبیاری کرنے میں سے جی کوہارا بھی لولووش کا ایک اہم مہرہ تھا۔

"چلو، اچھی بات ہے۔" میں نے چالاکی سے کہا۔ "یہاں تمہارا مشن بھی یقیناً اہمیت کا ہی حامل ہوگا۔ تبھی تو تم جیسے آدمی کو یہاں بھیجا گیا۔" میں نے اسے اکسایا۔

"تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔" وہ اپنی تعریف پر غرور آمیز فخر سے بولا۔ مغرور لوگوں کی یہی فطرت ہوتی ہے، جب تک ان کے مزاج کے مطابق بات نہ کرو یہ ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتے۔ تعریف پر سینہ پھلا کر آسانی سے بے وقوف بن جاتے ہیں۔ آگے بولا۔

"میں یہاں چیف ماسٹر کے ایک اہم مشن پر آیا ہوا تھا۔ مجھے ایک بڈھے کی تلاش تھی۔"

"او...... بڈھے کی تلاش......؟" میں نے بھویں اچکائیں۔ "کیا اب تمہارے کام کرنے کا یہی معیار رہ گیا ہے کوہارا......؟" میں نے اسے مزید بولنے پر اکسایا۔ "یا پھر تمہارے ماسٹر چیف نے میرے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد تمہیں اس قسم کے گھٹیا کام کے لائق چھوڑ دیا ہے؟"

میری یہ بات اسے مشتعل کر سکتی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ وہ پھٹ پڑنے پر مجبور ہو گیا، غرا کے بولا۔

"اب اپنی زبان کو لگام دے دو شہزی! ایسا نہ ہو کہ میں ماسٹر چیف کے اگلے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی تمہیں گولی مار دوں۔"

"اوکے یہ بتاؤ اس بڈھے میں ضرور کوئی ایسی اہم بات تو ہوگی جس کے لیے تمہیں اس کی تلاش میں یہاں بھیجا گیا تھا؟"

"میں نے اسے تلاش کر لیا ہے اور وہ اب میری قید میں ہے۔" اس نے کہا۔

اسی وقت جانے کیا محسوس کرتے ہوئے میں نے غیر ارادی طور پر اپنے ساتھ خاموش سے بیٹھے روڈلف اور یاسمین خانم کی طرف دیکھا تھا۔

ان دونوں کے چہروں پر سناٹے بکھرے ہوئے تھے۔ کوہارا کی آخری بات پر ان دونوں نے کچھ عجیب سے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ میرا اندر کچھ کھٹکا تھا۔ اچانک ڈرائیور کی مرتعش سی آواز نے گویا دھماکا کر دیا۔

"باس! شاید کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں آرہی ہے۔"

ان پُراندیش گھڑیوں میں کسی بھی قسم کی کشاکشی کی پوری توقع تھی۔

''گاڑی کی رفتار آہستہ کردو۔'' اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر والی نشست پر موجود سے جی کوہارا کی آواز ابھری۔

''کوبانگ، ہیتو، کار پر نظر رکھو، خطرہ محسوس ہوتے ہی بے دریغ فائرنگ کردینا۔''

کوہارا کا دوسرا حکم ہماری عقب کی نشستوں پر براجمان اپنے دونوں ہرکاروں کے لیے تھا۔ اب جانے ان میں کون کوبانگ تھا اور کون ہیتو......

اسی وقت میری تھکی ہوئی سماعتوں سے خودکار گنز کی مخصوص آواز سنائی دی۔ روڈلف اور یاسمین خانم کے چہرے بخار کی سی کیفیات سے دوچار نظر آرہے تھے جبکہ میری رگوں میں لہو کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔

''ہوشیار! کار قریب آرہی ہے۔'' سے جی کوہارا کی سانپ جیسی پھنکار ابھری۔

دھڑکتے لمحات کی کچھ گھڑیاں اور آگے کو سرکیں تو ڈرائیور کی اس بار خبردار کرتی آواز ابھری۔

چند لمحے بعد ہی وہ کار تیزی سے ہماری جیپ کو کراس کرتی ہوئی نکل گئی اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''میرا خیال ہے کوئی پکنک گروپ تھا۔ رفتار بڑھالو۔'' کوہارا کی بڑبڑاہٹ ابھری۔

لیکن میرے اندر کے گھاگ ایجنٹ نے کسی جانے انجانے خطرے کی بُو بھانپ لی تھی۔

مجھے کوہارا کی عقل پر ماتم کرنا پڑا تھا۔ اس کے پاس واقعی دماغ نام کی کوئی شے نہ تھی۔ وہ صرف انسانی لہو کو بیدردی سے بہانا جانتا تھا اور اسی میں ہی اس کی خونی جبلت کو تسکین ملتی تھی۔ دوراندیشانہ سوچ اور حالات کی تجزیہ نگاری شاید اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ورنہ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ اس دور افتادہ ویرانے میں ایک کار جو بہ قول ڈرائیور کے جانے کب سے ان کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ لیکن ان کی جیپ کی رفتار کم ہوتے ہی وہ کیوں تیزی سے آگے نکل گئی تھی؟ ضرور کار والوں نے ان کے شبہے کو باطل کرنے کے لیے ایسا کیا۔

میں نے ایک بار پھر محسوس کیا تھا کہ روڈلف اور یاسمین بے حد بےچین نظر آرہے تھے۔ پہلے کی نسبت ان کی یہ بےچینی کچھ پُراسرار قسم کی محسوس ہوئی تھی مجھے۔

جیپ کی رفتار پھر بڑھا دی گئی تھی۔ میرے جی میں آئی تھی کہ میں اس موٹے دماغ کے آدمی کوہارا کو یہ مشورہ دوں کہ وہ ان مشکوک کار والوں سے محتاط رہے۔ وہ آگے کہیں گھات لگا کر ہم پر اچانک حملہ کرسکتے تھے مگر میں خاموش رہا۔ مزید ذرا دیر تک سفر جاری رہا اور خیریت گزری۔

یہ اندیشوں بھرا سفر بالآخر ایک ایسی ویران سی جگہ پر ختم ہوا تھا جو آبادی سے دور اور ساحلِ سمندر کے قریب محسوس ہوتا تھا۔ یوں بھی یہ جگہ کسی پُرفضا مقام کا منظر پیش کرتی تھی، لیکن دور قریب میں مجھے کوئی آبادی، مکان یا ہٹس وغیرہ نظر نہیں آرہے تھے۔ جو ایسے مقامات کا حصہ ہوتے ہیں۔ ماسوائے اس ایک چوبی عمارت کے جو ایک بڑے ہٹ کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ جیپ اس کے قریب ہی رکی تھی۔

وہاں دو مزید مسلح افراد کھڑے دکھائی دیے تھے۔ جیپ کو دیکھتے ہی وہ بڑی مستعدی کے ساتھ لپکے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے نہایت پھرتی سے سے جی کوہارا کی طرف کا دروازہ کھولا تھا اور نیچے اتر آیا۔

ہمیں بھی گن پوائنٹ پر نیچے اتار لیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم پہلے ہی بےبس تھے۔

یہاں پہنچ کر میں اپنی عقابی نظروں کو تیزی سے گردش دینے لگا۔ میں یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش میں تھا کہ یہاں سے جی کوہارا کے کتنے مزید ہرکارے فروکش تھے۔ سردست ہٹ کے قریب یہی دو مسلح افراد ہی مجھے نظر آئے تھے۔ باقی اندر کتنے تھے، یہ ابھی پتا نہ تھا۔

ہٹ زیادہ بڑا نہ تھا مگر دیدہ زیب تھا اور اس کی بناوٹ بھی خاصی دلکش نظر آتی تھی۔ اس کے اردگرد کا علاقہ تقریباً کافی دور تک میدانی تھا۔ قریب میں پام اور سرو کے درخت نظر آتے تھے۔

اچانک میرے کانوں سے ایک تیز سیٹی جیسی آواز ٹکرائی۔ یہ کسی ٹرین کے انجن کی وسل تھی۔ گویا یہاں قریب کوئی ریلوے ٹریک تھا۔

راستے میں آتے ہوئے مجھے ایک سڑک کے کنارے ایک بورڈ ''کیتھڈرل آف منیلا'' کے نام کا لگا ہوا نظر آیا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہاں سے قریب ترین یہی علاقہ پڑتا تھا۔ اپنے نام سے تو مجھے یہ کوئی پتھریلی عمارت یا کوئی چرچ ٹائپ کی چیز محسوس ہوئی تھی، ممکن تھا کہ یہ منیلا کی کوئی مشہور عمارت ہو۔

ہم تینوں کو اندر چلنے کا حکم ملا۔ ہم پر انہیں ہتھیار سیدھے کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ہمارے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ ہٹ خاصا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کشادہ تھا اور ضرورت و آسائش سے متعلق ہر شے نظر آرہی تھی۔

''ان دونوں کو ساتھ والے کمرے میں لے جاؤ۔'' کوہارا نے روڈلف اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ کہا۔''اور...... اس شہزادی کو ساتھ والے کمرے میں لے جاؤ۔ میں جب تک ماسٹر سے بات کرلوں......''

کوہارا نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔''اور...... ہاں! گوتم آجائے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔''

''ہرگز نہیں...... یہ میری ساتھی ہے، میرے ساتھ ہی جائے گی۔'' روڈلف نے فوراً غصے سے گھور کر کوہارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو کوہارا کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس نے سنسناتی ہوئی سی تیز اور خونخوار نظروں سے روڈلف کی طرف دیکھا تھا۔

''روڈلف! یہ انسان کی شکل میں ایک خونی درندہ ہے، ابھی چلو اور اس کے منہ مت لگو، بعد میں دیکھ لیں گے۔'' میں نے روڈلف کے کان میں سرگوشی کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ روڈلف، سے جی کوہارا جیسے ظالم آدمی کی بربریت کی بھینٹ چڑھ جائے۔ روڈلف میرا اچھا دوست تھا اور میرے کام کا بھی آدمی تھا۔ شکر تھا کہ اس نے میری بات مان لی تھی۔

کوہارا کے حکم پر کوبانگ اور ہیتو نامی ہرکارے فوراً ہی جیسے چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے۔ انہوں نے ہم دونوں کو اپنے آتشیں ہتھیاروں سے ٹھوکا دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ قدم بڑھا دیے۔

کوبانگ اور ہیتو ہمیں لیے ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔

یہ کمرا بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہلکے پھلکے فرنیچر سے آراستہ...... ہم اسی حالت میں ان پر براجمان ہو گئے۔ ہمیں یہاں لانے والے کوبانگ اور ہیتو نے آپس میں کھسر پُسر کی اور کوبانگ نے اپنے سر کو دھیرے سے اثباتی جنبش دی۔ اس کے بعد وہ دونوں کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

ہمارے یہاں پہنچتے ہی میں اپنی ساعتیں بہ غور رکھتے ہوئے کوہارا کو اپنے ان دونوں برمی ہرکاروں کو مخاطب کرتے کے دوران ہی میں ان کے بارے میں جان چکا تھا کہ کون کوبانگ تھا اور کون ہیتو۔ یہ دونوں ہی برمی لگتے تھے۔ کوبانگ خاصے ڈیل ڈول کا مالک تھا اور ہیتو بھی کچھ ایسی جسامت رکھتا تھا۔ دونوں کے جسم گٹھے ہوئے مگر قامت درمیانی تھی۔

''تت...... تم اس کو جانتے تھے؟''

کوبانگ اور ہیتو کے کمرے سے نکلتے ہی روڈلف نے یوں سوال داغا جیسے یہ پوچھنے کے لیے جانے کب سے بےچین بیٹھا تھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے بڑی زہرخند نظروں سے روڈلف کو گھورا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔''میرا اب تم دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سمجھے تم......؟ لہٰذا مجھ سے کوئی سوال مت پوچھو۔''

روڈلف کچھ خفیف سا نظر آنے لگا۔ قدرے شرمساری سے بولا۔''ہے بڈی! پلیز، ہم سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب بتانے کا تہیہ کر چکا تھا، لیکن پلیز، فارگاڈ سیک! یاسمین کی مدد کرنے کا کچھ سوچو پہلے......''

''بھاڑ میں جائے وہ......'' میں نے بھنّائے ہوئے لہجے میں کہا۔''مجھے اب اس خاتون کے بارے میں جاننے کی کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی ضرورت، سمجھے تم......؟''

''تو پھر تم نے کیوں مجھے منع کیا تھا۔'' وہ بھی چڑ گیا۔

''اچھا! کیا بگاڑ لیتے تم اس قسائی کا؟ بولو......؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔''تمہاری بات پر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ بس! گولی مارنے کی دیر تھی تمہیں، کیا تم نے دیکھا نہیں، اس نے کیپٹن رانسے اور اس کے ساتھی کا کیا حشر کیا تھا؟''

روڈلف اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اس کے چہرے سے شدید بےچینی، تشویش اور جھلاہٹ مترشح ہوتی تھی۔

میری نظریں ہنوز اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ کسی زبردست قسم کی اندرونی کشمکش کا شکار تھا...... پھر اس کے چند سیکنڈوں کے بعد ہی اس کا چہرہ پُرسکون ہوتا چلا گیا، جیسے وہ کوئی تہیہ کر چکا ہو۔

اس نے مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر بولا۔''سنو، بڈی! یاسمین خانم کو بھی اپنا ساتھی سمجھو تم لیکن خدارا! اس کی مدد کرو۔''

''کس برتے پر؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اور یاسمین، اس درندے نما انسان کوہارا کو نہیں پہچانتے تھے مگر اس کے بارے میں جان ضرور گئے

ہیں۔'' وہ کچھ عجیب سے لہجے میں بولا۔ میں اس کی بات پر اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ روڈلف اور یاسمین، سے جی کوہارا کو پہچانتے نہیں تھے مگر جان گئے تھے۔ کیا مطلب تھا اس کی بات کا؟

''میں کچھ سمجھا نہیں......؟'' بالآخر میں نے پوچھ لیا۔

''کوہارا نے تم سے جس بڈھے کی تلاش کا ذکر کیا تھا، وہ یاسمین خانم کا باپ ہے۔''

''اس بڈھے میں ایسی کیا بات ہے؟'' میں نے بھویں سکیڑ کے پوچھا۔

''نہیں۔'' روڈلف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہیں پہلے سارا قصہ سنانا پڑے گا۔ پھر ہی تم ساری بات سمجھو گے۔'' وہ خود کلامیہ انداز میں بولا۔

''مگر جھوٹ نہیں، صرف سچ سنوں گا میں۔'' میں نے اُسے گھورا۔ وہ میری طرف شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''بڈی! میں نے تم سے کب جھوٹ بولا ہے؟''

''یاسمین خانم کے سلسلے میں تم نے مجھ سے جو کچھ چھپایا، یہ کیا تھا؟''

''چھوڑو بڈی! یہ فضول کی شکایتیں۔'' وہ بھی بُرا منانے لگا۔ ''یاسمین خانم کا معاملہ تم سے متعلق تھا ہی کب جو میں تمہیں اس کے بارے میں کچھ بتاتا، ہاں! البتہ، اب بات کچھ اور ہے اسی لیے تو تم سے میں نے پوچھا تھا کہ تم اس بے رحم آدمی کوہارا کو جانتے ہو؟''

''یہ لولوش کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک ہے۔ میرا اس سے کئی بار خونی ٹاکرا ہو چکا ہے۔'' میں نے بھی بالآخر ناراضی کا ''باب'' ختم کرنے کی غرض سے جواب دیا۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' روڈلف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اب بتاؤ مجھے یہ سب کیا چکر ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر مگر قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا بتاؤں؟ کہاں سے ابتدا کروں اور......''

''زیادہ تجسّس پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، روڈلف!'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''یاسمین خانم یا اس بڈھے سے متعلق کوئی بھی کہانی سنانے سے پہلے اتنا خیال ضرور رکھنا کہ اس میں غیر متعلق باتوں یا کسی قسم کی فضولیات کا دخل نہ ہو۔''

''اب تم خاموش رہو بڈی!'' روڈلف بھی چڑ کر بولا۔

وہ خفا ہو گیا تھا۔ ناراض تو میں بھی اُس سے تھا۔ خفگی کے اظہار پر میں بھی اسی انداز میں خاموش رہا۔ چند ثانیے بیت گئے۔ ہم دونوں ایک عام سے صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے رہنے کے باعث مجھے کاندھوں میں درد سا محسوس ہونے لگا تھا اور کافی دیر سے اسی حالت میں رہتے ہوئے مجھ پر جھلاّہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔

روڈلف کے ایک گہرا اور کھل کر سانس لینے کی ہنکارا نما آواز ابھری اور پھر وہ کچھ کسمسا کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں کسی اور طرف یونہی تکے جا رہا تھا۔ روڈلف میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھوں سے رسن بستہ ہونے کے باوجود ذرا جھک کر آہستگی سے بولا۔

''ہے بڈی! اِدھر دیکھو...... میری طرف۔'' میں نے آہستہ آہستہ اپنے چہرے کا رخ اس کی طرف موڑا۔ اس کے چہرے پر بڑی گہری اور دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

''تم میرے محسن ہی نہیں، میرے ایک اچھے دوست بھی ہو۔ لیکن میری نظروں میں تمہاری سب سے بڑی خوبی تمہاری اچھائی ہے۔ تمہارا نیک عزم ہے۔ میں تم سے دلی طور پر بے حد متاثر ہوں دوست! انسانیت کی راہ تم نے ہی تو مجھے سکھائی ہے۔ میں اسپیکٹرم کا ایک فعال ایجنٹ تھا۔

''اسپیکٹرم کو ہائی جیک کرنے کے بعد لولوش نے تنظیم کو برائی کے راستے پر گامزن کر دیا۔ اس کے لیے اسے پروفیشنل قسم کے بدمعاشوں کی ضرورت تھی۔ مجھے بھی لولوش نے ہی میکسیکو سٹی کے ایک کلب کی انڈرگراؤنڈ بدنامِ زمانہ مجرم تنظیم سے کھینچا تھا۔ میں اس کا نائب سربراہ تھا۔

''لیکن کاسپاکو اور گوتم بدھ کے مجسمے والے معاملے میں جب لولوش نے مجھے اپنے مفاد پر قربان کرنے کا ارادہ کیا تو میرا دل اس سے خراب ہو گیا۔ حالانکہ میں نے اس بدذات شخص کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔

''اسی بدبخت کے کہنے پر اپنی تنظیم میں موجود خاص خاص قریبی ساتھیوں کو نکال کر اسپیکٹرم کا حصہ بنایا تھا۔ یہ کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے کہ اسپیکٹرم کو مجرمانہ خطوط میں ڈھالنے میں لولوش کے ساتھ میرا کردار بھی شامل رہا ہے۔

''لولووش کے اس دھوکے کے بعد کاسپاکو جیسے سفاک انسان کے چنگل میں پھنس کے میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا بڈی! اور اپنے بیوی بچوں کو یاد کر کے میں دل ہی دل میں خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔

''تاہم ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ تنظیم (اسپیکٹرم) کی خاطر مرنے کے بعد میرے بیوی بچوں کو بہت سارو پیہ ملتا، اتنا کہ جو میری زندگی میں بھی انہیں نصیب نہ ہوتا۔ یہ تسلی تو مجھے تھی لیکن جس پُرفریب انداز میں مجھے کاسپاکو کے آگے چارے کے طور پر ڈالا گیا تھا، اس نے میرا لولووش سے دل خراب کر کے رکھ دیا۔ مگر تم نے میرے اندر جینے کی اور مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر زندگی کی امنگ جگائی تھی۔ میرے دل میں... بیوی بچوں...... کے پیار اور ان کی یاد، انہیں دوبارہ دیکھنے کی چاہت جگائی تھی۔ تب پھر میں نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ تمہاری مدد میں سردھڑ کی بازی لگا دوں گا۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو رہا۔ شاید سانس لینے کو رکا تھا۔ میں چپ تھا مگر غور سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میرے لیے روڈلف بے حد اہم ساتھی اور مددگار کی حیثیت رکھتا تھا مگر یاسمین خانم والے معاملے میں اس نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ لیکن اب مجھے بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ شاید میں نے اس سے یوں زود رنجی کے اظہار میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔

لہٰذا اب میں خاموشی سے اس کی گفتگو سننے پر مجبور تھا۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''بڈی! میں اب بھی کہتا ہوں تم سے کہ میں یاسمین خانم کے سلسلے میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا مگر اس کا موقع ہی کب ملا؟ یہ ایسا موضوع نہ تھا کہ میں مختصراً لفظوں میں تمہیں بتا کر جان چھڑا لیتا۔ تم خود سوچو! بھلا ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ میں تمہیں یاسمین خانم کے بارے میں نہ بتاتا؟ لیکن میں پھر تم سے التجا یہ کہوں گا کہ یاسمین کی مدد کرو۔ ورنہ...... ورنہ...... لولووش کا سپر پاور بننے کا ایک اور جنونی خواب پورا ہو جائے گا اور تمہارا اور اس کا ٹکراؤ بھی سخت مشکل کا شکار ہو سکتا ہے۔

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ میں اس کی بات پر چونک کر بھویں اچکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''ہاں، بڈی! یہ لولووش ایک بلا ہے...... تمہاری اور میری سوچ سے بھی بہت بُرا اور انسانیت کے لیے ایک موذی مرض ہے یہ...... جس کی فطرت میں ہی شیطان اور شیطانیت رچی بسی ہو اس سے کسی قسم کی بھلائی کی توقع رکھنے کے بجائے فوراً اسے موت کے گھاٹ اتار دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

''کچھ اس لیے بھی میں نے تمہارا آخری حد تک ساتھ دینے کا دل میں پختہ ارادہ باندھ رکھا ہے مگر میرا اب بھی یہی مشورہ ہے کہ یاسمین خانم کے طویل موضوعِ گفتگو میں ابھی وقت برباد کرنے کے بجائے پہلے اس کی اور اپنی فکر کرو اور یاسمین کو بھی میری طرح کا ہی اپنا ساتھی سمجھو۔ میں بہت جلد تمہیں اس کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''درحقیقت میں نے تمہاری اور یاسمین خانم کی جیبوں سے وہ رقعے نکال کر پڑھ لیے تھے جس سے میرا دل مزید خراب ہوا تھا۔'' میں نے بالآخر ناراضی کی اصل وجہ اُسے بتا دی۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کرو گے۔'' روڈلف آہستہ سے بولا۔ ''تم بھی میری طرح ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہو۔ کھوجی فطرت کے اور تجسس پسند، اس حوالے سے میں بھی اپنے اندر تھوڑی بہت زود فہمی رکھتا ہوں، مجھے احساس تھا کہ تم ہماری آنکھ لگنے کے بعد وہ رقعے ہماری جیب سے نکال کر ضرور پڑھو گے۔ یہی لکھا تھا یاسمین نے اپنے رقعے میں مجھے کہ ''جلدی سے تم سے جان چھڑانے کی کوشش کروں۔'' اور میں نے اپنے رقعے میں جواباً یاسمین کو لکھا تھا کہ ''تمہیں ابھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے۔'' تو بڈی! اس میں شبہے والی کیا بات ہے؟ یاسمین خانم تمہیں نہیں جانتی۔ جبکہ میں ابھی یاسمین والے معاملے میں تمہیں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ تم اگر نہ بھی پوچھتے تو میں خود تمہیں یاسمین خانم کی اصل حقیقت بتا ڈالتا۔ کیونکہ اس کے بغیر تمہاری امریکا یاترا کی مہم ادھوری ہی رہے گی۔

''بڈی! سمجھو تو میں تمہاری تقدیر کے اس کرشمے پر حیران اور خوش بھی ہوں کہ کوئی ایسی قدرت ہے جو غیب سے تمہارے ہاتھ مضبوط کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہے۔''

''یہ سب میرے اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے ایسے نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائی ہے، یہ خاصیت بھی تو کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''بے شک۔'' روڈلف بھی مسکرا کر بولا۔ ''میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہوتے تو میں تم سے گلے ملتا۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''یہ کون سی مشکل بات ہے۔ لو آؤ دوست......!''
یہ کہتے میں اس پر جھک گیا اور وہ مجھ پر۔ ہماری گردنیں ملیں، شانے یکجا ہوئے اور پھر ایک دوسرے کے کاندھوں پر سر دھرے ہم ہنس پڑے۔ روڈلف سے میرا دل صاف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میرے بہی خواہوں اور دوستوں میں اول خیر اور زہرہ بانو وغیرہ سرِفہرست تھے۔ جنہوں نے میرے عظیم مقاصد میں میرے حوصلے اور ہاتھ مضبوط کیے رکھے۔ عارضی طور پر وہ دور ہوئے تو روڈلف جیسا دوست میسّر آ گیا۔

روڈلف کی ''کیٹگری'' مختلف تھی۔ وہ عملی طور پر میرے ہاتھ ہی مضبوط نہیں کر رہا تھا بلکہ لولوش کے سلسلے میں میری ہر طرح سے رہنمائی کے لیے بھی کوشاں تھا۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ لولوش کو میں ایک عام آدمی یا محض ایک عالمی گینگسٹر سمجھنے کی غلطی منہ کروں، وہ اس سے ''آگے'' کی شے تھا اور مجھے اسی کے مطابق اس سے ٹکرانے کے لیے پہلے ہی سے کیل کانٹوں سے لیس ہونا تھا۔

اس سے روڈلف کی مراد یہی تھی کہ میں اس کے بارے میں وہ سب کچھ بھی جان لوں جو میرے لیے ضروری تھا، ورنہ لاعلمی میں لولوش جیسے ''بھوت'' سے ٹکرانا مجھے ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔

اسی کو تو مددِ خدا کہتے ہیں کہ اللہ انسان کی ہمت، حوصلہ اور ثابت قدمی پر اس کی مدد سے پیچھے نہیں ہٹتا، شاید اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ہمتِ مرداں، مددِ خدا......

میری توجہ اب سے جی کوہارا کے اس چنگل سے نکلنے پر مرکوز ہونے لگی تھی، جو روڈلف بھی چاہتا تھا۔

''مجھے یاسمین کی فکر ہو رہی ہے، روڈلف!'' تھوڑی دیر بعد میں متفکر لہجے میں بولا...... میری زبان سے یاسمین سے متعلق اس تفکر پر روڈلف کے چہرے پر مسرت چمکی تھی۔ بولا۔

''تھینکس گاڈ! تمہارا دل صاف ہو گیا۔ مجھے خود فکر ہو رہی ہے اس بے چاری کی طرف سے۔ یہ تو شکر کرو کہ کوہارا کو اس حقیقت کا علم نہیں ہوا ابھی تک کہ یاسمین درحقیقت پروفیسر جمشید حمیدی کی ہی بیٹی ہے، ورنہ تو......'' اس نے گہرے متفکر انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں استفساریہ زیرِلب بڑبڑایا۔

''پروفیسر جمشید حمیدی......؟''

''ہاں! وہی عمر رسیدہ آدمی جسے کوہارا تلاش کر رہا ہے۔'' روڈلف نے بتایا، پھر وہ ایک دم کچھ سوچتا ہوا خاموش ہو گیا اور میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہ گئیں۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر پُرسوچ لکیروں کا جال سا بن گیا تھا۔ پہلے اس کا چہرہ بجھ سا گیا، اس کے بعد ستے کے رہ گیا۔

''یہ...... اچانک تمہیں کیا ہوا روڈلف؟ خیریت تو ہے ناں......؟ تم بولتے بولتے اچانک چپ کیوں ہو گئے؟''

''کوہارا، لولوش کا آدمی ہے۔ اس نے یقیناً کوہارا کو ہمارے پیچھے لگایا ہو گا۔ کوہارا نے کامیابی کے ساتھ اپنا یہاں تک مشن پورا کیا۔ ہم اس کے نرغے میں آ گئے۔ تمہارے ساتھ تو شاید جو کرے سو کرے، لیکن مجھے وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ ابھی لولوش سے ہی بات کرنے والا تھا، اسے بتانے والا تھا کہ اس کا شکار اس کے جبڑوں میں ہے۔ لولوش اُسے حکم دے گا۔ روڈلف کو فوراً گولی مار کے ہلاک کر دو۔''

اس نے جیسے پیش آئندہ اور متوقع مناظر کی سفاک اور عجیب، سوچتی ہوئی آواز میں ڈرامائی تصویر کشی کر ڈالی۔ لیکن اس کی بات کی توجیہہ بھی خارج از امکان نہیں تھی۔ کیونکہ روڈلف بہرحال کاسپا کو کا ہی نہیں لولوش کا بھی شکار تھا۔

اس لیے کہ لولوش کو اب تک کے حالات کا پوری طرح سے علم ہو چکا تھا کہ اس کا اپنا ایک اہم ساتھی ان سے بددل اور متنفر ہونے کے بعد میرے ساتھ مل کر کیا ''کارنامے'' انجام دے رہا تھا......

اسی سبب لولوش سب سے پہلے اپنے اسی باغی امریکی ایجنٹ (روڈلف) کا پتّا صاف کر سکتا تھا۔ روڈلف کا یہ ''تجزیہ'' موجودہ حالات کے مطابق غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں کچھ تبادلہ خیال کرتا اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی، غیر ارادی طور پر ہماری نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔

وہاں سے جی کوہارا اپنے گماشتوں کو بانگ اور ہیتو کے ساتھ کھڑا ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں سفاکیت کا عنصر غالب تھا۔ اسے دیکھ کر بے چارے روڈلف کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

شاید روڈلف کے بدترین خدشات درست ثابت ہونے والے تھے۔

کوبانگ اور ہیتو حسبِ سابق مسلح تھے۔ کوہارا نے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انہیں مخصوص اشارہ کیا تھا۔ وہ دونوں آگے بڑھے۔ کوہارا دروازے پر ہی کسی گینڈے کی طرح جما کھڑا رہا۔
قریب آکر کوبانگ نے مجھے دھکا دیا۔ میں صوفے پر گر پڑا۔ روڈلف کو دونوں نے دبوچ کر اٹھالیا۔
''نن...... نہیں...... نہیں......'' وہ دہشت زدہ سی لرزتی آواز میں جیسے کراہ کر بولا۔
''کوہارا......! اسے کہاں لے جارہے ہو؟'' میں نے ذرا سیدھا ہوکر پھیلی ہوئی آنکھوں سے دروازے پر کھڑے کوہارا کی طرف دیکھ کے کہا۔
''موت کے پاس۔ ماسٹر لولوش نے اس غدار باغی کو گولی ماردینے کا حکم دیا ہے۔'' کوہارا نے جیسے حظ اٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔
''نہیں...... نہیں...... مجھے مت مارو...... م...... میرے بب...... بیوی...... بب...... بچے ہیں۔'' روڈلف گھگیا کر بولا۔
روڈلف کی سے جی کوہارا کے آگے داد فریاد پر اچانک ہی میرے چشم تصور میں وہ منظر گھوم گیا جب اسی شیطان صفت اور درندہ نما سے جی کوہارا نے اپنی یوٹ (yacht) میں مجھے اور بشام چھلگری کو قیدی بنائے رکھا تھا اور اسی طرح بشام چھلگری کو کوہارا کا ایک وحشی ساتھی بھومک...... گولی مارنے کے لیے کھینچے لیے جارہا تھا اور بشام، روڈلف ہی کی طرح کوہارا سے اپنی جاں بخشی کی فریاد کررہا تھا مگر کوہارا کے حکم پر اس کے وحشی ساتھی بھومک نے...... بشام کو عرشے پر لے جاکر بڑی بیدردی سے گولی ماردی تھی اور اس کی لاش سمندر میں پھینک دی تھی۔
(اگرچہ بعد میں اس برمی وحشی بھومک کو میں نے بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا اور اس دن سے کوہارا کو جان سے مار ڈالنے کا تہیہ کرلیا تھا)
آج وہی ظلم و بربریت کی خونیں کہانی کوہارا میری آنکھوں کے سامنے پھر دہرانے لگا۔
''نہیں کوہارا......! اِسے چھوڑ دو......'' میں نے کوہارا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جمے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہاہا...... ہاہا......! ابھی تو تمہاری باری بھی آنی ہے۔ ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی ماسٹر تم سے بات کرے گا۔ پہلے اِسے ٹھکانے لگا دوں۔'' کوہارا ایک وحشیانہ قہقہہ اگلتے ہوئے سفاکی سے بولا۔
''مجھے پہلے ماسٹر سے بات کرلینے دو۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''ہوسکتا ہے ہم کسی بات پر معاملہ سیٹل ڈاؤن کرلیں۔''
''ہاں...... ہاں ضرور...... لیکن پہلے اسے زندگی کی قید سے آزاد کرنا ہوگا۔ اس کے بعد۔'' چنگیزی فطرت کے حامل کوہارا نے کہا اور پھر کوبانگ اور ہیتو، روڈلف کو کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔
میرا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ مجھے رہ رہ کر پھر وہ بشام چھلگری والا منظر یاد آنے لگا۔ روڈلف نے جاتے جاتے مجھ پر ایک حسرت زدہ سی نظر ڈالی تھی، ایک آخری نظر...... جیسے کہہ رہا ہو...... ''بے بڈی! بس، ہمارا اتنا ہی ساتھ تھا، مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردینا۔ اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ کوہارا کو زندہ چھوڑنے کی میں نے اپنی زندگی کی کتنی خطرناک غلطی کی تھی۔ کچھ بھی تھا، مجھے انڈیمان سے کوچ کرنے سے پہلے ایک مشن کے تحت کوہارا کو بھی ٹھکانے لگا دینا چاہیے تھا۔
روڈلف زندگی ہارنے والا تھا اور میں بے بس و لاچار اسے گویا مقتل گاہ میں جاتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔
''کوہار......! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' شدتِ غیظ و غضب تلے میری آواز پھٹ گئی۔ کوہارا میری بے بسی پر قہقہے مارنے لگا۔ وہ ہمیشہ میری ایسی حالت سے حظ اٹھایا کرتا تھا۔ جب میں یا تو اس سے التجا کررہا ہوتا تھا یا پھر بے بسی سے چلّا رہا ہوتا۔
کوہارا ہنوز کمرے میں ہی موجود تھا۔ کوبانگ اور ہیتو، روڈلف کو لے جاچکے تھے۔ اب کسی وقت بھی فائر کی آواز ابھرنے والی تھی اور پھر روڈلف کی زندگی کا چراغ گل ہوجانا تھا۔
وہی ہوا...... گولی چلنے کی آواز ابھری۔ میرے دل کی دھڑکنیں جیسے رک گئیں، غیظ و غضب تلے میرا اندر مثلِ آتش فشاں کھولنے لگا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑے کوہارا کی بوٹیاں نوچ ڈالوں۔ دفعتاً ایک اور فائر ہوا اور پھر اسی وقت ہلکی ساخت کی مشین گن گرجی۔ میرے ہی نہیں کوہارا کے چہرے کے تاثرات بھی متغیر ہوگئے۔
''یہ...... یہ کیا ہوا؟'' کوہارا یک دم بدحواسی میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔ میں خود حیران تھا۔ میرے اندر کی گھٹن ختم ہونے لگی۔ کوہارا اسی بدحواسی کے ساتھ پلٹا۔ اس نے پلٹتے سے پستول نکال لیا تھا۔ وہ اس عالم میں کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دروازہ کھلا تھا مگر احتیاط کا دامن مقصود تھا کیونکہ میرے ہاتھ بند ھے ہوئے تھے پھر بھی میں اسی طرح دروازے کی طرف بڑھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

فائرنگ اور دھماکے کی آوازیں بڑھتی جارہی تھیں۔

مجھے دروازے کے پار دھواں سا اٹھتا نظر آنے لگا۔ میرا دل یکلخت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے روڈلف کی فکر ہو رہی تھی، اس غریب کا نجانے کیا حشر ہوا تھا؟ آیا وہ زندہ بھی تھا یا پھر...... اس سے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا۔

ہٹ پر شاید کسی نے حملہ کر دیا تھا۔ اچانک میرے تیزی سے سوچتے ذہن میں خیال ابھرا۔ کہیں یہ وہی کار سوار تو نہیں تھے جن کے تعاقب کا ڈرائیور کو شبہ ہوا تھا اور بعد میں وہ کار ہماری جیپ کو کراس کر کے آگے نکل گئی تھی اور کافی دور جا کر بظاہر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی؟

اگر ایسا تھا بھی تو وہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟ مجھے یہ سوچنے کا تادیر موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ اسی وقت دوڑتے قدموں اور چیخنے چلّانے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

میرے ہاتھ اگر کھلے ہوتے تو میں بھی اس اندھی نار میں کود پڑتا، مگر اب ایسا کرنا خود اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف ہوتا۔ میں دروازے کی طرف سے فوراً اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ سرِدست تو میں دروازہ بھی بند کرنے سے قاصر تھا۔

میں کھلے دروازے کے پیچھے ایک دیوار سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ خدشہ مجھے یہی تھا کہ نجانے یہ کون تھے اور شاید میرے بھی دشمن ہوں......

اچانک دروازے کے قریب ہی کوئی دوڑتا ہوا آیا۔ اسی وقت ایک تیز نسوانی مگر جوش میں ڈوبی آواز ابھری اور ساتھ ہی کسی مرد کی کراہتی ہوئی آواز بھی۔ اگلے ہی لمحے میری ہک دک سی نظروں نے دروازے سے ایک شخص کو اندر کمرے کے فرش پر گرتے دیکھا۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑا، وہ کوہارا کا ساتھی ہیونو تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا، مجھ پر بھی بس ایک لمحے کو اس کی نگاہ پڑی تھی، دوسرے ہی لمحے گولی چلی اور ہیونو ٹھنڈا ہو گیا۔

اسی وقت میں نے یاسمین خانم اور روڈلف کو اندر آتے دیکھا۔ وہ اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں اِدھر ہوں۔" میں نے کہا۔ وہ دونوں ہی بیک وقت چونک کر میری طرف پلٹے۔ روڈلف کو زندہ سلامت دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ روڈلف کے اب دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ ان دونوں نے مل کر میرے ہاتھ بھی جکڑ بندوں سے آزاد کر دیے۔

ہاتھ آزاد ہوتے ہی میرا پورا وجود یوں جوش سے بھر گیا جیسے میں پارا بننے لگا ہوں۔

"یہ حملہ...... کن لوگوں نے کیا؟" میں اتنا ہی پوچھ سکا تھا کہ روڈلف بولا۔

"بڑی نکل چلو...... جلدی۔" وہ کہتے ہوئے دروازے سے نکلا۔ یاسمین میرے ساتھ تھی۔ روڈلف آگے، ہم دونوں پیچھے۔

ہم کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئے۔ یہاں تین چار لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ دو تو میرے لیے اجنبی تھے، ایک کو میں پہچان گیا، یہ کوبانگ کی لاش تھی۔ مجھے کوہارا کی تلاش تھی۔

"کوہارا کدھر گیا؟" میں نے ہانپتی آواز میں پوچھا۔

"وہ بزدل اپنے ایک آدمی کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔" روڈلف کے بجائے یاسمین نے جواب دیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور جیسے اسی وقت مجھے کچھ یاد آیا۔

"تم ٹھیک ہو ناں......؟ اس رذیل کوہارا نے تمہارے ساتھ......"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا، میں اس جنگلی سؤر کو فقط بہلائے ہوئے تھی۔" اس نے جواب دیا۔ تاہم میرے سوال کا مطلب سمجھ کر اس کے صبیح چہرے پر ہلکی سرخی ابھری تھی۔ جبکہ عنابی لبوں پر خفیف سی مسکان۔ اس کی کھنچی ہوئی کمانوں والی بولتی ہوئی سی آنکھوں میں ایک رنگ سا جھلکا۔

اسی وقت ایک شخص دوڑتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ ایک نوجوان شخص تھا، میری اور روڈلف ہی کی عمر کا ہوگا۔ میں اُسے دیکھ کر چونکا۔

وہ اپنے چہرے مہرے سے انڈین یا پاکستانی دکھائی دیتا تھا۔ خاصا خوبرو تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے پیشہ ورانہ چابک دستی اور پھرتی دکھائی دی تھی۔ اس کی سانسیں کچھ پھولی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ لاشوں پر ڈالی۔ چہرے پر تاسف ابھرا۔ شاید ان میں اس کا کوئی ساتھی بھی مردہ پڑا تھا۔ تاہم اس نے کانپتی سی آواز میں بتایا۔

"وہ بھاگ گیا ہے۔" اس کا لہجہ بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔

"کون......؟ سے جی کوہارا......؟" روڈلف نے پوچھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''ہاں......! اپنے ایک ساتھی کے ساتھ، اپنی جیپ میں......''

''دفع کرو اُسے...... واپس نکلو' چلو جلدی سے......'' یاسمین بولی۔

''نہیں......'' میں نے اچانک کہا۔ وہ تینوں میرا چہرہ تکنے لگے۔ ''کوہارا کو میں جانتا ہوں اچھی طرح سے...... وہ بھاگنے والا نہیں، گھات لگانے والا درندہ ہے۔''

''مگر...... میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے جیپ میں ساتھی سمیت سوار اور روانہ ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے فائر کرکے جیپ کے ٹائر برسٹ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔'' اس نوجوان نے بتایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم اس سے پوچھا۔

''تم کون ہو؟ اور یہ حملہ کن لوگوں نے کیا تھا؟''

''بڈی! یہ ہمارے ہی ساتھی تھے، اسی کار میں پیچھا کررہے تھے۔'' روڈلف نے مجھ سے کہا۔ ''انہیں شبہ ہوا تو یہ اپنی کار آگے نکال لے گئے تھے، یہی تھے وہ جن پر کوہارا کے ڈرائیور کو سب سے پہلے شبہ ہوا تھا۔''

''میرے دو ساتھی مارے گئے ہیں۔ ان کی لاشیں میں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔'' نوجوان بولا۔

''جو کرنا ہے، جلد نمٹا دو۔ پولیس یا اُن کے ساتھی آگئے تو ہم مصیبت کا شکار ہوجائیں گے۔''

ہم ابھی لاشوں کو سنبھالنے کا تہیہ کرہی رہے تھے کہ اچانک گولی چلی اور ساتھ ہی روڈلف کی چیخ ابھری، وہ گرا، ہم ٹھٹکے لیکن سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسرا فائر ہوا۔ اس بار مذکورہ نوجوان گرا، تب تک میرے روم روم میں لہو پارا بن کے دوڑنے لگا تھا، پل کے پل میں دو گولیاں چلنے کے بعد میں اس کے ''مخرج'' کا اندازہ کرچکا تھا۔

میرے الٹے ہاتھ کی لاؤنج والی کھڑکی سے سے جی کوہارا کا مکروہ اور وحشت بھرا چہرہ نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، مجھ سے پہلے یاسمین خانم نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ بھی شاید مجھ سے ایک دو پل پہلے ہی اس کا اندازہ کرچکی تھی اور کوہارا کو تیسرے فائر کرنے کا موقع دیے بغیر ہی اس نے کھڑکی کی طرف فائر جھونک مارا۔

میں حرکت کرتے کرتے جامد ہوگیا۔ میری دھڑکتی نظروں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر گولی لگتے دیکھی اور دوسرے ہی لمحے کوہارا کا چہرہ غائب ہوگیا، مگر دوسرے لمحے کھلے دروازے کی طرف سے فائر ہوا۔ میں وہاں کسی کی جھلک کو بھانپ چکا تھا اور ایڑی کے بل پر گھوم گیا۔ گولی مجھ پر ہی چلائی گئی تھی جس سے میں بال بال بچا تھا مگر میں نے اپنے پھرکی کی طرح گھومتے وجود کو تھمنے نہیں دیا اور گولی خطا جاتے ہی میں نے گھومنے کے زور پر ہی ایک جست لگائی تھی۔

فائر کرنے والا ابھی دوسری گولی داغنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ میں اس کے سر پر جا پہنچا۔ دیکھا جاتا تو یہ میرا انتہائی خطرناک اور ''رسکی'' عمل تھا۔ دوسرا متوقع فائر میری پیشانی یا سینے پر سوراخ کرسکتا تھا۔ یہ بس میرے اندر کی جنون خیزی تھی جس نے مجھے بپھرا کر رکھ دیا تھا۔

یہ کوہارا نہیں تھا، اس کا وہ ساتھی تھا جس کے ساتھ وہ، بہ قول یاسمین خانم کے فرار ہوگیا تھا۔ شاید یہ اس کا وہی ساتھی تھا جو جیپ کا ڈرائیور تھا۔ کیونکہ اتنی جلدی کھڑکی سے ہٹ کر کوہارا دروازے پر پہنچ کر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔

میرا ایک ہی پنچ اس کی ناک پر پڑا تھا اور وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی کراہتی آواز کے ساتھ پیچھے کو الٹ کر ڈھے چکا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ اس کا پورا چہرہ ہی خون کی سرخی سے بھر گیا تھا۔ اسے بے حس و حرکت پاکر میں وحشت کے انداز میں اس طرف کو گھوما جدھر کھڑکی باہر کو کھلتی تھی، وہاں مجھے کوہارا دکھائی نہ دیا۔

درندہ چھینے کے بعد مزید خطرناک ہوجاتا ہے۔ مجھے روڈلف کی بھی فکر و تشویش تھی۔ نجانے وہ گولی لگنے کے بعد زندہ بھی بچا تھا یا نہیں...... میں نے آہستہ آہستہ سر دروازے سے باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ البتہ مجھے تیس چالیس گز کی دوری پر کوہارا کی جیپ کھڑی نظر آگئی۔ یہ رزیل یقیناً اپنے فرار کا ڈراما رچانے کے بعد دوبارہ اچانک آن دھمکا تھا۔

اسی وقت ہلکی ساخت کی مشین گن کے برسٹ چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں تڑپ کر پلٹا اور دنگ رہ گیا۔

☆☆☆

یاسمین خانم نہتی کھڑی تھی اور کوہارا...... خون خوار چہرہ لیے اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سب مشین گن تھی جس کی نال کا رخ یاسمین کی طرف ہی تھا۔ جبکہ یاسمین کا اپنا پستول تھوڑے فاصلے پر پڑا نظر آرہا تھا۔

نجانے یہ شیطانی درندہ کدھر سے اچانک آن وارد ہوا تھا۔ یہ اسی کا ہٹ تھا اور اس سے زیادہ کون اس کے محل و قوع سے واقف ہوسکتا تھا، تاہم میں نے پل کے پل اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ کسی کمرے کی کھڑکی سے کود کر آنکلا تھا اور اس نے یاسمین پر گولی چلادی تھی جو شاید سیدھی

اس کے پستول پر لگی تھی، ورنہ یاسمین خانم کا ہاتھ ضرور زخمی ہوتا۔

یہ شکر تھا کہ اس خونخوار بھیڑیے نے یاسمین کو گولی نہیں ماری تھی۔ یقیناً اس کی کوئی وجہ تھی، ورنہ کوہارا جیسے وحشی درندے سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے شکار کو زندہ چھوڑ دے۔

''کوہارا......!'' میں وہیں سے ہی دہاڑا۔ ''گولی مت چلانا، میں خود کو تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم دونوں میرے شکار ہو...... ہاتھ اوپر اٹھالو۔'' کوہارا بھیڑیے جیسی آواز میں غرا کر بولا۔ میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھالیے۔

''سنا نہیں تم نے......؟'' کوہارا نے دہاڑ کر یاسمین سے کہا۔ جس نے ابھی تک اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔

''یاسمین! جیسا یہ کہہ رہا ہے فوراً ویسا ہی کرو......'' میں نے جنونی انداز میں چلّا کر یاسمین سے کہا۔ کیونکہ کوہارا کی جنونی سفاکیت کو سب سے زیادہ میں جانتا تھا۔ وہ دوسری بار حکم دینے کے بجائے یاسمین کو برسٹ مار کر چھلنی کر سکتا تھا۔ اب بھی اس سے کوئی بعید نہ تھا۔ کئی ایسے خطرناک مواقع پر وہ مجھ پر بھی سیدھے برسٹ چلا چکا تھا۔

یاسمین نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر کر لیے تھے۔ میں اپنے ہاتھ بدستور سر سے بلند کیے ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ کوہارا نے گرج کر مجھے وہیں جامد ہونے کا کہا۔ میں رک گیا۔

''تم بھی جا کر اس کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ شہزادی! جلدی...... مگر خبردار...... پشت میری جانب مت کرنا۔'' کوہارا نے یاسمین سے تحکمانہ درشتی سے کہا اور یاسمین نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہاتھ اسی طرح بلند کیے آہستہ آہستہ انداز...... سے میری طرف بڑھنے لگی۔ اس طرف دروازہ ہونے کی وجہ سے ہی شاید کوہارا ہم دونوں کو وہاں یکجا کرنا چاہتا تھا تاکہ اسی طرح گن پوائنٹ پر ہمیں لیے اپنی جیپ تک پہنچ سکے۔

اسی وقت کسی کے کراہنے کی آواز ابھری۔ ہم چونکے۔ ہمارے زخمی ساتھیوں میں سے شاید کوئی ہوش میں آرہا تھا۔ کوہارا...... جو یاسمین کے قدم بڑھاتے ہی خود بھی ایک قدم آگے بڑھا چکا تھا، یک دم کسی ٹھٹکے ہوئے شکاری درندے کی طرح رک گیا۔

ہم نے دیکھا، کراہنے کی یہ آواز روڈلف کی تھی۔ وہ فرش پر پہلو کے بل پڑے پڑے پلٹنے کی کوشش میں تھا کہ کوہارا نے اپنے ہاتھ میں تھمی ہوئی گن کی نال کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ روڈلف کے زندہ ہونے کی لمحہ بھر کی مسرت سینے میں ہی دبی رہ گئی۔ روڈلف بے خبر تھا کہ اس کی یہ معمولی سی جنبش اس کے لیے موت کا پیامبر ثابت ہو رہی تھی۔

''نہیں......'' اچانک یاسمین ہسٹریائی انداز میں چلّائی۔ وہ اپنے بھیانک انجام کی پروا کیے بغیر کوہارا کی طرف لپکی۔ کوہارا کی گن کا رخ روڈلف کی جانب سے گھوم گیا۔ اب وہ اپنی جانب ہسٹریائی انداز میں درانہ وار دوڑتی ہوئی یاسمین کی طرف ہونے لگا۔

میرے لیے یہ نازک اور سنگین گھڑیاں جیسے تھم کر رہ گئیں۔ میں حرکت میں آیا اور یاسمین کے پیچھے لپکا۔ پل کے پل صورت حالات خطرناک سے سنگین تر ہوگئی تھی۔

کوہارا کی آنکھوں سے ہی نہیں مکروہ چہرے سے بھی درندگی کی تیز سرخی ابھری۔ میں نے یاسمین کے قریب پہنچتے ہی عقب سے اس کے کالر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش چاہی، تاکہ اسے جلاد صفت کوہارا کی مہیب قربت میں جانے سے روک سکوں مگر کامیاب نہ ہوسکا۔

اسی وقت گولی چلی۔ دھماکا ہوا۔ یاسمین چیخی اور لڑکھڑائی۔ میرا دھڑکتا ہوا دل جیسے رک گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے گویا ایک معجزاتی رنگ دیکھا۔ کوہارا کا وہ ہاتھ خالی ہو کے زخمی ہو چکا تھا۔ گن چھوٹ چکی تھی۔ یاسمین کا پاؤں جوش تلے یا پھر گولی کی آواز سن کر ویسے ہی لڑکھڑا گیا تھا۔ میری طرح شاید وہ بھی یہی سمجھی تھی کہ گولی اسے لگی ہے۔

یہ گولی داغنے والا وہی زخمی نوجوان تھا جسے روڈلف کے بعد کوہارا کے مذکورہ ساتھی نے نشانہ بنایا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی ابھی زندہ تھا۔ اسی نے ہی فرش پر لیٹے لیٹے کوہارا کی طرف گولی داغی تھی جو اس کے گن والے ہاتھ پر لگی تھی۔

گن...... کوہارا کے ہاتھ سے نکلتے ہی میری نسوں میں جیسے آتش فشاں پھوٹ پڑنے والا لاوا ابھر گیا۔ میں پھر نہیں رکا اور یاسمین کو سنبھالنے کا ارادہ ترک کرتے ہی کوہارا کو ''چھاپنے'' کے ارادے سے اس کی طرف بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکا۔ میں کوہارا کو دبوچنے کا یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس نے جو مجھے یوں جنوں خیزی کی حالت میں اپنی جانب لپکتے دیکھا تو...... میدان اس نے بھی نہیں چھوڑا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ادھر زخمی نوجوان میں شاید دوبارہ فائر کرنے کی سکت نہ رہی تھی، وہ ایک ہی گولی چلانے کے بعد دوبارہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بے حس وحرکت ہو گیا تھا۔

کوہارا اسی پر لپکا تھا اور ایک آخری کوشش چاہتے ہوئے اس نے اپنی سی تیزی کے ساتھ اس پر جھک کر پستول جھپٹنا چاہا تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ تب ہی میری داہنی لات حرکت میں آئی۔ وہ اس کے پہلو میں لگی۔ اس کے گینڈے جیسے پلے ہوئے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ ڈولا، سنبھلنے کی کوشش کرتے ہی اس نے جنگلی بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے اسی طرح جھکے جھکے انداز میں میری جانب گھوم کر اپنے سر کی ٹکر میرے پیٹ میں رسید کر ڈالی۔

بھاری مگر مضبوط جسامت کے باوجود اس نے کمالِ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میرے حلق سے مارے درد کے کراہ خارج ہوگئی۔ میں چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔ گرتے گرتے بچا اور دوبارہ اس پر جھپٹا۔

اس کی انتہائی کوشش فرش پر گرے پستول پر قبضہ جمانے کی تھی۔ یہی کوشش اس نے دوبارہ چاہی۔ اس کا ہاتھ پستول پر پڑ چکا تھا۔ میں ابھی دور تھا۔ پستول کو جھپٹتے ہی وہ دوبارہ سیدھا ہوا، میں ابھی اس کی پہنچ سے دور تھا۔ وہ پستول کی نال کا رخ میری جانب کرنے لگا تھا کہ یاسمین خانم چیختے ہوئے اس پر چھلانگ لگا چکی تھی۔

اس کی یہ دیوانہ وار حرکت خود اس کے لیے بھی خطرناک اور جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ یاسمین خانم اس پر خونخوار بلی کی طرح جھپٹی تھی۔ میری نظریں کوہارا کے ہاتھ میں پکڑے پستول کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ جس کی نال وہ یاسمین خانم کے پیٹ کی جانب موڑنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے بھی اس پر جست بھری۔

یاسمین نے اپنا ''کام'' یوں نمٹایا کہ اپنے بائیں ہاتھ کو اس کے پستول والے ہاتھ پر رکھ کے اس کا رخ موڑا اور داہنے ہاتھ کی انگلی کا ایک تیز نکیلا ناخن کوہارا کی ایک آنکھ میں گھسیڑ دیا۔ کوہارا کے حلق سے کسی جنگلی بھینسے کی سی ڈکراہٹ ابھری اور اس نے ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ ہی گولی چلا دی۔

فائر خالی گیا تھا۔ یاسمین نے اسی ہاتھ کی ٹھوکر پستول پر رسید کردی، باعثِ اذیت کوہارا پستول پر اپنی گرفت نہ رکھ سکا تھا، وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو اس نے یاسمین کو غضب ناک انداز میں جھنجوڑ ڈالنا چاہا تھا کہ میں نے قریب پہنچتے ہی اس کے پہلو میں اپنی داہنی ٹانگ کے گھٹنے کی زوردار ضرب لگا دی اور ساتھ ہی بائیں ہاتھ کا مکا اس کی کنپٹی پر بھی ''وجا'' دیا۔ وہ لمحہ بھر کو بے حال سا ہوا، تب تک یاسمین نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو اس سے الگ کرلیا۔

کوہارا کی ایک آنکھ یاسمین خانم کے تیز نکیلے ناخن نے اندر ہی پھوڑ ڈالی تھی۔ وہاں سے اب بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہونے لگی۔

مجھ پر جنون سوار تھا، میں اس پر پل پڑا، لاتیں گھونسے اور ٹھوکروں سے اس کی درگت بنا ڈالنا چاہی تھی کہ اس نے... فرار ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ دروازے کی طرف بھاگا۔

''یاسمین! روڈلف کو سنبھالو.....'' میں اس سے یہ کہتا ہوا دیوانہ وار کوہارا کے تعاقب میں لپکا۔ وہ ڈولتا، ڈگمگاتا ہوا دروازے سے باہر جا چکا تھا۔

یاسمین نے شاید پیچھے سے مجھے پکارا تھا مگر میں نہیں رکا، کوہارا میرے سامنے بھاگا جارہا تھا، اس کا رخ اپنی جیپ کی طرف تھا، میرے سر پر جنون سوار تھا کہ کوہارا کو جلد سے جلد جالوں...... دوڑنے کی رفتار میری بھی کم نہ تھی، وہ جیسے ہی اپنی جیپ کے قریب پہنچا، میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی لانگ جمپ لگائی اور میری ایک ٹانگ اس کی پشت پر پڑی، وہ بڑے زور سے جیپ کی فولادی باڈی سے سینے اور پیٹ کے بل ٹکرایا۔ اس قدر کہ اس کے حلق سے بلبلاتی ہوئی چیخ خارج ہوگئی۔

میں نے سخت غیظ آلود انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر ایک ہاتھ سے اس کے بالوں کو پکڑ کر اس کا سر باڈی پر دے مارا، ایک بار، دوسری بار، اس کی پیشانی کسی گینڈے کی طرح مضبوط تھی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں غراتے ہوئے اپنی دائیں کہنی کی ضرب تاک کر میرے پیٹ پر رسید کر دی۔

یہ وار اس کا میرے لیے زوردار ثابت ہوسکتا تھا، بلکہ کوئی عام آدمی ہوتا تو یہ روح کش ضرب کھاتے ہی بے حال ہو کے گر پڑتا۔ لیکن یہ میری تربیت کا حصہ تھا کہ دوبدو لڑائی کے دوران میں اپنے پیٹ کے عضلات اور پٹھوں کو اکڑا کر سخت کرلیتا تھا، مدِمقابل کو قریب سے دوبدو لڑائی کے دوران کاری وار کرنے کا موقع سب سے پہلے پیٹ پر ہی ضرب لگانے کا ملتا ہے اور مدِمقابل کوہارا جیسا ہو تو اس وار کا پیشگی سدِباب کرنے کی اہمیت وضرورت اور بڑھ جاتی ہے، یہی میں کیے ہوئے تھا، کچھ یہی سبب تھا کہ میں اس کا یہ وار

سہم گیا تھا۔ بس! ایک لمحے کو میں سست پڑا تھا اس کے بعد میرا رائٹ ہک حرکت میں آیا، اس کی ٹھوڑی پر اس زور سے لگا کہ اس کا چہرہ ہی گھوم گیا، تب ہی میں نے اپنے دونوں بازوؤں کا شکنجہ، پیچھے سے اس کی گردن کے گرد کس دیا، اب بس ایک جھٹکا دینے کی دیر تھی۔

یہ بہت خطرناک اور یقینی موت سے ہمکنار کر دینے والا داؤ تھا، جس کا فوری طور پر احساس کرتے ہی کوہارا گینڈے جیسی جسامت رکھنے کے باوجود کسی ماہی بے آب کے مانند تڑپا اور اپنے دونوں پیروں پر دباؤ ڈال کر اس نے جیپ کی باڈی سے ٹکا دیے اور اسی زور پر اپنے مغلوب وجود کو جھٹکا دیا۔ یہ داؤ اس کا چل گیا۔ نتیجے میں ہم دونوں ہی بھربھری مٹی والی زمین پر آرہے۔

آنکھ پھوٹنے کی اذیت کے باوجود کوہارا کے اندر جیسے کوئی شیطانی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ نڈھال ہونے کے بجائے غضب ناک بھینسے جیسا ہو رہا تھا اور میرے ہر وار کا مقابلہ کیے جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زمین پر ہم دونوں کے گرتے ہی وہ بجلی کی طرح تڑپا اور میرے شکنجے کی گرفت سے خود کو نہ صرف نکال لے گیا بلکہ اس نے میرے چہرے پر بھی اپنا ہتھوڑے جیسا مکا رسید کر دیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔

اسی وقت گولی چلی۔ میں ٹھٹکا۔ ہٹ کی طرف سے یاسمین پستول ہاتھ میں پکڑے دیوانہ وار دوڑی چلی آرہی تھی۔ گولی شاید اسی نے ہی چلائی تھی، کوہارا تب تک جیپ کا دروازہ کھول کے اس میں سوار ہو چکا تھا، اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر سنبھلتا۔ وہ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا چکا تھا۔

یاسمین میرے قریب پہنچ چکی تھی اور اس نے دیوانہ وار جیپ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ پورا پستول خالی کر دیا۔ جیپ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

”تت...... تم ٹھیک تو ہو ناں...... شہزی؟“ اس نے پوچھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔

”رر...... روڈلف...... وہ زندہ ہے؟“ میں نے بھی اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”وہ زندہ ہے مگر زخمی ہے۔ باقی مر چکے۔ ہمیں نکلنا چاہیے۔ پولیس یہاں آسکتی ہے۔“ وہ بولی۔

”وہ نوجوان......؟“

”وہ بے چارہ آخری سانسوں پر تھا۔ ختم ہو گیا۔“

یاسمین خانم کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

ہم ہٹ میں آ گئے۔ یہاں عجیب سی ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی کہ جی الٹنے کو ہو رہا تھا۔ یاسمین کے ساتھیوں کی کار موجود تھی۔ روڈلف نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے چہرے پر نیلاہٹ پھیلنے لگی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ بائیں پہلو میں گولی کا گہرا زخم نظر آتا تھا۔

یاسمین نے مختصر سے وقت میں جیسے تیسے اس کی پٹی تو کر دی تھی، مگر خون کا جریان بند ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”اس کی حالت تشویش ناک لگتی ہے۔“ میں نے متفکر لہجے میں یاسمین سے کہا۔

”ہاں! اسے گولی لگی ہے۔ وہ اندر ہی ہے۔ زخم بھی گہرا ہے۔ یہ اس کی قوتِ ارادی ہے جو لمحہ بھر کو یہ ہوش میں آیا تھا۔“ یاسمین نے کہا۔ ”لیکن فکر نہ کرو...... نکلنے کی کرو یہاں سے...... پولیس آگئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

ہم نے روڈلف کو سہارا دیا اور باہر کار تک لے آئے۔ پچھلی سیٹ پر اسے ڈال کر یاسمین خانم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

سہ پہر کے بعد شام جھک آئی تھی۔ میرا ارادہ کوہارا کے تعاقب میں نکلنے کا تھا مگر روڈلف کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔

یاسمین کار ڈرائیو کر رہی تھی اور میں اس کے متعلق خاموشی سے سوچے جا رہا تھا۔ خاصی بہادر خاتون تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ مجھے بائیس تیئیس سے زیادہ کا نہیں ہوا تھا۔ اس کے شہد رنگ بکھرے بکھرے سے بال اس کے حسنِ قیامت خیز کو مزید دوآتشہ بنائے ہوئے تھے۔ اس نے خاصی بہادری اور جی داری کا مظاہرہ کیا تھا۔

روڈلف سے اس کے بارے میں سیر حاصل ”مذاکرات“ کرنے کے بعد میرا دل یاسمین سے مطمئن ہو گیا تھا اور وہ منظر تو میں بھلائے نہیں بھلا پا رہا تھا جب میں کوہارا کے ساتھ دست بستہ تھا اور وہ دیوانہ وار اپنی جان کی پروا کیے بغیر کوہارا جیسے گوریلا سے جا بھڑی تھی۔

ایسا اس نے میری خاطر نہ سہی، روڈلف کی جان بچانے کی غرض سے کیا تھا۔ وہ بھی میرا دوست تھا لیکن روڈلف کے لیے یاسمین کا اس قدر جنونی ہو جانا پتا دیتا تھا کہ روڈلف اس کے لیے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا جتنا کہ

میرے لیے...... تب مجھے بھی فوری طور پر حرکت میں آنا پڑا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوصف مجھے ابھی تک یاسمین کی حقیقت کا علم نہ ہوسکا تھا۔ اگرچہ روڈلف اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہ چھپانے کا وعدہ کرچکا تھا لیکن پھر بھی میرے اندر کی تجسس آمیز بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ چکر کوئی گہرا ہی لگتا تھا۔ کوہارا کے منیلا میں خفیہ مشن کا تعلق یاسمین اور روڈلف کے خفیہ گٹھ جوڑ سے لگتا تھا۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''محفوظ ٹھکانے پر......'' یاسمین نے مختصر جواب دیا۔ اس کی نگاہیں بدستور ونڈ اسکرین کے پار جمی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اپنے کسی ٹھکانے پر محو سفر تھی۔ میرے اعصاب شل تھے اور میں خاصی تھکن محسوس کررہا تھا۔

''ہے بڈی! تم ٹھیک تو ہوناں......؟'' اچانک پچھلی سیٹ پر دراز روڈلف کی مخصوص انداز کی آواز ابھری۔ میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ یاسمین بھی اس کی آواز پر چونکی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کے پہلو پر بندھی ہوئی پٹی سے خون نظر آرہا تھا۔ بے چارے کی اپنی حالت ایسی تھی اور وہ میری خیریت پوچھ رہا تھا۔ میں نے جواباً مسکرا کر کہا۔

''میں تو ٹھیک ہوں، تم کیسا محسوس کررہے ہو؟''

''پیاس لگ رہی ہے۔'' اس نے ہولے سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ویسے شاید ٹھیک ہی ہوں میں......'' اس کی زندہ دلی قائم تھی۔ میں نے یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی ایک لمحہ کے لیے کار کی ونڈ اسکرین سے اپنی نگاہیں ہٹائیں اور بولی۔

''پانی نہیں ہے۔ راستے میں کسی گروسری اسٹور سے بوتلیں لے لیتے ہیں۔''

''ہرگز نہیں...... سفر جاری رکھو۔ میں برداشت کرلوں گا۔'' روڈلف نے کار روکنے سے منع کردیا۔ اس کی آواز اُکھڑی اُکھڑی سی محسوس ہوتی تھی۔ مجھے پھر تشویش نے آن گھیرا۔ یاسمین نے اپنے ہونٹ بھینچ کر کار کی رفتار مزید تیز کردی۔ روڈلف پھر بے ہوش ہوگیا تھا۔

مزید پندرہ بیس منٹ کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد، میرے محتاط اندازے کے مطابق کار شہر کی گنجان آبادی میں آچکی تھی۔

یہ خاصا مہنگا علاقہ نظر آتا تھا۔ گھنے باغات اور خوبصورت بینگلوز طرز کے مکانات بنے نظر آرہے تھے۔ ایسے ہی ایک مکان کے گیٹ کے سامنے یاسمین نے کار روک دی۔ گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ یاسمین ...نہ خود اتری۔ میں نے دیکھا، گیٹ مقفل تھا...... یاسمین نے جلدی سے کار سے اتر کر اسے کھولا تھا۔ چابی اس کے پاس تھی۔ وہ دوبارہ کار میں بیٹھی اور اندر پورچ میں لاکر روک دی۔ ہم نیچے اتر آئے۔ یاسمین نے گیٹ بند کیا۔ اس کے بعد ہم پچھلا دروازہ کھول کے روڈلف کو اٹھا کر اندر لے آئے۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہوچکا تھا۔

یہ ایک کشادہ کمرا تھا اور ضرورت کی ہر شے سے مزین نظر آتا تھا۔ تاہم ایک قسم کا ''بکھراؤ'' ضرور نظر آتا تھا۔ روڈلف کو ہم نے ایک فیملی صوفے پر لٹادیا۔

یاسمین نے مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔ وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب دوبارہ نمودار ہوئی تو میں چونک پڑا۔ اس کے ہمراہ ایک درمیانی عمر کا آدمی بھی تھا۔ قدرے جوان ہی نظر آتا تھا۔ قدوقامت مناسب ہی تھا۔ رنگ گورا تھا۔ خوبرو تھا۔ بال ہلکے تھے۔ ان میں کہیں کہیں سفیدی جھلکتی تھی، بالخصوص کنپٹیوں کی طرف۔ صحت قابل رشک تھی۔ چہرے پر ہلکی داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں۔ آنکھوں پر سیاہ موٹے فریم والے نظر کا چشمہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اگر اندر یہ موجود تھا تو باہر گیٹ مقفل کیوں تھا؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہی ہوسکتی تھی۔

یاسمین کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔

جوان مرد نے سوٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور نک سک سے خاصا بردبار اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔

''یہ میرا منگیتر ڈاکٹر حماد رضا ہے......''

یاسمین نے مجھ سے اس کا تعارف کروایا اور میں اس سے ملنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''منگیتر'' کے عنوان پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ کیونکہ حماد رضا اور یاسمین خانم کی عمروں میں مجھے کم ازکم پندرہ، بیس سال کا واضح تفاوت نظر آتا تھا۔ حماد پینتیس، چالیس کے پیٹے میں لگتا تھا تو یاسمین بائیس تیئیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ میرے حساب سے ان دونوں کو اب تک شادی شدہ ہوجانا چاہیے تھا۔ بہرکیف...... یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔

''اور...... حماد! یہ ہیں مسٹر شہزاد احمد خان...... تم انہیں نہیں جانتے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں بھی نہیں جانتی تھی، نہ ہی اس سے پہلے ہم کبھی ملے تھے۔ لیکن...... تفصیلی تعارف

بعد میں...... پہلے میرا خیال ہے روڈلف کو دیکھ لیا جائے۔"

وہ میرا بھی مختصر تعارف کراتے ہوئے حماد سے بولی تھی۔ مجھے روڈلف کی فکر تھی اور حیران تھا کہ مستقبل کے یہ دونوں میاں بیوی تعارف میں مصروف ہو گئے تھے۔ یا پھر انہیں تسلی تھی کہ روڈلف کی وہ خاطر خواہ طبی امداد کر گزریں گے۔

تاہم ڈاکٹر حماد اور میں نے ایک دوسرے سے مسکرا کر مصافحہ کیا۔

ڈاکٹر حماد کی مسکراہٹ سنجیدہ اور روایتی طرز کی تھی۔ اس کا ہاتھ بہت نرم اور پوپلا سا محسوس ہوا تھا مجھے۔ چہرے مہرے سے وہ مجھے کچھ پریشان اور الجھا ہوا دکھائی دیا تھا۔ جانے کیوں وہ بار بار یاسمین کی طرف عجیب سی تنبیہ آمیز نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔

ان دونوں کے درمیان نامانوس سی زبان میں کچھ مختصر اکھسر پھسر ہوتی رہی تھی۔ تاہم مجھ سے وہ شستہ انگریزی میں ہی بات کر رہے تھے۔ اس دوران میں نے ڈاکٹر حماد کی تنگ سی پیشانی پر شکنوں کا جال سا بھی بنتے دیکھا تھا۔ شفاف عدسے کے عقب میں اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں مجھے تشویش کے سائے بھی گہرے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

اس کے بعد روڈلف کو اٹھا کر ہم ایک کمرے میں پہنچے۔ یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ کسی ڈاکٹر کا کلینک معلوم ہوتا تھا۔ دوائیں، چھت سے منسلکہ لائٹس اور ایک بڑی کنٹوپ نما لائٹ کے عین نیچے بڑی سی آپریشن ٹیبل۔ جس کے سرہانے آکسیجن سلینڈر اور دائیں جانب ایک چھوٹی سی میز پر سرجری سے متعلق اسٹین لیس اسٹیل کے چمکتے لشکارے مارتے آلات، بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ روڈلف کو اسی آپریشن ٹیبل پر لٹا دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر حماد نے وہیں ایک دیوار سے لگے سنک سے دونوں ہاتھ واش کیے۔ اس کے بعد گلوز چڑھائے اور یاسمین نے سفید گاؤن پہننے میں اس کی مدد کی۔

"شہزی! تم کمرے میں جا کر آرام کر سکتے ہو۔" یاسمین نے مجھ سے کہا۔ میں واقعی تھکاوٹ سے بہت شل ہو رہا تھا لیکن روڈلف کی حالت کی وجہ سے متذبذب سا کھڑا رہا تو یاسمین ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ ازراہِ تشفی بولی۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ وہ اب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اب ایک ڈاکٹر فزیشن اور بڑے سرجن کے زیرِ علاج ہے۔"

"زخم گہرا نہیں ہے۔ گولی سپرفیشئیل ہے۔ ابھی نکال لیتے ہیں۔" اچانک ڈاکٹر حماد نے کہا۔ اس کی ناک پر سفید رنگ کا ماسک چڑھا ہوا تھا اور وہ روڈلف پر جھکا ہوا تھا۔

میں قدرے طمانیت بھری سانس لیے اسی نشست گاہ میں آگیا۔

سچی بات تھی جو اطمینان مجھے پہلے یہاں پہنچ کر ہوا تھا، وہ ایک بار پھر عنقا ہونے لگا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ میں یہاں آ کر عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

کیپٹن رانسے سے لے کر کوہارا تک اور پھر اس موڑ سے اچانک غیر متوقع مڈبھیڑ نے میرے اعصاب شل کر ڈالے تھے۔ پتا نہیں یاسمین اور اس کے بوڑھے باپ کا کیا چکر تھا جس میں سے جی کوہارا بھی شامل تھا۔

ایک بات پر میں اپنی بھویں سکیڑ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اگر یاسمین کا ادھیڑ عمر منگیتر یہاں موجود تھا تو پھر یاسمین کا وہ بوڑھا باپ کہاں تھا جس کی سے جی کوہارا کو تلاش تھی؟ اسے بھی تو ان کے ساتھ یہاں موجود ہونا چاہیے تھا؟ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کہیں کسی کمرے میں آرام فرما رہے ہوں؟

کیپٹن رانسے کی کوہارا کے ہاتھوں ہلاکت کو میں مکافاتِ عمل ہی سمجھ سکتا تھا۔ جس نے دولت کے لالچ میں اندھا ہو کر اپنے سینئر آفیسر بوانڈ...کو کار کے حادثے میں مروا دیا اور خود بھی کوہارا کی بربریت کا نشانہ بن گیا۔

کوہارا میرے ہاتھوں ایک بار پھر بڑی بھاری زک اٹھا کر بھاگنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس بار تو میں اس کا قضیہ بس، نمٹانے ہی والا تھا، لیکن شاید ابھی اس کی زندگی کے دن باقی تھے۔ تاہم مجھے تسلی تھی وہ میرے مقابلے میں دوبارہ میدان میں اتارا گیا تھا تو دوبارہ اس سے فیصلہ کن ٹکراؤ ممکن تھا۔

مجھے جانے کب نیند نے آلیا اور میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں شاید اس آرام دہ صوفے پر ہی بیٹھا بیٹھا پشت اور سر لگا کر سو گیا تھا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک نرم گرم سے بستر پر پایا۔ تب ہی مجھے اچانک یاد آیا کہ میں تو صوفے پر ہی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا تو...... پھر مجھے یہاں بیڈ تک کون لایا تھا؟

میں ارد گرد کا جائزہ لینے لگا اور بیڈ پر سے اٹھ بیٹھا۔ یہ ایک خوبصورت اور دیدہ زیب سا بیڈ روم تھا۔ نجانے کب تک میں سویا رہا تھا؟ میرے سامنے ہی وال کلاک رات کے دس بجے کا اعلان کر رہا تھا۔ گویا میں چار پانچ گھنٹے یا اس سے تھوڑا کم زیادہ.... سویا رہا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مجھے بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر نگاہ پڑی تو وہاں کانچ کا جگ اور ایک گلاس دھرا پڑا تھا۔ جگ کو مہین جالی سے ڈھانپا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ پی گیا۔ ایک اور گلاس بھی اسی طرح خالی کر گیا۔

ہر سو خاموشی طاری تھی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا جو بند تھا۔ کمرے میں تین فینسی لائٹیں لگی ہوئی تھیں جن میں ایک ہی بلب جلتا چھوڑ دیا گیا تھا۔

آرام کرنے اور پانی پینے کے بعد مجھے کچھ سکون ملا تھا۔ اچانک مجھے روڈلف کا خیال آیا۔ میں اس کی طرف سے متفکر تھا۔ تسلی بھی تھی کہ وہ اب محفوظ ہاتھوں اور لوگوں میں تھا، یہی کچھ میرا حال بھی تھا۔ پھر بھی میں اس کی خیر خیریت دریافت کرنے کی غرض سے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور...... دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دروازے سے تین چار قدموں کے ہی فاصلے پر تھا کہ اچانک وہ کھلا اور میں ٹھٹک سا گیا۔

سامنے ہی مجھے یاسمین خانم کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آ گیا۔

''تم جاگ گئے؟''

''ہاں! لل...... لیکن میں تو باہر صوفے پر سو گیا تھا...... یہاں کیسے آ گیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اس میں کیا مشکل ہے؟'' وہ موہنی سی مسکراہٹ اور کھنکتے لہجے میں بولی۔ ''میں اور حماد تمہیں سوتے میں یہاں اٹھا لائے تھے۔'' اس کی بات پر مجھے شرمندگی سی ہوئی اور میں نے فوراً بات بدلی۔

''روڈلف کیسا ہے اب؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور قدم بڑھائے۔ میں بھی چند قدم پیچھے سرک گیا۔

اب ہم آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے اپنے تراشیدہ ہونٹوں جیسے عنابی رنگ کا دیدہ زیب لباس پہن رکھا تھا۔ لائٹ پرنٹڈ سلیولیس فراک کے نیچے اس نے ٹائٹ سیاہ رنگ کی ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ پیروں میں کوٹ شوز تھے۔ بالوں کو سلیقے سے ربن کیا ہوا تھا۔ ہلکے میک اپ میں وہ خاصی حسین اور دلکش نظر آتی تھی۔

''تمہیں بھوک لگی ہوگی، میں نے کھانا لگا دیا ہے۔ حماد بھی تمہارا انتظار کر رہا ہے کھانے کی میز پر۔''

''شکریہ، میں ذرا فریش ہو کے آتا ہوں۔ آپ لوگ کھانا شروع کریں۔'' میں نے کہا۔ اس نے بدستور اپنی گہری گہری بولتی مسکراتی نگاہوں سے میری جانب تکتے ہوئے ایک طرف لگی بڑی سی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مترنم لہجے میں کہا۔

''اس میں تمہارے سائز کا کوئی نہ کوئی لباس موجود ہوگا۔ وہ پہن لینا۔ سب دھلے ہوئے اور صاف ستھرے کپڑے رکھے ہیں۔''

''بہت بہتر۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ وہ میری طرف اسی مسکراتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ میں یونہی بھویں اچکاتا ہوا وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں خاصی مشکل سے میرے ناپ کا لباس برآمد ہو سکا تھا۔ کبھی پینٹ تنگ پڑ جاتی تھی تو کبھی شرٹ۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے یہاں ٹھگنے قد یا درمیانی قامت کے ہی افراد مکین رہے ہوں۔ بہرکیف...... بڑی مشکل سے کنٹراسٹ میں ایک پینٹ شرٹ مجھے مل ہی گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں ڈائننگ ٹیبل پر تھا۔ حماد رضا اور یاسمین خانم بھی وہیں موجود تھے۔ بنگلے میں ابھی تک مجھے ان دونوں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

ہم خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔

''روڈلف نے کچھ کھایا پیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! وہ کھا چکا ہے۔ اسے میں نے سوپ دیا تھا۔ بہت بہتر ہے اب۔'' یاسمین جواب دیا۔

کھانا خاموشی کی فضا میں ختم ہوا۔ میرا اندر ایک بار پھر ڈھیر ڈھیرے پُرتفکیر سوچوں اور الجھنوں کے باعث بے چین سا ہونے لگا تھا۔ اسی سبب میں ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا تھا۔ حالانکہ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ جاگتے سے شاید ذہن خالی تھا اسی لیے بھوک کا زیادہ احساس ہوا۔ لیکن بعد میں ذہن پریشان خیالات کی آماجگاہ بنتے ہی بھوک کا وہ احساس جاتا رہا تھا جو ٹیبل پر سجے اس پُرتکلف ڈنر کے ساتھ انصاف کرنے پر اکسائے ہوئے تھا۔

''تم نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا مسٹر شہزی؟'' میز سے اٹھتے وقت ہی حماد نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''میں نے کھا لیا، کھانا بہت اچھا تھا۔ میں ذرا روڈلف سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

یاسمین مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ وہاں روڈلف بیڈ پر دراز تھا۔ اس کا اوپری بدن برہنہ تھا۔ نیچے لفافہ سی شلوار تھی۔ بائیں پہلو میں ڈریسنگ ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک بڑے سے تکیے پر سر اور گردن ٹکائے سگریٹ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پیتے ہوئے چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں مستغرق تھا۔
ہمارے اندر آتے ہی وہ مسکرا دیا۔
''کیسے ہو دوست؟'' میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ میرے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔
''اے ون......'' اس نے بھی مسکراتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔
''خدا کا شکر ہے، تم ٹھیک ہو گئے۔'' میں نے دعائیہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں ڈاکٹر حماد کا تہِ دل سے مشکور ہونا چاہیے۔''
''اس کی ضرورت نہیں۔'' اچانک عقب سے حماد کی آواز ابھری۔ وہ بھی ہمارے پیچھے چلا آیا تھا۔ ہم وہاں موجود کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔
''حالات اُلجھتے جا رہے ہیں اور ہمیں فوراً امریکا روانگی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔'' میں نے یاسمین اور اس کے منگیتر ڈاکٹر حماد کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے روڈلف سے کہا۔ میرے لہجے میں گہری تفکیر نمایاں تھی۔
روڈلف کے چہرے پر خاموشی طاری تھی۔ اسے شاید جواب دینے میں تامل تھا۔
''اس وقت تمہاری امریکا روانگی کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں مسٹر شہزی!'' یاسمین نے ہی جواب دیا۔ مجھے اس کے جواب سے کوئی سروکار نہ تھا۔
میں بدستور اسے نظرانداز کرتے ہوئے روڈلف کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ اس نے بھی ایک ذرا گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر یاسمین کی بات کی تائید میں بولا۔
''یاسمین ٹھیک کہہ رہی ہے شہزی!''
روڈلف کا جواب مجھے پسند نہیں آیا۔ میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کسی اور معاملے میں الجھ چکا تھا۔
''تمہاری مرضی روڈلف! تم اِدھر ہی رہو۔ میں نکلوں گا۔'' میں نے کھڑے ہونے کے لیے اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے۔
''ٹیک اِٹ ایزی مسٹر شہزاد!'' اچانک یاسمین نے سنجیدگی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''روڈلف مجھے تمہارے معاملے سے آگاہ کر چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سارے معاملات سے زیادہ اہم ہے اور ہم سب تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔''
''میں معذرت خواہ ہوں مس یاسمین کہ میں شاید آپ کی بات نہیں سمجھ پاؤں گا۔ بہرحال آپ کی یہاں تک عزت افزائی اور تعاون کا میں مشکور رہوں گا۔''
''شکریہ کیسا مسٹر شہزاد؟'' اس بار حماد نے کہا۔
''شکریہ تو ہمیں آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ......'' اسی وقت وہ خاموش ہو گیا۔ کیونکہ روڈلف نے اپنا ایک ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔
''یہ تم دونوں کی بات نہیں سمجھے گا۔ مجھے کہنے دو۔''
''دیکھو بڈی!'' وہ اب براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ ''یہ سارے معاملات بھی تمہارے معاملے کی ہی ایک کڑی ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں...... کہ لولووش سے ٹکرانے کے لیے...... تمہیں اپنے ساتھ وہ سارے معاملات لے کر چلنا ہوں گے، جو اس سے متعلق ہیں۔''
میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ''تم سے کس نے کہہ دیا کہ میری امریکا روانگی کا مقصد لولووش سے ٹکراؤ ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ میری اس کے ساتھ جنگ جاری ہے، لیکن میں پاکستان سے اسپیکٹرم کا نیٹ ورک ختم کر چکا ہوں۔ لہٰذا اب لولووش سے میری جنگ ثانوی مرحلے میں ہے اور میں امریکا کسی سے جنگ کرنے کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔ وہاں میرا مقصد صرف عابدہ کا حصول ہے اور بس......''
''بڈی! تم کیا سمجھتے ہو...... وہاں عابدہ تمہارا انتظار کر رہی ہے کہ تم امریکا پہنچو اور بڑے آرام سے اس کا ہاتھ تھام کر اگلی فلائٹ سے پاکستان پرواز کر جاؤ۔'' روڈلف کچھ تلخ ہونے لگا، یا پھر حقائق تلخ تھے۔ میں نے بُرا نہیں منایا۔ خاموش رہا۔ حماد اور یاسمین بھی چپ تھے۔
''بڈی!'' مجھے خاموش پا کر اس بار بڑی رسانیت سے بولا۔ ''کبھی کبھی تم بچوں جیسی ضد پر آ جاتے ہو، حالانکہ تم دماغ کے ہی نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں سے بھی پورے میچورڈ ہو۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بیک وقت ذہن اور ہاتھ پاؤں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن میں نے تمہیں دونوں خوبیوں میں طاق و مشاق پایا ہے۔ شاید یہ تمہارا عابدہ سے محبت کا وہ جذبہ ہے جو تمہیں عجلت اور بے چینی پر اکسا تا رہتا ہے اور تم ایک دم بے چین ہو کر جلد بازی پر اتر آتے ہو۔ اب جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ پوری سن لو اور سمجھ آ جائے تو پھر آگے کوئی فیصلہ کرو، میں تمہارے ہر فیصلے میں ساتھ ہوں، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''
وہ اتنا کہہ کر ذرا سانس لینے کو رکا۔ کمرے میں گمبھیر تا سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ تھوڑا سانس لینے کے بعد وہ

بولا۔ ''امریکا میں تمہارا ایک سے ایک جغادری دشمن خونخوار بھیڑیے کے مانند دانت نکوسے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے اور دشمن بھی وہ جنھیں تمہارے عابدہ والے معاملے میں متحد بھی کیے رکھا ہے۔ اب تم خود سوچ لو جب وہ خود تمہارے خلاف اس قدر متحد ہونے پر مجبور ہو چکے ہیں تو تم کیوں تمہار ہو؟

''باسکل ہولارڈ سے لے کر لولوش اور صیہونی تنظیم جیوش بزنس کیمونٹی تک سب ہی عابدہ اور تمہارے معاملے میں ایک طاقت بن چکے ہیں۔ لیکن ان تینوں کو الگ الگ خانوں میں رکھ کے بھی دیکھا جائے تو تمہارا ہر دشمن اپنی جگہ ایک مضبوط اور جامع تنظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔

''باسکل ہولارڈ سی آئی اے کے ایک پورے ونگ ٹائیگر ٹیگ کا چیف ہے۔ جے بی سی کو بھی ایک سے ایک خطرناک اسرائیلی انٹیلی جنس کی پشت پناہی حاصل ہوگی۔ رہا لولوش تو...... وہ ہے ہی اور شے...... اسے تم ان دونوں متذکرہ بالا عناصر کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہو۔ باسکل ہولارڈ اور جے بی سی والوں سے ممکن ہے تم اکیلے یا چند ساتھیوں کی معیت میں بھڑ سکتے ہو، لیکن لولوش کو نابود کرنے کے لیے تمہیں لولوش تک پہنچنے کے بجائے پہلے اس کی جڑوں تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔

''یہ ایک پورا ٹیم ورک ہے، ان لوگوں کا ٹیم ورک جو اس کی جڑوں تک سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں۔ لولوش خود کو ''پرنس آف برمودا'' کہتا ہے تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ جانتے ہو ناں بڈی! برمودا کیا ہے؟ اسرار کے پردے میں ڈوبی ہوئی ایک خوفناک سائنس ہے۔ ایک حیرت، ایک جادو...... ہے اور ایک دہشت ناک ٹرائی اینگل ہے۔

''انسان نے کائنات تو تسخیر کر ڈالی، چاند اور مریخ سمیت دیگر گمنام سیاروں تک جا پہنچا لیکن برمودا ٹرائی اینگل کے راز و اسرار...... کو آج تک طشت از بام نہ کر سکا۔ سنو بڈی! لولوش کے بارے میں جزائر برمودا کے باشندوں کو یہ دعویٰ کرتے سنا گیا ہے کہ ان کا شہزادہ برمودہ ٹرائی اینگل کا ایک دیوتا ہے اور اسی پُراسرار دنیا سے اس کا تعلق ہے۔ وہ اسے دیوتا مانتے ہیں۔ خیر چھوڑو...... لیکن تم کہتے ہو تمہاری جنگ لولوش سے نہیں ہے، جبکہ لولوش تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ عابدہ کا بیڑا غرق کرنے میں اس کا بھی تو پورا ہاتھ ہے۔ دیکھ لو سب سے پہلے وہی تمہارا راستہ کھوٹا کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ تم نے بھی تو اب تک اسے کم زک نہیں پہنچائی ہے۔

''مائی بڈی! یو آر سو گریٹ...... بٹ...... خدا کے لیے...... باسکل ہولارڈ اور جے بی سی سے ٹکرانا اپنی جگہ مگر لولوش سے ٹکرانے کے لیے تمہیں ذرا مختلف قسم کی ''پچ'' پر کھیلنا پڑے گا۔''

روڈلف...... پُرزور لہجے اور اپنے ایک ایک لفظ اور جملے پر زور دیتے ہوئے مجھ سے یہ سب کہتا رہا۔ میں بھی پورے دھیان اور غور سے اس کی باتیں سنتا رہا، کوئی اور شخص ہوتا تو شاید میں اتنی توجہ سے اس کی باتیں نہیں سنتا۔ مگر یہ روڈلف تھا۔ ایک ایسا آدمی جو لولوش کے بارے میں بہت کچھ بلکہ اندر تک اچھی طرح جانتا تھا۔

مجھے شاید اب اس کی نصیحت آمیز گفتگو کا مطلب ... سمجھ آرہا تھا۔ سارا زور اس کی گفتگو کا اسی بات پر تھا کہ صرف روڈلف ہی میرے لیے کافی نہیں، تاہم مجھے اسی جیسے لوگوں کی ایک پوری ٹیم کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا، تو کیا روڈلف کے علاوہ بھی یہاں...... اس بنگلے میں ایسے لوگ موجود تھے جو لولوش کی اصلیت اس کی حقیقت کو جانتے تھے؟ کون تھے وہ؟ یاسمین خانم، اس کا منگیتر یا پھر اس کا گمشدہ باپ......؟

''کیا تم بھول گئے کہ میں نے تم سے لولوش سے متعلق کیا کہا تھا کہ وہ ایک خطرناک عالمی گینگسٹر سے بھی آگے کی ''شے'' ہے۔'' تھوڑے توقف اور مجھے سوچتا پاکے وہ دوبارہ بولا۔

''اور...... تم نے کہا تھا کہ کیا لولوش کا دوسرا روپ کسی جادوگر کا ہے؟'' روڈلف بولتا رہا۔

میرا جواب اثبات میں تھا۔ لولوش ایک شیطانی جادوگر ہی نہیں بلکہ سائنسی بازیگر بھی ہے۔ بظاہر تو اسپیکٹرم کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں ہے، وہاں اس کا نائب کالاہان ہی اسے سنبھالے ہوئے ہے، مگر اسپیکٹرم کا اصل مرکز برمودا کے ایک جزیرے ''آئیوری'' میں ہے، اس کے پاس دنیا کے ہر قسم کے ٹاپ پروفیشنل ایکسپرٹیز کی ٹیمیں موجود ہیں۔ ان میں کرمنلو سے قطع نظر انجینئرز، ڈاکٹرز اور سائنس دانوں اور ماہر فلکیات سے لے کر تحقیق اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ماہر لسانیات سب ہی موجود ہیں۔ اسپیکٹرم سے انہیں بڑی بڑی تنخواہوں پر ہائر کیا گیا ہے، انہیں اعلیٰ درجے کی مراعات حاصل ہیں۔ اسپیکٹرم مختلف گروہ کا ایک ایسا مجموعہ ہے، ایک اکائی ہے۔ ایک اکیڈمی ہے۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''پوچھ سکتا ہوں کہ لولوش...... کے معاملات میں ان دونوں کی کیا حقیقت ہے؟''

میں نے درمیان میں اسے ٹوک دیا۔ میرا اشارہ قریب بیٹھے حماد رضا اور یاسمین خانم کی طرف تھا۔

جانے کیوں مجھے اسپیکٹرم اور لولوش کی... ان ''لوازماتی'' تعریفوں سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ کیونکہ کم و بیش ایسی باتوں کا علم میں بھی رکھتا تھا۔

میرے ٹوکنے پر روڈلف مسکرا کر بولا۔ ''بڈی! میرا مقصد تمہیں اسپیکٹرم اور لولوش سے مرعوب کرنا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ عنقریب تمہارا اور لولوش کا سامنا ہونے والا ہے، تمہارے لیے اس کے متعلق بہت سی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ اب تم اس کی کچھار میں گھسنے والے ہو۔ جو ایک گھن چکر ہے، حالانکہ میں ڈی کارلو سے لے کر لولوش تک ان کے بہت عرصے...، قریب رہ چکا ہوں، لیکن اب بھی لولوش اور اسپیکٹرم سے متعلق معلومات کو ناکافی سمجھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اب اصل بات کی طرف آجاؤ۔'' میں اسے دوبارہ ٹوکنے سے باز نہ آیا۔ روڈلف نے تھوڑا منہ بنایا اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے یاسمین اور اس کے منگیتر کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

''ان دونوں کا تو ثانوی سا تعارف کروا ہی چکا ہوں۔ یہ دونوں ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ حماد رضا تہران کی میڈیکل یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز میں ریسرچ اسکالر ہے۔ وہیں سے اس نے گریجویشن کیا تھا۔ جبکہ یاسمین بھی سائنس گریجویٹ ہے۔ اس کا تعلق زنجان سے ہے۔ یہ پروفیسر جمشید بے کی بیٹی ہے۔ پروفیسر جمشید، زنجان (ایران) میں آرکیالوجی کے ایچ او ڈی (ہیڈ) ہیں۔ مصریات پر اتھارٹی رکھتے ہیں۔

''اسپیکٹرم میں انہیں سابقہ سربراہ مسٹر ڈی کارلو نے ایک بڑے عہدے پر کام کرنے کی آفر کی تھی، جو اس وقت ایک واقعی معتبر ادارہ تھا۔ اس کی آفر، پروفیسر جمشید نے اس شرط کے ساتھ قبول کرلی تھی کہ وہ اپنے ملک کو نہیں چھوڑیں گے اور یہیں رہتے ہوئے اسپیکٹرم کے ''تعمیری'' کاز کے لیے کام کرتے رہیں گے۔

''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ اسپیکٹرم کے ادارے کی بنیاد ہی اس پر رکھی گئی تھی کہ وہ دریافت اور بازیافت کے علاوہ چوری شدہ نوادرات کی تلاش کرکے انہیں اپنے صحیح اور اصل مقام تک پہنچانے کا ذمے دار تھا۔ اسی لیے اسے بین الاقوامی سطح پر بڑی پذیرائی حاصل تھی اور فنڈنگ بھی اس ادارے کو اسی حساب سے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی ادارے میں ریسرچ کا کام بھی ہوتا تھا۔ لہٰذا اسپیکٹرم کی ایک برانچ آفس کی بنیاد، حکومتِ ایران کی اجازت کے بعد تہران میں بھی رکھی گئی۔''

اتنا کہہ کر روڈلف ذرا سانس لینے کو رکا اور پھر کہنا شروع کیا۔

''انہی دنوں پروفیسر جمشید بے...... قاہرہ (مصر) یونیورسٹی کے اشتراک سے عمومی نوعیت کے منصوبوں میں ان کے ساتھ مصر میں گمشدہ مقبروں کی تلاش اور کھدائی وغیرہ میں مصروف رہتے تھے، لیکن خاطر خواہ فنڈنگ نہ ہونے کے سبب ان کے بعض منصوبے تعطل کا شکار رہے۔ جس کا انہیں افسوس ہی رہتا تھا مگر اسپیکٹرم میں شمولیت کے بعد ان کے تعاون سے انہوں نے اپنے تاخیر زدہ منصوبوں کو دوبارہ عملی جامہ پہنانے کا عزم کیا لیکن اسی دوران اسپیکٹرم کے باقاعدگی سے شائع ہونے والے ایک سہ ماہی کیٹلاگ میں ایک مضمون ان کے لیے غیر معمولی دلچسپی کا سبب بنا۔

''یہ مضمون درحقیقت ترجمہ تھا ایک جرمن ٹی وی چینل ''زی ڈی ایف'' کے تحقیقاتی پروگرام کا۔ جس میں جرمن یونیورسٹی آف ٹرائیر کے پروفیسر اور تاریخ داں مسٹر کرسٹوفر شیفر نے اس بات کو رد کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ ملکہ فرعونِ مصر قلوپطرہ کی موت کو مصری کوبرا نے ڈسا تھا یعنی اس نے اس سانپ کے ذریعے خودکشی کی تھی، جسے انجیر کی ٹوکری میں چھپا کر لایا گیا تھا۔ جبکہ کوبرا سانپ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ ٹوکری میں نہیں آسکتا، نیز اس نے اپنی تحقیق اور مانچسٹر یونیورسٹی کے ماہرین کے مطابق بھی قلوپطرہ نے صندل، افیم اور ایک زہریلے پودے تاج الملوک کے آمیزے پر مشتمل ایک دوا کھائی تھی جو اس زمانے میں فوری طور پر ہلاک کر دینے والی جانی پہچانی دوا تھی۔

''اسی طرح ایک فرنچ برقی مضمون کا انگریزی میں ترجمہ تھا جس کے مطابق ملکہ قلوپطرہ جو ہفتم ملکہ بھی کہلاتی تھی، کے ایک عاشق اقاطوس کا ذکر کیا گیا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اس کی ایک لونڈی کے عشق میں گرفتار تھا اور وہ لونڈی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ مگر چونکہ تاریخ کے مطابق قلوپطرہ جو ایک ''جنسی بلی'' تھی، ساتھ ہی ایک ایسی مکڑی کے مثل بھی...... جو اپنے عاشقوں سے دل بھر جانے کے بعد انہیں ہلاک کر دیا کرتی تھی۔ اقاطوس کو بھی یہی ڈر تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی قلوپطرہ خودکشی کرنے کا ارادہ باندھ چکی اور خودکشی سے پہلے اپنے اسی عاشق کے کہنے پر

قلوپطرہ نے غسل کیا تھا اور گدھ کا تاج سر پر سجایا تھا، جس کے پُر قلوپطرہ کے حسین چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ ایک انگوٹھی تھی جس میں سانپ بنا ہوا تھا، یہ دشمنوں سے حفاظت کے لیے تھی۔ اس کے کسی مخصوص حصے کو دبانے سے سانپ کے پھن میں موجود زہر... جو مدِمقابل کو ڈس لیتا تھا، ایک سنہری بھونرا تھا۔ یہ بھی انگشتری کی صورت میں تھا۔ جس کے پیٹ کو ہلکا سا دبانے پر اس کے پَر تیزی سے حرکت کرتے اور اس کی بھنبھناہٹ...... ایک طرح کا عارضی مسمریزم کا اثر رکھتی تھی، جس کی آواز مدِمقابل کے دماغ کی رگیں سن کر دیا کرتی، یا وہ معمول بن جاتا (عارضی طور پر) یا پھر وہ مرجاتا تھا۔

"یہ سامان درحقیقت اقناطوس نے اپنی محبوبہ زرمانہ کو دیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ قلوپطرہ کی تلاش میں نکلے ہوئے رومی دشمن یہاں تک پہنچ سکتے ہیں اور وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، اس متوقع حملے کی صورت میں زرمانہ اپنا تحفظ کر سکے، لیکن بدقسمتی سے وہ ہتھیار قلوپطرہ نے زرمانہ سے چھین لیے تھے۔ وہ ان ہتھیاروں کو شاہی سامان سمجھ بیٹھی تھی، جو فرعون مرتے وقت اپنے مقبروں کی زینت بنایا کرتے تھے۔

"ادھر زرمانہ نے بھی انتقاماً ملکہ کو ان کی اصل حقیقت نہیں بتائی تھی۔ اقناطوس اور زرمانہ خود بھی یہی چاہتے تھے، یوں ملکہ کی خودکشی کے بعد دشمنوں کے حملے کے دوران انہی ہتھیاروں سے بچاؤ کرتے ہوئے یہ دونوں عاشق محبوب اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور "لکسر" کے مقام پر دریائے نیل کے گھاٹ کے قریب ایک ٹھکانا بنا کر وہاں رہنے لگے۔

"ایک دن اقناطوس اچانک غائب ہو گیا۔ زرمانہ اس کی جدائی میں پاگل سی ہو گئی۔ اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اپنے محبوب کی نشانی سمجھ کر اس نے بیٹی کی پرورش کی۔ اس کا نام اس نے ثمانہ رکھا۔ ثمانہ ابھی گیارہ بارہ سال کی تھی کہ ایک دن اچانک وہ بھی غائب ہو گئی۔ ثمانہ اکیلی رہ گئی۔

"اس کی ماں زرمانہ نے اپنی زندگی میں ہی وہ تینوں ہتھیار اس کے حوالے کر دیے تھے اور ان کا استعمال بھی بتاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اس کے (ناجائز) باپ کے دیے ہوئے ہیں۔ تب اس نے اپنے ان تینوں مذکورہ ہتھیاروں کے بل بوتے پر دھاک بٹھائی تھی اور اپنی چھوٹی سی ریاست میں حکومت کرنے لگی۔ "لکسر" کے لوگ اسے "بنتِ نیل" کہنے لگے تھے۔

"ساتھ ہی ساتھ ثمانہ اپنی ماں...... کو بھی تلاش کرتی رہتی تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنے باپ کی بھی تلاش تھی، حتیٰ کہ ایک دن ثمانہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے چند روز بعد ہی لکسر والوں نے دیکھا کہ کچھ اجنبی قسم کے لوگ کسی اہرام کی تعمیر کر رہے ہیں۔ جو پرانے لوگ تھے انہوں نے ان "پُراسرار معماروں" میں ایک عورت اور مرد کو بھی دیکھا تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ زرمانہ اور اس کا محبوب اقناطوس تھے۔ وہ ثمانہ کی لاش سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ بتایا گیا کہ اقناطوس کا تعلق ایک "وائٹ گلیکسی" نام کی کہکشاں کے ایک ہزاروں نوری سال کے کسی دور افتادہ سیارے "زوٹون" سے تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خلا سے آ کر مصری معماروں کو یہ عظیم الشان اہرام بنانے میں ان کی مدد کی تھی اور ان کا بیس کیمپ برمودہ ٹرائی اینگل کے کسی جزیرے میں تھا۔ جہاں زمین کے لوگ اور ان کے جہاز بھٹک کر ہمیشہ کے لیے پُراسرار طور پر غائب ہو جاتے تھے۔

یہ بھی کہا گیا کہ اقناطوس کے اچانک غیاب میں ایک مخصوص مدت (ٹائم پیریڈ) کا دخل تھا۔ جس کے بعد وہ ایک خاص تیز رفتار مقناطیسی کشش کے باعث اپنے سیارے "زوٹون" کی طرف، ذرات میں تبدیل ہو کر کھینچ لیا گیا تھا۔ یوں ایک مخصوص مدت گزارنے کے بعد اقناطوس نے اپنی محبوبہ کو اپنے سیارے میں بلا لیا۔ اب وہ ایسی ہی ایک مخصوص مدت ٹائم پیریڈ کے گزرنے کے بعد اپنی بیٹی ثمانہ کو بھی بلانا چاہتے تھے۔ لیکن ثمانہ وقت سے پہلے ہی انتقال کر گئی۔ یوں اب وہ اس کا زمین پر اہرام بنانے اپنے ستارہ نشیں ساتھیوں کے ساتھ پھر آئے تھے۔ کیونکہ فرعونی روایت کے مطابق انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا تھا۔ لہٰذا ثمانہ یعنی بنتِ نیل کو اس کے زر و جواہر، قیمتی لباس اور ان تینوں ہتھیاروں کے ساتھ ایک بڑے سے تابوت میں ڈال کر اہرام کے اندر ایک مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔ اس اہرام کا نام "ڈارک گریٹ پیرامڈ" رکھا گیا۔ اس نام کی وجہ یہی تھی کہ اس کی مخصوص بناوٹ ایسی تھی جہاں روشنی کا دخل ہی نہیں ہوتا تھا۔ چوروں کی دست بُرد سے بچانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

محققین اہرام اور تواریخ دانوں اور "ایگزو بایولوجسٹ" (حیاتیات کی وہ شاخ جس میں زمین کے باہر ذی حیات نامیوں پر ماحول کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے) کے مطابق اقناطوس کا تعلق ہماری زمین سے نہیں تھا۔ وہ کسی گمنام سیارے سے بھٹک کر ہماری زمین پر اترا تھا یا یہ ان لوگوں میں شامل تھا، کیونکہ قدیم مصر میں "خلائی انسان"

کے نظریے کی موجودگی بھی عظیم اہرام اور اُڑن طشتریوں، یو فوز کی نشاندہی کرتی ہے۔ یوں مصر کے اہراموں کی تعمیر میں خلائی انسانوں یا کوئی ایسی غیر مرئی مخلوق کا ہاتھ تھا جن کا تعاون مصری معماروں کے ساتھ رہا تھا۔ وہ خلائی مخلوق جو زمینی انسانوں سے زیادہ ذہین تھی اور سائنس میں بہت آگے بھی، اسی طرح اہرام مصر کی تعمیر کا تعلق بھی کسی نہ کسی حوالے سے برمودہ ٹرائی اینگل سے جڑتا ہے۔

لہٰذا پروفیسر جمشید۔۔۔ کوشانہ کی لاش اور اس کے مذکورہ اہرام ''گریٹ ڈارک پیرامڈ'' کی تلاش تھی کیونکہ ان کے مطابق یہ مذکورہ خلائی کے انتہائی طاقتور اور خطرناک ہتھیار تھے جو سولر انرجی (شمسی توانائی) سے چلتے تھے، سانپ کا زہر دراصل زہر نہ تھا وہ ایک انتہائی تیز وولٹ کی برقی رو ہوتی تھی، جو مدِمقابل کو چشم زدن میں ہلاک کر ڈالتی تھی۔

یہ سب اس کے خلائی ہتھیار تھے۔ ایک ہیڈ وائر تھا، بھی گدھ والا۔ جسے پہننے کے بعد بینائی زمین کے اندر ایک سو گز تک دیکھنے کی طاقت رکھتی اسی طرح پانی کے اندر بھی دو سو گز تک دیکھا جاسکتا تھا۔

غیر معمولی طاقتیں حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا لولوش نے اسپیکٹرم کے بانی اور سربراہ ڈی کارلو کا قتل کیا، اسپیکٹرم کو ہائی جیک کیا۔ لیکن تنظیم کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے بعد پروفیسر جمشید۔۔۔ نے اسپیکٹرم سے قطع تعلق کرلیا۔ ان کی برانچ بند ہوگئی۔ ایران نے اسپیکٹرم پر اپنے ملک میں پابندی عائد کردی۔ یہ سب پروفیسر جمشید کے ایما پر ہی کیا گیا تھا۔ کیونکہ اپنے بعض ذرائع سے انہیں لولوش کی اصلیت اور حقیقت کا علم ہو چکا تھا مگر وہ اپنا منصوبہ کسی قیمت پر بھی ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کچھ اسپیکٹرم کی مدد اور کچھ اور اپنی ذاتی کوششوں سے یہ ساری مفصل معلومات اکٹھی کیں اور اپنے ہونہار شاگرد حماد رضا اور بیٹی یاسمین خانم کے ساتھ مصر کی اس پُر اسرار مہم پر جانے کا ارادہ کیا۔

حماد اور یاسمین بھی ایک دوسرے کو جاننے لگے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ پروفیسر جمشید کو ان کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لڑکا بھی کون، ان کا ہونہار شاگرد تھا، پھر بھلا انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟ تاہم ان کی شادی کو انہوں نے اس مہم کی تکمیل کے بعد موخر رکھتے ہوئے ان کی منگنی کر ڈالی تھی۔

وہ یہ ساری سحر انگیز گفتگو تفصیل سے سنانے کے بعد خاموش ہوگیا۔ اس نے پوری روانی کے ساتھ یاسمین خانم سے متعلق حقیقت بیان کی تھی لیکن اس داستان میں مجھے حقیقت کم اور ''سحر طرازی'' کا جادو زیادہ محسوس ہوا تھا۔

میں نے غیر تاثر سی مسکراہٹ سے پہلے قریب بیٹھی یاسمین اور حماد کی طرف دیکھا جو اَب میری جانب کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے بھانپنا چاہ رہے ہوں کہ میں کس قدر اثر پذیر ہوا تھا۔ ظاہر ہے انہیں مایوسی ہی ہوئی تھی۔

''روڈلف! میں اب تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ تم مجھے آخر سمجھانا کیا چاہ رہے ہو؟'' بالآخر میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''لولوش کو تم نے شاید کوئی ماورائی طاقتوں والا انسان سمجھ لیا ہے۔ بے شک آج تک میرا لولوش سے سامنا نہیں ہوا ہے لیکن اس کی کافی حد تک حقیقتوں سے میں خود بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ میرا خیال ہی نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت بھی ہے کہ لولوش نے دانستہ اپنے ضعیف الاعتقاد قبیلے کے لوگوں کے لیے خود کو کوئی ماورائی شے ثابت کرنے کی کوشش کی ہو اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا ہو۔

''ایسا ہر دور میں ہوتا آیا ہے کہ کوئی بھی شخص گروہ میں خود کو ''اوتار'' یا ''اَن داتا'' بنانے کی ایک نفسیاتی بیماری میں مبتلا رہتا ہے۔ لولوش بھی ایسا ہی ایک نفسیاتی مریض ہے۔ وہ کوئی ایسی ہی ماورائی طاقتوں کا حامل شخص ہوتا تو اب تک بار بار میرے ہاتھوں ذلت آمیز اور رسوا کن شکست نہیں کھار ہا ہوتا۔

''میں معذرت خواہ ہوں روڈلف! کہ میں اب یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اب تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ روڈلف بڑی چالاکی سے مجھے لولوش سے خوف زدہ کرکے ایک ایسی لاحاصل مہم جوئی میں الجھانا چاہ رہا تھا جو مجھے میرے اپنے اہم مقصد سے کوسوں دور کر ڈالتی لیکن اس کا فائدہ اسے اور اس کے دوستوں (یاسمین وغیرہ) کے حصے میں جاتا۔ دوسری بات یہ بھی طے تھی کہ میرا دل اب بھی یاسمین والے معاملے میں روڈلف سے صاف نہیں ہوسکا تھا۔ وہ پہلے سے ہی ایک ایسے منصوبے کے راستے پر گامزن تھے جس کی منزل میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

''تو کیا تمہیں میری کسی بات پر یقین نہیں آیا ہے؟ تم سمجھ رہے ہو ہم تمہیں استعمال کرنا چاہ رہے ہیں؟'' روڈلف کی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ چہرے سے بھی ایک متاسفانہ سی حیرت مترشح تھی۔

''سوری دوست! مجھے میری منزل کی جانب اکیلے ہی سفر پر جانے دو تو بہتر ہوگا۔ تمہیں تمہاری مہم مبارک ہو۔''

''میرا خیال ہے مسٹر شہزی۔ کی بات ٹھیک ہے۔'' اچانک ڈاکٹر حماد نے طویل خاموشی کے بعد لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے کہ یہ مہم خالصتاً ہماری اپنی ہے۔''

''لیکن...... حماد! ہمیں مسٹر شہزی کو بتانا تو چاہیے کہ ہمارا دشمن مشترکہ ہے۔'' یاسمین نے اچانک کہا اور میرے کھنڈی ہوئی خاموشی لیے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ ''جبکہ ہماری مہم کا مقصد بھی تو لولوش کو ایک طرح کی شکست سے ہی سے دوچار کرنا ہے۔''

مجھے یاسمین کے منہ سے یہ سن کر کچھ حیرت ہوئی تھی، کہاں تو اس نے کیپٹن رانسے کی کسٹڈی میں مختصراً تحریری تبادلے کے دوران اپنے ''رقعے'' میں روڈلف کو میرے بارے میں لکھا تھا کہ...... ''مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہے۔ مجھے صرف تم سے مطلب ہے۔ اس سے جان چھڑاؤ، تاکہ ہم اپنی راہ لے سکیں۔ ہمارا مشترکہ مفاد اس سے زیادہ اہم ہے۔'' لیکن...... اب وہ مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ شاید وہ کوہارا جیسے خطرناک آدمی کے ساتھ میری خوں ریز اور دلیرانہ جنگ سے متاثر ہوئی تھی۔

''بہرکیف...... '' میں نے کہا۔ ''لولوش کے اور بھی بہت دشمن ہو سکتے ہیں اور یقیناً ہوں گے اور...... وہ اپنے اپنے طور پر اس سے نمٹ رہے ہوں گے۔ جبکہ میرا معاملہ اور ہے۔ میں امریکا لولوش سے جنگ کرنے نہیں جا رہا ہے، یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، میرا اپنا ایک مقصد ہے اور میں اسی مقصد پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنا چاہتا ہوں......

''ہاں! اس درمیان میں اگر کوئی رخنہ انداز ہوتا ہے، تب میں اس کے خلاف حرکت میں آتا ہوں، اس لیے کہ مجھے آگے کے لیے اپنا راستہ بنانا ہوتا ہے۔ اسی طرح لولوش ہی نہیں جو کوئی بھی میری راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرے گا، میں ایسا ہی کروں گا، ایک اور بات بتائے چلتا ہوں۔'' میں اتنا کہہ کر ذرا رکا۔ پھر ایک گہری سانس لی اور پہلے سے بھی زیادہ مستحکم لہجے میں دوبارہ بولا۔

''مجھے اس ساری کائنات میں صرف ایک ہی ہستی پر کامل بھروسا ہے اور وہ ہے میرا اللہ...... جتنا بڑا نام اتنا ہی بڑا آسرا...... ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے میں ہر مشکل گھڑی میں اسی پاک ذات کو پکارتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں وہی اول و آخر مشکل کشا ہے میرا، اس کے سوا سب ہیچ ہے۔ اب تک اسی نے ہی طاقتور سے طاقت ور دشمنوں کے مقابلے میں مجھے سرخرو فرمایا ہے اور آئندہ بھی وہی میری دست گیری فرمائے گا۔ پورا یقین ہے مجھے اور یہی یقین میرا ایمان بھی......''

''بے شک......'' بے اختیار یاسمین خانم اور حماد رضا کے لبوں سے برآمد ہوا تھا۔

روڈلف نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میرے چہرے سے ہویدا ہوتے غیر معمولی جوش اور شدتِ عزم کی تندی کو محسوس کر کے اس سے بولا نہیں گیا۔

''مجھے اپنا راستہ الگ بنانا ہوگا۔ میں اب اکیلا ہی امریکا روانہ ہونا چاہتا ہوں لیکن ساتھ ہی روڈلف! میں تمہارا مشکور رہوں گا کہ تمہارا اور میرا ساتھ جس قدر رہا شاندار رہا۔''

میں نے بات ختم کر دی لیکن میں نے دیکھا کہ روڈلف کے چہرے پر نہایت کرب اور افسردگی کے تاثرات تھے۔ اس نے عجیب سے انداز کی خاموشی طاری کر لی تھی اپنے چہرے پر۔ تاہم اس کے چہرے کا اُبال اور اتار چڑھاؤ اس کی اندرونی کیفیات کا پتا ضرور دے رہے تھے محسوس ہو رہے تھے جیسے وہ کسی کشمکش میں ہو۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب کسی بحث میں پڑے بغیر مسٹر شہزی کی بہ خیر و عافیت امریکا روانگی کا بندوبست کر دینا چاہیے۔'' اس بار ڈاکٹر حماد رضا نے کہا۔

''تمہارا مشکور ہوں ڈاکٹر حماد!'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر ممنون لہجے میں کہا۔ ''تازہ پیش آئند صورتِ حالات میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ میری منیلا سے امریکا روانگی کس حد تک ممکن ہے؟''

''اس کے لیے تمہیں تھوڑے دنوں کے انتظار کی ضرورت ہوگی۔'' یاسمین نے کہا۔

''پولیس میں میری کوئی نومی نیشن نہیں ہے۔ رہا کیپٹن رانسے کی ہلاکت اور ساحل پر واقع اس ہٹ پر کوہارا وغیرہ سے لڑائی کا معاملہ تو میرا نہیں خیال کہ پولیس اس میں ہماری موجودگی کا سراغ پا سکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے پولیس سے جان چھڑائی تھی، اب یہ مردود کوہارا بھی یہاں آن پہنچا تھا اور کاسپا کو تو پہلے ہی یہاں پہنچ ہی چکا ہوگا۔ ان دونوں سے اگر میں پھر جنگ میں الجھ جاتا تو میرا امریکا والا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ سکتا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ پھر میں بھی منیلا ہی کی نہیں بلکہ پورے فلپائن کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پولیس کی زد میں آجاتا۔ میرا نکلنا دشوار تر کر دیا جاتا۔ منیلا ہے...... کاسپاکو اور کوہارا کی اور بات تھی، وہ دونوں پروفیشنل کرمنلز تھے۔ میرا معاملہ دوسرا تھا۔ میں امریکا تک اپنا معاملہ ''صاف'' اور سیدھا ''رکھنا چاہتا تھا۔ کسی بھی قسم کی ''کرمنل نومی نیشن'' میرے کاز کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔

''پھر بھی کم از کم ایک دو روز کا انتظار مناسب رہے گا۔'' یاسمین نے کہا تو ڈاکٹر حماد نے مجھ سے پوچھا۔

''تم امریکا کی کون سی ریاست یا شہر پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''کیلی فورنیا۔'' میں نے جواب دیا۔ ایسے میں عارفہ سے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو میری سماعتوں میں گونجنے لگی۔

''وہاں تمہارا کوئی اپنا عزیز یا رشتے دار ہے؟''

''ہاں بھی اور نہیں بھی......''

''کیا مطلب......؟''

''میری ایک دور کی عزیزہ ہیں، وہ ابھی پاکستان میں ہی ہیں، البتہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں وہ امریکا آتی جاتی رہتی ہیں۔ وہاں بھی ان کا کاروبار ہے۔ سان ڈیاگو میں ان کی رہائش ہے۔ وہ وہیں ٹھہرتی ہیں۔ وہاں میرے کچھ اور ساتھی مددگار بھی ہیں۔''

''ہم......'' حماد نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد یاسمین نے روڈلف سے پوچھا۔

''روڈلف! تمہارا کیا خیال ہے؟ اب تو مسٹر شہزی نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ ہمارے راستے الگ ہیں؟''

اب ہم تینوں کی نظریں بیڈ پر دراز روڈلف کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر اندرونی کشمکش کا غماز نظر آرہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ روڈلف اگر چاہے بھی تو میرے ساتھ نہیں جاسکتا۔ اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ سفر کرسکے۔'' میں نے اس کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی کہہ ڈالا۔ درحقیقت میں روڈلف کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا جھکاؤ...... یاسمین خانم اور ڈاکٹر حماد کی مہم کی طرف زیادہ تھا۔

''ہرگز نہیں......'' اچانک روڈلف نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ دنیا کے آخری کونے کا بھی سفر کرسکتا ہوں بڈی! تم مجھ سے جان نہیں چھڑا سکتے، سمجھے تم......'' اس کے لہجے میں دوستانہ انداز کی برہمی تھی۔ ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا، تمہیں میری اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو یار......!'' میں نے چونک کر اور کسی قدر حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم ان کے ساتھ اپنی مہم کو جاری رہنے دو، جو شاید پہلے سے طے شدہ بھی تھی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ کیونکہ اندازہ میرا ابھی تھا کہ وہ آیا ہی منیلا اسی مقصد کے لیے تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یاسمین اور ڈاکٹر حماد یہیں موجود تھے۔ لیکن اس نے مجھ سے چھپائی تھی یہ بات اور یہی بات ہمارے بیچ وجہ تنازعہ بنی تھی۔

''تم اب بھی مجھ سے بددل ہو بڈی......!'' اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

''ہرگز نہیں میرے یار روڈلف!'' میں نے کھلے دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے اصل ساتھیوں کے ساتھ رہو لیکن مجھے جانے دو، میرا جانا ضروری ہے۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے، اب تمہیں کون روک رہا ہے؟'' وہ بولا۔ ''لیکن میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''تم میری دوستی کی خاطر ایسا کہہ رہے ہو؟'' میں نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''امریکا میرا وطن ہے، میرے بیوی بچے وہاں ہیں، وہ میرے منتظر ہیں، میں...... تو اپنی بیوی ماریا، بیٹے انتھونی اور بیٹی جولی سے فون پر بات بھی کر چکا ہوں، وہ میری آواز سن کر بے حد خوش ہوئے تھے اور بے چینی سے اب میری آمد کے منتظر ہیں۔''

میں خاموش ہوگیا اور دزدیدہ سی نظروں سے ڈاکٹر حماد رضا اور یاسمین کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے بشروں پہ پُرسوچ سی خاموشی کا راج تھا۔

بالآخر حماد کھڑا ہوگیا۔ یاسمین بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حماد بولا۔ ''رات بہت ہوگئی ہے، باقی باتیں کل ہوں گی۔ آرام کرنا چاہیے ہمیں اب۔''

وہ دونوں چلے گئے۔ جاتے وقت یاسمین نے مجھے اسی کمرے میں رات گزارنے کا کہہ دیا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے ہی میں چند گھنٹوں کی نیند لے چکا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہمیں ذرا تنہائی میسر آئی تو روڈلف نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہیں نیند آرہی ہے بڈی؟''

"نہیں تو، شاید تم سونا چاہتے ہو؟"
"میں تو سویا ہوا ہی ہوں ایک طرح سے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اب میں کیا بات کروں؟ تم نے چیپٹر ہی کلوز کر دیا۔"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اچانک مجھے ایک بات کا خیال آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔
"ایک بات شاید اب تک کلیئر نہیں ہوئی۔"
"کون سی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔
"پروفیسر جمشید بے...... والی، وہ یہاں کہیں نظر نہیں آ رہا ہے؟"
"وہ یہاں ہے بھی نہیں۔" روڈلف نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"تو پھر کہاں ہے وہ......؟" میں نے قدرے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
"نارتھ ویسٹ اسٹریٹ کے ایک مکان میں...... ہے۔ وہ مکان ایک بنگلہ دیشی مسلمان حفیظ اللہ کا ہے۔ وہ ان کا ایک مہربان میزبان ہے۔"
"اور...... یہ شاندار بنگلا......؟"
"یہ پروفیسر کی ملکیت ہے۔ وہ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی کسی مصری مہم کے سلسلے میں روانہ ہوتے ہیں تو یہاں چند دن ضرور ٹھہرتے ہیں۔ یہ جگہ انہیں پسند ہے۔" روڈلف بولا۔
"جب اسپیکٹرم نے انہیں اپنے نئے اسائنمنٹ کے سلسلے میں امریکا بلایا تھا اور مسٹر ڈی کارلو انہیں خاطر خواہ وسائل کے ساتھ یہ مہم ہینڈ اوور کر رہے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ شامل تھا، پہلے ہم دونوں مصر گئے تھے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود ہمیں بنتِ نیل (ثمانہ) کی ممی ملنا تو در کنار وہ ڈارک گریٹ پیرامڈ کو بھی نہ تلاش سکے تھے۔ کیونکہ مصر میں صرف ایک ہی اہرام نہیں ہے، نجانے کتنے ہیں، لیکن ہماری ناکامی کی وجہ یہی تھی کہ ہمارا ہوم ورک اور اس سلسلے میں تحقیق کمزور ثابت ہوئی تھی، تاہم پھر بھی میں اور پروفیسر جتنے دن قاہرہ میں رہے، تھوڑی بہت معلومات اور عملی کام کرتے رہے تھے۔ مگر لوٹنا ہمیں خالی ہاتھ ہی پڑا تھا۔
"اور...... پھر اسی دوران مسٹر ڈی کارلو کی جگہ اس شیطان لولوش نے لے لی تو یہ کام التواء کا شکار ہو گیا۔ جمشید بے نے بھی بددل ہو کر اسپیکٹرم کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا، مگر درونِ خانہ وہ اپنی جستجو میں لگے رہے، تب میں بھی کافی حد تک نیویارک میں رہتے ہوئے پروفیسر کی مدد اور رہنمائی سے کم یا زیادہ، بنتِ نیل کے گمشدہ مقبرے کی تلاش کے سلسلے میں مضامین اور نقشے وغیرہ اکٹھے کرتا رہا تھا۔
"لیکن اِدھر جمشید بے نے جب سے اسپیکٹرم سے ناتا توڑا ہے اور "ڈارک گریٹ پیرامڈ" کا کھوج اور بنتِ نیل یعنی ثمانہ کی ممی کی تلاش کے سلسلے میں لولوش سے ان کی رنجش کا آغاز ہوا ہے تب سے وہ ایران سے یہاں فروکش ہیں۔ ان کی تلاش سے پہلے کی ساری منصوبہ بندی اور تحقیق کا کام پوری یکسوئی کے ساتھ وہ یہاں نمٹا چکے ہیں۔ اب بس روانگی کی دیر تھی۔ اس بار وہ اپنی بیٹی یاسمین اور شاگرد حماد رضا کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، کیونکہ وہ بھی اب ان کے مددگار بن چکے تھے۔ اُدھر لولوش جو انہیں پہلے لالچ اور پھر دھونس دھمکی سے ساتھ ملانے اور قائل کرنے کی کوشش میں ناکام رہا تو انہیں اغوا کرنے کا آخری حربہ استعمال کیا۔
"ایران میں اپنے ایک سابقہ نمائندے کی مدد سے جو خود بھی ایک کرمنل تھا، جمشید بے کو اغوا کرنے کی کوشش چاہی، کوہارا کو اس نے خاص طور پر ان کے پیچھے برما سے تہران روانہ کیا تھا۔ یوں دو بار پروفیسر پر حملے ہوئے اور انہیں اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی، لیکن...... اس طرح اس مذکورہ مہم کے سلسلے میں جاری تحقیقاتی پروگرام ڈسٹرب ہونے لگا۔ کیونکہ وہ مہم پر جانے سے پہلے اس پر تفصیلی ہوم ورک کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مناسب جانا کہ وہ عارضی طور پر تہران سے یہاں فیلا نکل آئیں، ان کی روانگی کو انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا، مگر جانے کس طرح اس مردود موذی کوہارا کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ کئی دن تہران میں خاک چھاننے کے بعد فیلا آن پہنچا۔"
روڈلف کی بات مکمل ہوئی تھی کہ اچانک...... میں چونکا۔ روڈلف میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔
"کیا ہوا......؟" اس نے پوچھ لیا۔
"شش...... کوئی گڑبڑ محسوس کر رہا ہوں میں......"
میں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نہایت ہولے سے اور سرسراتے لہجے میں کہا۔
روڈلف کو یکایک چپ سی لگ گئی...... میں اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

زندگی بھر کی رفاقتیں اور رشتے اس لیے استوار کیے جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے دکھوں کا ازالہ کیا جائے... مگر کچھ لوگ رشتوں کا بھرم رکھنا نہیں جانتے... وہ صرف دولت کے پجاری ہوتے ہیں... اس کی اسیری میں زندگی تمام کر دیتے ہیں... دھوکا فریب اور دغا بازی کا ایسا جال جس میں الجھ کے وہ سب گرتے ہی چلے گئے...

دولت کی طاقت اور اس کے پیچھے خوار ہونے والوں کا قصہ......

پیسے کا کھیل

تمکین رضا

"ولسن! اوئے ولسن سیلی ناس!"

یہ آواز سن کر مجھے یوں لگا جیسے بہت سے خشک پتے سیمنٹ کے فرش پر گر رہے ہوں۔ میں نے سڑک پار کرتے ہوئے پکارنے والے کی جانب دیکھا۔ وہ ٹاٹینڈا کے بیرونی احاطے میں ایک پلاسٹک کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں ڈھلوان اور ٹوٹی پھوٹی سڑک ختم ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً میری ہی عمر اور جسامت کا تھا۔ عمر پینتیس کے لگ بھگ، قد پانچ فٹ چھ انچ اور وزن ایک سو چالیس پونڈ کے قریب۔ مجھے اس کی شکل کچھ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جانی پہچانی لگی۔ میں پندرہ سال امریکا کے ساحلی شہر سیئٹل میں گزارنے کے بعد حال ہی میں اپنے آبائی شہر کوئینکا آیا تھا جسے ایکواڈور کا دل کہا جاتا ہے اور تبھی سے میں جانے پہچانے لوگوں کی تلاش میں تھا۔

''آؤ بیٹھو۔'' اس نے ایک ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے ایک بڑی سی بیئر کی بوتل پکڑی ہوئی تھی۔

''میں تمہارے لیے بیئر منگواتا ہوں۔'' اس نے فراغ دلانہ انداز میں کہا۔

تب میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ ایمیلو مارزا تھا۔ میرے اسکول کے زمانے کا کلاس فیلو گو کہ ہم دوست نہیں تھے لیکن ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور ہماری کئی لوگوں سے واقفیت تھی۔

''میں شراب نہیں پیتا۔'' میں نے اسے بتایا۔ یقیناً اسے یہ سُن کر تعجب ہوا ہوگا کیونکہ مجھ جیسا شخص شراب سے کیسے دور رہ سکتا ہے جس کا ماضی داغ دار ہو اور اس نے کئی برس تک ایسے کام کیے ہوں جنہیں معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ میں نے شراب پی کر ٹیکسی بھی چلائی تھی۔ میری بچپن سے ہی آرزو تھی کہ پرائیویٹ سراغ رساں بنوں لیکن شراب نوشی اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی لہٰذا مجھے اسے ترک کرنا پڑا۔

''معافی چاہتا ہوں۔'' ایمیلو نے اپنی بیئر کی بوتل پکڑے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے اسے چھپانے کی جگہ تلاش کر رہا ہو۔ ''جون نے کہا تھا......''

میں اس سے مصافحہ کر کے بیٹھ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب سے شریفانہ زندگی اختیار کی تھی۔ میں جون سانچی سے نہیں ملا تھا۔ اگر ایمیلو نے اس سے کوئی بات کی تھی تو شاید جون نے اسے میری شراب نوشی کے زمانے کی کچھ کہانیاں سنا دی ہوں۔ جون میرا اچھا دوست تھا لیکن اسے گپیں مارنے کی عادت تھی اور چھوٹی سی بات کو بڑھا کر بیان کرتا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنا شغل جاری رکھو۔ اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔'' حالانکہ میں نے جھوٹ کہا تھا۔ اسے پیتا دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا کیونکہ مجھے شرافت کی زندگی اختیار کیے صرف ڈھائی ہفتے ہوئے تھے۔

''میں تمہارے لیے کچھ اور منگواؤں پانی یا......'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ فانٹا لے آؤ۔''

وہ کاؤنٹر کی طرف لپکا اور میرے لیے اورنج سوڈا کی بوتل لے آیا۔ جسے میں وائن اور بیئر کے متبادل کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ وہ نوعمری کے زمانے میں خوش شکل اور اچھا ایتھلیٹ تھا اور اب بھی اس نے اپنی خوب صورتی اور کسرتی جسم برقرار رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ وہ ہر ایسا کام کر رہا تھا جس سے اس کی یہ دونوں خوبیاں ظاہر نہ ہوں۔ اس نے ایک خاکی پتلون اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس کا رنگ اُڑ چکا تھا۔

''جون نے کہا تھا کہ شاید تم میری مدد کر سکتے ہو۔'' اس نے بیئر کا لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ اس کے گلے کی رگیں تن گئیں اور چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آنے لگے۔

''اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔'' میں نے اپنا سر پیچھے کیا اور سوال پوچھنے کے بجائے گلے پر انگلی رکھ دی۔

''اچھا یہ۔'' اس نے بے دھیانی میں اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے چند ہفتے پہلے دو رسولیاں نکلوائی ہیں۔ ابھی زخم پوری طرح نہیں بھرا۔'' اس نے بیئر کا چھوٹا گھونٹ لیا اور منہ بنائے بغیر نگل گیا۔

''معاف کرنا، مجھے معلوم نہیں تھا۔''

''اوہ، کوئی بات نہیں۔ اس نے اپنا ہاتھ ایسے ہلایا جیسے مکھی اُڑا رہا ہو۔ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس کا اس معاملے سے بہت گہرا تعلق ہے کہ میں تمہاری خدمات کیوں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اب تم ایک سراغ رساں ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟ جون نے بتایا ہے کہ تمہارا دفتر یہیں کہیں قریب میں ہے۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے ستاسی ڈالر ماہانہ پر سڑک کے پار آٹو ریپئر شاپ کے اوپر ایک بغیر کھڑکیوں والا چھوٹا سا دفتر کرائے پر لیا تھا۔ جس میں ہر وقت تیل اور گیس کی بُو آتی رہتی تھی۔ البتہ اس میں داخل ہونے کا راستہ الگ سے تھا بشرطیکہ آپ کو بغیر ریلنگ کی زنگ آلود لوہے کی سیڑھیاں چڑھنے پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس کے علاوہ میرے مالک مکان نے اپنا وائی فائی اکاؤنٹ استعمال کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔

میں نے اپنی قمیص کی جیب سے کارڈ نکالا اور اس کے سامنے میز پر رکھ دیا جو میں نے حال ہی میں چھپوایا تھا۔ ''ولسن سلی ناس، پرائیویٹ سراغ رساں۔'' اس کے نیچے میرا فون

نمبر درج تھا۔

''یقیناً یہ ایک دلچسپ کام ہوگا۔'' اس نے کارڈ کو ہاتھ میں لے کر کہا۔

''بس ٹھیک ہی ہے۔'' میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ اسے کیا بتاتا کہ اب تک مجھے ایک مقامی وکیل نے ہی تھوڑا بہت کام دیا ہے جس میں کاغذات کی ترسیل سے لے کر لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شامل تھا۔

''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں دوست۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''میرے کام کا تمہارے گلے سے کیا تعلق ہے۔''

''میں گلے کی بات نہیں کررہا بلکہ اس مسئلے کا تعلق میری آواز سے ہے۔''

''تمہاری آواز؟ کیا زخم بھرنے کے بعد بھی گلے کی خراش ختم نہیں ہوگی؟''

''ہاں۔'' اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ شاید اب میں پہلے کی طرح نہ گا سکوں۔''

''کیا تم گلوکار بھی ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت زیادہ مشہور نہیں تھا۔'' اس نے اپنے والٹ سے ایک تصویر نکال کر دکھائی۔ اس میں وہ ایک عورت کے ساتھ پلاسٹک کے پھولوں کی قطار کے سامنے پوز بنائے ہوئے کھڑا تھا۔ انہوں نے ایک بینر پکڑ رکھا تھا جس پر درج تھا۔ 'پرائمر پریمیو۔ پہلا انعام۔'

''خوب صورت عورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے مجھے شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو مسئلہ ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں کہنا چاہ رہا تھا کہ اس طرح کے کام نہیں کرتا لیکن مجھے کئی بلوں کی ادائیگی کرنا تھی۔ اس لیے اپنا منہ بند رکھا۔

''تم نے دیکھا۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہم ایک ساتھ کراؤکی، میں گایا کرتے تھے۔''

''کراؤکی؟'' اب میرے بناوٹی انداز میں مسکرانے کی باری تھی۔

''یہ موسیقی کا مقابلہ ہے جس میں مشہور نغمے گائے جاتے ہیں اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کئی مقبول گلوکار انہی مقابلوں کی دریافت ہیں۔''

''کسی ایک کا نام بتاؤ۔'' میں نے دل میں سوچا لیکن منہ سے نہیں کہا۔ اس کے بجائے میری زبان سے نکلا۔ ''گویا تم میری خدمات اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہو کہ اپنی آواز حاصل کرسکو؟''

میرا خیال تھا کہ میں نے کوئی مضحکہ خیز بات کہی ہے لیکن لگتا تھا کہ وہ اسے نہیں سمجھ سکا بلکہ اس نے ایسا ردِعمل ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور جب وہ شروع ہوگا تو پانچ منٹ تک بولتا رہے گا۔ اب وہ خود نہیں گا سکتا تھا لیکن وہ اپنی بیوی مونیکا کو اس کے خوابوں سے کیسے محروم کرسکتا تھا چنانچہ اس نے تجویز پیش کی کہ وہ اس کے بھائی ہیکٹر کے ساتھ گانے گائے۔ اس تصویر میں بھی وہ نہیں بلکہ اس کا بھائی تھا۔

اب میں نے اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ میری نظریں اس عورت کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے سیاہ گھنے اور چمکدار بال، ابھری ہوئی رخساروں کی ہڈیاں، بادامی آنکھیں، ستواں ابھری ہوئی ناک جس سے اس کی دلکشی میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔

ہیکٹر اپنے بھائی سے ایک یا دو سال بڑا تھا لیکن اگر بچپن میں کوئی انہیں دیکھ لیتا تو وہ جڑواں لگتے۔ وہ اب بھی ایمیلو سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے بال عمدگی سے تراشے گئے تھے اور اس نے اسٹائلش لباس پہن رکھا تھا۔ وہ فخریہ انداز میں مونیکا کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے وہ اس کی بھابی نہیں بلکہ دوست ہو۔

''تم نے دیکھا؟'' ایمیلو نے تصویر پر انگلی رکھی اور اسے واپس والٹ میں رکھ لیا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''بتاتا ہوں۔'' اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ''مجھے دو روز کے لیے گویا کوئل جانا ہے۔ ہم ائرپورٹ پر واقع نیوہلٹن میں ٹائل لگا رہے ہیں۔''

اب میں سمجھ گیا کہ اس کے کپڑوں پر دھبے کیوں لگے ہوئے تھے اور اس کی پک اپ کے ٹائروں پر سیمنٹ نظر آنے کی کیا وجہ تھی۔

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم دو دن مونیکا پر نظر رکھو اور اس بات کو یقینی بناؤ کہ ہیکٹر......تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں، میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس نے مجھے منہ مانگا معاوضہ دینے کی پیشکش کی لیکن جب میں نے اسے اپنی فیس بتائی تو پریشان ہوگیا۔ بہرحال تھوڑی سی بحث کے بعد ہمارے درمیان دو دن کا معاوضہ پینسٹھ ڈالر طے پا گیا۔

میں باتھ روم چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ اپنی خالی بیئر کی بوتل دیوار کے ساتھ لگے ہوئے زرد رنگ کے پلاسٹک کے ڈبے میں ڈال رہا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''معاف کرنا، تمہاری سوڈا کی بوتل گر گئی۔'' اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ حالانکہ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ''میں تمہارے لیے دوسری بوتل لے کر آتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں، وہ تقریباً خالی ہو چکی تھی۔''

☆☆☆

جن دوستوں کے ساتھ میں نے ان گلیوں میں اپنا بچپن گزارا تھا۔ وہ بھی اب بڑے ہو گئے تھے اور ان میں سے زیادہ تر اسی شہر میں مقیم تھے۔ ان میں سے کچھ کبھی یہاں سے نہیں گئے اور چند ایک میری طرح دوسرے شہروں میں جا کر بس گئے تھے لیکن اب وہ بھی مختلف وجوہات کی بنا پر واپس گھر آ گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے ساتھ میرا دوبارہ رابطہ ہو چکا تھا اور وہ ایک دو مرتبہ میرے نئے پیشے میں کارآمد ثابت ہوئے تھے۔

جیم اور ٹیگا کو ہم موٹے ریچھ کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ لڑنے بھڑنے کا ماہر تھا اور اس کی خدمات کرائے پر حاصل کی جا سکتی تھیں۔ جان موریل کچھ عرصہ پولیس میں رہ چکا تھا اور مقامی انتظامیہ سے اس کے اچھے تعلقات تھے اور میرا بہترین دوست جون سانچی جو ریٹائرڈ ورلڈ کلاس فٹ بال کھلاڑی تھا اور خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ وہ بھی حال ہی میں کوٹینکا واپس آیا اور اس کا ایک ہیرو کی طرح استقبال ہوا تھا۔

ان میں جیم اور جان سے کام لینے کے لیے مجھے معاوضہ ادا کرنا پڑتا لیکن جون کو ایسے بدمزہ کام کے لیے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی جبکہ میری نظر میں یہ ایک فائدہ مند کوشش تھی کیونکہ اس وقت میرے پاس کوئی اور منافع بخش کام نہیں تھا جس سے کچھ رقم ملنے کی امید ہوتی اور مجھے مکان کا کرایہ دینا تھا۔

میری غیر حاضری میں یہاں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں اور دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی میرے لیے ایک نئی دنیا تھی۔ ایک پوری برادری اپنے انفرادی گھروں کے بجائے ایک ہی چار دیواری میں رہائش پذیر تھی۔ یہ شہر کے مشرقی کنارے پر واقع ایک جدید طرز کا کمپلیکس تھا۔

تقریباً دس بج چکے تھے اور میں دو گھنٹے سے جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایمیلو نے مجھے اپنی پک اپ کے عقبی حصے میں ترپال میں لپیٹ کر یہاں تک پہنچایا تھا۔ اس طرح میں گارڈ کی نظروں میں آنے سے بچ گیا۔ (پرائیویٹ سراغ رساں بننے کے خواہشمند اس طرح کی بے عزتی کے لیے تیار رہیں)

ایمیلو کا دو منزلہ سفید مکان جدت اور انفرادیت کا شاہکار تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ گھر کی تمام بتیاں روشن ہیں اور میں وقتاً فوقتاً ایک کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے مونیکا کا سایہ دیکھ سکتا تھا۔

قریب ترین اسٹریٹ لائٹ وہاں سے چار مکانوں کے فاصلے پر تھی۔ اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ ایمیلو کا بھائی ہیکٹر تھا جو ایک گھنٹے بعد ٹیکسی سے باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ مکان میں داخل ہوا اور چند منٹوں بعد میں نے دوسری منزل کی کھڑکی کے پار دو سایوں کو متحرک ہوتے دیکھا۔ اگر کھڑکی پر پردے نہ ہوتے تو میں اپنے بچپن کے دوست کی بے وفا بیوی کو دیور کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ سکتا۔

کاش معاملہ اس سے آگے نہ بڑھتا۔ شاید میں نے اُن کے بارے میں رائے قائم کرنے میں جلدی کی تھی۔ انگلی کے اشارے اور ناراضی کے اظہار کے بعد مونیکا مڑی اور اس سے دور ہونے لگی۔ ہیکٹر اسے اپنی طرف کھینچ کر اس پر جھکا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی ہتھیار ہے پھر دو دھماکوں نے اس کی تصدیق کر دی۔ مونیکا گر پڑی اور ہیکٹر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں اپنی جگہ پر لرز کر رہ گیا۔ یوں لگا کہ میرا سر چکرا رہا ہے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور مکان کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس دوران میں نو گیارہ کو فون کر چکا تھا۔ پھر مجھے رکنا پڑ گیا جب میں نے مکان کے اندر سے ایک اور فائر کی آواز سنی۔

سات باوردی پولیس والے منٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ اس کے بیس منٹ بعد سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک انسپکٹر گولن بھی وہاں آ گیا۔ اس کا جسم اور چہرہ چوڑا، اور تر و تازہ تھا۔ اس کی سیاہ گہری آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے بہت کچھ دیکھ رکھا ہے لیکن کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوا۔ وہ اس طرح اکتاہٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا جیسے قتل یا خودکشی کی تحقیقات کرنا اس کے لیے روزانہ کا معمول ہو۔

انہوں نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے اپنی کارروائی شروع کی اور ملحقہ بیڈروم سے انہیں ہیکٹر کی لاش مل گئی جسے ایک گولی لگی تھی۔ بظاہر لگتا تھا کہ اس نے نو ملی میٹر کا پستول اپنے منہ میں رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔

یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ ٹھیک ہے کہ ہیکٹر اور مونیکا کا جھگڑا ہوا تھا لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ کیا وہ اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ ایک شخص

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جذبات میں آکر کسی کو قتل کر دے اور پھر خود کو بھی گولی مار لے۔

مجھے ان کے تعلقات کا پس منظر معلوم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ جتنا ایمیلو نے بتایا اور میرا خیال تھا کہ شاید اس نے بھی مجھے پوری بات نہیں بتائی تھی۔

ایسی کیا بات تھی؟ اور ہیکٹر نے مونیکا کا پیچھا کیوں نہیں کیا جب وہ کمرے سے باہر جارہی تھی۔ اس کے بجائے وہ اسے کھینچ کر کھڑکی کے سامنے لے آیا تاکہ وہاں سے گزرتا ہوا کوئی بھی شخص یا اگر کوئی میری طرح جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو تو وہ اسے قتل کرتے ہوئے دیکھ لے۔

میں نہیں جانتا کہ ایمیلو میری نظروں میں آئے بغیر کس طرح مکان میں داخل ہوا اور پھر واپس بھی چلا گیا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ اسی نے اپنی بیوی اور بھائی کو قتل کیا ہے اور مجھے بیوی اور بھائی کی نگرانی پر مامور کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میں ان کے خلاف گواہی دے سکوں۔

''اس نے یقیناً اسے گولی ماری ہوگی۔'' میں نے فرش پر پڑی ہوئی ہیکٹر کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوجائے۔''

فارنسک والے شاید کل یا پرسوں یہاں آئیں۔'' گولن نے کہا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سنی ہو۔

میں جانتا تھا کہ پولیس کا یہ شعبہ کتنا مستعد اور فعال ہے۔ ممکن ہے کہ میرے بیرونِ ملک قیام کے دوران ان پندرہ سالوں میں کچھ تبدیلی آگئی ہو۔ ممکن ہے کہ اب یہاں پہلے کی طرح سفارش اور رشوت کا دور دورہ نہ ہو۔ شاید یہ میں اس لیے سوچ رہا ہوں کہ میں نے ٹیلی وژن پر امریکی پولیس کی کارکردگی کی بہت سی قسطیں دیکھ رکھی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے مقامی پولیس پر بالکل بھروسا نہیں تھا۔

''تمہیں چاہیے کہ مقتول کا پوسٹ مارٹم کرواؤ اور......''

''مقتول؟'' گولن جھلاتے ہوئے بولا پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ ''تکنیکی طور پر خودکشی بھی ایک طرح کا قتل ہے لیکن تم جانتے ہو کہ میرے لیے کتنی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں جب افسرانِ بالا کو معلوم ہوگا کہ میں نے اس کیس میں پوسٹ مارٹم کروانے کے لیے محکمے کا کتنا پیسا خرچ کر دیا۔''

میں نے ایک بار پھر احتجاج کرنا چاہا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے دو باوردی پولیس والوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے قریبی بس اسٹاپ تک چھوڑ آئیں۔

''واپسی میں میرے لیے کافی اور چند پیسٹریاں لیتے آنا۔''

جب انہوں نے مجھے بس اسٹاپ پر چھوڑا تو رات زیادہ ہونے کی وجہ سے بسیں چلنا بند ہوگئی تھیں۔ پولیس والے بھی اسے ایک مذاق ہی سمجھ رہے تھے لیکن انہوں نے وہی کیا جس کا حکم دیا گیا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے پرانے شرابی دوستوں کی محفل میں چلا گیا۔ اس وقت مجھے کسی مشروب کی شدت سے ضرورت محسوس ہورہی تھی۔

ایمیلو چندروز بعد میرے دفتر آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خاصے خوش گوار موڈ میں تھا جبکہ اس کی بیوی اور بھائی کی لاشیں اسپتال کے مردہ خانے میں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ خاصا مختلف نظر آرہا تھا۔

''تم نے اپنے بال کٹوا لیے۔'' وہ اب بھی اس کام والے لباس میں تھا لیکن بال کٹوانے کے بعد اس کی شکل حیرت انگیز طور پر اپنے بھائی سے مل رہی تھی۔

''گویا کوئل میں گرمی بہت تھی۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور ایک موٹا سا سفید لفافہ میری میز پر پھینک دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''تم سراغ رساں ہو۔ تمہیں اتنی سمجھ تو ہونی چاہیے۔''

اگر مجھے اپنے آپ کو قائل کرنے کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہوتی کہ اس نے ہی اپنے بھائی اور بیوی کو قتل کیا ہے تو اس کے لہجے کی تبدیلی نے وہ بھی فراہم کر دیا۔ چندروز قبل وہ بہت پریشان تھا لیکن اب پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ پُراعتماد اور مطمئن نظر آرہا تھا۔

میں نے وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں پانچ سو ڈالر کے نوٹ رکھے ہوئے تھے جبکہ ہمارے درمیان پینسٹھ ڈالر معاوضہ طے ہوا تھا۔ مجھے یہ کام شروع کیے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں تھا کہ امریکا میں دہرے قتل کو چھپانے کا کیا ریٹ ہے لیکن اس وقت یہ پانچ سو ڈالر میرے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ پر لالچ غالب آگیا۔

''نہیں۔'' میں نے اپنی اندرونی ہلچل پر قابو پانے کی کوشش کی اور چہرے پر سختی پیدا کرتے ہوئے کہا پھر میں نے لفافے میں سے ستر ڈالر نکالے۔ جس میں میرا معاوضہ اور پانچ ڈالر ٹیکسی کا کرایہ شامل تھا اور لفافہ اس کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم نے کیا کیا ہے اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔''

ایمیلو نے مٹھیاں بھینچ لیں اور کھڑا ہوگیا، پھر کندھے اچکائے اور یوں مسکرایا جیسے وہ کوئی ایسی بات جانتا ہے جس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے میں لاعلم ہوں پھر لفافہ اٹھایا اور چلا گیا۔
میں اگلے روز بھی اسی معاملے پر غور کر رہا تھا کہ انسپکٹر گولن دو سادہ لباس پولیس والوں کے ساتھ آگیا جو اس رات مجھے بس اسٹاپ پر چھوڑ کر آئے تھے۔ میرے کمرے میں پھیلی ہوئی بو سے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی لیکن ان سپاہیوں کے چہروں پر ناگوار تاثرات تھے۔ گولن میرے سامنے رکھی ہوئی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا بریف کیس میری میز پر رکھ دیا۔
''تمہارا کہنا ہے کہ اس رات گھر میں داخل ہونے سے پہلے تم نے ہمارا انتظار کیا۔''
''یہ درست ہے۔ جب تمہارے لوگ وہاں پہنچے تو دروازہ مقفل تھا۔'' یہ کہہ کر میں نے تصدیق کے لیے ان دونوں سپاہیوں کی طرف دیکھا لیکن وہ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے خاموش کھڑے رہے۔
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ گولن نے ان کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اس نے بریف کیس کھول کر اس میں سے خاکی رنگ کے کاغذ کا لفافہ نکالا جس پر فارنسک کی مہر لگی ہوئی تھی اور اس پر چار دن پہلے کی تاریخ درج تھی۔
''تو تم پہلے کبھی اس گھر میں نہیں گئے؟''
''ہاں یہ سچ ہے۔'' میرے پیٹ میں مروڑ ہونے لگے اور اس وقت مجھے شدت سے کچھ پینے کی طلب محسوس ہوئی۔
گولن کے چہرے کے تاثرات سے میں سمجھ گیا کہ وہ محض پیشہ ورانہ شائستگی کے طور پر ثبوت دکھانے کے لیے میرے دفتر نہیں آیا۔ مجھے ایمیلو کی مسکراہٹ یاد آئی جب میں نے اس کے پیسے واپس کیے تھے اور سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات جانتا ہے جو مجھے معلوم نہیں۔
گولن نے کاغذ کے لفافے میں سے ایک چھوٹا پلاسٹک بیگ نکالا۔ اس میں ایک خالی فانٹا کی بوتل تھی۔ حالانکہ یہ جنوبی امریکا میں ایک مقبول کولڈ ڈرنک ہے اور اس کی روزانہ ہزاروں بوتلیں خالی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود مجھے یہ یقین کرنا پڑا کہ یہ وہی بوتل ہے جو اس روز ریستوران کی میز سے غائب ہوگئی تھی جب میں پہلی بار ایمیلو سے ملا تھا اور اس پر میری انگلیوں کے نشانات تھے۔
مجھے زون سکس کے آفس لے جایا گیا جہاں انسپکٹر گولن نے میرا انٹرویو کرنا تھا۔
''کیا میں اپنے وکیل کو بلا سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔
''اس کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''
انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیے تھے لیکن مجھے اس وقت کھجلی محسوس ہونے لگی جب میں نے ایک نوجوان اور دبلی پتلی پولیس اہلکار کو گولن کے لیے ایک پلیٹ میں چاکلیٹ کے بسکٹ اور چائے کا کپ لاتے دیکھا۔
2009ء میں بھی مجھے سرِعام شراب نوشی کے الزام میں واشنگٹن کے مضافاتی شہر ریسٹن میں گرفتار کیا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک بار پھر وہیں آگیا ہوں، ہسپانوی زبان کے پوسٹرز کے علاوہ سب کچھ وہی تھا۔ پولیس والوں کی وردی، ان کی سیاہ رنگت اور چھوٹے قد، اس لحاظ سے مجھے دونوں جگہوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ عمارت کا فرش سلیٹی اور دیواریں سبز تھیں اور کھڑکیوں کے گرد لوہے کی چوکھٹ لگی ہوئی تھی۔
''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ میں نے ہیکٹر مارزا کو قتل کیا ہے؟''
''کیوں نہیں؟'' گولن نے بسکٹ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔
''میرے پاس اُسے قتل کرنے کا کیا محرک تھا؟''
''ہاں۔'' گولن نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
''یہی جاننے کے لیے تو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔''
''یہ سوال تمہیں ایمیلو مارزا سے کرنا چاہیے۔''
''اس کا بھائی؟'' وہ حیران ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔ ''اوہ ہاں۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ ''تم نے یہی بات اس رات بھی کہی تھی۔''
اس نے اپنی نظریں مجھ پر جما دیں اور خشک لہجے میں کہا۔ ''اگر اس روز تم اصرار نہ کرتے کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو ہم اس کیس کو قتل اور خودکشی قرار دے کر بند کر چکے ہوتے لیکن جب تفصیلی تحقیقات کی گئیں تو ہمیں اس بوتل پر تمہاری انگلیوں کے نشانات مل گئے۔''
گولن بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اسے میری بدقسمتی پر ہنسی آ رہی ہوگی کہ کس طرح میرے اصرار نے مجھے مشتبہ بنا دیا۔
''میں ایسا کیوں کرتا! مجھے ایسی تحقیقات پر اصرار کرنے کی کیا ضرورت تھی جو میرے خلاف جاتی؟''
گولن کو اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے پر ملکہ حاصل تھا۔ اس وقت اس نے جو تاثر دیا۔ اس سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا ہے اور واقعی میرے سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔
میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن سختی سے

بند کر لیا۔ میں نے سراغ رسانی کی کوئی تربیت نہیں لی تھی البتہ بچپن میں میونسپل لائبریری سے لے کر ریمنڈ چینڈلر کے ناول ضرور پڑھے تھے لیکن اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ ایک معمولی سی بات بھی نہ سمجھ پاتا۔ گولن کے چہرے کے تمام تاثرات ایک ہی جانب اشارہ کر رہے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔'' میں بولا تو گولن کا چہرہ ایک منٹ کے لیے سپاٹ ہو گیا۔

''تمہیں معلوم ہے۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔ ''شاید ہمیں بہت جلد تمہیں کوٹھڑی میں بند کرنا ہوگا تاکہ تم پر تشدد کر کے اعترافِ جرم کروایا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ کچھ چھوٹے شہروں میں اب بھی ایسا ہوتا ہے۔''

میں نے اپنا منہ بند رکھا۔ مجھے پیغام مل گیا تھا۔ گولن ابھی تک بید یا ربر کا پائپ منگوانے کے لیے تیار نہیں تھا کہ یہ ایک آپشن ہوسکتا ہے۔ اس نے دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا تو ایک پیٹرول مین کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مسلح اور یونیفارم میں ملبوس تھا۔ میں نے اس کے سینے پر لگا ہوا بیج پڑھا۔ اس کا نام ایم کرسٹوفر تھا۔ میں چہرہ شناس ہوں اور ایک ہی نظر میں کسی بھی شخص کو کتاب کے مانند پڑھ سکتا ہوں۔ وہ کسی غریب گھرانے کا فرد تھا اور پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد اس کی گردن میں سریا فٹ ہو گیا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ رات کو بھی یونیفارم اور جوتوں سمیت بستر میں گھس جاتا۔

تاہم یہ قیاس آرائی میرے کسی کام نہ آئی۔ جب وہ مجھے تہ خانے میں واقع میری کوٹھڑی میں لے جا رہا تھا تو میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ٹائل کے فرش پر اس کی ایڑیوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔

پولیس اسٹیشن کے تہ خانے کی تنگ راہداری میں ایک قطار سے تین حوالاتی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کا رنگ خراب ہو چکا تھا تاہم وہ صاف ستھری تھیں اور ایسی بُو آ رہی تھی جیسے وہاں جراثیم کش اسپرے کیا گیا ہو۔ مجھے درمیان والی کوٹھڑی میں رکھا گیا اور پہننے کے لیے گہرے نیلے رنگ کا جمپ سوٹ ملا جو کسی پستہ قد اور موٹے آدمی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ وہ ڈھیلا لباس میرے جسم پر جھول رہا تھا لیکن اس کی لمبائی دو انچ کم تھی۔ انہوں نے میری گھڑی، سیل فون، جوتے اور بیلٹ تک لے لی لیکن نہ جانے کس وجہ سے گھر کی چابیاں میرے پاس ہی رہنے دیں۔ ایک کونے میں بغیر سیٹ والا ٹوائلٹ اور ایک زنگ آلود لوہے کا سنک نصب تھا۔ اس کے علاوہ میرے سونے کے لیے ایک تہ کیا ہوا پتلا سا گدا اور اس سے بھی زیادہ پتلا تکیہ سیمنٹ کے فرش پر رکھا ہوا تھا۔

انہوں نے مجھے جو چادریں اور تکیہ کا غلاف دیا۔ ان کا رنگ بھی سفید رہا ہوگا لیکن اب کثرتِ استعمال سے ان کا رنگ ہلکا سلیٹی ہو گیا تھا اور ان پر زرد اور بھورے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ گوکہ وہ دھلے ہوئے تھے لیکن پھر بھی میں نے اچھی طرح جھاڑا، اور زور زور سے دروازے میں لگی ہوئی سلاخوں پر مارا جس پر کرسٹوفر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے جانے کے بعد میں تہ خانے میں تنہا رہ گیا۔ میں بستر کے کنارے پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ اب تک میں نے ہنس کھیل کر زندگی گزاری تھی اور میرے ہونٹوں پر ہمیشہ کوئی چبھتا ہوا جملہ تیار رہتا لیکن یہ معاملہ بہت سنجیدہ تھا۔

مجھے اس ملک کے قوانین کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ کیا مجھے فون کرنے کی اجازت مل سکتی ہے اور اگر مل بھی گئی تو میں کسے فون کروں گا۔ میں نے اپنے منتشر خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

میری نظر سامنے کی دیوار پر گئی۔ وہاں کسی نے سبز رنگ پر کھرچ کر لکھا تھا، 'جیسیکا' میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس کے بائیں جانب چند فٹ کے فاصلے پر لکھا تھا جیسیکا ایک طوائف ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ ایک شخص کی محبوبہ دوسرے کی نظر میں طوائف ہے پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ دونوں جملے ایک ہی قیدی نے لکھے ہوں۔

ممکن ہے کہ اگر میں اس بارے میں مزید کچھ منٹ سوچتا اور اس چھوٹے سے معمے کو حل کرنے کی کوشش کرتا تو میرے دماغ کو تھوڑی سی مہلت مل جاتی اور جب میں اپنے اصل مسئلے کی طرف واپس آتا تو مجھے اس کا حل تلاش کرنے میں بھی آسانی ہوتی۔

''تم نے واقعی نہیں سوچا ہوگا کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا ولسن؟'' میرے تازہ دم دماغ نے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے بجائے کچھ اور سوالات داغ دیے۔ ان میں سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ گولن مجھ سے اعترافِ جرم کروانے کی کوشش کیوں کر رہا تھا اگر اس کے پاس بوتل پر میری انگلیوں کے نشانات تھے؟

جب میں نے اس سوال پر غور کرنا شروع کیا تو میری سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ انگلیوں کے نشانات کا ثبوت اپنی جگہ لیکن میں تو مکان میں گیا ہی نہیں پھر یہ بوتل وہاں کیسے پہنچی اور میرا وکیل یہ اعتراض کر سکتا تھا کہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ گوکہ فی الحال میرا کوئی وکیل نہیں تھا لیکن یہ بعد کی بات

ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ ایمیلو نے مجھے منہ بند رکھنے کے لیے رشوت دینے کی کوشش کیوں کی اور جب میں نے وہ رقم لینے سے انکار کیا تو اس نے پلان بی پر عمل کرتے ہوئے مجھے پھنسا دیا۔

میں نے بستر پر لیٹ کر سوچنے کی کوشش کی پھر سلاخوں سے لگ کر کافی دیر تک کھڑا رہا پھر تھک کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بالآخر میرے ذہن میں ایک خیال آ ہی گیا لیکن اس کے لیے ثبوت کی ضرورت تھی جو موجودہ صورتِ حال میں ممکن نہیں تھا۔

میں نے اپنے پرانے ساتھیوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ جیم اور جان موریل نگرانی کے کاموں میں ماہر تھے اور ایسی ہی ایک کوشش کرتے ہوئے میں موجودہ صورتِ حال میں پھنس گیا البتہ میرا تیسرا دوست جون سانچی اس کام کے لیے بہت مناسب تھا۔ وہ نوجوانی سے ہی بین الاقوامی کھلاڑی تھا اور مقامی لوگ اُسے ہیرو کا درجہ دیتے ہیں لیکن سوال یہ تھا کہ اس سے رابطہ کیسے کیا جائے؟

اس سوال کا جواب مجھے اگلی صبح مل گیا۔ جب ایک دبلا پتلا شخص میرے جیسا لباس پہنے ہوئے ناشتا لے کر آیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی جیب پر سرکاری نشان کڑھا ہوا تھا۔ ناشتے میں مرغی کی ایک ٹانگ، تھوڑے سے سفید چاول اور اورنج سوپ تھا۔

پندرہ برس امریکا میں گزارنے کے بعد مجھے اپنے ہی وطن میں حالات سے دوبارہ مطابقت پیدا کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اس پر قابو پا لیا۔

”تم جون سونچی کو جانتے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”بالکل۔“ اس نے کہا اور دوبارہ قدم آگے بڑھا کر سر جھکا لیا۔ یہ ایک طرح سے عقیدت کا اظہار تھا کہ میں اسے اس کے ہیرو سے ملنے کا موقع فراہم کر رہا تھا۔

”مجھے ایک کاغذ اور قلم چاہیے۔“ میں نے کہا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا پھر اچانک ہی رک گیا۔

”اس طرف۔“ اس نے سرگوشی کی اور اپنے بائیں جانب چند فٹ کے فاصلے پر چلا گیا تاکہ اوپر لگے ہوئے کیمرے کی زد میں نہ آ سکے۔ جب وہ مطمئن ہو گیا تو اس نے نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑ کر پنسل کے ہمراہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اتنی دیر میں اپنے خیالات مجتمع کیے اور کاغذ کے دونوں جانب جون کے لیے پیغام لکھ دیا۔ نیچے اس کا فون نمبر بھی تھا تاکہ میرا محسن اس سے رابطہ کر سکے۔ میں نے وہ کاغذ اسے پکڑایا تو اس نے تعظیماً سر جھکایا پھر وہ خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے وہ کاغذ اس سے واپس لیا اور اس کے نیچے ایک سطر اور لکھ دی۔

”اس آدمی کو بیس ڈالر دے دینا۔“

اس بار وہ تقریباً میرے قدموں میں جھک گیا۔ اس نے احتیاط سے وہ کاغذ جیب میں رکھا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ناشتا شروع کیا۔ جس کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے لیکن جب بھوک لگی ہو تو سب چلتا ہے۔ میں نے منٹوں میں وہ ناشتا ختم کیا اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس کے بعد واقعات تیزی سے رونما ہونے لگے۔ میں نے حوالات میں دو دن گزارے اور چار مرتبہ کھانا کھایا۔ انہوں نے میرے پاس جو چابیاں چھوڑ دی تھیں۔ ان کا میں نے یہ مصرف نکالا کہ ان کی مدد سے دیوار کا رنگ کھرچ کر دن لکھنے لگا۔ لیکن تہ خانے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ اس لیے میں گزرے ہوئے وقت کا اندازہ اس کھانے سے لگاتا جو میرا چھوٹا دوست لے کر آتا تھا۔

تیسرے دن صبح کو میں نے کرسٹوفر کے قدموں کی آواز سنی لیکن اس کا انداز پہلے سے مختلف تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ زبردستی مارچ میں حصہ لینے کے بجائے پُرسکون انداز میں چل رہا ہو۔ قریب آنے پر میں نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جون ہی تھا اور اس کے چہرے پر وہی پُراعتماد مسکراہٹ تھی جو کئی برسوں تک درجنوں میگزین کے سرورق پر نظر آتی رہی۔ وہ کرسٹوفر کو کوئی قصہ یا لطیفہ سنا رہا تھا اور وہ ہر جملے پر بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو میں اور جون آپس میں گلے ملتے لیکن فی الوقت ہم نے سلاخوں کے پیچھے سے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔

”کیا حال ہیں؟“ اس نے اس طرح پوچھا جیسے ہم پولیس اسٹیشن کے بجائے کسی سڑک پر مل رہے ہوں۔

”مجھے تمہاری مدد چاہیے دوست۔“

”بالکل، مجھ سے جو ہو سکا وہ کروں گا۔“

”تم نے مجھے نہیں بتایا کہ جون سانچی کو جانتے ہو۔“ کرسٹوفر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”تم جاننے کی بات کر رہے ہو۔ ہم ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ یہ میرے بچپن کا دوست ہے۔“

”کیا واقعی؟“ اس نے جون کی طرف دیکھا جس نے سر ہلا کر تصدیق کی کہ یہ سچ ہے۔ کرسٹوفر کا انداز بالکل بدل

گیا۔ اب اُس کی نظروں میں میرے لیے عزت تھی۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ ہم نے بیس سال پہلے صرف ایک سیزن ساتھ کھیلا تھا۔

''کیا تم کونے پر جا کر انتظار کر سکتے ہو؟'' میں نے کہا تو کرسٹوفر کا منہ بن گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سرگوشی میں جون سے کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''میرا اندازہ ہے کہ تم نے شراب پی ہوگی اور......''

''میں شراب چھوڑ چکا ہوں۔'' میں نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔

جون نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی؟''

''جون، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھ پر قتل کا الزام ہے۔''

''قتل؟'' جون مڑکر کرسٹوفر کی طرف دیکھنے لگا۔ پہلے تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا پھر سر ہلا کر تائید کردی۔

میں نے جلدی جلدی پورا قصہ اُسے سنایا۔ اس دوران کرسٹوفر بھی قریب آ گیا تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو دونوں کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' جون نے ابتدائی صدمے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بار پھر پُراعتماد اور پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کو دیکھو۔'' میں کہتے کہتے رک گیا۔ میری نظریں کرسٹوفر پر تھیں جو آگے کی طرف جھک گیا تھا۔

''گولن۔'' اس نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔ ''تم جاننا چاہتے ہو کہ اگر گولن......''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اچھی طرح۔ کیا وہ بھی اس کھیل میں شامل ہے؟''

کرسٹوفر نے کندھے اچکا دیے اور ویڈیو کیمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے مزید کچھ نہ کہنا چاہ رہا ہو۔

''صرف یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایمیلو نے مجھے اس طرح پھنسایا کہ میں وقوعہ کا گواہ بن جاؤں اور ایسا لگے کہ اس کے بھائی نے مونیکا کو قتل کیا اور بعد میں خودکشی کرلی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا بیان اس سے مختلف ہے۔ شاید گولن نے اسے یہ بتایا ہوگا تو وہ میرے دفتر آیا اور مجھے رشوت دینے کی کوشش کی۔ شاید وہ میرے ماضی کے پیشِ نظر سمجھ رہا تھا کہ میں یہ خطیر رقم دیکھ کر پھسل جاؤں گا لیکن جب میں نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے پلان بی پر عمل کیا۔''

''تم سمجھتے ہو کہ گولن شروع سے ہی اس منصوبے میں شامل تھا؟'' جون نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایمیلو جانتا تھا کہ گولن کو خریدا جا سکتا ہے ورنہ وہ کبھی اس سے رجوع نہ کرتا۔''

''اگر ایمیلو جانتا تھا تو دوسرے لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہوگی۔''

''ظاہر ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے دوست۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔''

دو دن بعد جون کے ساتھ جو شخص آیا۔ وہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا۔ اس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ میرا نیا وکیل تھا۔

گارڈ نے میری کوٹھری کا تالا کھولا اور کچھ کہے بغیر انہیں اندر آنے دیا۔ پھر وہ کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا لیکن جب وکیل نے اسے ڈانٹا تو وہ راہداری کے آخری سرے پر چلا گیا۔

''نیلسن اڈرو۔'' وکیل نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''کرسٹوفر کے ساتھ کیا ہوا؟'' میں نے جون سے پوچھا۔

''پریشان مت ہو۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی نوکری ختم نہیں ہوئی۔ آج اس کی چھٹی ہے۔''

''جو کچھ اس نے ہمیں بتایا ہے اگر گولن کو معلوم ہو جائے تو شاید اس کے ساتھ اس سے بھی بُرا ہو۔'' وکیل نے کہا۔ ''تم اپنی جگہ صحیح تھے۔ ایمیلو نے تمہاری ذہانت اور دیانت کا غلط اندازہ لگایا۔''

''حالانکہ میرے لیے ایسا کرنا بہت مشکل تھا۔'' میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔ اس پر ان دونوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں سنجیدہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔''

''ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔'' نیلسن بولا۔ ''جب تم نے سوچا کہ ایمیلو نے اپنی بیوی اور بھائی کو قتل کیا ہے اور پیسوں کے عوض اپنا منہ بند رکھنے سے انکار کر دیا تو اسے جوابی کارروائی تو کرنا ہی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ گولن کو پہلے سے جانتا تھا یا لوگوں سے سنی ہوئی باتوں پر اعتبار کر کے اس تک

پہنچا لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ انہوں نے مل کر یہ کام کیا۔''

''یعنی مجھے اِس کیس میں پھنسا دیا؟''

''یقیناً تمہیں ڈرانے کے لیے۔'' وکیل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''گولن نے ابھی تک تم پر الزام عائد نہیں کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں۔ انہوں نے یہی سوچا ہوگا کہ ایک دو ہفتے یہاں رکھ کر تم سے بات منوانا آسان ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ زبان بند رکھنے کی قیمت ایک ہزار ڈالر یا اس سے بھی زیادہ کر دیں۔ اس کے باوجود بھی اگر تم نہ مانے.....'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''دو لاشیں پہلے سے مردہ خانے میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک کا اضافہ اور ہو جائے گا۔''

''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن وہ اتنی زحمت کیوں اٹھا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ ان کے پاس اس بوتل پر میری انگلیوں کے نشان موجود ہیں جو ایمیلو نے گھر میں رکھی تھی۔ گولن نے خود مجھے وہ بوتل دکھائی ہے۔''

''اس نے تمہیں ایک بوتل دکھائی ہے۔'' وکیل نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بوتل مکان میں نہیں تھی اور نہ ہی اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ فارنسک والوں نے چار دن میں اپنی کارروائی مکمل کی ہو اور پلاسٹک کی بوتل سے انگلیوں کے نشانات اٹھانا اتنا آسان نہیں۔ اس کے لیے انہیں بوتل کو کوسٹو، بھیجنا ہوگا۔ وہاں سے جواب آنے میں مہینے لگ سکتے ہیں۔''

میں اپنا سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ایک ایسے جرم میں پھنس گیا ہوں جو میں نے کیا ہی نہیں۔ جون نے تسلی دینے کے انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وکیل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''سارجنٹ کرسٹوفر نے ہمیں گولن کے پس منظر کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی ہیں جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ بعض اوقات اس کا طریقہ کار انتہائی دقیانوسی اور روایتی ہوتا ہے جسے کوئی بھی مہذب معاشرہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اور بھی افسران ہیں جو اِن الزامات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''کیا وہ پولیس والے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کیا وہ رضا کارانہ طور پر یہ بات کریں گے؟''

''بالکل نہیں۔'' وکیل نے کہا۔ ''اس سلسلے میں تمہارے دوست جون نے بہت مدد کی ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے جون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اگر ہم پولیس والوں کے پاس جائیں گے تو ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ وہ گولن کی طرح ٹیڑھے نہیں ہیں؟''

دونوں نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا۔ ''تمہاری غیر موجودگی میں یہاں بہت کچھ بدل گیا ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''لیکن سب نہیں۔ بہت سی باتیں پہلے جیسی ہی ہیں۔ میں انسپکٹر گولن سے بات کروں گا اور اسے احساس ہو جائے گا کہ تمہیں چھوڑنے کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔''

''لیکن ایمیلو آزاد رہے گا؟ اس نے دو لوگوں کو قتل کیا ہے اور وہ آزاد رہے گا؟''

''اس کا انحصار تم پر ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جون اس سلسلے میں بھی تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے جون کی طرف دیکھا اور اس نے ایک بار پھر تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ واقعی میرے لیے ایک بینک تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کتنی راتیں ٹیکسی چلا کر میں اس کا قرضہ اتار سکوں گا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا جس کی پیش گوئی نیلسن نے کی تھی۔ چند روز بعد ہی مجھے رات کی تاریکی میں پولیس اسٹیشن کے عقبی دروازے سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد گولن نے ایمیلو پر ہاتھ ڈالنے میں دیر نہیں لگائی اور اُسے یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ گولن ایک عرصے سے اس طرح کارروائیاں کر رہا تھا اور اس کے پاس ایمیلو کے خلاف کچھ ثبوت تھے جس کی وجہ سے اُسے خاموش ہونا پڑا۔ ویسے بھی گولن بکاؤ مال تھا اور جہاں سے اسے زیادہ قیمت مل جائے۔ وہ اسی کا ہو جاتا تھا اور میرے دوست جون کو ایسے لوگوں کی قیمت لگانا آتی تھی۔

ایمیلو کے پاس اعترافِ جرم کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے گولن سے اُلجھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس واقعہ کے بعد میں بہت محتاط ہو گیا ہوں اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے آپ کو سراغ رسانی تک ہی محدود رکھوں گا اور کبھی کسی کے ذاتی معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا۔ اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے میں نے رات میں ٹیکسی چلانا شروع کر دی ہے کیونکہ جان گیا ہوں کہ پیسے میں بہت طاقت ہے۔ اس سے صرف مادی اشیا ہی نہیں بلکہ انسانوں کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ یہ پیسے ہی کی طاقت تھی جس نے ایک بے گناہ کو حوالات سے نکال کر اصلی مجرم کو وہاں پہنچا دیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"یہ جو مرد ذات ہوتی ہے، کبھی اِس پر اعتبار مت کرنا۔"

اس کے کانوں میں کسی کی سرگوشی گونجی۔ لبوں پر آنے والی مسکراہٹ بہت خاص محسوس ہو رہی تھی۔ سیٹھ بشیر احمد اس کی سوچ اور مسکراہٹ سے بے خبر اس کے جسم سے اٹھنے والی خوشبو سے مدہوش ہو رہا تھا۔

"ڈارلنگ میرا خیال ہے گرمیوں کا یہ موسم یہیں گزار لیتے ہیں۔" نشے میں چور اس کی آواز لڑکھڑائی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مرد و زن

اعتزاز سلیم وصلی

مرد و عورت کو گاڑی کے دو پہیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے... دونوں میں توازن ہو تو آگے کا سفر طے ہوتا ہے... ورنہ بیچ راستوں میں راہیں جدا ہو جاتی ہیں... نفسیاتی و جذباتی رویوں کی عکاس ایک پُرانتقام کہانی...

دو شکاریوں کا دلچسپ کھیل...... دونوں کو اپنے اپنے شکار کی تلاش تھی......

''جیسے مرضی ہو آپ کی۔'' اس نے ہلکے سے اپنا ہاتھ سیٹھ کے چہرے پر گھمایا۔
''تم کہو تو ساری عمر یہیں گزار لوں۔'' وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لایا۔
''ابھی رات پڑی ہے سیٹھ صاحب اتنی جلدی مت کریں۔'' وہ ہنسی۔ اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ''ارے میں آپ کے لیے اسپیشل پیگ بناتی ہوں۔'' وہ اٹھ بیٹھی۔ سیٹھ پہلے ہی نشے میں گم تھا۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ لڑکی نے نظر بچا کر گلاس میں کچھ ڈالا۔ مری کا موسم اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ باقی ملک کے موسم کے برعکس سردی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ سیٹھ بشیر اس کے ہاتھ سے اسپیشل پیگ پینے کے بعد لیٹ گیا۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ دوسری صبح اس کی لاش ہوٹل سے اٹھائی گئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق ہارٹ اٹیک کی وجہ سے رات کسی وقت اس کے دل کی دھڑکن رک گئی تھی۔

☆☆☆

''سیٹھ بشیر، ملک کا سب سے بڑا بزنس مین، ہارٹ اٹیک کی وجہ سے مری کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے کمرے میں جان سے گزر گیا۔'' اس نے ڈائری پر موجود ایک لسٹ میں یہ لائن لکھی۔ چہرے پر موجود مسکراہٹ چہرے کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اسے عادت تھی بلاوجہ مسکرانے کی۔ دوسرے پیج پر اس نے واضح الفاظ میں لکھا۔ ''میرا کردار۔'' اور اس کے سامنے لکھ دیا۔ ''ایک خوبصورت سیکریٹری، پرسنل سیکریٹری جس نے ایک سال پہلے یہ سیٹ سنبھالی تھی اور اب اس کی بیوی بننے والی تھی مگر باس نے شادی سے پہلے مری کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں سب سے چھپ کر رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل کے عملے میں چند لوگوں نے ہی مجھے دیکھا ہوگا مگر کون پہچانے گا؟ اور پھر یہ کونسا قتل کیس ہے جس میں قاتل کی تلاش کی جائے گی۔'' اپنے تحریر کردہ الفاظ پڑھ کر وہ خود ہی ہنس پڑی۔ بالوں کا کلر تبدیل کروانے کے علاوہ اس نے ہیئر اسٹائل بھی تبدیل کر لیا تھا۔ چہرہ جس پر کل میک اَپ کی تہ تھی آج بالکل سادہ مگر کشش سے بھرپور تھا۔ اس نے بغور اپنا جائزہ لیا اور اخبار اٹھا کر کسی نئی ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔

☆☆☆

''تم اب اسکول جاب چھوڑ دو گی؟'' عدیل کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''کیوں چھوڑ دوں جاب؟'' حسینہ میک اَپ کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ شوہر کی بات اس پر کم ہی اثر کرتی تھی۔
''میں نے بہت برداشت کر لیا، میری تنخواہ کافی ہے گھر چلانے کے لیے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔
''مگر برائی کیا ہے؟ میرا ٹائم بھی اچھا پاس ہو جاتا ہے۔''
''برائی کیا ہے؟ دکھاؤں تمہیں میں برائی کیا ہے؟'' عدیل کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے اپنا ٹچ موبائل آن کیا اور کچھ دیر چھیڑنے کے بعد ایک تصویر نکال کر حسینہ کے سامنے رکھی۔
''یہ تم ہو اور تمہارے ساتھ کون ہے؟'' فیس بک پر لگائی جانے والی اس تصویر میں حسینہ کے ساتھ ساتھی اسکول ٹیچر سعید تھا۔ دونوں کے سامنے پیزا رکھا تھا اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
''او...... اس شیطان نے شرارت کر دی۔ میں نے منع بھی کیا تھا۔'' حسینہ کے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ نے اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیا۔ ''یہ سعید نے ہم بریک ٹائم میں پیزا کھا رہے تھے جب اس کمینے نے سیلفی بنائی۔'' وہ ہنسی۔ حسینہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔
''مجھے کوئی دلچسپی نہیں تمہارے ان بکواس دوستوں سے، میں بس یہ جانتا ہوں تم ماں بننے والی ہو اب تمہیں جاب چھوڑ دینی چاہیے۔'' عدیل ناراضگی سے بولا۔
''کم آن عدیل، فضول باتیں مت کرو۔ ویسے بھی میں نے کہا تھا مجھے یہ بچے وغیرہ کے چکر میں ابھی کچھ سال نہیں پڑنا مگر تم ہی نہیں مانے تھے، اب اس کے لیے میں اپنی ایکٹیوٹیز تو نہیں چھوڑ سکتی...... ویسے بھی ٹیچنگ میرا شوق ہے۔'' وہ نارمل انداز میں بولی۔ دونوں کے درمیان میں کافی بحث ہوئی مگر نتیجہ ہمیشہ کی طرح حسینہ کے حق میں نکلا اور اس نے جاب جاری رکھی۔ تین ماہ بعد ان کے ہاں روبینہ نے جنم لیا۔ حسینہ بیٹی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بالکل اس کی تصویر تھی۔ عدیل اور وہ بے حد خوش تھے مگر اس کی وجہ سے کچھ دن حسینہ کو سب کاموں سے دور ہونا پڑا۔ ایک سال بعد حسینہ اپنے پرانے کاموں کی طرف لوٹ گئی۔ مردوں کو کھلونا سمجھنے والی حسینہ کے دن روز کسی نئے ہینڈسم کے ساتھ گزرتے تھے۔ عدیل بے خبر نہیں تھا مگر وہ روبینہ کی وجہ سے چپ رہتا تھا اور پھر وہ ہوا جس کے متعلق کبھی کسی نے بھی نہیں

سوچا تھا۔

☆☆☆

''آپ کا نام؟'' پہلا سوال۔

''روبینہ عدیل۔'' پُراعتماد لہجے میں جواب دیا گیا۔

''آپ نے پرسنل سیکریٹری کی جاب کے لیے اپلائی کیا ہے مگر تعلیم صرف ایف ایس سی؟'' دوسرا سوال۔

''جی مگر مجھے کافی تجربہ ہے اس جاب کا، میں پہلے بھی کافی جگہ کام کرچکی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کی سی وی میں لکھا ہے آپ چھ مختلف جگہ پر کام کرچکی ہیں مگر کہیں بھی ایک سال سے زیادہ کام نہیں کیا؟''

''ہاں، بس مجھے جہاں کا ماحول پسند آئے گا وہاں ہمیشہ رہوں گی۔'' وہ مسکرائی۔ اسی دوران اس کے سامنے بیٹھا منیجر کھڑا ہوگیا۔

''باقی کے سوال باس خود پوچھیں گے۔'' باس آچکا تھا۔ ستائیس سے کچھ اوپر عمر، پُرکشش شخصیت، چہرے پر سجی دل آویز مسکراہٹ اور باوقار چال...... زاہد مرزا اس کے سامنے آبیٹھا۔

''اس بار شکار زبردست ملا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ زاہد مرزا نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''ہمم...... تو آپ ہیں روبینہ، نائس۔'' اس نے تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے شفیق صاحب کافی سوال پوچھ چکے ہیں آپ سے، آپ کل سے جوائن کرلیں۔'' زاہد اس کے حسن سے کچھ زیادہ ہی متاثر دکھائی دیتا تھا۔

''شکریہ سر۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر چل دی۔

☆☆☆

اس شام عدیل سرخ چہرہ لیے گھر واپس آیا۔ آٹھ سال کی روبینہ ڈری ڈری نظروں سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے خبر تھی کہ آج پھر مما اور ڈیڈ میں لڑائی ہوگی۔ جوتے اتار کر اس نے روبینہ کی طرف دیکھا۔ ''روبی بیٹا اپنے کمرے میں جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں باہر نہیں آنا۔'' وہ اٹھ کر چپ چاپ اندر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد حسینہ کی آمد ہوئی۔

''ارے عدیل آج آپ جلدی آگئے ہیں۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں آج سر میں درد تھا اس لیے جلدی آگیا۔'' عدیل نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' وہ بولی۔
''دیکھ رہا ہوں کہ بے شرم اور بے حیا عورت کا چہرہ اتنا حسین کیوں ہے؟''
''کیا مطلب؟'' وہ بلند آواز میں بولی۔
''آواز نیچی رکھو، کُتیا۔'' وہ چلایا۔ ''میں دیکھ چکا ہوں تم آج ایک نئے لڑکے کی بانہوں میں گھسی جا رہی تھیں اس شاپنگ مال میں۔''
''تو کیا ہوا؟ تم ہوتے کون ہو پوچھنے والے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔
''میں کون ہوتا ہوں؟'' وہ حیران ہوا۔ ''میں تمہارا شوہر ہوں حسینہ، تمہاری پہلی محبت جس کے لیے تم نے گھر چھوڑ دیا تھا اور میرے ساتھ اس شہر میں آ بسیں۔''
''ہاں کر دی تھی ایک غلطی، اب اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔''
''کیسی سزا؟''
''مجھے قید کرنا چاہتے ہو تم۔''
''ہاں کیونکہ تم اسی قابل ہو میری برداشت جواب دے چکی ہے۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''تو آزاد کر دو مجھے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
''مگر روبی؟'' وہ بے بسی سے بولا۔
''روبی میری بیٹی ہے میرے جیسی بنے گی۔'' اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر عدیل کو آگ لگ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ مارا۔
''خبردار میری بیٹی کبھی تم جیسی نہیں ہوگی۔''
''عدیل۔'' حسینہ کے ناخن اس کے چہرے پہ نشان ڈال گئے۔
''مما، ڈیڈ۔'' اپنے کمرے سے چلاتی ہوئی روبینہ اُن کی جانب بڑھی۔ اس کی آواز سن کر عدیل پلٹا۔
''روبی، میری بیٹی۔'' وہ پیچھے مڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔ اسے گلے لگانا چاہتا تھا مگر یہ اس کی آخری خواہش تھی۔ حسینہ نے پھل کاٹنے والی چھری اس کی گردن میں اتار دی۔ وہ تڑپ کر گرا۔ حسینہ پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ چھری کے کئی وار عدیل کی گردن میں دھنسے اور خون اُبل پڑا۔ بیٹی کو گلے لگانے کی خواہش میں اس نے موت کو گلے لگا لیا تھا۔ روبینہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ باپ کی گردن سے بہنے والے خون کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''جی سر۔'' اپنی آرام دہ چیئر سے اٹھ کر روبینہ اس کے پاس آئی۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''کوئی غلطی ہو گئی سر؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔
''ارے نہیں، میں تو دیکھ رہا تھا خدا نے کائنات میں کتنے خوبصورت رنگ بھرے ہیں۔'' زاہد مسکرا کے بولا۔ روبینہ کے چہرے سرخی آئی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی اور بولی۔
''دو ہفتے ہو گئے ہیں میری جاب کو اور آپ کو آج یہ بات پتا چلی ہے؟'' اس کے لہجے میں لاڈ آ گیا۔
''میں تو کب سے غور کر رہا تھا مگر مناسب الفاظ نہیں ملے۔''
''آپ باس ہیں آپ کے لیے ہر چیز مناسب ہے۔''
''کچھ معاملات میں باس ہمیشہ درست نہیں ہوتا۔'' وہ ہنسا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔
''آج لنچ کے لیے کہیں باہر چلتے ہیں۔'' اس نے دعوت دی۔
''میری خوش نصیبی ہوگی یہ۔''
''کیا میں آپ کو روبی پکار سکتا ہوں؟'' وہ کچھ زیادہ ہی تیز رفتار تھا۔ اس نے روبینہ کا ہاتھ تھام لیا۔
''جی کیوں نہیں۔''
''اور مجھے سر صرف آفس میں کہنا، آفس سے باہر ہم دوست ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا۔
''پچھلے پانچ بھی یہی کہتے تھے، ٹھیک راستے پر جا رہے ہو باس۔'' وہ... دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔
''شکریہ سر۔''

☆☆☆

پولیس آئی اور عدیل کی لاش لے گئی۔ روبینہ کو اس واقعے کے بعد بالکل چپ لگ گئی۔ حسینہ نے بیان دیا کہ وہ اور روبینہ اس کے دوست سعید کے گھر تھے۔ سعید کی گواہی اس کے حق میں تھی مگر سب سے بڑا کام ان دو راتوں نے کیا جو حسینہ نے نوجوان پولیس انسپکٹر کے ساتھ گزاری تھیں اس لیے وہ قتل کے مقدمے سے صاف بچ نکلی اور نامعلوم قاتل کے کھاتے میں قتل کا ایک اور کیس درج ہو گیا۔
روبینہ اگرچہ کم عمر تھی مگر وہ بہت کچھ سمجھ رہی تھی۔ ماں کے بیڈ روم میں ہر روز کوئی نیا بندہ ہوتا تھا۔ حسینہ اس سے پیار کرتی تھی مگر یہ محبت خطرناک ثابت ہوئی۔ مرد ذات سے کھیلنے والی حسینہ نے بیٹی کے ذہن میں مرد نام سے ہی نفرت

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پیدا کردی تھی۔ روبینہ کے دماغ میں ہر وقت باپ کی گردن سے بہنے والے خون کا منظر چکرا تا رہتا۔ اس نے ایف ایس سی میں شاندار مارکس حاصل کیے اور میڈیکل میں ایڈمیشن لینے میں کامیاب ہوگئی۔ حسینہ بیٹی کو نفسیاتی مریض بنا کر خود اس سے بالکل لاتعلق ہوگئی۔ وہ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی جب حسینہ کا شراب پی کر گاڑی چلاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہوگیا۔

اب روبینہ بالکل تنہا تھی۔ اس نے تعلیم چھوڑ دی اور جاب کی تلاش میں نکل پڑی۔ حسن اس کے کام آیا اور شہر کے سب سے بڑے شاپنگ مال کے مالک غلام علی نے اسے پرسنل سیکریٹری رکھ لیا۔ وہ جانتا نہیں تھا اس نے موت کو دعوت دے ڈالی ہے۔ ایک رات نشے میں جب وہ روبینہ کو لے کر ساحلِ سمندر پر آیا تو دوسرے دن اس کی لاش سمندر میں تیرتی دکھائی دی۔ پولیس رپورٹ کے مطابق نشے کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنا ہوش کھو بیٹھا اور سمندر میں ڈوب گیا۔ البتہ اس کے ساتھ کون آیا تھا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ روبینہ کا اگلا نشانہ جبار احمد بنا۔ اس کے ہاتھوں قتل ہونے والے تمام لوگوں کے برعکس یہ انتہائی شریف انسان تھا۔ اس نے روبینہ کی بہت مدد کی مگر بدلے میں کچھ نہ مانگا۔ لیکن روبینہ کے دل میں مرد ذات کے لیے رحم نہ تھا۔ میڈیکل کی تعلیم اس کے کام آئی۔ اس نے شوگر کے مریض جبار کو رفتہ رفتہ مخصوص میڈیسن کے استعمال سے مار ڈالا۔ ساتھ ساتھ وہ ڈائری پر اپنے کارناموں کی تفصیل بھی لکھتی رہی۔ اس دوران اس نے دو شہر بدلے۔ بشیر احمد سے پہلے ایک پرائیویٹ اسکول کا پرنسپل اس کا نشانہ بنا اور اس کے بعد بشیر احمد کو نشانہ بنایا۔ تقریباً دو ماہ بعد اسے زاہد ملا تھا۔

☆☆☆

شہر کے مہنگے ترین ہوٹل میں ویک اینڈ نائٹ اپنے عروج پر تھی۔ تمام ٹیبلز پر کوئی نہ کوئی جوڑا بیٹھا دکھائی دیا۔ ماڈرن لباس میں ملبوس روبینہ اور پُرکشش شخصیت کا مالک زاہد کا جوڑا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ دونوں ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔

''یہ تم اپنے پرانے باس کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوٹلنگ کرتی تھیں؟'' زاہد نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

''ارے بالکل نہیں، وہ تو بوڑھے تھے، مجھے کہتے تھے، بیٹی یہ ماڈرن لباس مت پہنا کرو۔'' اس نے نقل اتاری۔ زاہد ہنس پڑا۔

''اور تم نے باباجی کو کیوں چھوڑ دیا؟''

''میں نے کب چھوڑا تھا، اُن کی ڈیتھ ہوگئی تھی ہارٹ اٹیک سے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اوہ، اچھا یہ بتاؤ تمہاری فیملی میں کون کون ہے؟'' زاہد نے پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں، میں ان چند بدقسمت لوگوں میں سے ہوں جن کا کوئی نہیں ہوتا۔'' اس نے پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

''میں ہوں نا۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''آج ہم میرے فلیٹ پر چلیں گے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کیونکہ آج ویک اینڈ نائٹ ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''تو؟''

''تو ہم ساتھ ساتھ گزاریں گے۔''

''وہ اس کی بات سن کے سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔

''جو حکم باس کا۔'' وہ ہنسی۔

بل ادا کر کے وہ اپنی کار کی جانب بڑھے۔ کچھ دیر بعد ہی گاڑی شہر کے پوش ایریا میں پہنچ چکی تھی۔ دونوں دوسری منزل کے فلیٹ کی جانب بڑھے۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی روبینہ کو احساس ہوا کہ یہاں کافی دن سے کوئی نہیں آیا۔

''یہاں صفائی نہیں کرتے آپ؟''

''نہیں، میں کبھی کبھی یہاں آتا ہوں، کچھ وقت تنہا گزارنے کے لیے۔'' اس نے فریز رکھولا اور وہسکی کی بوتل نکالی۔ ''تم پیتی ہو؟''

''کبھی کبھار۔'' وہ ایک گھونٹ میں ہی نصف پی گیا۔

''لاؤ میں پیگ بنا دیتی ہوں، اس طرح اچھے نہیں لگ رہے۔'' وہ ادا سے بولی۔

زاہد اُسے بوتل پکڑا کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ساتھ ہی نظر بچا کر اپنے پرس سے زہر نکالا۔ یہ اسپیشل قسم کا زہر تھا جو اسے بہت مہنگا ملا تھا۔ گلاس میں ڈال کر وہ اس کی جانب لائی جو ڈائری پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ سے لے کر دو گھونٹ بھرنے کے بعد زاہد مڑا۔ ''شکار نمبر دو۔'' اس کے چہرے پر قاتل مسکراہٹ تھی۔ خنجر کی چمک ابھری اور روبینہ دل کے قریب دھنس گئی۔

''تم سب ہوتی ہی بے وفا ہو، کبھی ایک ساتھ کبھی دوسرے کے ساتھ'' وہ چلایا۔ ساتھ ہی گلاس منہ سے لگا کر ایک سانس میں پی گیا۔

▲▲▲

جونک

عمران قریشی

انسان کا گھر ہی جنت ہوتا ہے... مگر ہوسِ دنیا اور نفسانی خواہشات میں گِھرا انسان ایک دوسرے سے دور ہوتا چلا جاتا ہے... آخرکار عجیب جان لیوا عذاب اور بیگانگی سے دوچار ہوتا ہے... جس قدر دوریاں ہیں وہ سب خواہشاتِ نفسانی کی پیداوار ہیں... ایک ہی گھر میں رہنے والے میاں بیوی... ان کی زندگی کا محور و مرکز مال و زر تھا...

مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے دو مجرموں کی یکجائی کا شاخسانہ......

بس اسٹاپ کے سامنے واقع گرلز کالج کی چھٹی ہونے والی تھی۔ کمرشل ایریا ہونے کی وجہ سے یہاں دفاتر کی تعداد کچھ زیادہ تھی اس لیے دن کے ان مخصوص اوقات کے دوران میں ٹریفک کے ازدحام کا یہ عالم تھا کہ سڑک پر پیدل چلنا بھی دشوار ترین معلوم ہوتا تھا۔

موسلا دھار بارش نے صبح سے جل تھل کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ بس اسٹاپ کی چھت تلے زیادہ تر لوگ طوفانی بارش سے بچنے کی نیت سے کھڑے تھے لیکن کچھ ایسے بھی

تھے جن کی نگاہوں کا مرکز گرلز کالج کی عمارت تھی۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکوں کی تھی۔ وقاص انہیں دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ عمر کی اس دلیز میں قدم رکھ چکے تھے جہاں یہ سب باتیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم اگر ان کی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالی جاتی تو ان کی تمام زندگی مجرمانہ سرگرمیوں سے عبارت تھی لیکن اب اٹھاون سال عمر ہونے کے بعد ان میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ بس اسٹاپ پر کھڑے ان لڑکوں کو اوچھی حرکات سے باز رہنے کی تلقین کر سکتے۔

بس کا دیوپیکر جثہ اسٹاپ کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور لوگوں کے ہجوم میں انتشار کی کیفیت نمایاں ہوئی پھر وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے بس کے اندر داخل ہونے کی کوششیں کرنے لگے۔ ان کی وحشیانہ حرکتوں کو دیکھ کر وقاص کی قوت مدافعت ماند پڑ گئی اور وہ ہاتھوں میں چھتری سنبھالے بس کے دروازے سے کچھ دور ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کنڈیکٹر مخصوص اسٹاپ کی گردان کرتے ہوئے ان کی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہجوم کے بس میں داخل ہو جانے کے بعد اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور وقاص کو بازو سے تھام کر چڑھا لیا۔

بس کے اندر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی لیکن وقاص کے بڑھاپے کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک نوجوان نے اپنی سیٹ اُن کی نذر کر دی۔ وہ طویل سانس لیتے ہوئے کھڑکی کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئے۔ طوفانی بارش کی وجہ سے خنکی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ انہوں نے مفلر کو کانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹا اور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سوچنے لگے کہ ان کا ناتواں جسم اب مشقت طلب کام کے لیے موزوں نہیں رہا تھا۔ صائمہ انہیں ہمیشہ نوکری نہ چھوڑنے کی تلقین کرتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ وہ لکھ پتی ہونے کے باوجود بھی اس کی ریٹائرمنٹ پر ملنے والی مختصر رقم پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اب تو کچھ عرصے سے اس کا کام بھی اچھا چلنے لگا تھا۔ اس کے باوجود بھی ایک جونک کی طرح ان کے جسم سے چمٹی ہوئی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ جب تک ان کے جسم میں خون کی آخری بوند باقی تھی۔ تب تک وہ ان سے علیحدہ ہونے کی کوشش نہیں کرے گی۔ تاہم اب وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے متعلق سوچنے لگے تھے۔

صائمہ گزشتہ ہفتے سعید آباد کے جاگیردار کے مدعو کرنے پر اس کی زمینوں کی طرف چلی گئی تھی۔ اس لیے انہیں گھر جانے کے بعد کھانے پینے کا انتظام بھی کرنا تھا لیکن انہیں اس کے متعلق کچھ زیادہ فکر نہیں تھی۔ کھانا بنانے کی مختصر دردسری کے علاوہ انہیں تنہائی کے وہ چند لمحات میسر آ جاتے تھے جو صائمہ کی موجودگی میں ممکن نہیں تھے۔ تمام سفر کے دوران انہیں نیند نہیں آ سکی اور بس آخری اسٹاپ پر پہنچ کر رک گئی۔ وہ چھتری کو سنبھالے نیچے اتر آئے۔ بارش کی شدت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ تاہم ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔

انہوں نے چھتری کو کھولا اور اسٹاپ سے آگے مضافات میں واقع خوب صورت رہائشی اسکیم کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ وہ مہنگے ترین رہائشی علاقے میں رہنے کے باوجود بسوں میں دھکے کھاتے پھر رہے تھے۔ لیکن انہیں اپنی تقدیر سے کوئی گلہ نہیں تھا اور نہ ہی اپنی لکھ پتی بیوی سے کوئی شکوہ تھا۔ یہ سب تو مکافاتِ عمل کا ایک حصہ تھا جو کچھ جوانی میں انہوں نے بویا تھا، وہ بڑھاپے میں کاٹ رہا تھا۔

بس اسٹاپ سے اُن کے بنگلے کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ لیکن بوجھل ہوتے ہوئے دماغ کو شدت کے ساتھ کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ بنگلے کے پاس پہنچنے کے بعد انہوں نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا۔ وقاص نے تھکے ہوئے انداز میں سر ہلا کر جواب دیا پھر چھتری بند کر کے اندر داخل ہو گئے۔

کار پورچ کے ساتھ وسیع و عریض لان تھا۔ لان کے کنارے سیمنٹ کا مختصر کمرا تھا جس کے کھلے ہوئے دروازے میں جرمن شیفرڈ محوِ استراحت تھا۔ وقاص کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی زندگی کے دوسرے مختلف کرداروں کی طرح اس خونخوار کتے کا وجود بھی عجیب و غریب حیثیت کا اختیار رکھتا تھا۔ بظاہر معصوم اور بے ضرر دکھائی دینے والا یہ بھیڑیا نما جانور انتہائی خوفناک اور خونخوار تھا۔ درحقیقت اس کی تربیت انسانی جسم کو بے دردی کے ساتھ تباہ کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ صائمہ کے کہنے کے مطابق سعید آباد کا جاگیردار اسے اپنے دشمنوں کو سزا دینے کے لیے استعمال کرتا تھا اور اس نے اسے حاصل کرنے کے لیے نہ صرف تگڑی رقم معاوضے کے طور پر جاگیردار کو ادا کی تھی بلکہ اپنی زندگی کی ایک رات بھی جاگیردار کی نذر کی تھی۔ وقاص نے اچٹتی ہوئی نگاہ کتے کے وجود پر ڈالی اور کار پورچ کو عبور کر کے رہائشی کمروں کی طرف آ گئے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انہوں نے بالترتیب پہلے کپڑے تبدیل کیے پھر کافی اور سینڈوچ تیار کرنے کے بعد اپنے کمرے کے صوفے پر آبیٹھے۔ میز پر صبح کا اخبار رکھا ہوا تھا۔ انہیں یہ اخبار پڑھنا رات کو نصیب ہوتا تھا۔ صبح آفس جانے کے لیے انہیں معمول سے کچھ پہلے گھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ تاکہ بس کے سفر کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے آفس وقت پر پہنچ سکیں۔ انہوں نے اخبار کے اندرونی صفحات پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں جرائم سے متعلق چند خبروں کے درمیان ایک مختصر سرخی موجود تھی۔ انہوں نے نہایت دبیز شیشوں والی عینک لگانے بعد سرخی کا مطالعہ کیا۔

گرین ٹاؤن میں کُتّے کے کاٹنے سے ہونے والی موت کے متعلق پولیس کا لاعلمی کا اظہار۔

سرخی کے نیچے تفصیل موجود تھی۔

گزشتہ ہفتے کُتّے کے کاٹنے سے واقع ہونے والی موت کے متعلق پولیس اب تک چند شواہد اکٹھے کرنے کے علاوہ مکمل طور پر ناکام دکھائی دیتی ہے۔ یاد رہے اس موت سے قبل متعدد اموات کے سلسلے کا ہدف شہر سے باہر کے مختلف علاقہ جات تھے۔ گرین ٹاؤن میں یہ پہلی واردات ہے جس میں کتے نے ادھیڑ عمر شخص کے نرخرے کو تقریباً مجروح کرکے رکھ دیا تھا۔ عموماً قتل کی واردات کے دوران مجرم کے ہاتھوں کے پرنٹ، یا پھر چلائی جانے والی گولی مجرم کی نشاندہی کا باعث بنتی ہے لیکن ان پُراسرار وارداتوں کے دوران ایسا کوئی بھی ثبوت اس لیے دستیاب نہیں ہوسکا کہ قتل کی واردات میں انسان کے بجائے ایک خونخوار کُتّے کے ملوث ہونے کے قوی امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے پولیس ثبوتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے تقریباً مفلوج ہوکر رہ گئی ہے۔ تاہم مخصوص کُتّے کی تلاش جاری وساری ہے۔ وقاص نے اخبار کو دوبارہ میز پر رکھ دیا اور ٹی وی کو آن کرنے کے بعد کافی اور سینڈوچ سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ان کے قریب رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف صائمہ کی سُریلی آواز سنائی دی۔ اس نے مختصر الفاظ میں خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد رات کو اپنی آمد کے متعلق مطلع کیا اور سلسلے کو منقطع کر دیا۔ ان کے بالکل سامنے والی دیوار پر صائمہ کی قدِآدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ تاہم بے انتہا خوب صورتی اور مہنگے ترین میک اَپ کی وجہ سے تیس پینتیس سے زیادہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وقاص کو اس کی خوب صورتی سے کبھی بھی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ ایک مجبوری تھی جو انہیں کچی ڈور کی طرح باندھے ہوئے تھی۔ اگر یوں کہا جائے کہ ان دونوں نے شادی کے بیس پچیس سال ایک دوسرے کو نہایت متحمل مزاجی اور بُردباری کے ساتھ برداشت کیا تھا تو بے جا نہیں ہو گا۔ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو وقاص نے اسے صرف کامیابی کی طرف بڑھنے والی سیڑھی کے طور پر استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ کافی حد تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے تھے چونکہ یہ کامیابی صائمہ کے وجود کی مرہونِ منت تھی اس لیے کامیابی سے ہمکنار ہونے کے باوجود بھی وہ کچھ خاص فائدہ حاصل نہ کر پائے تھے۔ صائمہ کی جائداد اور بینک بیلنس پر اسی کا اختیار تھا۔ وقاص کی حیثیت ایک کٹھ پتلی کے مانند تھی لیکن وہ اب تھک کر چکنا چور ہو چکے تھے۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب بوڑھے وجود کو اولاد جیسے سہارے اور سلیقہ شعار محبت کرنے والی بیوی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان دونوں نعمتوں سے محروم تھے۔ بیس پچیس سالہ ازدواجی زندگی کے دوران صائمہ انہیں اولاد جیسی نعمت سے ہمکنار نہیں کر پائی تھی۔ علاوہ ازیں ان کے رشتے کے درمیان محبت اور احساس کے جذبے کا بھی فقدان تھا۔

کافی اور سینڈوچ ختم کرنے کے بعد انہوں نے قریب رکھی ہوئی تپائی کی دراز کو کھولا اور اس کے اندر سے خون بھری سرنج کو باہر نکال کر نچلی منزل کی طرف چل دیے۔ ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر جب انہوں نے لان میں قدم رکھا۔ تب جرمن شیفرڈ نے چونکتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سرنج کی طرف دیکھا اور بے چینی کے عالم میں دم ہلانے لگا۔ اس کے بالکل سامنے کھانے کا برتن رکھا ہوا تھا۔ وقاص نے سرنج کو کھولتے ہوئے تمام خون برتن کے اندر انڈیل دیا۔ کُتّے نے عجلت کے عالم میں خون کو چاٹنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر اس کے قریب کھڑے بغور دیکھتے رہے۔ پھر واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ شام کے سات بجنے والے تھے۔ صائمہ کے اتنی جلدی آنے کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کاہلی کے انداز میں آنکھیں بند کرلیں اور گزشتہ زندگی کے متعلق سوچنے لگے۔

☆☆☆

دراصل صائمہ وقاص کی دوسری بیوی تھی۔ اُن کی پہلی بیوی کا نام فہمیدہ تھا۔ ماں باپ نے ان کی رضامندی نہ ہونے کے باوجود بھی ان کی شادی کردی تھی۔ ان کے پاس کوئی کام دھندا نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے فہمیدہ کے تمام زیورات فروخت کر کے محلے میں پی سی او کی دکان کھول لی۔ ان دنوں موبائل کا دور دورہ نہیں تھا اس لیے دکان خوب چلنے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لگی۔ پی سی او کے علاوہ وقاص غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی ملوث رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک لمبی فہرست ایسی لڑکیوں اور عورتوں کی تھی جو جسم فروشی کا دھندا کرتی تھیں۔ ایسی عورتوں کی تلاش میں اوباش قسم کے لڑکے ہمہ وقت دربدر دکھائی دیتے تھے۔ وہ ان لڑکوں اور بدچلن عورتوں کے درمیان رابطے کا کام کرتے تھے اور معاوضہ دونوں پارٹیوں سے وصول کرتے تھے۔

صائمہ اُن کے محلے میں رہتی تھی۔ اس کی عمر ان دنوں بیس سال کے قریب تھی۔ وہ وقاص کے پی سی او پر فون کرنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ دکان کے اندر پردہ داری اور رازداری کے اصولوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے لکڑی کے مختصر کیبن بنائے گئے تھے۔ ان کیبنز کے اندر پنکھے لگے ہوئے تھے۔ معقول انتظام ہونے کی وجہ سے صائمہ گھنٹوں گھنٹوں لڑکوں سے بات چیت کیا کرتی تھی۔ بِل زیادہ تر ادھار کی صورت میں مہینے کی شروعات میں ادا کیا جاتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ پی سی او کے قریب ہی کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس کی ماں پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کرتی تھی۔ اس کی تنخواہ معقول تھی لیکن دل کی مریضہ ہونے کی وجہ سے تنخواہ کا زیادہ تر حصہ ڈاکٹروں اور صائمہ کی فضول خرچیوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ مہینے کے آخر میں نوبت فاقوں اور ادھار کھاتے تک چلی آتی تھی۔ اس کی ماں اس کی بے پروائیوں اور عیاشیوں سے سخت نالاں تھی اور یہی پریشانی ایک دن اس کی موت کا سبب بنی۔ اُن کی طبیعت خراب ہونے کے فوراً بعد وقاص اور دیگر محلے داروں نے انہیں اسپتال لے جانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ محلے والوں نے چندہ اکٹھا کر کے کفن دفن کا انتظام کر دیا لیکن صائمہ کی ذمے داری اٹھانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوا۔ دو وقت کا کھانا ہمسائے ترس کھا کر اسے بھجوا دیا کرتے تھے اور گزارے لائق رقم اسے فون پر پھنسائے ہوئے لڑکوں سے مل جاتی تھی۔ اس لیے کھینچ تان کر گزارا ہو ہی جاتا تھا۔ محلے میں یہ چشمگوئیاں گردش کر رہی تھیں کہ وہ جسم فروشی کے دھندے کو اپنا چکی ہے۔ وقاص اسے کام کی پیشکش کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔

ایک رات جب وہ تمام دن کی آمدنی گننے میں مصروف تھے۔ اس آمدنی کے علاوہ ان کی میز پر بیس ہزار کی رقم بھی پڑی ہوئی تھی۔ یہ رقم انہوں نے مزید پی سی او لگانے کے لیے ایک عزیز سے ادھار لی تھی۔ دکان میں اس وقت ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس لیے رقم کو کیش باکس میں رکھنے سے قبل انہوں نے گننے کا ارادہ کیا تھا۔ ابھی وہ رقم گننے بھی نہیں پائے تھے کہ صائمہ دکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وقاص نے عجلت کے عالم میں نوٹوں کو کیش باکس کے اندر منتقل کیا اور صائمہ سے مخاطب ہوتے ہوئے تلخ لہجے میں بولے۔

''تمہارا گزشتہ ماہ کا حساب کتاب ابھی باقی ہے اس لیے مزید کال کرنے سے پہلے اس کھاتے کو صاف کرنا تمہارے لیے ضروری ہے۔ بصورت دیگر میں تمہیں فون استعمال نہیں کرنے دوں گا۔'' صائمہ کی نگاہیں میز کے پیچھے بنے کیش باکس پر مرکوز تھیں۔ وہ سو سو کے نوٹوں پر مشتمل گڈی کو بخوبی دیکھ چکی تھی اور اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات اس بات کی عکاسی کر رہے تھے کہ اس کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔ وقاص نے اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے دراز کے قفل میں چابی گھما دی اور سرد لہجے میں بولے۔

''دیکھو میں تمہارے حالات سے واقف ہوں لیکن میرے کاروبار کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ تم نے ابھی جو رقم میری ٹیبل پر دیکھی تھی، وہ میں نے اپنے ایک رشتے دار سے اُدھار لی تھی۔'' صائمہ نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر دوپٹے کو فرش پر پھینک دیا پھر گریبان چاک کرنے کے بعد چلّاتے ہوئے بولی۔

''خاموشی کے ساتھ رقم میرے حوالے کر دو۔ ورنہ میں چلّا چلّا کر محلے والوں کو جمع کرنے کے بعد انہیں بتا دوں گی کہ تم نے میری عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

وقاص نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ گلی سنسان پڑی تھی لیکن عموماً دس بجے کے بعد پی سی او پر رش ہونے لگتا تھا۔ اس وقت پونے دس بجنے والے تھے۔ صائمہ نے پونی کی صورت میں بندھے ہوئے بالوں کو کھول کر چہرے پر بکھیر دیا۔ اس کے عریاں سینے پر سگریٹ کے چند نشان دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً یہ کارنامہ اس کے آوارہ دوستوں میں سے کسی کا تھا جو وقاص کے کھاتے میں خوب صورتی کے ساتھ منتقل ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس سوچنے سمجھنے کا زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے خاموشی کے ساتھ دراز میں چابی گھمائی اور رقم نکال کر میز پر رکھ دی۔ صائمہ نے چیل کی طرح جھپٹ کر گڈی اٹھائی۔ پھر اسے چاک گریبان میں گھسیڑتے ہوئے بولی۔

''مکان کے کرائے اور پرچون والے کے واجبات ادا کرنے کے لیے مجھے اس سے بھی کچھ زیادہ رقم درکار ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مہربانی کر کے کیش باکس میں رکھی ہوئی باقی تمام رقم بھی میرے حوالے کر دو۔ جلدی کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' وقاص نے دراز کے اندر رکھی ہوئی موجودہ دن کی تمام سیل نکال کر میز پر رکھ دی اور مسکراتے ہوئے بولے۔

''میں تمہاری دیدہ دلیری اور ہمت کی داد دیتا ہوں لیکن اس رقم سے تمہارا گزارا کتنے دنوں تک ہوسکتا ہے۔ اس کے ختم ہوجانے کے بعد کیا کرو گی۔ اگر مجھ پر اعتبار کرسکتی ہو تو جسم کو ڈھانپنے کے بعد میری تجویز کو غور سے سن لو۔ تمہارے حق میں تجویز بہتر ثابت ہوگی۔''

صائمہ زہرخند لہجے میں بولی۔ ''جو کہنا ہے۔ جلد از جلد کہہ ڈالو۔ میں گھر کو کھلا چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔''

وقاص بولے۔ ''تمہارے جسم پر ثبت سگریٹوں کے نشان اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تم پاک دامن نہیں رہیں۔ میری بات تلخ ضرور ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ تم اپنی جوانی کو فضول اور اوباش لڑکوں کے ہاتھوں ضائع کر رہی ہو، اگر اس کا مناسب استعمال کرو تو وہ سب کچھ حاصل کرسکتی ہو جس کی تمہارے دل میں خواہش ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور کھیلو گی۔''

صائمہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''مجھے عزت نیلام کر کے کمائی ہوئی رقم سے چھین کر حاصل کی ہوئی رقم زیادہ پُرکشش دکھائی دیتی ہے۔ تم نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں جسم فروش لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے حالات نے ایسا بنا دیا ہے۔''

وقاص نے کہا۔ ''ہر ناجائز کام کے پیچھے حالات کی گردش ہی کارفرما ہوتی ہے لیکن حالات کو اپنے حق میں موافق بنانا انسان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ صرف ٹھنڈے دماغ کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس وقت کی کمی نہیں ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو، میں تمہارے حتمی فیصلے کا منتظر رہوں گا۔''

صائمہ دکان کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وقاص کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دو دنوں کے بعد اس نے ان کے ساتھ کام کرنے کی حامی بھرلی۔ وقاص جانتے تھے کہ وہ اوباش لڑکوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی تھی لیکن بدلے میں اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ ان کے لیے بہترین آمدنی کا ذریعہ ثابت ہوسکتی تھی۔ اس لیے اس کے اقرار کے بعد انہوں نے ایک رات اس کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی جس کے مطابق حاصل ہونے والی آمدنی دونوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہونا تھی اور وقاص کی مرضی کے خلاف صائمہ کوئی بھی معاہدہ کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ وہ ہر وقت وقاص کے رابطے میں رہنے کی متقاضی تھی۔ علاوہ ازیں کہیں بھی جانے سے قبل ان کے ساتھ صلاح مشورے کی پابند تھی۔ صائمہ نے اس تفصیلی ملاقات کے دوران پس وپیش کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ وہ مکمل طور پر اپنے آپ کو وقاص کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وقاص کے دماغ میں اس کم عمر حسینہ کو استعمال کرنے کی لمبی پلاننگ موجود تھی۔ اب تک ان کے پی سی او میں آنے والی لڑکیوں میں صائمہ کا حسن سرفہرست تھا اس لیے انہوں نے اسے اونچے عہدوں پر فائز ایسے افسروں کے لیے استعمال کرنے کے متعلق سوچا جو لاکھوں میں معاوضہ دینے کے لیے بخوشی تیار ہوسکتے تھے۔

ان کے پی سی او پر آنے والے چند اشخاص کا تعلق ایسے محکموں سے تھا جہاں حرام کی آمدنی کی بھرمار تھی اور وہ سب عیاشانہ فطرت کے حامل تھے۔ وقاص نے جب صائمہ کی خوب صورتی کے متعلق ان سے بات چیت کی تو انہوں نے نہ صرف دلچسپی کا اظہار کیا بلکہ منہ مانگا معاوضہ دینے کی بھی حامی بھرلی۔ تب انہوں نے صائمہ کو بناؤ سنگھار کر کے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ ان متعلقہ افراد کی آنکھیں صائمہ کے حسن کو دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کے رویے کو مدنظر رکھتے ہوئے وقاص نے منہ پھاڑ کر رقم کا مطالبہ کیا اور کچھ دیر کی پس وپیش کے بعد صائمہ کے حسن کے خریداروں نے رقم دینے کی حامی بھرلی۔ یہ رقم لاکھوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اس ڈیل کے بعد نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ہوگیا۔ وقاص اور صائمہ لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی رسائی وزیروں مشیروں تک ہوئی اور انہوں نے اپنے سیٹ اَپ کو بڑھانے کے لیے مزید کم عمر اور حسین لڑکیوں کا انتظام کرلیا لیکن حیرت انگیز طور پر ان دونوں کے تعلقات میں دنوں کے حساب سے استحکام پیدا ہوتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب وقاص نے عمر کے تفاوت کے باوجود صائمہ سے شادی کرلی۔ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔

شادی کے فوراً بعد صائمہ نے نہ صرف جسم فروشی کے دھندے سے انکار کر دیا بلکہ...... اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی کا تقاضا بھی نہایت دھڑلے سے ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس مختصر عرصے کے دوران وقاص کو گھر بیٹھ کر کھانے کی اس حد تک عادت پڑ چکی تھی کہ بازار سے سودا سلف لانا بھی

انہیں دشوار محسوس ہونے لگا تھا۔ پی سی او کو وہ کب کا فروخت کر چکے تھے اور کرائے کے گھر کو خیرباد کہنے کے بعد مہنگے ترین رہائشی علاقے میں منتقل ہو گئے تھے۔ صائمہ کے غیر متوقع تقاضے نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا۔ لیکن انکار کا حوصلہ اُن میں نہیں تھا۔ اب وہ نہ صرف صائمہ کے وجود کے محتاج تھے بلکہ اس کے جائز و ناجائز حکم ماننے کے لیے مجبور بھی تھے۔ انہیں فہمیدہ کے ساتھ کوئی دلی لگاؤ نہیں تھا۔ افسوس صرف اس بات کا تھا کہ ان کا فیصلہ پانچ سالہ بچے کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں اسے طلاق دینے کا کوئی معقول جواز بھی ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ ایک فرمانبردار اور مخلص بیوی تھی۔ لیکن صائمہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنا انہیں اس لیے منظور نہیں تھا کہ اب تک حاصل ہونے والی تمام کمائی صائمہ سے شادی کے بعد اس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس لیے اگر وقاص سے بدظن ہو جاتی تو انہیں تمام زندگی کی جمع پونجی سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ فہمیدہ سے انہیں اولاد کے علاوہ اور کچھ بھی حاصل نہیں ہو پایا تھا اس لیے طلاق میں کچھ مضائقہ نہیں تھا۔ کچھ دنوں میں ہی فہمیدہ کو نہ چاہنے کے باوجود بھی طلاق دے دی۔ اس انتہائی اقدام میں کامیابی کے بعد صائمہ کی ہمت بڑھ گئی اور اس نے وقاص کو روزگار کی جدوجہد کے لیے اکسانا شروع کر دیا۔ اب معاملہ وقاص کی برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ اگر انہیں روزگار کے لیے خوار ہونا تھا تو صائمہ سے شادی کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ صائمہ نے ناراض ہو کر ان کا جیب خرچ بند کر دیا اور انہیں قطعی طور پر نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ حالات دگرگوں ہونے کے بعد مجبوراً وقاص کو نوکری کرنے کے لیے ہامی بھرنی پڑی۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن صائمہ کی جان پہچان بارسوخ طبقے میں کافی حد تک تھی۔ اس لیے نوکری کے حصول کے لیے مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وقاص نے بحالت مجبوری کام پر جانا شروع کر دیا۔ ان کی محدود تنخواہ ان کے لیے مختص تھی۔

صائمہ نے اپنے زمانۂ عروج کے دوران وزیروں سے رابطے کے وقت کچھ مکانات اور چند دکانیں اپنے نام منتقل کروالی تھیں۔ ان کا کرایہ صائمہ کے تگڑے اخراجات کے لیے کافی تھا۔ بارہ پندرہ سال کیسے گزر گئے۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے لگے۔ لیکن صائمہ جوان سے جوان تر ہوتی چلی گئی۔ وقاص صبح آٹھ بجے آفس کے لیے نکل جایا کرتے تھے اور ان کی واپسی پانچ بجے سے پہلے نہیں ہوا کرتی تھی۔ بسا اوقات انہیں ناشتا بھی خود ہی تیار کرنا پڑتا تھا کیونکہ صائمہ صبح دیر سے اٹھنے کی عادی تھی۔

شام کو جب وہ تھکے ہارے بنگلے میں قدم رکھتے تب وہ یا تو فون پر بات چیت میں مصروف ہوتی تھی یا پھر شراب کے نشے میں دھت اپنے کمرے کے بستر پر بے سدھ پڑی ہوتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ چند دنوں کے لیے بنگلے سے باہر چلی جایا کرتی تھی اور عموماً اس کی واپسی ایک دو ہفتوں کے بعد ہوتی تھی۔ وقاص کے پوچھنے پر وہ انہیں ٹال دیا کرتی تھی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اس نے اپنی روش کو تبدیل نہیں کیا تھا اور وزرا و امراء کے ساتھ اس کی یاری دوستی بدستور قائم و دائم تھی۔ یہ ایک سال قبل کی بات ہے۔ طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد جب وہ بنگلے میں داخل ہوئی تو اس کے ہمراہ خطرناک اور خونخوار جرمن شیفرڈ تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ وقاص لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ صائمہ کو کتے کے ساتھ دیکھنے کے بعد انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یہ نیا شوق تمہیں کب اور کیونکر پیدا ہوا؟'' صائمہ نے جرمن شیفرڈ کی زنجیر چوکیدار کے ہاتھوں میں تھمائی اور اسے کتے کو اسٹور میں بند کرنے کے لیے کہنے کے بعد وقاص کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ایک کاروبار کا تانا بانا میرے دماغ میں پنپ رہا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ اگر بات چل نکلی تو ہم لاکھوں میں کھیلیں گے۔'' وقاص نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ایسا کون سا کاروبار ہے جو ایک معمولی کتے کا مرہونِ منت ہے۔''

''یہ معمولی کتا نہیں ہے۔ سعید آباد کے ایک جاگیردار کی حویلی میں اس کی مخصوص تربیت ہوئی ہے اور میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے نہ صرف معاوضہ ادا کیا ہے بلکہ جاگیردار کی ناجائز خواہش کو پورا کرنے کی خاطر رات اس کے ڈیرے پر بسر کی ہے۔'' وقاص کو ایسا لگا جیسے انہوں نے کڑوی کسیلی گولی نگل لی ہو لیکن تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے بولے۔

''آج سے پندرہ سال قبل تم نے جسم فروشی کے دھندے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک کتے کے حصول کے لیے معاہدے کی خلاف ورزی میری عقل و سوچ سے بالاتر ہے۔'' صائمہ ان کی بات پر توجہ دیے بغیر بولی۔

''سعید آباد کا جاگیردار اس کتے کے ذریعے اپنے

دشمنوں کا قتل کرواتا تھا۔ یہ انسانی نرخرے کو بھنبھوڑ کر خون پینے کا عادی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اوپری طبقے کی زیادہ تر خواتین اپنے شوہروں سے نالاں رہتی ہیں اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خاطر خواہ معاوضہ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ یہ کتا ان کی نجات کا ذریعہ بنے گا۔'' وقاص نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''تم کتے کے ذریعے انہیں قتل کروانا چاہتی ہو۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ جیتے جاگتے انسان کو گلا دبا کر مارنے کے لیے غیر معمولی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتے کے لیے تو یہ سب ناممکن ہے۔'' صائمہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

''جب کتے کا ہدف شراب کے نشے میں دھت ہو تو کتے کے لیے اس کا نرخرہ چبانا کوئی مشقت طلب کام نہیں...... یہ ایسا کرنے کا عادی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے خونخوار کھیل میں ملوث دیکھا ہے۔''

وقاص بولے۔ ''لیکن یہ جانور ہمیں بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ایسے جانور کی نگاہوں میں اپنے مالک کے علاوہ اور کسی کی اہمیت آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔''

صائمہ بولی۔

''یہ صرف خون کا وفادار ہے۔ اسے کسی انسان سے کوئی سروکار نہیں جو اس کے لیے خون مہیا کرے گا۔ اس کی اہمیت اس کے مالک کے برابر ہوگی۔'' وقاص بولے۔

''اس کے باوجود بھی اسے شکار کی طرف متوجہ کرنے کا کوئی نہ کوئی اشارہ تو ضرور ہوگا۔ ورنہ تو یہ گوشت اور خون کے حصول کے لیے کسی پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکے گا۔'' صائمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''جاگیردار کے کہنے کے مطابق اسے قتل سے قبل مقتول کے جسم کا خون پلانا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ اس شخص کو لاکھوں افراد کے درمیان تلاش کرنے کی بخوبی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں تجربے کے طور پر اگلے ماہ کی شروعات سے اسے استعمال کرنے کے لیے قریبی شہر جا رہی ہوں۔ اگر مقصد میں کامیابی ہوئی تو قتل کے اس سلسلے کو مزید مستحکم کرنے کی کوششیں کروں گی۔ ورنہ جاگیردار معاوضہ واپس دینے کے بعد اسے واپس حویلی لے جائے گا۔''

وقاص خاموش ہوگئے۔ وہ یہ سب نہیں چاہتے تھے لیکن ان کے چاہنے نہ چاہنے سے بھلا کیا ہونے والا تھا۔ صائمہ سے شادی کے بعد انہوں نے وہی سب کچھ کیا تھا جس کا اس نے انہیں حکم دیا تھا۔ ان کی قوتِ مدافعت شادی کے بعد تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

پھر ایک سال کے دوران میں مختلف شہروں میں بارہ قتل کی وارداتوں میں جرمن شیفرڈ کو بخوبی استعمال کیا گیا۔ ان وارداتوں سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد سے صائمہ کی گہری جان پہچان تھی لیکن چند ایسے بھی تھے جو ناواقف تھے اور صائمہ کی سہیلیوں کے توسط سے اپنے عزیزوں سے چھٹکارے کے لیے آئے تھے۔ صائمہ نے ان سب سے منہ مانگا معاوضہ وصول کیا۔ چونکہ قتل کی تمام وارداتیں ملک کے مختلف شہروں میں وقوع پذیر ہوئی تھیں اس لیے ان اموات کو حادثاتی قرار دے کر نظرانداز کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قتل سے قبل صائمہ مقتول کی بیوی سے اس کا خون طلب کرتی تھی۔ یہ خون مقتول کو شراب پلا کر بہ آسانی حاصل کر لیا جاتا تھا۔ دو تین کیس ایسے بھی سامنے آئے جس میں مقتول شراب پینے کا عادی نہیں تھا۔ ایسی صورت میں اسے زبردستی پلا کر معاملے کو بہ احسن وخوبی حل کیا گیا۔ اب تک جتنے بھی کیس وقوع پذیر ہوئے تھے، ان میں موت مردوں کی واقع ہوئی تھی اور یہ صائمہ کی مردوں سے بے انتہا نفرت کا منہ بولتا ثبوت تھا اور وقاص کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ وہ بھی مرد تھے اور ان کی ازدواجی زندگی اتنی خوشگوار بھی نہیں تھی کہ وہ صائمہ سے محبت کی توقع رکھ سکتے۔ اس لیے انہوں نے چھپ کر اس کی بات چیت سننی شروع کر دی۔ جلد ہی یہ بات سامنے آگئی کہ وہ واقعی وقاص کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اسے صرف نجات کے لیے خون کی ایک سرنج درکار تھی۔ چونکہ وقاص شراب نوشی کے عادی نہیں تھے اور مدہوشی کے بغیر ان کے جسم سے خون نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ صائمہ کی اس حرکت نے وقاص کو اس سے بدظن کر دیا اور انہیں شدت کے ساتھ فہمیدہ اور اکلوتے بیٹے کی یاد ستانے لگی۔

کچھ دنوں کی سوچ و بچار کے بعد انہوں نے فہمیدہ کے ساتھ بات چیت کا فیصلہ کیا۔ اس طویل عرصے کے دوران اس کی دوسری شادی ناکام ہو چکی تھی۔ انہوں نے فون کے ذریعے بات چیت کا آغاز کر دیا۔ گلے شکوؤں کی ابتدا ہوئی۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ اور تلخی خوشی سے ایک دوسرے کو باخبر کیا گیا۔ کچھ دیر کے لیے رونے دھونے کی نوبت بھی آئی۔ بالآخر طوفانی بادوباراں کے بعد مطلع صاف ہوگیا۔ اس کے بعد عہد و پیماں، منتوں وعدوں کے سلسلے کا

آغاز ہوا اور فہمیدہ نے یہ شرط ان کے سامنے رکھ دی کہ اگر وہ صائمہ کو طلاق دینے کے لیے تیار ہیں تو وہ بہ خوشی ان کے ساتھ دوبارہ شادی کرنے کے لیے رضامند ہو سکتی ہے۔ بصورت دیگر بات چیت صرف فون تک محدود رہے گی اور ان کا ملنا جلنا ممکن نہیں ہوگا۔

وقاص نے انہیں یقین دلایا کہ وہ جلد اسے امید افزا فیصلے سے آگاہ کریں گے۔ تب تک بات چیت کے سلسلے کو وقتی طور پر ملتوی کرنا ہوگا۔ فہمیدہ نے ہامی بھرتے ہوئے انہیں یقین دلایا کہ وہ گھر والوں کو ان کی آمد سے مطلع رکھے گی اور جلد مزید بات چیت کی منتظر رہے گی۔ وقاص نے مطمئن انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ صائمہ کو طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ انہیں تو اس سے بہت بدلے چکانے تھے۔ صائمہ نے ان کی زندگی کو تقریباً مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ بیس سالہ رفاقت کے دوران انہیں کوئی بھی ایسی بات یاد نہیں تھی جس میں وقاص کی خوشی اور رضامندی کا خیال رکھا گیا ہو جو کچھ بھی ہوا تھا صائمہ کی مرضی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہوا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ اس کی رفاقت سے مطمئن نہیں تھی اور آدم خور کُتّے کے ذریعے ان کی ہلاکت کی متمنی تھی۔ یہ وقاص صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ شراب نہیں پیتے تھے۔ ورنہ اب تک جرمن شیفرڈ انہیں چیر پھاڑ چکا ہوتا۔

فہمیدہ کی اس کال کے بعد وقاص کی زندگی کا مقصد صائمہ کے خون کا حصول بن کر رہ گیا۔ وہ شراب کی عادی تھی۔ اس لیے وقاص کو زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑا اور انہوں نے مدہوشی کے عالم میں صائمہ کا خون سرنج میں بھر لیا۔ پھر رات کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن دوپہر کے قریب جب صائمہ کا نشہ ٹوٹنے لگا تب سعید آباد کے جاگیردار کا فون آ گیا اور اس نے صائمہ کو اپنی زمینوں پر رات کے کھانے کے لیے مدعو کیا۔ صائمہ نے معنی خیز انداز میں وقاص کی طرف دیکھتے ہوئے جلد آنے کا وعدہ کیا اور ریسیور رکھنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر اس کی جاگیر کی طرف چلی گئی۔ وقاص کو اس کے جانے کا ملال نہیں تھا خون والی سرنج ان کے پاس تھی اور وہ جب چاہتے، کُتّے کو اس کی موت کے لیے تیار کر سکتے تھے۔ اب انہیں صرف صائمہ کی آمد کا انتظار تھا۔

☆☆☆

حالات پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے نہ جانے رات کے کس پہر اُن کی آنکھ لگ گئی اور وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے گہری نیند سو گئے۔ سوئی کی تکلیف دہ چبھن سے اُن کی آنکھ کھلی۔

صوفے کے اردگرد بڑی بڑی مونچھوں والے دو آدمی ہاتھوں میں ریوالور تھامے کھڑے تھے۔ صائمہ ان کے سامنے ایزی چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ حواس بیدار ہوتے ہی انہوں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ صائمہ سرد لہجے میں بولی۔

''خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہو۔ مجھے صرف تمہارا خون درکار تھا۔ وہ میں نے نیند کے دوران حاصل کر لیا۔'' وقاص نے صوفے کے گرد کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے.... خون بھری سرنج پکڑی ہوئی تھی جس میں بھرا ہوا خون ان کی موت کا پیش خیمہ تھا۔ صائمہ بول رہی تھی۔

''درحقیقت میں سعید آباد کے جاگیردار کے ساتھ شادی کرنے والی ہوں اور مجھے اب تمہارے بوڑھے وجود کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی ہوں کہ تم مجھ سے علیحدگی کے بعد دوبارہ فہمیدہ کو اپنانے کی کوشش کرو۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑ رہا ہے۔'' وقاص بولے۔

''فہمیدہ مجھ سے علیحدگی کے بعد دوسری شادی کر چکی ہے۔ اس لیے اسے اپنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی سعید آباد کے جاگیردار سے شادی کی بات تو مجھے تمہارے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' صائمہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''تمہاری تمام زندگی دھوکا دہی اور مجرمانہ سرگرمیوں میں گزر گئی۔ لیکن اس کے باوجود بھی تمہیں جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گزشتہ ہفتے سعید آباد جانے سے قبل میں نے تمہاری اور فہمیدہ کی گفتگو سن لی تھی لیکن تمہیں کُتّے کی موت مارنے کا فیصلہ میں نے گفتگو سننے سے قبل کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ سے چھٹکارے کے لیے تم نے بھی بہت کچھ سوچ رکھا ہوگا لیکن میں تمہیں اس پر عملدرآمد کا موقع نہیں دوں گی۔'' صائمہ نے صوفے کے قریب کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ اس نے ریوالور کو جیب میں رکھا اور دروازے کے پاس رکھے ہوئے فریج کا دروازہ کھول کر شراب کی بوتل نکال کر اس کا ڈھکن کھولنے لگا۔ وقاص معاملے سے کافی حد تک آگاہ ہو چکے تھے اس لیے سرد لہجے میں بولے۔

''تم جو کچھ کرنے والی ہو۔ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ میں حفاظتی اقدام کے طور پر بہت سے

ٹھنڈی
تبت
پریکلی ہیٹ
پاؤڈر
TIBET
Prickly
Pow
Bacterial
تبت پریکلی ہیٹ پاؤڈر
گرمی دانوں سے نجات اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس
TPHP/07/2K17

لوگوں کو اس کے متعلق آگاہ کر چکا ہوں۔ اس لیے میری گمشدگی یا پھر موت کا ذمے دار تمہیں گردانیں گے۔ ان کی بات درمیان میں رہ گئی۔ خون سے بھری ہوئی سرنج کو پکڑے ہوئے آدمی نے سرنج صائمہ کے حوالے کی اور وقاص کے دونوں ہاتھوں کو جھٹکے کے ساتھ موڑ کر کمر کے پیچھے کر دیا پھر شراب کی بوتل لانے والے دوسرے آدمی نے انہیں گردن کے پاس سے پکڑ کر بوتل کا سرا اُن کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ وقاص نے جدوجہد کی بھرپور کوشش کی لیکن دونوں آدمیوں کی مضبوط گرفت کے باعث صرف کسمسا کر رہ گئے اور بوتل کا سیال ان کے حلق میں سے ہوتا ہوا معدے میں منتقل ہونے لگا۔ ان کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہوتا چلا گیا۔ سانس سینے میں اٹکنے لگا اور آنکھیں نشے کی وجہ سے اوپر چڑھ گئیں۔ جلد ہی وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گئے لیکن آدمی نے بوتل کو ان کے منہ سے باہر نہیں نکالا۔ صائمہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اس کی مدہوشی کے لیے آدھی بوتل کافی ہے۔ اگر تم نے ساری اس کے منہ میں انڈیل دی تو یہ مہینے بھر سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔'' آدمی نے بوتل کا سرا اس کے منہ سے باہر نکال لیا۔ صائمہ دوبارہ بولی۔

''اس پر شراب کا نشہ مکمل طور پر چڑھنے تک میں کُتّے کو خون پلا دیتی ہوں۔ تم دونوں اس کا خیال رکھنا۔'' دونوں آدمیوں نے سر اثبات میں ہلایا اور صائمہ خون سے بھری ہوئی سرنج کو ہاتھوں میں تھامے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا کمرا مکان کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر ٹی وی لاؤنج سے ہوتی ہوئی لان میں آ گئی۔ جرمن شیفرڈ اپنے کمرے کے پاس بیٹھا اس کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے لان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہلکے ہلکے غرانے لگا۔ عموماً وہ صائمہ اور وقاص کو دیکھنے کے بعد دم ہلانے لگتا تھا۔ یہ اس بات کی نشاندہی ہوتی تھی کہ وہ انہیں بخوبی پہچانتا ہے۔ تاہم اس رات اس نے ایسا نہیں کیا۔ صائمہ کو اس کی سردمہری محسوس کر کے تعجب ہوا۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کہ وہ رات کو لان میں کھلا رہتا تھا۔ یقیناً اس کی غیر موجودگی کے دوران وقاص نے اسے زنجیر سے باندھ کر رکھا ہو گا جس کی وجہ سے وہ پریشان تھا۔ صائمہ نے آگے بڑھ کر اس کی زنجیر کو ہک سے علیحدہ کیا اور اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آزاد کر دیا۔ کُتّے نے غراتے ہوئے اس کے جسم کو سونگھا۔ صائمہ نے جھکتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سرنج کو کُتّے کی پلیٹ میں رکھنے کی کوشش کی۔ وہ کتّے کے غیر معمولی رویّے سے بے خبر تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور وہ دانت نکوستے ہوئے خونخوار نگاہوں سے صائمہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اس وقت اس کا ہدف صائمہ کا جسم تھا۔ اس نے یکلخت حملہ کرتے ہوئے صائمہ کے نرخرے کو دانتوں میں دبا لیا۔ صائمہ کے حلق سے دلدوز چیخ نمودار ہوئی اور اس کے جسم نے مچھلی کی طرح تڑپنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ سن کر وقاص کی نگرانی پر مامور دونوں آدمی کمرے سے نکل کر پہلی منزل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب وہ دونوں لان میں پہنچے تو تب تک صائمہ ہاتھ پاؤں کو ڈھیلا چھوڑ چکی تھی اور کتا نرخرے کو چبانے کے بعد خون پینے میں مصروف تھا۔ اسے لاش کے پاس سے ہٹانا اب ممکن نہیں تھا۔ وہ مداخلت کرنے والے کسی بھی وجود کو چیر پھاڑ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

دونوں عجلت کے عالم میں ٹی وی لاؤنج کی طرف آ گئے۔ انہوں نے سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور جاگیردار کو حالات کے متعلق بتانے لگے۔ جاگیردار نے صائمہ کی موت پر اظہارِ افسوس کیا اور وقاص کی موت کا حکم دینے کے بعد سلسلے کو منقطع کر دیا۔

دوسرے دن کا اخبار چونکا دینے والی خبر سے مزیّن تھا۔

''ملک میں ہونے والی پراسرار ہلاکتوں کی تفتیش کا معاملہ منظر عام پر آ گیا۔ پولیس ذرائع کے مطابق ہلاکتوں میں ملوث آدم خور کتے کو زندہ پکڑ لیا گیا ہے لیکن کُتّے کے مالکان کو اس لیے گرفتار نہیں کیا جا سکا کہ خطرناک کتے نے رات کے کسی پہر دونوں میاں بیوی کے نرخروں کو چبا کر انہیں ہلاک کر ڈالا۔ کتے نے ایسا کیوں کیا؟ یہ بات زیرِ تفتیش ہے۔ اس بات کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر ہے کہ کُتّے نے پاگل ہو کر یہ حرکت کی ہے اور اس بات کی توقع بھی نہیں کی جا رہی کہ دونوں میاں بیوی کُتّے کی تربیت میں ملوث ہیں۔ پولیس مخصوص تربیت دینے والے افراد کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ تاحال تلاش کا سلسلہ کامیاب ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ لیکن جلد گرفتاری متوقع ہے۔ پولیس کے مزید کہنے کے مطابق ہلاک ہونے والے دونوں میاں بیوی کا تعلق گزشتہ وارداتوں میں ملوث لواحقین سے منسوب کیا جا رہا ہے اور پولیس ہلاک ہونے والے افراد کے لواحقین کو دسترس میں لے کر تفتیش کا نئے سرے سے آغاز کر چکی ہے۔ جلد بہتر نتائج کی توقع ممکن ہے۔''

تہلکہ

جمال دستی

حقیقت کے رنگ جتنے گہرے ہوں گے... طاقت اور تاثیر اسی قدر زیادہ ہوگی... وہ باکمال مصنف تھا... اس کا ہر ناول بیسٹ سیلر تھا... مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ وہ لاجواب فنکار تھا اور ایسا میزبان تھاکہ مہمان اس کی میزبانی بھول نہ پاتے تھے...

چونکا دینے والے انجام سے مزین تہلکہ خیز کہانی

وہ ایک بوڑھا تھا۔ بہت کمزور ناتواں۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھی جانا ہوتا تو بیساکھی کے سہارے جایا کرتا۔ اس کے باوجود معاشرے میں اس کی ایک اہمیت تھی۔ وہ ایک بڑا جاسوسی ناول نگار تھا۔

اس کے ناولوں کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا۔ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے تھے۔ اس کو معاوضہ بھی اتنا ملتا تھا جس کا دوسرے رائٹر تصور ہی کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک تنہا انسان تھا۔ اس نے ایک گھر بنا لیا تھا۔ اس کا گھر بھی ایک شاہکار تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گھر تو کوئی اتنا عالی شان نہیں تھا لیکن اس کی لوکیشن بہت اچھی تھی۔ ایک طرف چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ گھر کے سامنے ایک پارک تھا۔ پارک سے فاصلے پر ایک کالونی بنی ہوئی تھی۔ اس کی ضروریات اسی کالونی سے پوری ہوتی تھیں۔

اس کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ہر پبلشر کی خواہش ہوتی کہ قرار کا ناول اس کے ادارے سے شائع ہو۔ اس نے کسی زمانے میں شاعری بھی کی تھی۔ قرار اس کا تخلص تھا۔ پھر یہ ہوا کہ لوگ اس کا اصل نام فراموش کر گئے۔ وہ سب کے لیے قرار ہو کر رہ گیا۔

اس کے ناول کے پلاٹ حیرت انگیز ہوا کرتے۔ وہ سچویشن کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ اس کے ناولوں کے کردار چلتے پھرتے محسوس ہوتے۔ آج اسے کسی کو انٹرویو دینا تھا۔ حالانکہ وہ انٹرویو وغیرہ سے دور ہی رہا کرتا لیکن اس لڑکی نے فون پر اتنی بے تابی ظاہر کی تھی کہ قرار نے اسے وقت دے ہی دیا تھا۔

وہ اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ اس لڑکی نے اپنا نام عالیہ بتایا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنی وہیل چیئر دروازے کی طرف دھکیلنی شروع کر دی۔ پہلے تو اسے بہت پریشانی ہوتی تھی لیکن اب عادت ہو گئی تھی۔ دروازے کے لاکس بھی اس کی سہولت کے لیے نیچے لگائے گئے تھے۔ تاکہ وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر ہاتھ بڑھا کر لاک کھول سکے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ایک جوان اور خوب صورت سی لڑکی اپنے شانے پر ایک بیگ لٹکائے کھڑی تھی۔

اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ”میں عالیہ خورشید ہوں۔“

قرار گہری اور چبھتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر خشک لہجے میں بولا۔ ”بی بی! مجھے انتظار پسند نہیں ہے۔ میں بیمار آدمی ہوں۔ تم پورے چالیس منٹ دیر سے آئی ہو۔“

”سوری سر۔“ عالیہ جلدی سے بولی۔ ”اس طرف کی ساری سڑکیں کھدی ہوئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے ایک لمبا چکر کاٹ کر آپ تک پہنچی ہوں۔“

”چلو اندر آجاؤ۔“ اس نے اپنی وہیل چیئر ایک طرف کھسکا لی۔

عالیہ اندر آگئی۔ یہ ایک سلیقے کا ڈرائنگ روم تھا۔ آرٹسٹک انداز میں سجا ہوا، فرنیچر اگرچہ بہت کم تھا لیکن جو بھی تھا بہت طریقے کا تھا۔ کمرے میں دو الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

ایک ڈیوائڈر تھا جس پر دو گڑیائیں رکھی تھیں۔ عالیہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ قرار نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

عالیہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا جبکہ میں یہ جانتی تھی کہ آپ انٹرویو نہیں دیتے۔ لیکن آپ نے میری درخواست قبول کر لی۔“

”ہاں، ایسا ہی ہے۔ میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ ویسے بھی میں ایک بیمار انسان ہوں۔ نہ جانے زندگی کی ڈور کب ٹوٹ جائے اور یہ کہانی ختم ہو جائے۔“

”قرار صاحب۔ خدا آپ کو زندہ رکھے۔ آپ جیسے لکھنے والے ہمارے یہاں بہت کم ہیں۔“

”بی بی، یہ سب خواہشیں ہو سکتی ہیں۔ دعا ہو سکتی ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو لکھ دیا جاتا ہے۔“

اسی دوران میں اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ عالیہ نے جلدی سے گلاس میں پانی انڈیل کر دیا۔ قرار نے پانی پیا۔ سکون کا سانس لے کے کچھ قرار میں آگیا۔

”آپ اس گھر میں اکیلے ہیں؟“ عالیہ نے پوچھا۔

”نہیں بی بی، اب اتنا بھی اکیلا نہیں ہوں۔ پرانی یادیں میرے ساتھ ہیں اور گزرے دنوں کی پرچھائیاں ہیں۔ جب شام ڈھل جاتی ہے تو گزرے دنوں کے شہر سے ہر طرف سے نکل نکل کر میرے پاس آنے لگتے ہیں۔ وہ لوگ جو کبھی میرے ساتھ ہوا کرتے تھے، وہ میرا دل بہلاتے ہیں۔ تم مجھے بس دو منٹ دینا۔ میں اچھی طرح خود کو سنبھال لوں پھر تمہارے سوالوں کے جواب دوں گا۔“

”ہاں، ہاں ضرور۔ مجھے کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔ میں کہہ کر آئی ہوں کہ قرار صاحب کے پاس مجھے دیر ہو سکتی ہے۔“

قرار اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک بار پھر اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس نے میز پر رکھا ہوا ان ہیلر اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی حالت کچھ سنبھل گئی تو اس نے عالیہ کے سوال کا جواب دیا۔ ”ہاں، بی بی میں اکیلا ہوں۔ بیوی کی موت کے بعد تنہائی میرے ساتھ رہ گئی ہے۔ ایک بیٹی ہے۔ جو اپنے شوہر کے ساتھ ملک سے باہر ہے۔ خدا اسے خوش رکھے۔“

”آپ کے دن رات کیسے گزرتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کھانا وغیرہ کیسے ہوتا ہے؟“

”ایک ملازمہ ہے جو بے چاری صبح آ کر کھانا بنا جاتی ہے۔ ناشتا دے دیتی ہے۔ بس اسی طرح گزر رہی ہے۔“ قرار

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے کہا۔ ’’اس کے علاوہ کتابیں تنہا رہنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔ ہر دم میرے ساتھ رہتی ہیں۔‘‘

’’معاف کیجیے گا۔ کیا میں آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ اور جان سکتی ہوں؟‘‘ عالیہ نے پوچھا۔

’’بی بی مجھے اپنی یادوں کو آواز دینی ہوگی۔‘‘ قرار نے کہا۔ ’’اور اب میں اس مرحلے پر ہوں کہ اپنی یادداشت دہرانا نہیں چاہتا۔‘‘

’’بس ایک سوال کا اور جواب دے دیں۔‘‘

’’چلو پوچھو۔‘‘

’’آپ مرتے ہوئے لوگوں کی اتنی خوب صورت جزئیات نگاری کس طرح کر لیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کردار آپ کے سامنے ہی دم توڑ رہے ہوں۔‘‘

وہ مسکرا دیا۔ ’’بی بی یہی تو وہ فن ہے جس نے مجھے دوسروں سے ممتاز کر دیا ہے۔‘‘

☆☆☆

اس گھر سے کچھ فاصلے پر سلطان کا فلیٹ تھا۔

زوبی نام تھا اس کی بیوی کا۔ دونوں میاں بیوی نے اپنی زندگی کی راہ بالکل مختلف رکھی تھی۔

یہ راہ جرائم کی تھی۔ ابتدا میں تو صرف سلطان اس راہ کا مسافر تھا لیکن اب زوبی بھی ہر محاذ پر اس کا ساتھ دینے لگی تھی۔

سلطان ایک خبر لے کر آیا تھا، ایسی خبر بہت دنوں کے بعد ملی تھی۔ ان دونوں نے اپنا طریقۂ کار بدل دیا تھا۔

پہلے وہ دھڑلے سے لوگوں کو اسلحہ دکھا کر لوٹ لیا کرتے تھے لیکن اب اس میں خطرات زیادہ ہو گئے تھے۔ اب وہ ریکی کر کے واردات کرتے تھے۔ کسی بھی ایسے گھر میں داخل ہوتے جہاں ایک دو افراد ہوں۔

ان کو اسلحہ دکھا کر زیر کر لینا کوئی مشکل نہیں ہوتا تھا پھر وہ آرام سے اپنا کام کر کے اس گھر سے نکل آتے، کوئی نشان چھوڑے بغیر۔

اب سلطان ایک رائٹر کے گھر کی خبر لے کر آیا تھا۔

’’ارے ان لکھنے والوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جو تم نے پلاننگ کر لی ہے؟‘‘ زوبی نے کہا۔

’’اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ میں اس کی پوری معلومات لے کر آیا ہوں۔ دو دنوں تک ریکی کی ہے۔ وہ ایک بہت مشہور رائٹر ہے۔ جاسوسی ناول نگار، کیا شاندار گھر ہے اس کا، دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔ لاکھوں کی آمدنی ہے اس کی۔ اور ایک بات سب سے اچھی یہ ہے کہ وہ اپنے مکان میں اکیلا ہی رہتا ہے۔‘‘

’’کوئی ملازم؟‘‘

’’نہیں اس کے پاس کوئی ملازم بھی نہیں ہے۔ ایک ملازمہ ہے جو صبح آ کر کام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس گھر میں سناٹا ہو جاتا ہے۔‘‘

’’کمال ہے۔‘‘ زوبی نے کہا۔

’’اب ایک بات اور سن لو۔ یہ بھی بہت مزے کی بات ہے۔ وہ اپاہج ہے۔ مکمل اپاہج۔‘‘ سلطان نے بتایا۔ ’’وہیل چیئر پر گھومتا ہے۔ اب خود دیکھ لو۔ ہمارا کام کتنا آسان ہو گیا ہے۔‘‘

’’یہ تو ہے۔‘‘

’’زوبی، اتنا آسان ٹارگٹ ہمیں کبھی ملا نہیں ہوگا۔‘‘

’’کرنا کیا ہے؟‘‘

’’کچھ خاص نہیں۔ اس کا مکان آبادی سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اس طرف لوگوں کا آنا جانا بھی کم ہوتا ہے۔ اس کے گھر سے راستہ چرنا آئی لینڈ کی طرف جایا کرتا ہے۔ شوقین لوگ اسکوبا ڈائیونگ کے لیے اسی طرف جاتے ہیں۔ ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تفریح کے لیے نکلے تھے۔ راستے میں، اس گھر کے پاس ہماری گاڑی خراب ہو گئی۔ ہم میاں بیوی ہیں۔ وہ ہمیں پناہ دے دے گا اور ہم رات میں اس گھر کا صفایا کر جائیں گے۔‘‘

’’اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو کیا ہوگا؟‘‘ زوبی نے پوچھا۔

’’ہونا کیا ہے، بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتا رہ جائے گا۔ کیا کر سکے گا۔ ایک مکمل اپاہج انسان ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ دیکھ لو ایسا موقع شاید دوبارہ نہ ملے۔‘‘

’’فرض کرو اس کے گھر سے کچھ نہ ملا تو؟‘‘

’’ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بہت کچھ ہے اس بوڑھے کے پاس۔ تم جانتی ہو کہ میں کچا کام نہیں کرتا ہوں۔ پوری انفارمیشن ہوتی ہے میرے پاس۔ تب جا کر ہاتھ ڈالتا ہوں۔‘‘

’’یہ تو ہے۔‘‘ زوبی نے اقرار کیا۔ ’’میں نے تمہیں کبھی ناکام ہوتے نہیں دیکھا ہے۔‘‘

’’میں نے اپنے استادوں سے ایک بات سیکھی ہے کہ اس کام میں جلد بازی نہیں کرتے۔ بہت سکون سے کام کرتے ہیں۔ اور چھچھورا پن نہیں دکھاتے۔ میرے بہت سے جاننے والے اسی چکر میں پکڑے گئے ہیں کہ ادھر ان کے ہاتھ لمبی رقم لگی ادھر انہوں نے عیاشی شروع کر دی۔ شاپنگ، ہوٹلنگ، باہر جا کر عیاشی۔ اسی لیے وہ نظروں میں آ جاتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں۔ بہت صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہمیں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔ ہم ابھی تک اسی پالیسی کی وجہ سے بچے ہوئے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہیں۔"

"ارے بابا، میں تمہاری ان ہی صلاحیتوں پر عاشق ہوئی ہوں۔" زوبی نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ، ہمیں تیاری کیا کرنی ہوگی؟"

"کس بات کی تیاری؟ بس چل دینا ہے۔ کامیابی تو ہونی ہی ہے۔"

دوسرے دن ان کی گاڑی اس مصنف کے مکان کے سامنے خراب ہوگئی۔ زوبی اس علاقے کی لوکیشن کو دیکھ کر متاثر ہوگئی تھی۔ "کمال ہے اس بوڑھے نے کیسی جگہ گھر بنایا ہے اور گھر بھی کتنا خوب صورت ہے۔"

"آئیڈیل لوکیشن ہے۔" سلطان نے کہا۔ "یہ اور بات ہے کہ ہم اس گھر سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم یہاں رہ نہیں سکتے۔"

"ویسے بھی اس ویرانے میں کم از کم میں تو نہیں رہ سکتی۔" زوبی نے کہا۔

"چلو، چل کر گھر کی گھنٹی بجاتے ہیں۔" سلطان نے کہا۔ آس پاس بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔"

دونوں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کردی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ گھنٹی دروازے کے ساتھ ہی تھی۔ اس کے برابر میں ایک نوٹ لکھا ہوا تھا۔ "براہِ کرم گھنٹی بجانے کے بعد کچھ دیر انتظار کریں۔ میں ایک معذور انسان ہوں۔ مجھے دروازے تک آنے میں دیر لگ سکتی ہے۔"

دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سلطان نے گھنٹی دبا دی۔ دونوں ہدایت کے مطابق انتظار کرنے لگے دروازہ پانچ منٹ کے بعد ہی کھلا تھا۔

وہ ایک معذور انسان تھا۔ جو اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجیے گا۔" زوبی نے کہا۔ "ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ ہم پکنک کے ارادے سے چرنا آئی لینڈ کی طرف جارہے تھے کہ ہماری گاڑی خراب ہوگئی۔"

قرار کچھ نہیں بولا۔ وہ گہری نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔

"رات بھی ہوتی جارہی ہے۔" سلطان نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم کیا کریں کہ آپ کا گھر دکھائی دے گیا۔ ہم نے گھنٹی بجادی۔"

"اب کیا چاہتے ہو؟" قرار نے پوچھا۔

"بس ایک رات کی پناہ۔" زوبی نے کہا۔ "ہم صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی کہ صبح ہوتے ہی تم کو بھگا دوں گا۔" قرار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ اندر آجاؤ، ہمارے مہمان ہو۔"

اس نے اپنی وہیل چیئر ایک طرف ہٹالی تھی۔ دونوں اندر آگئے۔ قرار نے دروازہ بند کردیا۔

گھر کی سجاوٹ نے دونوں کو حیران کردیا تھا۔ بہت ہی آرٹسٹک سجاوٹ تھی۔ قرار داد طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

زوبی نے اعتراف کیا۔ "جناب، آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔"

"ہاں، یہ میرے ذوق کے عین مطابق ہے۔" قرار فخریہ طور پر بولا۔ "میں ایک رائٹر ہوں۔ اس گھر کی سجاوٹ میں نے اپنے طور پر کروائی ہے۔"

"بالکل جناب، ایک رائٹر کے گھر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔" سلطان نے کہا۔

"جناب، آپ کیا لکھتے ہیں؟" زوبی نے پوچھا۔

"کہانیاں، جاسوسی انداز کی کہانیاں۔ قرار نام ہے میرا۔"

"ارے آپ قرار صاحب ہیں؟" زوبی نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔ "میں تو آپ کی بہت سی کتابیں پڑھ چکی ہوں۔"

قرار مسکرا دیا۔

"بیٹھ جاؤ۔ تم دونوں۔" قرار نے کہا۔ "معاف کرنا، میں تم دونوں سے بڑا ہوں۔ اسی لیے تم کہہ کر مخاطب کررہا ہوں، بُرا نہ ماننا۔"

"ارے نہیں جناب، مجھے تو اچھا لگا ہے۔" زوبی نے کہا۔ "اپنائیت کا احساس ہوا ہے۔"

دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ قرار اپنی وہیل چیئر پر ہی بیٹھا رہا۔
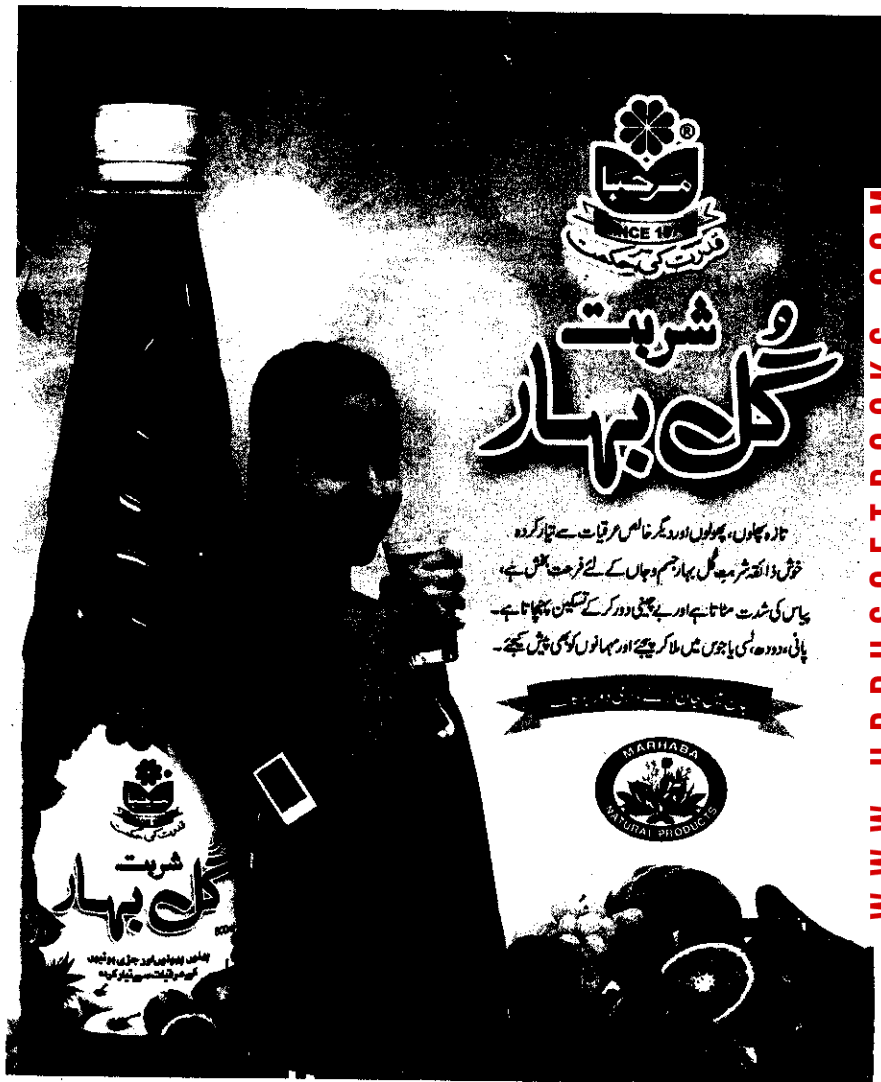
"کیا آپ اکیلے ہی رہتے ہیں؟" زوبی نے پوچھا۔

"اکیلا تو نہیں۔ بہت سے لوگ ہیں میرے ساتھ۔" اس نے بتایا۔ "لیکن وہ سب میری یادوں میں ہیں۔ جب مجھے تنہائی زیادہ محسوس ہوتی ہے تو میں انہیں اپنی یادوں سے باہر نکال کر ان سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔"

"بہت باحوصلہ آدمی ہیں آپ۔"

"میں اپنا سارا کام خود ہی کرتا ہوں۔" وہ بتا رہا تھا۔ "ایک ملازمہ آتی ہے جو اپنا کام کرکے دن میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد میں ہوتا ہوں اور میری یادیں یا پھر قلم کاغذ۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ارے میں نے تم دونوں کو چائے کا تو پوچھا ہی نہیں۔ میں چائے لے کر آتا ہوں۔"

"مجھے بتائیں، میں چائے بنا دیتی ہوں۔" زوبی نے کہا۔

"بہت شکریہ تمہارا۔ لیکن اس قسم کا کام میں خود ہی کرتا ہوں۔ جس دن میں نے محسوس کر لیا کہ میں اپاہج ہوں۔ اس دن میں قبر میں چلا جاؤں گا۔ ابھی میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تم دونوں بیٹھو، میں ابھی آیا۔"

قرار اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

"یہ تو واقعی بہت کمال کا آدمی ہے۔" زوبی نے سرگوشی کی۔

"ہاں، میں نے جیسا سنا تھا' وہ ویسا ہی ہے۔ مہمان نواز بھی ہے لیکن ہم اس کی مہمان نوازی صرف ایک رات کے لیے دیکھ سکیں گے۔ کل صبح یہاں سے چلے جانا ہے اور کم از کم ایک سال تک جرنا آئی لینڈ کی طرف نہیں آنا ہے۔"

زوبی ہنس دی۔

سلطان کو اس کی ہنسی بہت پسند تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھنٹیاں سی بج رہی ہوں۔

کچھ دیر بعد قرار ایک ٹرالی گھسیٹتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ٹرالی کو اس طرح اپنی وہیل چیئر کے آگے لگا رکھا تھا کہ اسے گھسیٹنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

"میں اسی طرح اپنے سارے کام کرتا ہوں۔" قرار نے کہا۔

اس ٹرالی میں چائے کے ساتھ کھانے پینے کی بھی چیزیں تھیں۔

"آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا؟" سلطان نے کہا۔

"ارے کوئی تکلف نہیں۔ یہ تو عام سی بات ہے۔" قرار نے کہا۔

"چائے میں بنا دیتی ہوں۔" زوبی نے کہا۔

"لیکن میرے لیے مت بنانا۔ تم نے جس وقت گھنٹی بجائی تھی، اس وقت میں چائے ہی پی رہا تھا۔"

زوبی نے دو کپ بنا کر ایک اپنے لیے رکھ لی، دوسری سلطان کے حوالے کر دی۔ دونوں کیک کے ساتھ چائے پینے لگے۔

"جناب، میں نے آپ کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔" زوبی نے کہا۔ "کیا زبردست لکھتے ہیں آپ۔ خاص طور پر مرتے ہوئے لوگوں کے تاثرات لکھنے میں آپ کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم۔ بہت سے لوگ مجھ سے یہی سوال کرتے ہیں۔ اب میں کیا کہوں۔ کتنوں کو جواب دوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ پریکٹس ہو گئی ہے۔"

"آپ کی یہ پریکٹس بھی کمال کی ہے۔" سلطان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں، بہت غیر معمولی ہے۔" قرار نے کہا۔ "لکھنے والے تو بہت ہیں۔ میں نے ایک مختلف راہ اپنائی ہے اسی لیے کامیاب ہوں۔ کیا نہیں ہے میرے پاس۔ دوسرے لکھنے والے جن چیزوں کے خواب دیکھتے ہیں، وہ سب کچھ میں نے حاصل کر لیا ہے۔"

"میری تو خواہش ہے کہ میں کبھی آپ کو لکھتے ہوئے دیکھوں۔" زوبی نے کہا۔ "دیکھوں تو سہی کہ لکھتے ہوئے آپ کے تاثرات کیا ہوتے ہیں؟"

"چلو ہو سکتا ہے کہ آج رات ہی تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے۔ میں اپنے ناول کا آخری باب لکھ رہا ہوں۔ کل صبح پبلشر کو دینا ہے۔"

اچانک سلطان کو ایسا لگا جیسے اس کے سینے میں چھریاں چلنے لگی ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا۔ ایسی ہی کیفیت زوبی کی بھی ہونے لگی تھی۔ اس کو ابکائیاں آنے لگیں۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔

دونوں تڑپ کر صوفے سے نیچے آ گئے۔

اسی وقت قرار اپنی وہیل چیئر سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بہت بے رحمانہ تھے۔

وہ اپنے پیروں پر چلتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سلطان اور زوبی نیچے گر کر تڑپ رہے تھے۔ سلطان کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ قرار ایک ڈائری اور قلم لے کر واپس آ گیا تھا۔

"ذلیل، ذلیل انسان۔ تو...... تو نے کیا کر دیا؟" سلطان اٹکتے ہوئے بولا۔

"میں نے تم دونوں کو جو زہر دیا ہے، وہ ایسا ہی ہوتا ہے۔" قرار ہنس رہا تھا۔ "کچھ ہی دیر میں تم دونوں دنیا کے جھنجٹ سے آزاد ہو جاؤ گے اور ہاں......" اس نے زوبی کی طرف دیکھا۔ "تم کو یہ خواہش تھی نا کہ مجھے لکھتے ہوئے دیکھو۔ تو اس آخری وقت میں تمہاری یہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔"

اس نے سامنے کرسی پر بیٹھ کر ان دونوں کی طرف دیکھ دیکھ کر لکھنا شروع کر دیا۔ وہ ان دونوں کی طرف دیکھتا جا رہا تھا اور اس کا قلم ڈائری پر لفظوں سے کھیل رہا تھا۔

کیونکہ کل صبح ہی پبلشر آنے والا تھا۔

اسے امید تھی کہ اس کا یہ ناول بھی ایک تہلکہ مچا دے گا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سرور اکرام

ایک اتفاق کی بدولت زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی چلی جاتی ہیں۔ حادثاتی طور پر ہونے والی ایک عام سی ملاقات... جس نے متواتر ایسے ایسے واقعات میں الجھا دیا کہ ایک کے بعد ایک گرہ لگتی اور کھلتی چلی گئی... پُراسرار کرداروں اور تحیر زدہ تاریک ماحول میں سفر کرتی کہانی... ہر کردار میں ایک کہانی پوشیدہ تھی... کردار آتے گئے... گتھیاں سلجھتی چلی گئیں... رگوں میں دوڑتے خونِ وفا کا امتحان... احتساب اور انصاف پرور ماجرا...

سرورق کا خوب صورت رنگ...... لمحوں کو یادگار بنا دینے والی دلچسپ کہانی......

پتا نہیں چل سکا کہ گاڑی کیوں رک گئی ہے۔
آس پاس کوئی آبادی ہی نہیں تھی۔ ہر طرف خاموشی اور تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ ریل کا کوئی اسٹاپ بھی نہیں تھا۔ آج کل ہر قسم کے سفر میں اس قسم کے اندیشے لاحق رہتے ہیں۔
نہ جانے کس وقت ڈاکو حملہ کر دیں۔ تخریب کار ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں۔ یا اس قسم کی کوئی اور واردات ہو جائے۔ سفر آہستہ آہستہ طویل ہی ہوتا جا رہا تھا۔

میں ایسے ڈبے میں سفر کر رہا تھا جس میں گنتی کے کچھ ہی لوگ تھے۔ ان مختلف لوگوں میں ایک لڑکی بھی تھی اور شاید وہی لڑکی ہم سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

اس لڑکی کا چہرہ ایسے حجاب میں چھپا ہوا تھا جس میں سے صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان آنکھوں ہی نے ہم سب کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

بہت خوبصورت آنکھیں تھیں اس کی۔ ان میں بے پناہ کشش تھی۔ وہ جب دیکھتی تو ایسا لگتا جیسے برقی لہریں اس کی آنکھوں سے نکل رہی ہوں۔

اس کے علاوہ اس میں اور خاص بات نہیں تھی۔ اگر ہو بھی تو اس کا اندازہ اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا پورا جسم مع چہرے کے چھپا ہوا تھا۔

گاڑی کے اچانک رک جانے نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ ''کیا بات ہے۔ گاڑی کیوں رک گئی۔ شاید ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ شاید ٹرین کی پٹریاں دھماکے سے اڑا دی گئی ہیں۔''

طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ڈبّے میں موجود ایک صاحب نے کہا۔ ''کم بخت یہ بھی پتا نہیں چل رہا ہے کہ ریل کہاں آ کر رکی ہے؟''

''مدن پور کے پاس۔'' دوسرے صاحب نے بتایا۔ ''یہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر اگلا... اسٹیشن ہے۔''

ہو سکتا ہے کسی اور نے یہ بات محسوس نہ کی ہو لیکن مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ مدن پور کا نام سن کر وہ حجاب والی لڑکی بے چین سی ہو گئی تھی۔

اس وقت ڈبّے کے مسافر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے میں مصروف تھے جبکہ میری توجہ اس لڑکی کی طرف بھی تھی۔ اچانک وہ لڑکی اپنی سیٹ سے اٹھی اور دوسری طرف کے دروازے سے باہر اُتر گئی۔

اس کی اس حرکت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ اس جنگل میں کیا لینے اُتری تھی۔ کیا اسے خوف نہیں تھا۔ میرے علاوہ شاید ہی کسی اور نے اس کی اس حرکت پر دھیان دیا ہو کیونکہ وہ سب کے سب دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا۔ میں نے بھی جب دوسروں کو دوسری طرف متوجہ دیکھا تو خود بھی اسی دروازے سے اتر گیا۔ جس دروازے سے لڑکی اتری تھی۔

میرے پاس اس سفری بیگ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے وہ بیگ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

میرے خدا۔ گھپ اندھیرا۔ اور سوائے درختوں، پودوں اور جھاڑیوں کے وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا اور وہ خوبصورت آنکھوں والی پُراسرار لڑکی ان ہی اندھیروں میں کہیں گم ہو گئی تھی۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ میرے ایک طرف ٹرین کھڑی تھی اور دوسری طرف اندھیرا جنگل تھا۔

اچانک درختوں کے درمیان سے روشنی کی ایک چمک سی دکھائی دے گئی۔ شاید یہ وہی لڑکی تھی جو اپنا موبائل آن کر کے موبائل کی روشنی میں راستہ تلاش کر رہی تھی۔

میں اسی طرف چل پڑا۔ جس طرف وہ روشنی دکھائی دی تھی۔ میں ابھی کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ ٹرین نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ وہ اب اپنے راستے پر روانہ ہو رہی تھی۔

میں ٹرین سے اُتر کر پھنس چکا تھا۔ میں جتنی دیر میں ٹرین تک پہنچتا، وہ بہت آگے جا چکی ہوتی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں آگے بڑھتا رہوں۔

اور میں لڑکی کے موبائل کی روشنی میں رہنمائی لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ نہ جانے کیوں وہ لڑکی اپنے موبائل کو بس کبھی کبھی آن کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر اندھیرے میں آگے بڑھنے لگتی۔ یا تو اس جنگل میں اسے کسی کا خوف تھا۔ یا شاید موبائل کی بیٹری ختم ہوتی جا رہی تھی۔

اور اچانک ایک چیخ سنائی دی۔

یہ چیخ جنگل کے سناٹے میں لہراتی ہوئی بہت دور تک چلی گئی تھی۔ یہ اسی لڑکی کی چیخ تھی۔ میں نے اس چیخ کی طرف دوڑ لگا دی۔ اب وہ لڑکی چیخ تو نہیں رہی تھی لیکن اس کے موبائل کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

میں اس روشنی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے یہاں اپنے موبائل کی ٹارچ روشن کر لی تھی۔ جس سے سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لڑکی ایک گڑھے میں گری ہوئی تھی۔

وہ گڑھا اتنا گہرا تو نہیں تھا۔ اگر وہ تھوڑی سی جدوجہد کرتی تو باہر آ سکتی تھی لیکن شاید وہ بُری طرح سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خوفزدہ ہوگئی تھی۔

اپنے قریب ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوکر اور بھی چیخنے لگی۔ ”گھبراؤ نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم گڑھے میں گرگئی ہو۔ لاؤ اپنا ہاتھ، میں باہر کھینچ لیتا ہوں۔“

”نہیں۔نہیں۔میرے قریب مت آنا۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔“

”بے وقوف لڑکی! میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔ تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ میں نے کہا۔”میں تمہارے لیے اجنبی نہیں ہوں۔“

”تو پھر کون ہو تم؟“

”تمہارے سامنے ٹرین میں بیٹھا ہوا مسافر۔“ میں نے بتایا۔”جس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور سارے راستے میں تمہیں دیکھتا آیا تھا۔“

”اوہ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی...پھر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھادیا۔

میں نے اسے گڑھے سے باہر کھینچ لیا۔ اس اندھیرے میں کچھ پتا تو نہیں چل رہا تھا لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا عبایا بُری طرح الجھ چکا ہے۔

ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے تھے۔

”اس اندھیرے میں اور اس جنگل میں تم کہاں جارہی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں جارہی ہوں۔“ اس نے کہا۔”پلیز۔ مجھے جانے دو۔روکنا نہیں مجھے۔“

”بے وقوف لڑکی، یہ جنگل ہے۔شہر نہیں ہے کہ تم پکنک منانے نکل پڑی ہو۔ اس جنگل میں ڈاکو گھومتے پھرتے ہیں۔ میرا تو جاہے جو بھی حشر ہو لیکن تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اٹھا کر لے جائیں گے تم کو۔“

”اور میں چاہتی بھی یہی ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا چاہتی ہو۔“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”یہی کہ ڈاکو آکر لے جائیں۔“ اس نے کہا۔

اور ڈاکو آگئے۔ان کی آمد اچانک ہی ہوئی تھی۔ وہ دس بارہ مسلح افراد تھے۔ جنہوں نے ذرا سی دیر میں ہم دونوں کو گھیر لیا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت ہی بھیانک رات تھی۔

ڈاکو ہم دونوں کو اپنے ساتھ نہ جانے کہاں لے آئے تھے۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لڑکی خوفزدہ ہوکر چیخنے چلانے لگے گی۔ اس کے برعکس وہ بالکل خاموش تھی اور بغیر کسی احتجاج کے ان ڈاکوؤں کے ساتھ چلی جارہی تھی۔

آگے ایک شخص کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ جسے وہ کبھی کبھی روشن کرکے راستے کی نشان دہی کر دیا کرتا۔ بہت دیر سفر کے بعد ہم ایک ایسی بستی میں پہنچ گئے.... جہاں چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔

یہاں اس لڑکی کو علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ وہ ڈاکو اسے کسی اور طرف لے جانے لگے تھے۔ میں نے جب احتجاج کرنا چاہا تو مجھے دھکے دے کر آگے بڑھا دیا گیا۔

انہوں نے مجھے ایک جھونپڑی میں بند کر دیا تھا۔

اس جھونپڑی میں ایک چارپائی، ایک ٹوٹی ہوئی کرسی۔ پانی کے مٹکے‘ ایک گلاس اور ایک لالٹین کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کا دروازہ گرچہ زیادہ مضبوط نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی مضبوطی یا کمزوری سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ میں ڈاکوؤں کے چنگل سے نکل کر کہیں نہیں جاسکتا تھا۔

میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں خواہ مخواہ اس لڑکی کی ہمدردی میں ٹرین سے باہر آگیا تھا۔کیا ضرورت تھی مجھے اس کا تعاقب کرنے کی۔

ساری رات جاگتے اور کبھی سوتے ہوئے گزر گئی۔ ایسے ماحول میں نیند کہاں سے آتی لیکن دوسری صبح بہت حیرت انگیز اور خوش گوار تھی۔

دروازہ کھلا اور ایک ڈاکو پانی کی ایک بالٹی‘ تولیا منجن اور صابن وغیرہ لے کر آگیا تھا۔”یہ لو بھائی۔ ہاتھ منہ دھولو۔“ اس نے کہا۔”تمہارا ناشتا بھی آرہا ہے۔“

یہ ایک حیرت کی بات تھی۔

ڈاکوؤں کا ایسا سلوک میری سمجھ سے باہر تھا۔”وہ لڑکی کہاں ہے...جو میرے ساتھ تھی۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

اس دوران میں ایک دوسرا شخص بڑے سلیقے سے ٹرے میں ناشتا بھی سجا کر لے آیا تھا۔انڈے۔ پراٹھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پانی کی بوتل۔ چائے۔ سب کچھ تھا اس میں۔
اس نے وہ ٹرے میرے سامنے رکھ دی تھی۔
"سائیں جلدی سے ناشتا کرلو پھر سردار کے پاس جانا ہے۔"
میں نے اندیشوں کے درمیان ناشتا کیا تھا۔ نہ جانے یہ سردار کیسا آدمی ثابت ہوتا۔ اس نے اگر اٹھوایا تھا تو یوں ہی تو نہیں جانے دے گا کہ جناب، آپ نے ناشتا کرلیا ہے۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔
بہر حال جیسے تیسے ناشتا ختم کرلیا۔
دونوں ڈاکو جھونپڑی سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے سگریٹ سلگالی۔ میرا بیگ میرے پاس ہی تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی میرے بیگ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔
ابھی سگریٹ ختم ہی نہیں ہوئی تھی کہ ایک شخص جھونپڑی میں داخل ہوگیا۔ وہ ایک طویل قامت نوجوان تھا۔ جس کے ہاتھ پاؤں بتا رہے تھے کہ وہ ایک طاقتور نوجوان ہے۔ وہ بہت غرور اور نفرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "دیکھ تیرے لیے اچھا موقع ہے۔ تو بھاگ جا یہاں سے۔" اس نے کہا۔
"بھاگ جاؤں؟" میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔
"ہاں بھاگ جا۔" اس نے کہا۔ "میں تجھے بھاگنے کا موقع دے رہا ہوں۔ ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔"
"کیا تم ہی سردار ہو؟" میں نے پوچھا۔
"تو پاگل ہوگیا ہے۔" وہ غرایا۔ "میں سردار نہیں ہوں۔ سردار کا کا ہے۔"
میں اس سے پوچھنے والا تھا کہ میں کس طرف سے نکلوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ وہ دونوں ڈاکو پھر میری جھونپڑی میں چلے آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر وہ دراز قامت نوجوان جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔
"یہ کیا کہہ رہا تھا تم سے؟" ایک نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ مجھ سے میرا نام پوچھ رہا تھا۔" میں نے غلط بیانی کی۔
"یہ بھی پاگل ہوگیا ہے۔ تم آؤ ہمارے ساتھ۔"
میں جھونپڑی سے باہر آگیا۔ وہ ڈاکوؤں کی اچھی خاصی بستی تھی۔ کچھ عورتیں بھی دکھائی دیں اور بہت سے وحشت ناک صورت کے مرد تھے۔ جو سب کے سب مسلح تھے۔ ان کی خوفزدہ نگاہیں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔
مجھے اس لڑکی کی فکر تھی۔ وہ نہ جانے کہاں تھی۔ ان لوگوں نے اس بے چاری کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔
مجھے ایک بڑی جھونپڑی میں پہنچادیا گیا۔ اس جھونپڑی کی چھت پر سرخ رنگ کا ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جھونپڑی کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک تخت تھا۔ جس پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔
اور ایک شیر جیسا بوڑھا آدمی اس تخت پر بہت شان سے بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی اس تخت پر اس بوڑھے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔
گرچہ اس نے عبایا نہیں پہن رکھا تھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر نقاب تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں کی وجہ سے اسے پہچان لیا تھا۔
وہ اس لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔
وہ مجھے دیکھ کر مسکرادی تھی۔ "آؤ نوجوان۔" اس بوڑھے نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "میں کاکا ہوں۔ اس بستی کا سردار۔"
میں نے اس سے مصافحہ کیا۔ بوڑھے نے تخت کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"
میں اس کے کہنے پر کرسی پر بیٹھ گیا .... بے شمار سوالات میرے ذہن میں تھے۔ کون تھی یہ لڑکی۔ اس ڈاکو سے اس کا کیا تعلق تھا۔
"تم حیران ہو رہے ہوگے کہ ڈاکوؤں کے سردار سے میرا کیا تعلق ہے؟" لڑکی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔" میں نے اپنی گردن ہلادی۔
"تعلق یہ ہے کہ یہ میرے بابا ہیں اور میں ان کی بیٹی ہوں۔" لڑکی نے بتایا۔
"کیا؟" میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔
"ہاں۔" سردار نے اس کی تائید کی۔ "یہ میری بیٹی ہے۔ یہ شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ کبھی کبھی مجھ سے ملنے کے لیے جنگل میں چلی آتی ہے۔ حالانکہ میں منع بھی کرتا ہوں کہ خود نہ آیا کرے۔ لیکن یہاں سے سنتی ہے۔" اس نے پیار بھری نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔
"میرا نام حجاب ہے۔" لڑکی نے بتایا۔ "تم نے دیکھا ہوگا کہ میں ٹرین رکنے پر کچھ پریشان ہو رہی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کیونکہ میں مدن پور کے اسٹیشن پر ہی اترتی ہوں۔ وہاں سے اس جنگل کی طرف آ جاتی ہوں۔ مجھے ڈر اس لیے نہیں لگتا کہ یہ سارا علاقہ میرے بابا کا ہے۔ جس سے بھی کہوں گی وہ بابا کے پاس پہنچا دے گا لیکن جب ٹرین مدن پور سے کچھ فاصلے پر رک گئی تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہیں اُتر جاؤں۔''

اب بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

''نوجوان، تمہارا نام کیا ہے۔ تم کیا کرتے ہو؟'' اس لڑکی کے باپ ڈاکوؤں کے سردار نے پوچھا۔

''جناب۔ میرا نام اشعر ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میرا اپنا بزنس ہے اور اسی سلسلے میں لاہور جا رہا تھا۔''

''شادی ہو چکی ہے تمہاری؟''

''نہیں۔ کیونکہ والدین ہیں نہیں اسی لیے کسی نے میرے بارے میں سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں۔'' میں نے بتایا۔

''میں تم سے صاف صاف پوچھ رہا ہوں۔ اگر حجاب سے شادی کا موقع مل جائے تو کیا تم اسے قبول کر لوگے؟''

میں سناٹے میں رہ گیا تھا۔

میں حجاب کو نہیں جانتا تھا۔ ذرا سی دیر کا ساتھ رہا تھا اس سے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا مزاج کیسا ہے۔ اس سے شناسائی صرف اس کی خوبصورت آنکھوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ لیکن کسی کو اپنانے کے لیے صرف آنکھیں ہی تو کافی نہیں ہوتیں۔

اور اب یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے سردار کی بیٹی ہے۔ ایسے خطرناک بیک گراؤنڈ رکھنے والی لڑکی کو کس طرح اپنا جیون ساتھی بنایا جا سکتا تھا۔

اس کے باوجود اس لڑکی میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ دل پر اثر کرنے والی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ پیار کرنے والی ایک مخلص لڑکی ہے اور جن حالات میں اس نے زندگی گزاری ہے، وہ حالات اس کے لیے بھی سازگار نہیں رہے ہوں گے۔ وہ ایک ڈاکو کی بیٹی تھی اور ایسے لوگوں کی زندگی کا کیا بھروسا۔

نہ جانے کس وقت پولیس کے ہاتھ لگ جائیں، یا مقابلے میں مار دیے جائیں۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

''جواب دو نوجوان۔'' سردار نے مخاطب کیا۔ ''کیونکہ آج اس کا فیصلہ ہونے جا رہا ہے۔''

''فیصلہ ہونے جا رہا ہے، میں نہیں سمجھا؟''

سردار نے اپنے سامنے قالین پر بیٹھے ڈاکوؤں کی طرف دیکھا پھر گرجدار آواز میں بولا۔ ''بچل کھڑا ہو جا۔''

وہی دراز قامت ڈاکو کھڑا ہو گیا۔ جس نے مجھے بھاگ جانے کو کہا تھا۔

''یہ بچل ہے۔'' سردار نے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم نے ابھی نہیں بتایا تو اس کا ہاتھ حجاب کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔''

میں نے بچل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی التجائیں تھیں پھر میں نے حجاب کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ میں اسے اپنانے کا اعلان کر دوں۔ بابا سے کہہ دوں کہ میں اسے اپنا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔

''بولو نوجوان تم چپ کیوں ہو؟'' سردار نے پھر کہا۔

''جی ہاں سردار۔ میں اس لڑکی کو اپنانے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے کہہ دیا۔

ڈاکو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ حجاب کی آنکھیں میرا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ خود سردار کے ہونٹوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

''ٹھیک ہے۔ تو پھر آج رات کو تم دونوں کی منگنی ہو جائے گی۔'' سردار نے کہا۔

''سردار، یہ نہیں ہوگا۔'' وہی نوجوان کھڑا ہو گیا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' سردار نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تو میرے حکم کے خلاف جا رہا ہے؟''

''نہیں سردار۔ میری ایسی ہمت کہاں ہے۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟''

''سردار، برسوں سے ہمارے یہاں ایک رسم چلی آ رہی ہے کہ اگر امیدوار دو ہوں تو دونوں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے۔''

''اور وہ دوسرا امیدوار کون ہے؟''

''وہ میں ہوں سردار۔'' نوجوان نے کہا۔ ''میں نے برسوں سے یہ خواب دیکھ رکھا تھا اور اب تم مقابلے کے بغیر کسی اور سے منگنی کر رہے ہو تو پھر کچھ نہیں کہوں گا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سردار۔ کیونکہ میں تو تمہارا فرمانبردار بندہ ہوں لیکن یہ بات ہماری رسم کے خلاف ہوگی۔ اب تم جانو سردار۔"

وہ نوجوان یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔

اس نوجوان نے بات ہی ایسی کی تھی کہ سردار جزبز ہو کر رہ گیا تھا۔ خود حجاب بھی پریشان دکھائی دینے لگی تھی۔

اور میرا یہ حال تھا کہ میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی کہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔ اس نوجوان سے تو میں کسی طور مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا اور اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔

وہ جسمانی لحاظ سے طاقت ور شخص تھا جبکہ میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی اسلحوں اور ہتھیاروں کے درمیان گزاری تھی جبکہ میں نے کبھی کوئی ہتھیار اپنے ہاتھ میں بھی نہیں لیا تھا۔

"نوجوان تم نے سن لیا کہ بچل کیا کہہ رہا ہے؟" سردار نے میری طرف دیکھا۔

"جی ہاں......سن لیا ہے میں نے......اور۔"

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، حجاب نے بولنا شروع کر دیا۔ "بابا۔ یہ بات اس وقت ہو سکتی تھی جب میں نے یہاں زندگی گزاری ہوتی۔ میں نے اپنی زندگی شہر میں گزاری ہے اور یہ بھی شہر کے ہیں۔" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ "اس لیے ہم دونوں پر یہاں کے قانون اور رسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ ہم اگر ایک دوسرے کے ساتھی بنے تو اس طرح بنیں گے جو طریقے شہر میں رائج ہیں۔"

وہ نوجوان پھر کھڑا ہو گیا۔ "حجاب ٹھیک کہتی ہے سردار لیکن اگر یہ منگنی شہر میں ہو رہی ہوتی اور حجاب کا تعلق ہم لوگوں سے نہیں ہوتا تو پھر یہ بات ٹھیک تھی لیکن سردار۔ جب سب کچھ یہیں ہو رہا ہے تو پھر جو ہوگا یہاں کی رسم کے مطابق ہوگا۔"

سردار ایک بار پھر پریشان ہو کر رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر معاملہ کچھ اور ہوتا تو شاید وہ اس نوجوان کو جان سے مروا دیتا لیکن اس کم بخت نے رسم کی بات چھیڑ کر پوری بستی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

میں نے حجاب کی طرف دیکھا۔ وہ اس بار بھی آس بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی پھر نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت اور اتنا حوصلہ کہاں سے آ گیا کہ میں نے کھڑے ہو کر بولنا شروع کر دیا۔ "سردار۔ اگرچہ میں شہر کا باسی ہوں۔ لڑائی جھگڑا میں نہیں جانتا لیکن میں حجاب کے لیے اس نوجوان کا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ میں اس سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔"

☆☆☆

میں نے چیلنج تو قبول کر لیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس سے لڑنا میرے بس کی بات کہاں تھی۔ جسمانی مقابلے میں تو وہ مجھے پھاڑ کر رکھ دیتا۔

مجھے جھونپڑی میں واپس پہنچا دیا گیا۔

سردار اور حجاب دونوں ہی اس صورتِ حال سے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ وہ نوجوان مجھے بھاگ جانے کے لیے کیوں کہہ رہا تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ اس کے اور میرے درمیان مقابلہ ہوگا اور میں اس مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔

جھونپڑی میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ حجاب میرے پاس آ گئی۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ "تم نے مقابلے کا چیلنج کیوں قبول کیا۔" اس نے پوچھا۔

"تو اور کیا کرتا۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس اور کوئی آپشن ہی نہیں ہے۔"

"دیکھو۔ میں تمہارے لیے اجنبی ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "تم میرے لیے اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔" تم کو جانا ہو تو چلے جاؤ یہاں سے اور ویسے بھی میرا اور تمہارا کوئی اتنا پرانا ساتھ بھی نہیں ہے۔ مجھے ذرا بھی برا نہیں لگے گا۔"

"حجاب میں کوئی ستارہ شناس ٹائپ کی چیز نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور نہ ہی میری کوئی حس اتنی بیدار ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے مجھے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہم دونوں کے ستارے ایک ہیں۔ ہمیں ایک ساتھ بہت سی منزلیں عبور کرنی ہیں۔ بہت کچھ دیکھنا ہے ہمیں۔ اور شاید میں برسوں سے جس قسم کے خواب دیکھتا چلا آ رہا ہوں، ان خوابوں کی تعبیروں کی ابتدا ہو چکی ہے۔"

"کس قسم کے خواب دیکھ رہے ہو تم؟"

میں نے تفصیل سے اسے اپنے خوابوں کے بارے میں بتایا۔ یہ خواب مجھے برسوں سے پریشان کرتے آئے تھے۔ ان خوابوں میں جنگل ہوتے تھے۔ ایک لڑکی ہوتی تھی۔ ایک حویلی ہوتی تھی۔ کچھ لوگ زخمی یا مردہ حالتوں میں ہوتے تھے اور خواب ختم ہو جاتے۔

بظاہر خوابوں کے درمیان کوئی ربط نہیں ہوتا... یا شاید ہوتا ہو۔ بہرحال جنگل اور حجاب تو خوابوں سے نکل کر سامنے آ گئے تھے۔ اب آگے نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

''تو اس سے تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میرے اور تمہارے ستارے ایک ہیں؟'' حجاب نے پوچھا۔

''کیونکہ تمہارے سوا میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور نہ ہی میں پہلے اس قسم کے ماحول اور حالات میں گرفتار ہوا ہوں۔''

''تو اس کا مطلب یہ کہ تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے اس شخص سے مقابلے کا ارادہ کر لیا ہے۔؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اور بات ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ مقابلہ کیسے ہوگا۔ مجھے تو کوئی ہتھیار استعمال کرنا نہیں آتا۔''

''یہ مقابلہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہاتھوں سے ہوتا ہے۔'' حجاب نے بتایا۔ ''اور میں سمجھتی ہوں کہ تم ہاتھوں سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''ظاہر ہے کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔''

''اسی لیے مشورہ دے رہی ہوں کہ تم یہاں سے بھاگ لو۔'' اس نے کہا۔

''نہیں۔ میں بزدلوں کی طرح بھاگنا نہیں چاہتا۔''

''مجبوری ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''تو پھر جی توڑ کر اس کا مقابلہ کرو۔ جو ہوگا اسے خدا کی مرضی سمجھ کر قبول کر لوں گی۔''

حجاب کے جانے کے بعد میں پھر سوچنے لگا تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیسے مقابلہ کروں۔

ابھی میں اپنی حکمت عملی ترتیب ہی دے رہا تھا کہ وہی نوجوان بچل جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ وہ یقیناً میرا مضحکہ اڑانے آیا ہوگا لیکن وہ اس وقت بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''مبارک ہو۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''حجاب بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔''

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔ شاید وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ ''بچل۔ مقابلے کے بعد مبارکباد دینا۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''پہلے سے اس لیے دے رہا ہوں کہ یہ مقابلہ تم ہی جیتو گے۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں جیتوں گا؟''

''ہاں۔ تم جیتو گے۔'' اس نے اپنی بات دہرائی۔ ''اس لیے نہیں کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو بلکہ اس لیے کہ خود میں نے ہارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''جو کہہ رہا ہوں بہت سوچ کر کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں حجاب جیسی لڑکی کے قابل نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ خوبصورت اور پڑھی لکھی جبکہ میں کیا ہوں۔ ایک ڈاکو۔ نہ جانے کس وقت جیل ہو جائے یا پولیس مقابلے میں مار دیا جاؤں۔''

بظاہر وحشی اور خونخوار نظر آنے والا شخص کیسی سمجھداری کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے اندر کا انسان جاگ اٹھا تھا۔

''اجنبی تم کو کیا معلوم کہ میں نے حجاب سے کتنی محبت کی ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ وہ جب یہاں آتی میں دیوانوں کی طرح اس کے آگے پیچھے ہوتا رہتا۔ میں اس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تاب ہوا کرتا لیکن میں نے اس پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس سے محبت کی ہے کیونکہ میں تو اس کے قابل ہی نہیں تھا لیکن جب آج تم اور حجاب میرے سامنے آئے تو میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے اسی لیے جب سردار نے تم دونوں کی منگنی کا اعلان کیا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے سردار کو وہ رسم یاد دلا دی۔''

''جب تم نے وہ رسم یاد ہی دلا دی ہے تو پھر کیوں پیچھے ہٹ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت سوچنے کے بعد۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اندازہ کر لیا کہ میں کسی بھی حال میں اس کے قابل نہیں ہوں۔''

''کیا اب یہ مقابلہ نہیں کرایا جائے گا؟''

''نہیں اب نہیں ہوگا۔'' وہ افسردگی سے بولا۔ ''اگر کوئی ایک پیچھے ہٹ جائے تو دوسرے کے ساتھ منگنی کر دی جاتی ہے۔ یہ بھی یہاں کی رسم ہے۔''

اس کے جانے کے بعد حجاب جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ وہ بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ ''اشعر، بچل مقابلے سے دستبردار ہو گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔''

"تمہیں کیسے معلوم؟"

میں نے بتا دیا کہ بچل نے میرے پاس آ کر کیا کہا تھا۔ حجاب کو بھی یہ سب سن کر کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ "اشعر بچل نے اپنے آپ کو ایک اچھا انسان ثابت کر دیا ہے۔"

"ہاں حجاب وہ واقعی ایک اچھا انسان ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے جیسے مقابلے سے دست بردار ہو کر اس نے یہ مقابلہ جیت لیا ہے۔"

پھر اسی شام میری اور حجاب کی منگنی کر دی گئی۔

☆☆☆

میں نے کب سوچا تھا کہ میری منگنی کچھ اس انداز سے ہوگی۔

سردار نے ایک قیمتی انگوٹھی مجھے دی تھی اور ایک میری طرف سے حجاب کو دی تھی۔ اس کے ساتھ اس نے پچاس پچاس ہزار روپے ہم دونوں کو دیے تھے۔

اس شام بچل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے چارہ اپنے دکھوں اور آرزوؤں کو لے کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ڈاکوؤں نے بہت زبردست ضیافت کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ نہ جانے کیا کیا گا کر اور الاؤ روشن کر کے اچھل اچھل کر رقص بھی کر رہے تھے۔

بالکل وہی ماحول تھا جو فلموں میں دکھائی دیتا ہے یا ایسی کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے۔

اور اس وقت جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو۔

ڈاکوؤں میں افراتفری مچ گئی لیکن انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ اس وقت سردار نے ہمارے پاس آ کر کہا۔ "تم دونوں فرار ہو جاؤ۔ پولیس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال دیا ہے۔"

"نہیں بابا، میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" حجاب نے کہا۔

"بے وقوف مت بنو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ یہاں سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ ہے۔ تم دونوں اس راستے سے نکل سکتے ہو۔"

"خود آپ کیوں نہیں نکل جاتے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" سردار نے کہا پھر حجاب سے مخاطب ہوا۔ "بیٹا اس جنگل سے نکلنے کے بعد ایک حویلی ملے گی۔ وہ نواب رشید کی حویلی ہے تم نواب رشید کو اپنے بارے میں بتا دینا کہ تم میری بیٹی ہو، وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔ اب جاؤ دیر مت کرو۔"

"بابا آپ کہاں جائیں گے آپ کا کیا ہوگا؟"

"میری فکر مت کرو میں کسی طرح آ ملوں گا تم دونوں سے۔ اس وقت نکلو، دیر مت کرو شاباش۔"

☆☆☆

ایک بار پھر اسی جنگل اور ویسے ہی اندھیرے میں سفر شروع ہو گیا۔

سردار نے ہم دونوں کو خفیہ راستے سے باہر نکال دیا تھا اس نے کہا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر نکل آئے گا۔

ہم اپنی پشت پر گولیوں کی آواز سنتے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ واپسی کا سفر بھی ویسا ہی ہوا تھا۔ جیسا یہاں آتے ہوئے ہوا تھا۔ وہی قدم قدم پر جھاڑیوں سے الجھنا، خاردار پودوں سے زخمی ہونا جگہ جگہ خطرے اور اندھیرے۔ اس بار تو ہم اپنا اپنا موبائل بھی آن نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کی روشنی دور ہی سے پولیس والوں کو دکھائی دے جاتی اور ان کی بندوقوں کا رخ ہماری طرف ہو جاتا۔

نہ جانے ہم کتنی دور تک دوڑتے اور بھاگتے رہے۔ گولیوں کی آوازیں اب دور بہت دور رہ گئی تھیں۔

"پلیز اشعر اب رک جاؤ" حجاب نے کہا۔ "اب مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔"

ہم ویسے بھی اتنی دور نکل آئے تھے، اب رک جانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا اور حجاب کی حالت بھی اس قابل نہیں تھی۔ ہم ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے۔

حجاب نے اپنی کمر میری کمر سے لگا لی تھی۔ خدا نے اس لڑکی کو کس انداز سے میری زندگی میں شامل کر دیا تھا۔ ایک اجنبی لڑکی جس کو ٹرین کے سفر میں دیکھا۔ اس کا تعاقب کیا۔ کئی طرح کے واقعات پیش آئے اور اب وہ میری منگیتر بنی... میرے پاس بیٹھی تھی۔

ایک ہی دن میں نہ جانے کتنے مراحل طے ہو گئے تھے۔

"حجاب تمہارے بابا نے نواب رشید کے یہاں

جانے کے لیے کہا ہے۔ کیا تم ان کو جانتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں ان کو نہیں جانتی۔'' حجاب نے کہا۔

''بابا کے نہ جانے کتنے بھید مجھ پر ابھی کھلے نہیں ہیں۔''

''تم کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میری یادیں اس وقت سے شروع ہوتی ہیں جب بابا مجھے شہر کے ایک ہاسٹل میں ایڈمیشن دلانے کے لیے لائے تھے۔ وہ بہت مہنگا ہاسٹل تھا اس ہاسٹل کی عمارت بہت وسیع اور حسین تھی۔ آج مجھے یاد ہے۔ بابا نے میرا داخلہ بھی بہت اچھے اسکول میں کروا دیا تھا۔

''میں یہ نہیں جانتی تھی کہ بابا کون ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ میرے لیے تو بس ان کی حیثیت گھنی چھاؤں جیسی رہی ہے۔ بابا نے بتایا تھا کہ میری ماں کا بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے اور انہوں نے ماں بن کر میری پرورش کی ہے۔ انہوں نے کبھی مجھے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بہترین اسکول' بہترین ہاسٹل' بہترین کپڑے۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔''

''یہ تمہیں کب پتا چلا کہ تمہارے بابا میرا مطلب ہے کہ ان کا کام کچھ اور ہے؟''

''جب میں کالج میں تھی، اس وقت پتا چل گیا تھا۔'' حجاب نے بتایا۔ ''کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ یہ سوچ کر ہی وحشت ہو گئی تھی کہ میرے بابا ڈاکوؤں کے سردار ہیں پھر آہستہ آہستہ ساری باتیں غائب ہو گئیں۔ صرف باپ اور بیٹی کا رشتہ رہ گیا۔ میں نے سوچا وہ ہوا کریں ڈاکو...... میرے تو بابا ہیں۔ مجھ سے بے پناہ پیار کرنے والے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ میں کبھی کبھی خود بھی ان سے ملنے کے لیے آ جاتی جس طرح کل آئی تھی۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ بتاؤ کیا پہلے پولیس نے گھیرا نہیں ڈالا تھا؟''

''نہیں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا ہے۔''

''حجاب تمہیں یاد ہو گا، میں نے چند گھنٹوں پہلے تم سے کہا تھا کہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے اور تمہارے ستارے ایک ہو گئے ہیں، ہمیں ایک ساتھ بہت سفر طے کرنا ہے۔''

''ہاں یاد ہے مجھے اور چند گھنٹوں بعد ہی تمہاری بات سچ ہو گئی۔'' حجاب نے کہا۔ ''اشعراب میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''ضرور کہو۔''

''تمہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تم یہ جانتے ہو کہ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ سوائے میرے بابا کے اور وہ بھی اس وقت نہ جانے کس عذاب میں گھرے ہوں گے۔ پتا نہیں ان کو دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں اسی لیے میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک بات کا یقین دلا دو۔''

''ہاں کہو کس بات کا یقین چاہتی ہو تم؟''

''یہی کہ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔'' اس نے کہا ''کیونکہ میں بالکل بے سہارا ہوں۔''

''نہیں' تم بے سہارا نہیں ہو۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

میرے ہاتھ کی گرفت میں اس کا ہاتھ کانپ کر رہ گیا تھا۔ ہم بہت دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ بالکل خاموش پھر بہت دیر بعد میں نے اس سے کہا۔ ''کیا تمہیں یہاں کا راستہ معلوم ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں میں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''یہاں سے ایک راستہ اس حویلی کی طرف جاتا ہے۔ جس کے بارے میں بابا نے بتایا ہے لیکن ہم اندھیرے میں نہیں جا سکتے۔ تھوڑی روشنی ہو جائے پھر نکلیں گے۔''

ہم پھر خاموش ہو گئے۔ ویسے تو شاید ہم دونوں ہی کے پاس کہنے اور سننے کے لیے بہت کچھ ہو گا لیکن اس جنگل اور اس اندھیرے میں خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

پھر آہستہ آہستہ صبح ہونے لگی۔

میرے خدا روشنی کے ساتھ ہی اس جنگل کا بھیانک پن اس طرح ختم ہو گیا تھا جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر سب کچھ تبدیل کر دیا ہو۔ رات کو نظر آنے والا وہ بھیانک جنگل روشنی میں ایک خوبصورت منظر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہر طرف خدا کی قدرت دکھائی دے رہی تھی۔ طرح طرح کے پرندوں کی خوبصورت آوازوں نے جنگل کو موسیقی کے سُروں سے بھر دیا تھا۔

میں اس روشنی میں پہلی بار حجاب کو دیکھ رہا تھا، وہ

واقعی بہت خوبصورت تھی۔ ''اب اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔'' اس نے شرما کر پوچھا۔

''خدا کی قدرت کا نظارہ کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''حجاب میرا یہ سفر میرے لیے بہت مبارک رہا ہے کیونکہ اس سفر میں تم مجھے مل گئی ہو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

''بس اب چل دو۔'' حجاب جلدی سے بولی۔ ''ایسا نہ ہو کوئی اس طرف آ نکلے۔''

ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔ روشنی کی وجہ سے اب ہماری رفتار خاصی تیز ہو رہی تھی۔ ذرا سی دیر کے سفر کے بعد درختوں، پودوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا پھر ایک میدان آ گیا اور اس میدان کے دوسرے سرے پر ایک حویلی تھی۔ نواب رشید کی حویلی اور یہ وہی حویلی تھی جس کو میں بار بار اپنے خواب میں دیکھا کرتا تھا۔

☆☆☆

''اب کیا سوچنے لگے؟'' حجاب نے مجھے گم صم دیکھ کر پوچھا۔

''حجاب یہ وہی حویلی ہے۔'' میں نے بتایا۔ وہی جس کو میں خواب میں دیکھتا آیا ہوں۔ خدا جانے کیا بھید ہے۔''

''پتا نہیں۔'' حجاب بھی پریشان ہو گئی تھی۔ ''اب تو ہمیں حویلی میں جانا ہی ہوگا۔''

دس پندرہ منٹ کے مزید سفر کے بعد ہم حویلی کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ بہت شاندار حویلی تھی۔ گیٹ پر پہریدار کھڑے تھے جنہوں نے ہمیں روک لیا تھا۔

''ہم رشید نواب صاحب سے ملنے آئے ہیں۔'' حجاب باوقار انداز سے بولی۔

''کون ہیں آپ دونوں؟'' ایک پہریدار نے پوچھا۔

''یہ ہم نہیں بتا سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بس انہیں ہمارا پیغام دے دو کہ ہم ان سے ملنے آئے ہیں۔''

ایک پہریدار اندر خبر کرنے چلا گیا۔ ہم حویلی کا جائزہ لینے لگے۔ واقعی بہت شاندار حویلی تھی۔ قدیم طرز کی لیکن اس کی دیکھ بھال ہوتی رہی ہوگی اسی لیے شاندار تھی اور نئی معلوم ہوتی تھی۔

پہریدار واپس آ گیا تھا۔ ''آئیں میرے ساتھ تشریف لے آئیں۔''

ہمیں ایک بڑی خوبصورت سی بیٹھک میں لے جایا گیا۔ ہر چیز سے نوابی شان جھلک رہی تھی۔ قدیم طرز کا انتہائی قیمتی اور خوبصورت فرنیچرز...... دبیز قالین...... دیواروں پر نواب صاحب کے آباؤ اجداد کی شاندار بارعب تصویریں۔ شکار کیے ہوئے جانوروں کے سر ان کی سینگیں وغیرہ۔

پورا ماحول نوابی دور کی فلم کے قیمتی سیٹ کا تھا۔

''نواب صاحب کچھ دیر میں تشریف لاتے ہیں۔'' پہریدار نے ادب سے بتایا۔

''ٹھیک ہے ہم ان کا انتظار کر رہے ہیں۔'' حجاب نے کہا۔

پہریدار واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے دس بارہ منٹ بعد ایک لڑکی بیٹھک میں داخل ہو گئی۔ بہت ہی عجیب لڑکی تھی۔ اس نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی آج کل بہت سی لڑکیاں اس قسم کا لباس استعمال کرتی ہیں۔

لیکن وہ سگریٹ بھی پی رہی تھی اور اس کے بولنے کا ایسا انداز تھا جیسا کوئی لڑکا بول رہا ہو۔ اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ دونوں کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

حیرت انگیز طور پر اس کی آواز بھی مردانہ تھی۔ وہ حجاب کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''خوبصورت لڑکی ہو تم ایسی خوبصورتی ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔''

''آپ کون ہیں؟'' حجاب نے اس سے پوچھا۔

''میں ایک مسافر۔'' وہ سگریٹ کا کش لے کر بولی۔ ویسے میرا نام کاشف حسین ہے۔ میں نے ایم بی اے کر رکھا ہے۔''

اس لڑکی کے حوالے سے ہر بات حیرت کی بات تھی۔ ایک تو اس کا لباس پھر اس کے سگریٹ پینے کا انداز پھر اس کی آوز اور اب وہ اپنا نام بتا رہی تھی، کاشف حسین۔

نہ جانے کیا بھید تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ لڑکی کچھ اور کہہ سکتی یا ہم اس سے کوئی بات کر سکتے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت بوکھلائی ہوئی بیٹھک میں داخل ہو گئی۔ ''ارے بی بی آپ یہاں کیوں آ گئیں۔'' اس نے اس لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلیں میرے ساتھ ورنہ بابا ناراض ہو جائیں گے۔''

''ایک تو یہ بابا ہر وقت ناراض ہوتے رہتے ہیں۔'' وہ اپنی مردانہ آواز میں بولی۔ ''اچھا دوستو پھر ملیں گے۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سالگرہ نمبر 2 کے دلکش مضامین ورنگارنگ سلسلے لیے مئی 2018ء کا دل پذیر شمارہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
رفعت سراج اور شیریں حیدر کے ماہرانہ قلم کے شاہکار مسلسل ناول
حیا بخاری نے کھلائے محبت کے حسین گلاب...... محبت لفظ ہے لیکن...... کی صورت
عالیہ حرا کے خالص افسانوی ہنر کا شاہکار مکمل ناول...... جب پھاگن پھول کھلائے
مایہ ناز مصنفہ نگہت سیما کی خصوصی تحریر...... کوئی شہر یار وفاؤں کا
عنیزہ سید، عقیلہ حق اور سیما رضا ردا کی پُراثر کاوشیں
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے پُرنور جذبوں کا بیان
شیف ثمینہ سے دلچسپ و مزیدار
ملاقات شائستہ زریں کے تعاون سے
اس کے علاوہ
نفیسہ سعید، ھما بیگ، فرح طاھر، دردانہ نوشین،
نبیلہ نازش راؤ، شمع تفسیر و دیگر قابلِ قدر قلمکاروں کی دلفریب تحریریں
پڑھیے گوشۂ ظرافت میں نامور مزاح نگاران کی شگفتہ، شگفتہ باتیں
اس کے ساتھ، ساتھ قارئین کے خوب صورت مراسلات، دلربا شاعری، مزیدار پکوان اور بہت، بہت کچھ صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

اس نے یہ جملہ ہم دونوں سے کہا تھا۔
وہ عورت اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔ یہ ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ ''کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔'' حجاب نے کہا۔ ''لیکن شاید اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔''
''مجھے بھی اس کو دیکھ کر افسوس ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔
اسی وقت نواب رشید بیٹھک میں داخل ہو گئے۔ ان کی عمر پچاس سے زیادہ ہو گی لیکن صحت بہت اچھی تھی اور شخصیت بھی بہت شاندار۔
ہم دونوں انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک گہری نگاہوں سے ہمارا جائزہ لیتے رہے پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''اپنا تعارف کرواؤ۔ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟''
''جناب ہم دونوں کچھ دنوں کے لیے آپ کے پاس پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔'' حجاب نے کہا۔
''اوہ۔'' نواب رشید نے ایک گہری سانس لی۔ ''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟''
''میرے بابا نے۔'' حجاب نے بتایا۔ ''نام تو ان کا ایاز ہے لیکن اس علاقے میں وہ کاکا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔''
''تم کاکا کی بیٹی ہو؟'' نواب صاحب اچانک پُرجوش ہو گئے تھے۔
''جی جناب۔''
''پھر تو تم میری بیٹی کی طرح ہو۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''بیٹا یہ حویلی بھی تمہاری ہے تم جب تک جی چاہے یہاں رہو۔ ساری زندگی تم رہ سکتی ہو۔ یہ بتاؤ تمہارا بابا کہاں ہے اور ہاں تم مجھے چاچا کہنا۔ یہ سمجھو کہ میں تمہارا چاچا ہوں۔''
''چاچا جس وقت ہم لوگ چلے ہیں اس وقت پولیس نے گھیراؤ کر لیا تھا۔'' حجاب نے بتایا۔ ''بابا نے کسی طرح ہم دونوں کو اس جنگل سے نکال دیا تھا۔''
''خدا خیر کرے گا اور یہ کون ہے؟'' نواب صاحب نے میری طرف دیکھا۔
''میرا نام اشعر ہے جناب۔'' میں نے بتایا۔ ''اور میں حجاب کا منگیتر ہوں۔''
''خوش آمدید میرے بچے۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ اب یہ حویلی تمہاری بھی ہے۔''
''چاچا ہم ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں۔'' حجاب نے بتایا۔
نواب صاحب نے اسی وقت ملازمین کو بلا لیا۔ حجاب کو اندر زنان خانے میں بھجوا دیا گیا تھا جب کہ میرے لیے اسی وقت ایک کمرا مخصوص ہو گیا تھا۔
میں بستر پر لیٹ کر سوچتا رہا کہ ڈاکوؤں کے ایک سردار کا ایک نواب سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور تعلق بھی ایسا کہ اس کا نام سنتے ہی نواب صاحب سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے ہمارے لیے اپنی حویلی کے دروازے فوراً ہی کھول دیے تھے۔
مجھے یاد آیا کہ حجاب نے یہ کہا تھا کہ بابا کے ابھی ایسے بہت سے بھید ہیں جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی۔ ممکن تھا کہ نواب صاحب کے حوالے سے بھی بھید وابستہ ہوں۔
سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ رات بھر کی بیداری اوپر سے بے پناہ تھکن...... ایسا سویا کہ اندھیرا ہونے کے بعد ہی اٹھا تھا۔
اٹھتے ہی چند لمحوں تک کچھ یاد نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں پھر آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ میں اس وقت نواب صاحب کی حویلی میں تھا اور رات ہو چکی تھی۔
دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ حجاب ایک ملازمہ کے ساتھ داخل ہوئی۔ ملازمہ نے ٹرے میں چائے دانی اور چائے کے دیگر برتن اٹھا رکھے تھے۔
''تم یہ سب میز پر رکھ دو۔'' حجاب نے ملازمہ سے کہا۔ ''اور جاؤ۔ صاحب کو چائے میں بنا کر خود دے دوں گی۔'' ملازمہ باہر چلی گئی۔
''اشعر خوب سوئے۔ کیوں؟''
''ہاں۔'' میں بستر سے نیچے آ گیا۔ ''خوب گہری نیند آئی تھی۔''
''اب جلدی سے نہا کر فریش ہو جاؤ۔''
''ہاں......'' میں نے کہا۔ ''تم جاؤ دس منٹ کے بعد آ جانا۔''
دس منٹ کے بعد حجاب میرے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ حویلی کے حالات بھی بتاتی جا رہی تھی۔ ''اس گھر میں کئی لوگ ہیں۔ ایک تو نواب صاحب کی بیگم ہیں جہاں آرا بیگم۔ ایک بہو ہے ایک بیٹا ہے اور ایک

بیٹی ہے۔ غزالہ جس کو تم دیکھ چکے ہو اُن کے علاوہ کچھ اور رشتے دار بھی ہیں جو اسی حویلی میں رہتے ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم ہو سکا۔''

''کیا اس کے بعد نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اس کے بعد نہیں ہوئی لیکن یہاں میرا بہت خیال رکھا جا رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''حجاب ایک بات بتاؤ۔ ہمیں یہاں رہ کر کرنا کیا ہے۔ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ ہمیں شہر چلنا چاہیے، جہاں ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' حجاب نے بتایا۔

''لیکن بابا کا پیغام آ گیا ہے۔''

''بابا کا پیغام؟''

''ہاں بابا کا پیغام میرے موبائل پر...... انہوں نے لکھا ہے کہ وہ خیریت سے ہیں اور ہم دونوں یہی رک کر ان کا انتظار کریں۔ وہ دو چار دنوں میں ہم سے آ ملیں گے۔''

''کیا انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہیں؟''

''نہیں یہ نہیں بتایا۔ صرف اتنا بتا دیا ہے کہ وہ خیریت سے ہیں۔''

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک ملازم کمرے میں داخل ہو گیا۔ ''آپ دونوں کو نواب صاحب نے یاد کیا ہے۔''

نواب رشید اپنی اسی بیٹھک میں تھے جہاں ان سے پہلے ملاقات ہوئی تھی، وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ایک بہت خوبصورت سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ مشرقی لباس میں وہ بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ میں اور حجاب اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

ہم دونوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس دن عجیب سے حلیے میں ہمارے سامنے آئی تھی اور جس نے اپنا نام کاشف حسین بتایا تھا۔

''یہ میری بیٹی ہے غزالہ۔'' نواب صاحب نے اس کا تعارف کروایا پھر ہماری طرف اشارہ کیا۔ ''اب تم دونوں خود بتا دو۔''

''میں حجاب ہوں۔'' حجاب نے کہا۔ ''اور یہ میرے منگیتر ہیں اشعر۔''

''خوشی ہوئی آپ دونوں سے مل کر۔'' وہ لڑکی مسکرا کر بولی۔

ایک اور حیرت اس کی آواز بالکل نارمل تھی۔ جس طرح لڑکیوں کی آوازیں ہوا کرتی ہیں بلکہ اس کی آواز زیادہ خوبصورت تھی، سریلی اور میٹھی آواز۔

اگر یہ اس کی اوریجنل آواز تھی تو پھر وہ کیا تھا نواب صاحب کچھ دیر تک میرے مشاغل کے بارے میں پوچھتے رہے۔ اس دوران وہ لڑکی غزالہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے نواب صاحب سے پوچھا۔ ''جناب اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں ہاں ضرور پوچھو۔''

''ہم نے آپ کی صاحبزادی کو عجیب حالت میں دیکھا تھا اس وقت شاید یہ......''

''اوہ تو یہ راز تمہیں بھی معلوم ہو گیا۔'' نواب صاحب افسردہ ہو گئے۔ ''یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ غزالہ کا یہ حال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مرد ظاہر کرنے لگتی ہے۔ اس کی آواز تک بدل جاتی ہے۔ وہ اپنا نام بھی کاشف حسین بتاتی ہے۔''

''اور یہ کاشف حسین کون ہے انکل؟'' حجاب نے پوچھا۔

''حویلی کا جن۔'' نواب صاحب نے بتایا۔

''حویلی کا جن؟'' میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

''ہاں بیٹا حویلی کا جن۔'' نواب صاحب نے کہا ہمیں پہلے اس کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ غزالہ کی عادت ہے کہ شام کے وقت حویلی کی چھت پر ٹہلتی ہے۔ پرندوں کو دیکھتی ہے۔ بادلوں کو دیکھتی ہے، یہ اس کی ہمیشہ کی عادت ہے لیکن اس شام جب وہ چھت سے نیچے آئی تو اس کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کاشف حسین کہہ رہی تھی، اس کی آواز تک تبدیل ہو گئی تھی۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن اس کی یہی حالت ہے۔ ہفتے میں دو تین بار وہ جن اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یہ کاشف حسین بن جاتی ہے۔''

''لیکن غزالہ تو سگریٹ بھی پی رہی تھی انکل؟''

''ہاں دورے کی حالت میں وہ ایسا کام کرتی ہے۔ جو زیادہ تر مرد حضرات کیا کرتے مثلاً سگریٹ پینا، گالیاں دینا وغیرہ۔''

''آپ نے اس کا علاج کروایا؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو بیٹے اس کا علاج ڈاکٹروں کے بس میں تو نہیں ہے۔ البتہ کئی روحانی عاملوں کو دکھا چکا ہوں لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

''افسوس ہے کہ اتنی اچھی اور پیاری لڑکی کا یہ حال ہو رہا ہے۔'' حجاب نے کہا۔

''خیر چھوڑو۔'' نواب صاحب نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ''تم دونوں یہاں آرام سے رہو۔ کیونکہ ایاز کا پیغام آیا تھا کہ جب تک وہ نہ آ جائے تم دونوں کو اسی حویلی میں رکھا جائے۔''

''جی ہاں انکل۔ میرے پاس بھی اسی قسم کا پیغام آ چکا ہے۔''

''تو پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تم آرام سے رہو۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

اسی وقت باہر سے ایک نعرۂ مستانہ کی صدا بلند ہوئی اور ایک ملنگ ٹائپ آدمی اندر آ گیا۔ حویلی کے دو ملازمین شاید اسے روکنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

''کون ہو تم؟'' نواب صاحب نے اس سے پوچھا۔ ''اس طرح حویلی میں کیوں داخل ہو گئے ہو؟''

''نواب۔ میں کاشف حسین کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بہت دنوں سے اس کی تلاش تھی اس حویلی میں اس کا احساس ہو رہا ہے۔ کہاں ہے وہ سامنے لاؤ اسے۔''

''آ گیا کاشف حسین۔''

دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ وہی لڑکی وہی غزالہ ایک بار پھر مردانہ لباس اور بدلی ہوئی آواز کے ساتھ دروازے کے درمیان کھڑی تھی اور خطرناک بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

''بتا کیوں آیا ہے یہاں؟'' غزالہ نے غصے سے پوچھا۔

''کاشف حسین میں تجھے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔'' ملنگ نے کہا۔

''تو پھر لے جا۔'' غزالہ نے ریوالور کا رخ ملنگ کی طرف کر کے گولی چلا دی۔

☆☆☆

بڑی مشکلوں سے غزالہ کو قابو میں کر کے اندر بھیجا گیا تھا۔ ملنگ کی قسمت اچھی تھی کہ گولی اسے نہیں لگی تھی پھر اس سے پہلے کہ غزالہ دوسرا فائر کر سکتی، میں نے اپنی جگہ سے اچھل کر اس کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا تھا پھر اس کا ریوالور چھیننے میں دیر نہیں لگی تھی۔

ملنگ کی بُری حالت ہو رہی تھی۔ اس نے پھر کوئی آواز نہیں نکالی کچھ نہیں کہا بلکہ اس بیٹھک سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

غزالہ کو پہلے کی طرح اندر لے جایا گیا تھا۔ نواب رشید بہت خاموش ہو گئے تھے۔

''انکل خدا کا شکر ہے اس کی جان بچ گئی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔'' حجاب نے کہا۔

''ہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔'' نواب صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس کا یہ اس ہفتے میں دوسرا دورہ ہے۔ ورنہ عام طور پر اتنی جلدی جلدی نہیں ہوتا۔ خدا جانے یہ کاشف حسین کون ہے اور میری غزالہ کے پیچھے کیوں پڑ گیا۔''

''جناب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ عام ملنگوں اور عاملوں وغیرہ کے بس کی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے آپ کو اللہ کے واقعی کسی نیک بندے کو پکڑنا ہو گا۔''

''ہاں بیٹا اب یہی تلاش رہ گئی ہے۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''خیر تم دونوں پریشان نہ ہو، یہ ہمارا معاملہ ہے۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔''

نواب صاحب سے کچھ دیر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ مجھے غزالہ کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ کتنی خوبصورت لڑکی اور ایک آسیب کے چنگل میں آ گئی تھی۔

شام کی چائے کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

ملازمین نے مجھے دیکھا لیکن کوئی سوال نہیں کیا۔ میں یونہی ٹہلتا ہوا پائیں باغ کی طرف آ گیا۔ باغ بھی بہت خوبصورت تھا۔

قدیم انداز کا لیکن بہت سلیقے سے بنا ہوا۔ طرح طرح کے پودے اور پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے جن کی خوشبو پورے باغ میں پھیلی ہوئی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں ٹہلتا رہا پائیں باغ میں پھر مجھے حویلی کی چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں دکھائی دے گئیں۔ میں ان سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔

بہت دور تک پھیلی ہوئی چھت تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اسی چھت پر آنے کے بعد غزالہ کی یہ کیفیت ہوئی تھی تو یہ چھت آسیب زدہ تھی۔ یہاں جنوں کا بسیرا تھا۔

ہلکا سا خوف تو محسوس ہو رہا تھا لیکن تجسس بھی تھا۔ شاید کچھ دکھائی دے جائے، کوئی غیر فطری بات ہو جائے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

پوری چھت خالی اور اُداس تھی۔ پرندے پرواز کر رہے تھے اور بادلوں کے گولے ہواؤں میں اڑتے پھر رہے تھے۔ ایک عجیب طرح کی نیم غنودگی کا ماحول تھا۔

میں واپس آنے لگا تو اچانک ایک چیز پر نظر پڑ گئی۔ یہ چمکتی ہوئی چیز ایک لاکٹ تھا۔ یہ لاکٹ چھت کی ایک دیوار کے ساتھ اینٹوں کے درمیان اس طرح پڑا ہوا تھا کہ سرسری انداز سے اس پر نظر نہیں جا سکتی تھی۔

لیکن میرا تو مشن ہی یہی تھا کہ چھت کا بغور جائزہ لوں۔ دیکھوں کہ آسیب زدہ ماحول میں کیا چیز مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے وہ لاکٹ مجھے دکھائی دے گیا تھا۔

میں نے اینٹیں ہٹا کر اس چین اور لاکٹ کو نکال لیا۔ وہ چاندی کی زنجیر سے منسلک لاکٹ تھا جو حرف کے کا تھا یعنی وہ لاکٹ جس کا بھی تھا اس کا نام k سے شروع ہوتا ہے۔

اِس قسم کے لاکٹس عام طور پر نوجوان پہنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ لاکٹ میل زدہ اور زنگ خوردہ ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت دنوں سے ان اینٹوں کے درمیان دبا ہوا تھا۔ شاید آسیب کی وجہ سے چھت کی طرف کوئی آتا نہ ہو اس لیے وہ نگاہوں سے محفوظ رہ گیا تھا۔

میں نے وہ لاکٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اس کے بعد دوسری اینٹیں ہٹانی شروع کر دیں کہ شاید کچھ اور دکھائی دے جائے۔ کچھ دیر بعد میری محنت بار آور ثابت ہوئی۔ ان ہی اینٹوں کے درمیان ایک ڈائری دبی ہوئی مل گئی۔

اور اس ڈائری کے مالک کا نام بھی k سے تھا اور ڈائری پر پورا نام لکھا ہوا تھا۔ ''کاشف حسین۔''

☆☆☆

کہتے ہیں کہ خدا جب کسی بھید کو ظاہر کروانا چاہتا ہے تو راستے روشن کرتا چلا جاتا ہے اور پوشیدہ چیزیں سامنے آنے لگتی ہیں۔

اس لاکٹ اور اس ڈائری کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

کتنے اتفاقات ایک ساتھ ہوئے تھے۔ میرا سفر.....ٹرین میں حجاب سے میری دلچسپی۔ حجاب کا جنگل میں اتر نا۔ میرا تعاقب کرنا پھر ڈاکوؤں کی آمد حجاب سے میری منگنی۔ جنگل سے فرار۔ نواب صاحب کی حویلی میں آنا یہاں غزالہ کو دیکھنا۔ یہ جاننا کہ اس پر کاشف حسین نام کا کوئی آسیب آیا کرتا ہے۔

پھر میرا سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر آنا۔ جہاں وہ ڈائری اور لاکٹ اس لیے رکھے ہوئے تھے کہ میں آ کر ڈسکور کروں۔ دریافت کروں اور میں نے دریافت کر لیا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ ہم دونوں یعنی میں اور حجاب اس ڈائری کو پڑھنے میں مصروف تھے۔ اس ڈائری کے مالک نے تاریخوں کے حساب سے واقعات درج کیے تھے۔

۱۸ مئی۔ آج نواب رشید کی صاحب زادی غزالہ سے ملاقات ہوئی۔ کیسی خوبصورت اور مہربان لڑکی ہے۔

۲۶ مئی۔ سچ یہ ہے کہ میں اور غزالہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ ہم نے اتنے سے دنوں میں ایک دوسرے کو جان لیا ہے، پرکھ لیا ہے۔

۵ جون۔ نواب رشید کے تیور بدلے ہوئے لگ رہے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے انہیں میری اور غزالہ کی محبت کا اندازہ ہو گیا ہے۔

۷ جون۔ نواب رشید نے آج براہ راست مجھے دھمکیاں دی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں اس خیال سے باز آ جاؤں کہ میں غزالہ کو حاصل کر سکتا ہوں۔

۸ جون۔ نواب رشید سے مجھے خوف آنے لگا ہے۔ ہم دونوں نے آج رات حویلی سے فرار ہونے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ غزالہ پوری طرح میرا ساتھ دے رہی ہے۔

جس کے بعد اور کچھ نہیں آخری اندراج ۸ جون کا تھا اس کے بعد کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔

''اشعر یہ سب کیا ہے؟'' حجاب نے ڈائری پڑھ لینے کے بعد پوچھا۔ ''کیا مطلب ہوا اس کا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ کاشف حسین کوئی آسیب

نہیں بلکہ جیتا جاگتا کردار تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور دوسری بات یہ ہے کہ نواب رشید اسے اچھی طرح جانتے تھے اور تیسری بات یہ ہے کہ غزالہ نے اس نوجوان سے محبت کی تھی۔''

''اگر یہ سب درست ہے تو پھر آسیب اور غزالہ کی ایسی کیفیت کیوں؟'' حجاب نے پوچھا۔

''ہاں یہ سوچنے والی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے امید ہے کہ ہم اس راز کو بھی پالیں گے۔ خدا نے اس ڈائری کا بھید یونہی ظاہر نہیں کیا۔ اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔''

☆☆☆

وہ اس وقت بالکل نارمل ہو رہی تھی۔

میں اور حجاب اس وقت لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ وہ بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت ایک عام سی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن نہیں شاید وہ اپنی لڑکپن اور جوانی کی حدود سے آگے نکل چکی تھی۔ میں اسے غور سے نہیں دیکھ پا رہا تھا کیونکہ ہر بار وہ ایک چھلاوے کی طرح سامنے آتی رہی تھی۔

اب اسے غور سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس سے کم نہیں ہوگی۔ اس کے نقوش دھندلانے لگے تھے لیکن اس کے چہرے کی معصومیت برقرار تھی۔ اس کا حسن برقرار تھا اسی لیے وہ پہلے مجھے لڑکی دکھائی دی تھی۔

''غزالہ آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟'' حجاب نے پوچھا۔

''میں گریجویٹ ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ اور بات ہے کہ کبھی کالج نہیں گئی۔ تعلیم پرائیویٹ طور پر حاصل کی ہے کیونکہ بابا نے کالج جانے کی اجازت نہیں دی۔''

''وہ کیوں؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے اپنی گردن جھکالی ''بابا یہ کہتے ہیں کہ مجھ پر کوئی آسیب وغیرہ کا بتا ہے۔'' وہ ہنس دی ''لیکن مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔''

میں نے اور حجاب نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یعنی وہ گفتگو ہماری کوششوں کے باوجود شروع ہوگئی تھی جو ہم کرنا چاہتے تھے۔

''آپ یہ بتائیں کہ یہ بات آپ کے بابا نے کب سے بتانا شروع کی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے خیال میں آپ کب سے اس مصیبت میں مبتلا ہیں؟''

''سولہ سترہ تو ہو ہی گئے ہوں گے۔'' غزالہ نے بتایا۔ ''لیکن مجھے نہیں پتا۔''

''حساب کتاب آسان ہو گیا تھا یعنی اگر کاشف حسین نام کا کوئی نوجوان حویلی میں آیا ہوگا تو اس وقت غزالہ بھی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔

''غزالہ ایک بات بتائیں۔ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟'' حجاب نے پوچھا۔

''شادی۔'' وہ طنزیہ انداز میں ہنس دی۔ ''ایک ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا جس پر کسی جن کا سایہ ہو۔'' میں نے غیر محسوس طور پر اپنی جیب سے کے والا لاکٹ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔

اس لاکٹ کو دیکھتے ہی غزالہ کے تیور اچانک بدل گئے۔ حیرت انگیز طور پر ایسا لگا جیسے اس کے خدوخال مردانہ ہو گئے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بھی بھاری ہو گئی تھی۔

اس نے جھپٹ کر وہ لاکٹ میز سے اٹھالیا۔ ''اوئے میں تو اس کو کب سے تلاش کر رہا تھا۔ یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گیا؟''

حجاب پریشان ہو کر اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ وہ سخت خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ خود میرا حال بھی عجیب ہو گیا تھا۔

میں ایک ناممکن بات کو ممکن ہوتے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک لڑکی نے اپنا چولا بدل لیا تھا۔ اس کی آواز بدل گئی تھی۔ اس کی چال بدل گئی تھی۔ اس کے تیور بدل گئے تھے۔

وہ اسی طرح اس لاکٹ کو چومتے ہوئے حویلی کے اندر چلی گئی۔ جب کہ ہم دونوں بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

اس رات اور بھی کئی واقعات ہوئے۔

کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ نواب صاحب کا بلاوا آ گیا۔ نواب صاحب کے پاس بابا بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکوؤں کا سردار کا کا۔ حجاب کا باپ۔

میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا میرے آنے کے

بعد حجاب بھی کمرے میں داخل ہوئی اور آ کر سردار سے لپٹ گئی تھی۔ ”بابا! مجھے یقین تھا کہ تم ان کے حصار سے نکل آؤ گے۔ اسی لیے مجھے اطمینان تھا۔“

”بس بیٹا تمہاری دعائیں مجھے نکال کر لے آئی ہیں۔“ سردار نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ”تم بتاؤ تمہیں یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں پریشانی تو نہیں ہوئی لیکن حیران ضرور ہوں۔“ میں نے کہا۔

”شاید تمہیں اس بات پر حیرت ہو رہی ہو گی کہ ڈاکوؤں کے سردار کا ایک نواب سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”جی ہاں یہی بات ہے۔“

”تو میں بتاتا ہوں۔“ نواب رشید نے کہا۔ ”میرے اور کاکا کے تعلقات بہت پرانے ہیں کم از کم بیس پچیس برس پرانے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں اپنے دشمنوں کے نرغے میں تھا۔ جائداد اور زمینیں دشمنی میں اضافہ کر دیتی ہیں تو کئی مواقع پر جب میں دشمنوں کے ہاتھوں شاید مارا جانے والا تھا اس وقت کاکا نے کئی بار میری جان بچائی۔ اس کے مجھ پر نہ جانے کتنے احسانات ہیں۔“

”یہ باتیں تو مجھے معلوم ہی نہیں تھیں۔“ حجاب نے کہا۔

”بیٹا اور بھی تمہیں بہت سی باتیں نہیں معلوم۔“ سردار نے کہا پھر میری طرف دیکھا۔ ”اشعر بیٹے۔ تمہیں اور حجاب کو اس حویلی میں بھیجنے کا ایک مقصد تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ تم کو غزالہ بٹیا کو اپنے ساتھ شہر لے جانا ہے۔“

”اپنے ساتھ لے جانا ہے؟“ میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔

”ہاں۔“ سردار نے کہا۔ ”تم نے غزالہ بٹیا کی حالت تو دیکھ ہی لی ہے۔ شہر میں ایک بہت بڑے بزرگ ہیں فیض عالم وہ اس آسیب کو دور کر سکتے ہیں۔ تمہارے ساتھ حجاب بھی ہو گی۔“

”حجاب بیٹا تم یہ اچھی طرح جانتی ہو کہ خود تمہارے بابا شہر میں نہیں رہ سکتے۔“ نواب رشید نے کہا۔

”لیکن جناب آپ تو رہ سکتے ہیں نا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ تم نہیں جانتے شہر میں میرے لیے بہت خطرے ہیں۔“ نواب صاحب نے بتایا۔ ”اور وہاں کم از کم ... پندرہ بیس دنوں تک رہنا ہے۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فیض عالم صاحب کو اسی حویلی میں بلا لیا جائے؟“ میں نے مشورہ دیا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ سردار نے کہا۔ ”فیض عالم صاحب اپنے آستانے سے باہر نہیں نکلتے لیکن تم لوگ فکر مت کرو۔ شہر میں تم تینوں کے لیے بہترین بندوبست کر دیا گیا ہے تمہیں وہاں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔“

”بابا۔ کیا غزالہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے گی؟“

”ہاں وہ تیار ہے۔“ نواب صاحب نے بتایا۔ ”اس کی زندگی میں تھوڑی سی تبدیلی آ جائے گی۔“

”ایک بات بتائیں۔ آپ دونوں نے مجھ پر اتنا بھروسا کیوں کر لیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ انسانوں کو سمجھتے اور ان سے نمٹتے ہوئے میں نے برسوں گزار دیے ہیں۔“ سردار نے کہا۔ ”تم ان چکروں میں نہ پڑو۔ روانگی کی تیاری کرو۔“ ”کل صبح تم تینوں کو یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔“

یہ ایک اور نئی کروٹ تھی۔ شاید خدا نے اسی مقصد سے مجھے اس حویلی یا جنگل کی طرف بھیجا تھا کہ میں غزالہ کی صحت یابی کا ذریعہ بن جاؤں۔

حجاب بہت پُرجوش تھی۔ ”یہ بہت اچھا ہو گا اشعر۔ غزالہ آپی بہت اچھی ہیں۔ سوائے اس پرابلم کے۔“

”او ہو وہ تمہاری آپی بھی ہو گئیں؟“

”ہاں ان کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ آپی کہنے کو دل چاہتا ہے۔“ حجاب نے بتایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ غزالہ وہاں جا کر ٹھیک ہو جائے گی؟“

”ہاں بابا نے کچھ سوچ کر ہی یہ بات کی ہو گی۔“ حجاب نے کہا۔ ”وہ یونہی کوئی بات نہیں کہتے۔“

”میرے لیے یہ سفر زندگی بھر یاد رہے گا۔“

”اور میرے لیے بھی۔“ حجاب دھیرے سے بولی۔ ”نہ جانے کیسی کیسی شاخیں نکلتی جا رہی ہیں۔“

اور دوسری صبح ہم تینوں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

شہر میں ایک شاندار کوٹھی تھی جس میں ہماری رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کوٹھی سردار کی ہے یا نواب رشید کی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لیکن وہ ایک شاندار کوٹھی تھی مکمل طور پر فرنشڈ زدو گاڑیاں بھی تھیں۔ چوکیدار اور ملازمین بھی تھے یعنی پورا اسیٹ اَپ تھا۔

غزالہ ہمارے ساتھ آنے کے بعد بہت خوش تھی۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ مجھے اس حویلی سے نکال کر لے آئے۔ میں تو اس کی دیواروں کو دیکھ دیکھ کر پاگل ہو گئی تھی۔''

''لیکن تمہاری حویلی تو بہت شاندار ہے غزالہ؟'' میں نے کہا۔

''ہاں شاندار تو ہے لیکن انسان کی نیچر ماحول میں تبدیلی چاہتی ہے۔'' غزالہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ''اور تبدیلی نہ ملے تو وہ نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔''

غزالہ اکثر اپنی باتوں سے اس بات کا ثبوت دیتی آئی تھی کہ وہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہے۔ میں اسے لڑکی ہی لکھوں گا۔ کیونکہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

اس کوٹھی میں آنے کے بعد جیسے اس کے گزرے ہوئے دن واپس آ گئے تھے۔ ہم بہت دیر تک ٹی وی دیکھتے رہے۔ پھر اپنی اپنی پسند کی موسیقی سنتے رہے اور جب اس سے بھی دل بھر گیا تو کیرم بورڈ نکال کر بیٹھ گئے۔

ہم بچوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے روٹھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو منا رہے تھے۔ اس دوران گھر کے ملازمین ہماری خدمت میں لگے ہوئے تھے۔

ہماری پسند کے پکوان بن رہے تھے۔ پھر کھانے کے بعد ہم نے گاڑی نکالی اور آئس کریم کھانے چلے گئے۔ میں نے جان بوجھ کر غزالہ سے کاشف حسین کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ بہت خوش تھی۔

وہ بار بار اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ اس نے زندگی کا ایسا لطف کبھی نہیں لیا تھا۔ اس کی زندگی بہت ہی بور گزر رہی تھی۔

ہم تینوں کے لیے جو کمرے مخصوص کیے گئے تھے، وہ بھی بہت شاندار تھے۔

دوسری صبح بھی بہت خوشگوار تھی۔ غزالہ کو کسی قسم کا دورہ وغیرہ نہیں پڑا تھا۔ وہ صبح کو بالکل ایکٹو تھی اور اسی صبح سردار اچانک کوٹھی میں آ گیا۔

ہم سب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ چائے پینے کے دوران اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں کسی قسم کی پریشانی تو نہیں ہوئی میرے بچوں؟''

''نہیں بابا۔ پریشانی کیسی ہم نے تو خوب انجوائے کیا۔'' حجاب نے کہا۔ ''لیکن بابا یہ کوٹھی کس کی ہے؟''

''تمہاری۔'' سردار نے بتایا۔

''مذاق نہ کریں بابا۔ واقعی یہ بتائیں یہ کوٹھی کس کی ہے؟''

''میں نے کہا نا کہ تمہاری۔'' سردار نے کہا۔ ''میں نے کئی سال پہلے اسے تمہارے لیے خرید لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے ڈیکوریٹ کرتا چلا گیا پھر تمہارے نام پر گاڑیاں خریدیں۔ غرض یہ کہ یہ سب کچھ تمہارا ہے۔''

''بابا۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

''میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔'' سردار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس قسم کے اور کتنے سرپرائز ہیں آپ کے پاس۔''

''بس دو چار اور ہیں۔'' سردار مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بعد اسٹاک ختم ہو جائے گا۔''

میں اس وقت نہ جانے کیا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جس لڑکی سے اتفاقاً میری منگنی ہو گئی تھی، وہ ایک ڈاکو کی بیٹی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک شاندار کوٹھی کی مالک تھی۔ اس کے پاس گاڑیاں تھیں۔ اس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے بھی ہوں گے۔

اور خود میں کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک عام سا بزنس مین۔

سردار نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ باہر آ جاؤں۔ میں سمجھ گیا کہ اب غزالہ کے حوالے سے بات ہو گی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ لان میں ٹہلتے ہوئے سردار نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیٹے کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ میں غزالہ کو وہاں سے یہاں کیوں لایا ہوں؟''

''ظاہر ہے کسی فیض عالم صاحب سے اس کا روحانی علاج کروانے۔''

''نہیں بیٹے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں غزالہ کو فیض عالم صاحب کے پاس نہیں لایا ہوں۔ کیونکہ فیض عالم نام کے کسی آدمی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

☆☆☆

یہ ایک نیا موڑ تھا۔
فیض عالم نام کے کسی آدمی کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اور غزالہ کے لیے بھی بتایا گیا تھا کہ فیض عالم صاحب اس کا روحانی علاج کریں گے۔
آخر کیوں؟ سردار کو ایسی غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی۔
''تم یہ سوچ رہے ہوگے کہ میں نے نواب رشید سے کیوں جھوٹ بولا۔'' سردار نے پوچھا۔
''ظاہر ہے۔ یہ سوال میرے ذہن میں آرہا ہے۔'' میں نے کہا۔
''بیٹے اگر میں یہ بتاتا کہ میں غزالہ کو کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جارہا ہوں تو وہ کبھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔'' سردار نے کہا۔
''اوہ۔ تو آپ غزالہ کو کسی ماہرِ نفسیات کے پاس لے جائیں گے۔'' میں نے پوچھا۔
''ہاں۔ کیونکہ یہ کیس اسی کا ہے..... اس کی کیا وجہ ہے یہ بھی میں جانتا ہوں اسی لیے سب سے پہلے غزالہ کو اس حویلی سے نکالنا ضروری تھا۔ کیونکہ مجھے غزالہ سے بہت محبت ہے۔ بہت پیار کرتا ہوں اس سے۔ اس کی وجہ بھی تمہیں معلوم ہوجائے گی۔''
''آپ تو مجھے حیران کیے دے رہے ہیں۔''
''ہاں زندگی میں سوائے حیران ہونے کے اور رکھا ہی کیا ہے۔'' سردار نے کہا۔
''کیا غزالہ نفسیاتی ٹریٹمنٹ کے لیے تیار ہوجائے گی۔'' میں نے پوچھا۔
''ہاں۔ اس سے اس موضوع پر بات ہوچکی ہے اور وہ بھی اپنی اس کیفیت سے بہت پریشان ہے۔''
''تو کب لے جانا پڑے گا غزالہ کو۔''
''ڈاکٹر پرویز خود آئیں گے یہاں۔'' سردار نے بتایا۔ ''تم بھی ان سے مل کر خوش ہوجاؤ گے، وہ بہت کمال کے آدمی ہیں۔''
ڈاکٹر پرویز ایک گھنٹے بعد پہنچ گیا تھا۔ وہ پینتیس چالیس سال کا ایک باوقار انسان تھا۔ اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ سائیکاٹرسٹ ہے۔ بس اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔
اس کی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ خود غزالہ بھی بار بار قہقہے لگارہی تھی۔ ڈاکٹر پرویز کی آمد نے ماحول پر خوشگوار اثرات قائم کردیے تھے۔
پھر اچانک باتیں کرتے کرتے ڈاکٹر پرویز نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ ''غزالہ صاحبہ میں ایک بات بتاؤں۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گی۔''
''نہیں، بتائیں۔''
''آپ کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ بہت آسانی سے کسی کو مسمرائز کرسکتی ہیں۔''
''اچھا یہ تو مجھے آج ہی پتا چلا۔'' غزالہ مسکرادی۔
''آج آپ چاہیں تو اس کا تجربہ ہوسکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔
''وہ کیسے؟''
''میں خود کو تجربے کے لیے پیش کرسکتا ہوں۔ آپ میری آنکھوں میں جھانک کر مجھے مسمرائز کرسکتی ہیں۔''
''ناممکن۔''
''تجربہ کرلیں۔ دیکھیں میری طرف۔''
یہ گفتگو اتنی دلچسپ ہوگئی تھی کہ ہم سب ان دونوں کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔
غزالہ نے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر پرویز کی طرف دیکھا اور چند لمحوں بعد خود اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ ہم حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
ڈاکٹر پرویز نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔ ہم سب بہت خاموشی اور دلچسپی سے اس کی مہارت کو دیکھ رہے تھے۔
چند لمحوں بعد غزالہ مکمل طور پر ٹرانس میں آگئی تھی۔ ڈاکٹر ہی کے اشارے پر حجاب نے غزالہ کو صوفے پر لٹادیا تھا۔
ڈاکٹر پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے ہدایات دے رہا تھا۔ اس کی آواز آہستہ تھی لیکن اس میں حکم تھا۔ زور تھا۔
''غزالہ تم سو رہی ہو۔ تم سو چکی ہو۔ گہری نیند۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ کوئی دباؤ نہیں ہے۔ تم بالکل پُرسکون ہو۔''
''ہاں۔ میں بالکل پُرسکون ہوں۔'' غزالہ نے کہا۔
''تم اب سے ایک سال پیچھے چلی گئی ہو۔ بتاؤ ایک

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سال پہلے کیا ہوا تھا۔"
"ہاں۔ میں ایک سال پیچھے چلی گئی ہوں۔" غزالہ نے کہا۔
"اور اب تم بتاؤ گی کہ تمہارے ساتھ کیا کیا گزری ہے۔" ڈاکٹر نے ہدایت دی۔

☆☆☆

"میں غزالہ ہوں۔ نواب رشید کی بیٹی۔ میرے بابا بہت دولت مند اور طاقت ور انسان ہیں۔ میں ایک شاندار حویلی میں رہتی ہوں۔ اس حویلی میں بابا اور میں رہتے ہیں۔ میری امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میری امی کو میری بہن کے غم نے مار دیا۔ بابا بتاتے ہیں کہ میری بہن کا نام آئینہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ پھر اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے وقت میں حویلی میں نہیں تھی۔ اپنے آپ کو بہلانے کے لیے مری چلی گئی تھی۔
لیکن کیوں۔ میں اپنے آپ کو کیوں بہلا رہی تھی۔ کیا ہوا تھا مجھے ایسا کون سا صدمہ تھا کہ مجھے خود کو بہلانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔
اف۔ کتنا گھپ اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں کوئی دوڑ رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے۔ مجھے بہت خوف محسوس ہو رہا ہے۔ میں اس اندھیرے سے بھاگ جانا چاہتی ہوں لیکن اندھیرا جیسے میرے پورے وجود پر محیط ہوتا جا رہا ہے۔ ڈر لگ رہا ہے۔"

غزالہ نے کانپنا شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر پرویز نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ تم بالکل پُرسکون ہو۔ تم سو رہی ہو۔ کچھ دیر بعد تم خود ہی اٹھ جاؤ گی۔ اس وقت تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ تم بالکل پُرسکون رہو گی۔"
غزالہ کو اس صوفے پر چھوڑ کر ہم ایک طرف آ گئے۔ یعنی میں، حجاب اور سردار۔ "ڈاکٹر آپ واقعی باکمال ہپناٹسٹ ہیں۔" میں نے اس کی تعریف کی۔
"بیٹا۔ کیا پتا چلا ہے" سردار نے پوچھا۔
"اتنی جلدی کچھ نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "کم از کم ..... سات آٹھ سیشن کے بعد ان کا پورا ماضی سامنے آئے گا۔ ابھی تو انہوں نے ماضی میں سفر شروع ہی کیا ہے۔"
"یہ اندھیرا اندھیرا کیوں کہہ رہی تھی؟"
"وہ بھی پتا چل جائے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔
ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم بہت دیر تک اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔
دو دنوں کے بعد غزالہ کے ساتھ پھر ایک سیشن ہوا تھا۔ اس سیشن میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ غزالہ صرف تین سال پیچھے گئی تھی پھر پانچویں سیشن میں اچانک بہت کچھ سامنے آ گیا۔
غزالہ نے کہا۔ "خدا جانے ایسا کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ وہ اجنبی مجھے اتنا اچھا کیوں لگ رہا ہے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ کوئی میرے دل اور ذہن کے اتنا قریب نہیں آیا تھا۔
"وہ ہے بھی بہت اچھا۔ بہت مہربان۔ بہت اچھی باتیں کرنے والا۔ بابا بھی اس کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں لیکن بابا کے سامنے میں اس اجنبی سے زیادہ باتیں نہیں کرتی۔ نہ جانے بابا کیا خیال کریں۔ ان سے ڈر بھی لگتا ہے۔"
اس نے پھر کہا۔ "میرے خدا کیا کروں میں۔ میں اس سے اتنا قریب کیوں ہوتی جا رہی ہوں۔ اس نے مجھ پر ایسا جادو کیوں کر دیا ہے۔ وہ جب مجھ سے باتیں کرتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ وہ بس اسی طرح سامنے بیٹھا رہے اور باتیں کرتا رہے۔
"ہائے۔ آج کیا ہو گیا تھا مجھے۔ میں نے اس سے محبت کا اظہار کیوں کر دیا۔ اس نے بھی اسی گرم جوشی سے میری محبت کا جواب دیا۔ جیسے اب تک اسے اسی لمحے کا انتظار ہو۔ اب کیا ہوگا۔ ہم نے محبت کا اظہار تو کر دیا ہے۔ تو کیا بابا کھلے دل سے ہماری اس محبت کو قبول کر لیں گے۔"
اس دن میں یہ آخری بات تھی۔ یعنی یہ سیشن یہیں ختم کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر پرویز کا یہ کہنا تھا کہ زیادہ بوجھ اس لیے نہیں ڈالا جا سکتا کہ ذہنی توازن بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔
بہرحال اس دن یہ پتا چل گیا تھا کہ بہت پہلے اس حویلی میں کوئی نوجوان آیا تھا اور غزالہ اس سے محبت کرنے لگی تھی لیکن وہ نوجوان کون تھا؟

☆☆☆

"اب کیا ہوگا۔" غزالہ کہہ رہی تھی۔ "بابا کو پتا چل گیا ہے کہ میرے اور اس نوجوان کے درمیان کوئی سلسلہ

شروع ہوگیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میں نے بابا کی نگاہوں میں خون اترا ہوا دیکھ لیا ہے۔ وہ سخت غصے میں ہیں اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ان کے غصے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے۔''

اس نے پھر کہا۔''ہم دونوں نے حویلی سے فرار ہونے کا پروگرام بنالیا ہے کیونکہ اسے بھی احساس ہوگیا ہے کہ یہ کیس بگڑ چکا ہے۔ اور بابا کبھی بھی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دیں گے۔''

''او خدا۔ یہ کیا ہورہا ہے۔ نہیں بابا نہیں، یہ اندھیرا کیوں ہورہا ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے بابا۔ یہ کس کے دوڑتے قدموں کی آواز آرہی ہے۔ کون ہے یہ۔ یہ کون چیخ رہا ہے۔''

''بتاؤ بابا۔ یہ کون چیخ رہا ہے۔ کہاں ہو سب لوگ۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ یہاں اتنا اندھیرا کیوں ہے۔ بابا۔ بابا۔''

پھر غزالہ نے دو چار جھٹکے لیے اور خاموش ہوگئی۔

ہم اس کے پاس سے ہٹ آئے۔ ہم میں سے ہر شخص خاموش تھا۔ اس کی کہانی بڑی حد تک ہمارے سامنے آچکی تھی لیکن اب بھی ایک سوال باقی تھا کہ غزالہ دورے کی صورت میں اتنا کیوں بدل جاتی ہے۔

سردار اب خاموش رہنے لگا تھا۔

یہ اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ سردار نے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ دیا ہے۔ یا وقتی طور پر سب نے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔

وہ اب اس کوٹھی میں ہمارے ساتھ ہی رہتا۔ اس کی خاموشی سے کسی بات کا پتا نہیں چلتا تھا۔

اس دوران نواب صاحب کے فون آتے رہے تھے۔ وہ ہم سموں کی خیریت دریافت کیا کرتے۔ اور جب انہیں یہ بتایا جاتا کہ غزالہ کا روحانی علاج بہت کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے تو وہ بھی خوش ہوجاتے۔

بالآخر ایک اور سیشن کے بعد ڈاکٹر پرویز نے غزالہ کی بدل جانے والی کیفیت کا راز بھی دریافت کیا۔ اس وقت غزالہ اپنے کمرے میں تھی جب کہ ڈرائنگ روم میں ہم جمع تھے۔

''غزالہ دراصل m.p.d کی مریضہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اور یہ m.p.d کیا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''اسے multiple personality disorder کہتے ہیں۔ یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی شخص یا تو کسی سے بے پناہ محبت کرے یا بے پناہ نفرت کرے۔ دونوں صورتوں میں وہ اس کی مکمل شخصیت ایڈاپٹ کرلیتا ہے۔ اپنے آپ کو اسی روپ میں ڈھال لیتا ہے۔''

''خدا کی پناہ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزالہ آپی نے جس شخص سے محبت کی، وہ خود اسی کے روپ میں چلی گئیں۔''

''ہاں اس کیس میں ایسا ہی ہوا ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔''یہاں تک ہوتا ہے کہ آواز تک بدل جاتی ہے۔ چال ڈھال وہی ہوجاتی ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس لڑکی پر آسیب کا سایہ ہوگیا ہے جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔''

''اور اس کا علاج کس طرح ہوتا ہے؟''

''اب ہمیں ان کے علاج کے مرحلے کی طرف توجہ دینی ہوگی۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔''یورپ میں تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کئی کئی شخصیات میں تبدیل ہوجاتا ہے پھر باری باری ہر شخص کی پرتیں اتاری جاتی ہیں جس طرح آپ نے لباس اتارنا شروع کیا ہو اور آخر میں اوریجنل شخصیت سامنے آجاتی ہے۔''

''حیرت انگیز۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یعنی انسانی نفسیات کی جڑیں ایسی ہوتی ہیں۔''

''اس سے بھی زیادہ گہری۔'' ڈاکٹر نے کہا۔''اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ نوجوان کون ہے یا صرف غزالہ کا تخیل ہے۔''

''نہیں ڈاکٹر تخیل نہیں ہے۔'' سردار نے ہم سموں کی طرف دیکھا۔''اس کا وجود تھا۔ وہ ایک جیتا جاگتا کردار تھا اور اس نوجوان کا نام کاشف حسین تھا۔ غزالہ نے اس سے محبت کی تھی۔''

☆☆☆

بیس دنوں کے بعد ہم واپس جارہے تھے۔

غزالہ کا ٹریٹمنٹ ہوچکا تھا۔ اس کی نفسیاتی گرہیں کھل چکی تھیں۔ اب وہ کاشف حسین نہیں تھی، ایک نارمل لڑکی تھی اور کاشف حسین اس کا محبوب تھا جو حویلی کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہوچکا تھا۔

سردار ہمارے ساتھ واپس نہیں جارہا تھا۔ اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”بیٹے اب تو تم نے یہ جان لیا ہوگا کہ قدرت تمہیں کس مقصد سے جنگل کی طرف لائی تھی اور حویلی کی طرف کیوں لے گئی۔“

”جی انکل۔“ میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ میں اب اسے انکل ہی کہنے لگا تھا۔ خدا جانے اتنا شریف انسان ڈاکوؤں کا سردار کیوں بن گیا تھا۔

”دیکھو، غزالہ اب ٹھیک ہو چکی ہے۔ تم دونوں شہر آ چکے ہو اگر چاہو تو حجاب اور تمہاری شادی کرا دی جائے اور تم اس کوٹھی میں زندگی گزارو۔ تمہیں دوبارہ حویلی کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن میں ایک خاص مقصد سے تمہیں اس حویلی کی طرف بھیج رہا ہوں۔“

”اور وہ مقصد کیا ہے انکل؟“

”وہ ہے کاشف حسین کو تلاش کرنا۔“ سردار نے کہا۔

”کاشف کو تلاش کرنا۔“

”ہاں مجھے یقین ہے کہ اس کو اسی حویلی میں کہیں رکھا گیا ہے۔“ سردار نے بتایا۔ ”وہ بہت بڑی اور پیچیدہ قسم کی حویلی ہے اس لیے میں تو تلاش نہیں کر سکتا لیکن تم خاموشی کے ساتھ یہ کام کر سکتے ہو۔“

”کیا ایسا ممکن ہے کہ میں اس سلسلے میں غزالہ سے مدد لوں۔“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”غزالہ کی مدد لی تو وہ کہیں جوش میں آ کر نواب صاحب کو نہ بتا دے کیونکہ غزالہ نے بہرحال اس نوجوان سے محبت کی تھی۔ یہ خبر شاید اس سے برداشت نہ ہو سکے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں احتیاط رکھوں گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں تم حجاب کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو وہ ایک باحوصلہ لڑکی ہے۔“

اور ہم دوبارہ حویلی پہنچ گئے۔

نواب رشید کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا کیونکہ غزالہ صحت یاب ہو کر واپس آ گئی تھی۔ اب اس پر کسی قسم کے دورے نہیں پڑتے تھے۔

”فیض عالم صاحب نے اس کا آسیب بھگا دیا لیکن اس میں ایک تبدیلی یہ آ گئی تھی کہ وہ اب خاموش رہنے لگی تھی۔ نواب صاحب نے مجھے اور حجاب کو اس حویلی میں رک جانے کے لیے کہا۔ ”بچو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دونوں کم از کم اس وقت تک اس حویلی میں رہو جب تک کاکا کا مسئلہ حل نہ ہو جائے۔“

”کاکا کا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے جناب؟“ میں نے کہا۔ ”وہ ایک ڈاکو ہیں۔ ڈاکوؤں کے سردار ہیں۔ پولیس کو ان کی تلاش ہے۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔“

”میرے بچو۔ شاید تم یہ نہیں جانتے کہ کاکا کون ہیں۔“ نواب رشید نے کہا۔ ”تم دونوں شاید انہیں ڈاکو ہی سمجھ رہے ہو۔“

”تو پھر میرے بابا کیا ہیں انکل؟“ حجاب نے پوچھا۔

”ایک بہت بڑا لیڈر۔“ نواب رشید نے بتایا۔

”کیا تم دونوں نے کبھی شجاعت علی خان کا نام سنا ہے؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں شجاعت علی خان کو۔“

تو یہ کاکا وہی شجاعت علی خان ہیں۔“ نواب رشید نے بتایا۔

☆☆☆

یہ کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب شجاعت علی نے اس وقت کی کرپٹ حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔

ایس اے اپنے دادا کے زمانے سے جاگیردار اور دولت مند چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ہر دور میں حق کی آواز بلند کی تھی۔ ہر دور میں ان پر پریشانیاں آتی رہی تھیں۔

وہ ایک اخبار بھی نکالا کرتے تھے جس کا نام احتساب تھا۔ وہ اخبار اپنا فرض پورا کر رہا تھا۔ معاشرے میں جہاں بھی کرپشن نظر آتی، احتساب کے نمائندے وہاں پہنچ جاتے۔

انہوں نے کئی موومنٹ بھی چلائیں۔ ان کی زندگی کا صرف ایک مقصد رہ گیا تھا کہ وہ حق اور صداقت کی آواز بلند کرتے رہیں اور عوام کو حکمرانوں کے خلاف بتاتے رہیں۔

پھر ان پر درجنوں کیسز بنا دیے گئے۔ سب سے بڑا کیس ایک حساس ادارے کے سربراہ کے قتل کا تھا جب کہ اس کی موت میں ایس اے کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ مجبوراً

روپوش ہو گئے کیونکہ انہیں انصاف کی توقع نہیں تھی۔ وہ کہا کرتے۔ ”اپنے بھی خفا مجھ سے بے گانے بھی ناخوش۔ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔ ان کی روپوشی طویل ہوتی چلی گئی کیونکہ آنے والی حکومت نے انہیں اپنے لیے خطرہ سمجھا اور ان مقدمات کو برقرار رکھا۔“

نواب رشید یہ سب بتا رہے تھے اور ہم تینوں خاموشی سے سن رہے تھے۔

”انکل مان لیا کہ میرے بابا ایس اے ہیں اور حکومت کے باغی ہیں تو پھر وہ ڈاکوؤں کے سردار کیسے ہو گئے؟“ حجاب نے پوچھا۔ ”ڈاکوؤں کا سردار بننے کے لیے تو پورا ڈاکوؤں والا بیک گراؤنڈ ہوتا ہے۔“

”بیٹا یہ بھی ایک عجیب کہانی ہے۔“ نواب رشید نے کہا۔ ”ایس اے نے کسی زمانے میں کچھ ڈاکوؤں کی طرف سے اپنے اخبار میں آواز اٹھائی تھی کہ یہ بے چارے ڈاکو نہیں ہیں جب کہ اصل ڈاکو وہ ہیں جنھوں نے ان لوگوں کو ڈاکو بننے پر مجبور کیا ہے یعنی جاگیردار اور وڈیرے، سیاست داں اور صنعت کار وغیرہ۔ ان کا احتساب کیا جائے، انہیں پکڑا جائے کیونکہ یہ ڈاکو بے چارے تو کٹھ پتلیاں ہیں جب کہ ان کو نچانے والے ہاتھ کوئی اور ہیں۔“

”یہ بات تو صحیح ہے۔“

”تو پھر یہ ہوا کہ جب ایس اے پر برا وقت آیا تو ان ہی ڈاکوؤں نے ان کا ساتھ دیا اور انہیں اپنے پاس لے گئے پھر نہ جانے کیسے اتفاقات ہوئے کہ انہیں اپنا سردار بنا دیا گیا۔“

”اور اس کے لیے بابا نے یقیناً ڈاکوؤں والا کردار ادا کیا ہوگا۔“ حجاب نے کہا۔

”نہیں۔ اس معاملے میں تمہارے بابا کا ہاتھ صاف رہا ہے۔ ان کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہ پچھلے کئی برسوں سے پوری بستی کے اخراجات اپنی جیب سے پورے کر رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں ہونے دی۔ ان ڈاکوؤں کو یہی چاہیے کہ ان کے اخراجات پورے ہوتے رہیں اور ایس اے ان کے اخراجات پورے کر رہا ہے۔“

”میرے بابا تو پھر ایک بڑے انسان ہیں انکل۔“ حجاب نے کہا۔

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ نواب رشید نے کہا۔ ”وہ ایک بڑا انسان ہے۔“

اسی وقت ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔

وہ ایک بھاری جسامت کا ایسا شخص تھا جس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی لیکن اس کی آنکھیں اس کے چہرے کے برعکس تھیں۔ ان آنکھوں میں بے رحمی کے تاثرات تھے۔

”السلام علیکم رشید بھائی۔“ اس نے نواب صاحب کو سلام کیا۔

”اس وقت جاؤ میرے پاس کچھ مہمان بیٹھے ہیں۔“ نواب رشید نے کہا۔

”تو کیا ہوا۔ یہ میرے بھی مہمان جیسے ہیں۔ بہت پیارے پیارے لوگ ہیں خیر یہ تو اپنی غزالہ بیٹی ہے لیکن یہ دونوں کون ہیں؟“

”میرا نام اشعر ہے۔“ میں نے اپنا تعارف کروایا۔

”اور میں حجاب ہوں۔“ حجاب نے بتایا۔

”اور میں حمید نواب ہوں۔“ اس نے بتایا۔ پھر رشید نواب کی طرف دیکھا۔ ”کیوں بھائی صاحب میں نے غلط تو نہیں کہا۔“

وہ آدمی بیک وقت مکار بھی تھا اور معصوم بھی۔

نواب رشید نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”حمید میرے سوتیلے بھائی ہیں۔“

”یہ آپ کیوں یاد دلاتے رہتے ہیں بھائی صاحب۔“ وہ بُرا مان جانے والے انداز میں بولا۔ ”بہرحال ہوں تو آپ کا بھائی۔“

وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کے آنے سے ماحول میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اس انداز کے ہوتے ہیں وہ پورے ماحول پر اپنے منفی اثرات پیدا کر جاتے ہیں۔

”معاف کرنا میرے بچو۔“ نواب رشید نے کہا۔ ”اس کی وجہ سے کوفت ہو گئی۔ ہے تو میرا سوتیلا بھائی۔ لیکن اپنی حرکتوں کی وجہ سے عاق ہو چکا ہے۔“

ڈاکوؤں کے سردار یعنی حجاب کے بابا کا ماضی بھی سامنے آ چکا تھا۔ میری حیرت کی وجہ یہ تھی کہ اتنا مہذب اور سلجھا ہوا آدمی ڈاکو کس طرح بن سکتا ہے۔

نواب رشید بول رہا تھا۔ ”میرا اور کاکا کا برسوں پرانا ساتھ ہے۔ مجھے اس شخص کی دوستی پر فخر ہے۔ اس نے نہ جانے کتنی بار میرا ساتھ دیا ہوگا میں اس کے اور اس کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اولاد کے لیے جو بھی کرسکوں، وہ کم ہوگا۔''

غزالہ اور حجاب اندر چلی گئی تھیں جب کہ میں اور نواب رشید بیٹھک میں رہ گئے تھے پھر نہ جانے مجھے کیا سوجھی، میں نے نواب رشید کی طرف دیکھا۔ ''انکل اگر میں آپ سے کوئی بات پوچھوں تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے۔''

''بتاؤ کیا پوچھنا ہے۔''

''انکل ہوسکتا ہے کہ میرا یہ سوال آپ کو ناگوار گزرے اسی لیے پہلے سے معافی مانگ رہا ہوں۔''

''اوہ تکلف کیوں کررہے ہو۔ پوچھو۔''

''کیا آپ کی صاحبزادی غزالہ کی زندگی میں کبھی کوئی آیا تھا۔ معاف کیجیے گا یہ ایک بے ڈھنگا سا سوال ہے۔''

''میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' نواب کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ ''اس کا جواب ہے ہرگز نہیں، ہمارے خاندان میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے اگر کوئی آجائے تو پھر وہ اپنی جان سے ہی جائے گا۔''

اور میں سمجھ گیا کہ اس کاشف حسین کی گمشدگی میں نواب رشید ہی کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

خدا ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح اس سرنگ میں آگیا تھا۔

ایس اے خان کی وہ بات مجھے یاد رہتی تھی۔ ''بیٹے، کاشف اسی حویلی میں ہوگا۔ اسے تلاش کرنے کی کوشش کرو۔'' اور میں اس کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ یہ سرنگ دکھائی دے گئی۔

حویلی کی ایک دیوار کے ساتھ کچھ زینے تھے جن کو اینٹیں چن کر بند کردیا گیا تھا اور اسی زینے کے نیچے ایک بڑا سا سوراخ تھا۔

میرے پاس اس وقت ایک ٹارچ موجود تھی۔ اس ٹارچ کی روشنی میں وہ سوراخ دکھائی دے گیا تھا۔ میں نے دو چار اینٹیں اِدھر اُدھر ہٹائیں تو سوراخ بہت واضح ہوگیا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں آسانی سے داخل ہوا جاسکتا تھا۔

عام طور پر ایسے مقامات سیلن زدہ ہوتے ہیں۔ چمگادڑیں وغیرہ اپنا بسیرا کیے رکھتی ہیں یا مکڑیوں کے جالے ہوتے ہیں لیکن اس سرنگ کے دہانے پر ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

جس سے ثابت ہو رہا تھا کہ یہ سرنگ کسی کے باقاعدہ استعمال میں ہے۔

میں نے خدا کا نام لے کر اس سرنگ میں قدم رکھ دیا۔ وہ سرنگ دور تک چلی گئی تھی۔ انتہائی گہرا اندھیرا تھا پھر مجھے غزالہ کی دو چار باتیں یاد آنے لگیں جو اس نے ٹرانس کے عالم میں کہی تھیں۔

''بابا بہت اندھیرا ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ میں کہاں آگئی ہوں۔''

شاید غزالہ کو اسی سرنگ میں آنے کا اتفاق ہوا ہو اور یہ سرنگ اس کے لاشعور اور اس کی یادوں کا حصہ بن گئی ہو۔

میں ٹارچ روشن کیے آگے بڑھتا چلا گیا۔

اچھی خاصی کشادہ سرنگ تھی اور اس میں ہوا بھی آرہی تھی۔ نہ جانے اس سرنگ کو کب تعمیر کیا گیا ہوگا اور کن لوگوں کے استعمال میں رہی ہوگی۔

میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ بھی اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ سرنگ کتنی دور تک گئی ہوگی۔ بس میں اپنی دھن میں چلا جارہا تھا کہ اچانک ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

اس قیامت نے پشت سے وار کیا تھا۔ شاید کوئی ڈنڈا مارا تھا یا کوئی اور بات تھی کہ میں اپنے ہوش میں نہیں رہ سکا تھا۔ چکرا کر گر پڑا۔ میں بے ہوش ہوگیا تھا۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میں کب تک بے ہوش رہا ہوں گا۔

جب ہوش آیا تو چند لمحوں تک سمجھ ہی نہیں آسکا کہ خود میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ جب اوسان بحال ہوئے تو اندازہ ہوا ایک کوٹھری میں ہوں۔

اس کوٹھری میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ جس کی اداس زرد روشنی میں وہ کوٹھری پوری طرح دکھائی دے رہی تھی۔

میں اس کوٹھری میں اکیلا نہیں تھا۔

ایک آدمی اور بھی تھا۔ لالٹین کی بیمار روشنی میں وہ کسی ڈھانچے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اپنے سر میں تکلیف محسوس ہورہی تھی۔

نہ جانے حملہ آور کون تھا۔ نواب رشید نے یہ کام خود تو نہیں کیا ہوگا۔ اس کا کوئی نہ کوئی آدمی سرنگ کی نگرانی کے لیے موجود ہوگا۔ اس نے میرے ساتھ یہ حرکت کی ہوگی۔

''کو...... کون ہو تم؟'' میں نے کسی کی کمزور لڑکھڑاتی آواز سنی۔

میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے چہرے اور سر کے بال بُری طرح بڑھے ہوئے تھے۔ ''تم کون ہو؟'' میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''میں تو اپنا نام تک بھول چکا ہوں۔''

''چلو۔ میں تمہیں یاد دلا دوں۔ تم کاشف ہو۔''

''کاشف۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''ہاں یاد آ گیا۔ میں کاشف ہوں۔ کاشف حسین۔''

''تم یہاں کب سے قید ہو؟''

''شاید برسوں ہو گئے۔'' اس نے بتایا۔ ''اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے مجھے۔''

''کیا یہ بتا سکتے ہو کہ کس نے قید کیا ہوگا؟''

''ہاں۔ شاید بتا سکتا ہوں۔ نواب نے۔ نواب نے قید کیا ہے مجھے۔ میرے خدا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ''کیا جرم تھا میرا۔ میں نے تو صرف محبت کی تھی۔''

''تم یہ بتاؤ۔ کیا تم چل سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا فائدہ۔ یہاں سے کہاں جاؤں گا؟''

''ہمت پکڑو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اب یہ بتاؤ۔ کھانا پانی دینے کے لیے کون آتا ہے۔''

''ہاں۔ نواب خود آتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ایک بے رحم انسان ہے۔ اس نے مجھ پر بہت ظلم کیا ہے۔''

''کس وقت آتا ہے؟''

''بس اب آتا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''اب تو اسے زیادہ کھانا لانا ہوگا۔ کیونکہ اب تم بھی آ گئے ہو۔''

''اچھا۔ میں اپنی جگہ جا رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''میں اسی طرح لیٹ جاؤں گا۔ جیسے اچانک بے ہوش ہوں پھر نواب جب آئے گا تو اسے دیکھ لوں گا۔''

اس کے بعد میں اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔

بہت دیر تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ مکمل خاموشی رہی پھر سرنگ میں کسی کے قدموں کی آواز گونجنے لگی، کوئی آ رہا تھا۔ میں جس انداز میں لیٹا ہوا تھا اسی طرح لیٹا رہا۔

پھر اس کوٹھری کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر آ گیا۔

''اوہ، یہ تو ابھی تک بے ہوش ہے۔'' کسی کی آواز آئی۔

میں نے وہ آواز پہچان لی تھی۔ وہ آواز نواب حمید کی تھی۔ رشید کا سوتیلا بھائی۔ میں نے پلکوں کی درز سے دیکھا۔ نواب کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ اس نے وہ ٹرے ایک طرف رکھتے ہوئے کاشف سے کہا۔ ''یہ کم بخت ابھی تک بے ہوش ہے۔ میں اس کا بھی کھانا لے کر آیا ہوں۔ جب ہوش میں آئے تو بتا دینا۔ خود کھا لے گا۔''

نواب حمید کوٹھری کے دروازے تک ہی بڑھا تھا کہ میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ذرا بھی دیر کی تو یہ دروازہ بند کر کے چلا جائے گا۔

اس کم بخت میں بہت جان تھی۔ وہ بہت دیر تک میرا مقابلہ کرتا رہا۔ میں شاید اپنی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی آپشن نہیں تھا کہ یا تو خود مر جاؤں یا اس کم بخت کو مار دوں۔

اس میں بہت جان تھی۔

بہت طاقت تھی لیکن میں چونکہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا؟ اس لیے میں اس پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ میں نے مار مار کر اس کا حلیہ خراب کر دیا۔

اس دوران کاشف خاموش تماشائی کی طرح یہ سب دیکھتا رہا تھا۔ شاید اس بے چارے میں اتنی جان ہی نہیں رہی تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرا ساتھ دے سکتا۔

میں نے جنونی کیفیت میں نواب رشید کو مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد کاشف کو لے کر اس سرنگ سے نکل جانا بہت آسان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ہم سب ہال میں جمع تھے۔

نواب حمید کو ایک طرف باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔ وہاں غزالہ تھی۔ ایس اے خان تھا۔ حجاب تھی اور نواب رشید تھے۔

اس کہانی کی گرہیں اب کھلنے والی تھیں۔

کاشف حسین کی شیو بنا دی گئی تھی۔ اس کے بال کاٹ دیے گئے تھے۔ اسے نہلایا گیا تھا...اور نئے کپڑے پہن کر اس کی شخصیت ہی کچھ اور ہو چکی تھی۔ وہ واقعی ایک بانکا سجیلا نوجوان تھا۔

کاشف بتا رہا تھا۔ ''میں نے نواب حمید کو نواب رشید کے خلاف سازش کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ حمید نے کرائے کے ایک قاتل کی خدمت حاصل کی تھیں۔ اتفاق سے وہ قاتل مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اور میرا احترام کرتا تھا۔ اس کی وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ تو جب اس قاتل نے

مجھے دیکھ لیا تو ساری بات بتا کر اور مجھ سے معذرت کر کے وہاں سے چلا گیا پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں خود نواب حمید سے پوچھوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے یہ بات نواب حمید سے پوچھی اور میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ پر اچانک حملہ کر کے مجھے اس طرح بے بس کر دے گا۔ اس کے بعد اس نے مجھے سرنگ والی کوٹھری میں لے جا کر قید کر دیا۔"

"اور میں کاشف کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔" غزالہ نے بتایا۔ "میں نے اسے چھت پر سے حویلی کی سرنگ والے حصے کی طرف آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں دوڑتی ہوئی اس طرف آئی تو کاشف غائب تھا۔ البتہ سرنگ کا دہانہ کھلا ہوا تھا۔ میں سرنگ میں داخل ہو گئی۔ مجھ پر کاشف کے لیے ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہاں بے پناہ اندھیرا تھا۔ میں اس اندھیرے میں آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر شاید خوف سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔"

"اور غزالہ کو حویلی کے ایک ملازم نے اس سرنگ سے تلاش کیا تھا۔" نواب رشید نے بات آگے بڑھائی۔ "ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔"

"اور میں یہ سمجھتی رہی کہ کاشف کی گمشدگی میں بابا کا ہاتھ ہے۔" غزالہ نے بتایا۔ "اس لیے میں اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ اور شاید نفسیاتی مریض بن گئی۔"

"میں نے چھت پر سے ہی کاشف کا چین اور ڈائری پائی تھی۔" میں نے بتایا۔ "وہ چیزیں چھت پر کیسے پہنچ گئیں؟"

"انہیں میں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کیونکہ ان سے کاشف کی یادیں وابستہ تھیں۔" غزالہ نے بتایا۔ اس نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔

"اب کہانی جب یہاں تک پہنچ ہی گئی ہے تو آگے میں بتاتا ہوں۔" ایس اے خان نے کہا۔ "کاشف نے غزالہ کو اس حویلی سے باہر کہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ حویلی میں مہمان کی حیثیت سے رہ کر غزالہ کو قریب سے دیکھ لے۔ اس کے بارے میں جان لے اور جب وہ اپنے ارادے پر قائم رہے تو پھر میں نواب رشید سے غزالہ کا رشتہ مانگ لوں گا۔"

"کیوں، کاشف سے تمہارا تعلق۔" نواب رشید نے پوچھا۔

"تعلق یہ ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔" ایس اے خان نے انکشاف کیا۔

☆☆☆

ہم سب جیسے پتھر کے ہو گئے۔

یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔

اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ ایس اے خان، کاشف کے لیے بے چین کیوں ہو رہا تھا۔ وہ اسے ہر قیمت پر تلاش کیوں کروانا چاہتا تھا۔ دونوں کے درمیان باپ اور بیٹے کا رشتہ تھا۔

"تو یہ بات کاشف نے مجھے کیوں نہیں بتائی ہے؟" نواب رشید نے پوچھا۔

"اس کی بھی وجہ تھی۔" ایس اے خان نے کہا۔ "میں یہ چاہتا تھا کہ ان دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے۔"

"اب تو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کرائے کا وہ قاتل مجھے کیوں پہچانتا تھا۔ اور میرا احترام کیوں کرتا تھا۔" کاشف نے کہا۔ "صرف بابا کی وجہ سے۔"

"تم لوگوں نے ایک بات مجھ سے کیوں نہیں پوچھی۔" نواب حمید اچانک بول پڑا۔ "اہم بات یہ ہے کہ جب اس شخص نے میرا راز جان لیا تھا۔ تو میں نے اسے قید میں رکھنے کی زحمت کیوں کی۔ اسے ختم کیوں نہیں کر دیا۔"

"ہاں۔ یہ بات اہم ہے۔" نواب رشید نے اس کی طرف دیکھا۔ "چلو بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ بھید جاننے کے لیے تم سبھوں کو میرے کمرے میں چلنا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "وہاں اس سوال کا جواب مل جائے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تو ویسے بھی بندھا ہوا ہوں۔"

یہ پورا قافلہ نواب حمید کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

شاید اس کہانی کے ایک دو بھید ابھی باقی تھے۔ نہ جانے حمید ہمیں کیا دکھانا چاہتا تھا۔ ہم اس کے کمرے میں پہنچ گئے۔ پورے کمرے میں کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا تھا اور فضا میں ناگوار سی بو تھی۔

"میں پہلی بار اس کمرے میں آیا ہوں۔ نہ جانے یہ کم بخت کیا دکھانا چاہتا ہے۔"

پھر اس شخص نے جو کچھ دکھایا، وہ بہت ہی کربناک تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اتنا اذیت ناک منظر پہلے کبھی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہیں دیکھا ہوگا۔
کئی بکس تھے۔ جن میں زندہ تتلیوں کو پنوں کے ذریعے پیوست کردیا گیا تھا۔ کچھ تتلیاں مرچکی تھیں کچھ اب تک چرچرا رہی تھیں۔
دو خرگوش تھے۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک تھا۔ ان کی دموں کے ساتھ بھی کیلیں ٹھونک دی گئی تھیں۔ وہ بری طرح اچھل رہے تھے۔ اذیت ناک آوازیں نکال رہے تھے۔
''سمجھ گئے تم لوگ۔ جو میرے قبضے میں آتا ہے۔ میں اسے مارتا نہیں ہوں۔ اسی طرح تڑپا تڑپا کر اپنی قید میں رکھتا ہوں۔''
اس نے نواب رشید کی طرف دیکھا۔''رشید بھائی۔ تم کو تو یاد ہوگا کہ ہمارے ابا حضور ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔ یہی کرتے تھے نا۔ میری ذرا سی شرارت پر مجھے گھنٹوں کے لیے کونے والی کوٹھری میں بند کردیا کرتے اور میں روتا رہتا۔ لیکن میری فریاد کوئی نہیں سنتا تھا۔ بس میں آج تک اسی بات کا بدلہ لے رہا ہوں دوسروں سے اسی طرح مجھے سکون ملتا ہے۔ چین ملتا ہے۔ کیونکہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایسا ہی ہوتا تھا میرے ساتھ۔''اس نے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کردیا تھا۔
اس کمرے کی فضا بہت ہی بوجھل ہوگئی تھی۔

☆☆☆

ہم سب ایک بار پھر ہال میں آگئے تھے۔
''اس آدمی نے اگرچہ میرے ساتھ برسوں برا سلوک کیا ہے۔'' کاشف نے نواب حمید کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن میں اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اپنے اوپر ہونے والا ظلم معاف کررہا ہوں۔ کیونکہ یہ ایک مریض ہے۔''
''اور جب خود میرے بیٹے نے معاف کردیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں سزا دینے والا۔'' ایس اے خان نے کہا۔ ''میں بھی معاف کررہا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید نواب رشید مجھے معاف کردیں۔ حجاب معاف کردے اور میرا خدا مجھے معاف کردے۔''
''میں نہیں سمجھا کاکا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' نواب رشید نے حیرت سے پوچھا۔
''نواب رشید۔ کیا تمہیں اپنی تین سال کی بچی یاد ہے۔'' ایس اے خان نے پوچھا۔
''میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ میری جان تھی۔ دریا میں ڈوب کر مرگئی۔''
''وہ مری نہیں۔ زندہ ہے۔''
''کیا۔'' نواب رشید کھڑا ہوگیا۔''کاکا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میری بچی زندہ ہے؟''
''ہاں۔''
''تو پھر کہاں ہے وہ؟''
''یہ ہے تمہاری بچی۔'' ایس اے خان نے حجاب کی طرف اشارہ کردیا۔
''کیا۔ یہ میری بچی ہے؟''
''ہاں نواب رشید۔'' ایس اے خان نے کہا۔''خدا نے انتقام اور غصے کو اسی لیے ناجائز قرار دیا ہے کہ آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے۔ مجھے یہ یقین ہوگیا تھا کہ میرے کاشف کو غائب کرنے میں تمہارا ہاتھ ہے۔ کیونکہ مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ تم کاشف اور اپنی بیٹی کے درمیان پیدا ہونے والی محبت سے بہت ناراض تھے اور اسی لیے تم نے اس کو غائب کروادیا۔ یا شاید جان سے ماردیا۔ میں اس وقت کچھ نہیں کرسکا تھا۔ میں کمزور اور بے بس تھا۔ حکومت کے خوف سے دربدر ہو رہا تھا۔
''پھر مجھے یہ بچی دکھائی دے گئی۔ یہ نہر میں ڈوبی نہیں تھی۔ میں نے اسے نکال لیا تھا لیکن تمہارے پاس لے جانے کے بجائے میں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔''
''میرا ارادہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد تمہاری بے چینی دیکھ کر واپس کردوں گا لیکن مجھے اس سے محبت ہوتی چلی گئی۔ میں نے اسے اپنی اولاد سمجھ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ اس کو ہاسٹل میں داخل کرایا اور خود بھٹکتا رہا۔ میں نے ہر طرح کی تکلیف برداشت کی لیکن اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ اور آج تمہاری امانت تمہیں واپس کررہا ہوں۔''
ایس اے خان رو رہا تھا۔ حجاب بھی رو رہی تھی۔ غزالہ اور نواب رشید رو رہے تھے۔ پورا ماحول سوگوار ہوگیا تھا۔ کہانی کے اس موڑ کی توقع شاید کسی کو بھی نہیں ہوگی۔
پھر ایس اے خان اٹھ کر جانے لگا۔''اب تم لوگ مجھے اجازت دو۔ میں نے شاید اپنا فرض پورا کردیا ہے اور ویسے بھی دوڑتے دوڑتے تھک چکا ہوں۔ اس لیے خود کو حکومت کے حوالے کرنے جارہا ہوں۔''
حجاب بابا کہہ کر ایس اے خان سے لپٹ پڑی وہ کمرا ایک بار پھر آنسوؤں اور ہچکیوں سے بھر گیا۔

ضمیر فروش

حسام مظہر سلیم

زندگی میں اکثر نشیب و فراز آتے ہیں... بعض اسے معمولی جھٹکے دے کر آگے بڑھا دیتے ہیں... بعض زندگی کا نہ صرف رخ بدل ڈالتے ہیں بلکہ مقصدِ حیات کا تعین بھی کر دیتے ہیں... کاغذ اور قلم سے وابستگی رکھنے والے شخص کی روداد جس نے کبھی جرم کا تصور بھی نہ کیا تھا... ایک پُرسکون زندگی گزار رہا تھا... مگر اچانک ہی وہ تند و تیز آندھی کی لپیٹ میں آگیا جس نے اسے زخموں سے چور چور کر ڈالا... اس کی سانسوں کو اکھاڑ دیا... انسانی وجود کے دشمنوں اور ان کے جسمانی اعضا کی خرید و فروخت کا گھناؤنا کھیل... روشن بستیوں سے ویران راستوں کی طرف آنے والے باحوصلہ مسافروں کا فیصلہ کن معرکہ...

حق و ناحق کی کشمکش...... بے ضمیروں اور عیاروں کا خونی ٹکراؤ......

خالد مکرانی کا گھرانا پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ اُس کی ماں، ایک جواں سال بہن، چھوٹا بھائی، دادی۔ خالد مکرانی دو کمروں والے تنگ و تاریک مکان میں رہتا تھا۔ مکرانی کا باپ سائٹ ایریا کی ایک فیکٹری میں آتش زدگی کے دوران جھلس کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بہار بانو اور اس کی بہن پوش علاقے کے بنگلوں میں کام کر کے گھر کا چولہا گرم رکھتی تھیں۔ چھوٹا بھائی سارا دن محلے کے بچوں کے ساتھ گلی میں کھیلتا رہتا اور دادی ایک جھلنگا سی چارپائی پر پڑی جوڑوں کے درد سے ہائے ہائے کرتی رہتی تھی۔

مکرانی کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا، دوستوں کے خرچے پر عیش کرتا تھا۔ اشفاق عرف شاقی کے ساتھ مل کر موبائل چھیننا اور لڑکیوں کے موبائل نمبر حاصل کر کے انہیں پھانسنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ شیدے قسائی کی بیٹی پر نظر میں رکھا ہوا تھا۔ رابعہ کی کالج سے واپسی پر اس کے راستے میں کھڑا ہو جاتا۔ وہ پاس سے گزرتی تو بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرتا منہ سے سیٹی بجاتا اسے سرتاپا گھورتا شرفو کے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتا، پھر وہ اور شاقی چائے پیتے اور نئی وارداتوں کے پلان بناتے۔ ایک دن مکرانی نے شاقی کے پاؤں پکڑتے ہوئے مسکا لگایا۔ ''استاد کہیں سے بھی کوشش کر کے رابعہ کا نمبر لا دے۔'' پھر لہجے میں درد بھرتے ہوئے بولا۔ ''شاقی بھائی اپن کی قسمت ہی پھوٹ گئی چند دن سے وہ نجر اٹھا کر نہیں دیکھتی۔'' شاقی پان کی گلوری منہ میں رکھتے بولا۔

''ابے سالے تو پھکر کاہے کو کرتا ہے اپن ہے ناں، تو شام میں میرے کو ہوٹل میں ملنا تیرے کو نمبر مل جاوے گا۔'' شاقی اٹھا، ہوٹل سے نکلا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

مکرانی بھی اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر شام ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس کی ماں اور بہن کام سے واپس آ گئی تھیں۔ ماں گھر کا کام کاج کرنے لگی اور بہن چھوٹے بھائی کے ساتھ ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ ماں نے مکرانی کو دیکھ کر کہا۔ ''اڑے خالد تو کام دھندے سے

لگ جا۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا ہے کبھی تیرے منہ پر بارہ نہیں بجے آج کا ہے کو پریشان ہے؟"

مکرانی نے جھٹ سے بات بنائی۔ "اماں...... ! کام دھندا نہیں اسے جبھی تو پریشان ہوں۔"

ماں سر سے پاؤں تک بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تیری یہ دو من کی لاش اچار ڈالنے کے کام آوے گی؟ محنت مزدوری کرنے کو موت آتی ہے؟ ہیں...... ! میرے کو بتا گھر میں جوان بہن بیٹھی ہے اس کی سادی کی پھکر نہیں ہے تیرے کو، جب دیکھو اونٹ کی طرح منہ اٹھائے چلا آتا ہے، میرے نصیب پھوٹ گئے تیرے جیسی اولاد پیدا کر کے۔" ماں رونے لگی، وہ ماں کو روتا چھوڑ کر پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا، شام تک بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا، شام ہوتے ہی شرفو کے ہوٹل پر پہنچ گیا، شاقی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"لے بھئی تیرا کام ہو گیا۔" شاقی نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کے سامنے لہرایا۔ "چل اب فٹافٹ ایک دودھ پتی کا آرڈر دے۔"

مکرانی نے کاغذ کا ٹکڑا جیب میں ڈالتے ہوئے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آنے تک دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ بیرا چائے دے کر چلا گیا تو شاقی، مکرانی کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

"ابے مکرانی! یہ لڑکیوں کے چکر تو چلتے رہتے ہیں لیکن تو نے سوچا اتنے دن ہو گئے ہم نے کوئی لمبا ہاتھ نہیں مارا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔"

"استاد بات تو تمہاری ٹھیک ہے پر ہم کیا کریں؟" مکرانی نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ "ساری جگہ جگہ پولیس گھوم رہی ہے، پکڑے گئے تو مارے جائیں گے۔"

"تم لوگ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو کچھ نہیں ہو گا۔" ان کے قریب سے ایک بھاری بھرکم ... آواز سنائی دی۔ دونوں نے بیک وقت آواز کے ماخذ کی طرف دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا سا آدمی ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر اڑتیس سے چالیس سال کے درمیان رہی ہو گی۔

"تم کون ہو؟" شاقی نے غرا کر پوچھا۔

اس آدمی کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ رینگنے لگی۔

"میں تم دونوں کو خوب جانتا ہوں۔" اس نے تکلف کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔

"وہ کیسے؟" شاقی نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔ اجنبی نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔ "تم دونوں بہت تیز ہو مگر تمہاری منصوبہ بندی ناقص ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" شاقی کو اس کے طرزِ تخاطب سے اُلجھن ہونے لگی تھی۔

"لیکن ایک بات طے ہے تم دونوں جی دار ہو ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہو۔" وہ شاقی کی بات کو پسِ پشت ڈال کر اپنی دھن میں کہتا چلا گیا۔

"دیکھو تمہاری بکواس قطعی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی، صاف صاف بات کرو ورنہ ابھی تمہارا مزاج درست کرتا ہوں۔" شاقی اس کا شانہ جھنجوڑنے لگا۔

"مجھے غلط نہ سمجھو، میں تمہارا دوست ہوں۔" اجنبی نے ملائمت اور حلاوت سے کہا۔ "میرا نام سکندر خان ہے اور میرا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کام بھٹکے ہوئے مسافروں کو منزل تک پہنچانا ہے، سمجھ گئے نا؟'' سکندر نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ ''اس وقت میں تم دونوں سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسا معاہدہ؟'' شاقی نے تحیر آمیز سنجیدگی سے پوچھا۔

''ایسا معاہدہ جو تم دونوں کی زندگیوں میں خوشی کا پیغام لائے گا۔ جو تمہارے دکھوں اور محرومیوں کا خاتمہ کر دے گا۔ لو...... یہ سگریٹ پیو۔'' اس نے ایک اعلیٰ قسم کے سگریٹ کا پیکٹ ان کی طرف بڑھایا جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ پھر خلیق لہجے میں بولا۔ ''آؤ پہلے کسی پارک میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں میں تفصیل سے تم لوگوں کو سمجھاتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

شاقی اور مکرانی نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مکرانی نے آہستگی سے کہا۔ ''چل استاد بات کر لینے میں کیا حرج ہے۔''

وہ دونوں اٹھے اور سکندر خان کے ساتھ پارک کی طرف چل دیے۔

پارک میں لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ سکندر قدرے ویران گوشے میں ایک سنگی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں چپ بیٹھے اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے۔ سکندر ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کر لو۔''

''کام کیا ہے؟'' خالد مکرانی نے پوچھا۔

''دیکھو میں تم لوگوں سے کوئی بھی کام لے سکتا ہوں، بس تم لوگوں سے جو کام کہا جائے، وہ تم کو کرنا ہے۔'' اس نے جیب سے ہزار ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور گود میں رکھ لی۔

روپوں کی جھلک دیکھ کر شاقی اور مکرانی کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

سکندر ان کی کیفیت بھانپتے ہوئے زیر لب مسکرایا اور نوٹوں کی گڈی کو لہراتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں میرے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھر لو، یہ ہزار ہزار کے سو نوٹ تمہارے ہو جائیں گے۔''

مکرانی، سکندر کی آفر سن کر تذبذب میں مبتلا ہو گیا، وہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص اتنی بڑی رقم بطور ایڈوانس دے رہا ہے تو کام بھی یقیناً بڑا اور خطرناک ہوگا۔ وہ جانتا تھا اس طرح کی آفرز کسی نیک کام کے لیے نہیں دی جاتیں۔

''کیا سوچ رہے ہو جوان؟'' مکرانی کی سوچ کا تسلسل سکندر کی آواز سے ٹوٹ گیا۔

''کک...... کک...... کچھ نہیں بس ایسے ہی ایک خیال آ گیا تھا۔'' مکرانی نے مسکرا کر اپنی کیفیت چھپانے کی کوشش کی۔

''شاقی نے اسے آنکھوں سے اشارہ کیا...... پھر سکندر سے کام کی ہامی بھر لی۔''

سکندر نے نوٹوں کی گڈی ان کی طرف بڑھائی۔ ''یہ ایک لاکھ روپے ہیں ایڈوانس کے طور پر رکھ لو۔'' وہ بینچ سے اٹھا اور جانے لگا۔ چند قدم آگے بڑھا پھر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کل دوپہر دو بجے اسی پارک میں ملنا اور یہ ذہن میں رکھو کہ میری نظریں تم دونوں کے تعاقب میں رہیں گی۔'' وہ واپس مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پارک سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

صحرائے چولستان کے تپتے ہوئے ویرانے میں دور دور تک زندگی کے آثار نہیں تھے۔ سوائے ان کھنڈرات کے جو ریت میں دفن دریا کے کنارے اپنی قدامت کا پتا دیتے تھے۔ تا حدِ نگاہ ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

فون پر ناصر یزدانی نے اسے ان کھنڈرات میں بلایا تھا، کیوں بلایا تھا وہ یہ وقت ملاقات بتاتا لیکن جب شاکر علی یہاں پہنچا تو ناصر نہیں تھا۔ کافی وقت گزر گیا، شاکر اپنی فور وہیل جیپ سے اترا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گیا، دور سرکنڈوں سے بنی ہوئی دو جھونپڑیاں نظر آئیں۔ وہ واپس جیپ کے پاس آیا۔ پانی کی بوتل اٹھائی اور جھونپڑیوں کی طرف چل پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے تربتر ہو رہا تھا، بادِ سموم سے اُڑنے والی ریت پسینے کے ساتھ مل کر جسم کے ساتھ چپک گئی تھی، وہ ہانپتا ہوا جھونپڑیوں تک پہنچ گیا، جھونپڑیاں اندر سے خالی تھیں۔ ایک جھونپڑی میں کچے فرش پر قدموں کے نشان تھے۔ اس نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا قریباً پچاس گز دور ایک ٹیلے کے نشیب میں ایک گٹھڑی پر اس کی نظر پڑی جس کے اوپر ایک گدھ منڈلا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ گدھ زمین پر اترتا، گٹھڑی میں خفیف سی حرکت ہوئی، شاکر بھاگ کر وہاں پہنچا اور قریباً دس فٹ پیچھے رک کر اس گٹھڑی کو دیکھنے لگا اوپر منڈلاتے ہوئے گدھ نے دائرے میں چکر لگایا اور ایک طرف پرواز کر گیا۔ وہ ایک انسان تھا جس کے جسم پر لباس نام کی ایک دھجی تک نہیں تھی۔ اس کا چہرہ خون میں تر تھا، جسم پر جا بجا گہرے زخم تھے۔ آنکھوں کے پپوٹے غائب تھے جس سے اس کی آنکھیں مستقل طور پر کھلی ہوئی تھیں اور آسمان کی طرف گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

شاکر علی چند قدم آگے بڑھ گیا جیب سے رومال نکالا

اور پانی سے تر کر کے مضروب کے چہرے پر جما ہوا خون صاف کرنے لگا، خون صاف ہوتے ہی جو چہرہ سامنے آیا، اس نے شاکر کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی، وہ زخم خوردہ چہرہ ناصر یزدانی کا تھا۔ دفعتاً اس کے سینے پر ہلکا سا زیروبم محسوس ہوا سینے کا زیروبم ظاہر کر رہا تھا کہ یزدانی ابھی زندہ ہے۔

یزدانی ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا اور ریت پر قدموں کے نشان دیکھ کر شاکر علی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے اس حالت تک پہنچانے والے ایک سے زیادہ تھے۔ ناصر کی حالت دیکھ کر شاکر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ انتہائی درندگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ جسم کے مختلف حصوں سے گوشت کاٹا گیا تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا اور نچلا ہونٹ سوجا ہوا تھا۔

''ناصر۔'' شاکر نے اُسے آواز دی۔

کوئی جواب نہ پا کر اس نے دوسری مرتبہ پکارا، اس بار ناصر کے بالائی ہونٹ میں حرکت پیدا ہوئی، اس نے شاید کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر حلق سے خرخراہٹ کی آواز خارج ہوئی۔ ''بولو ناصر میں شاکر ہوں...... شاکر علی!'' وہ اس پر جھکتے ہوئے بولا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے تھوڑا سا پانی اس کے حلق میں ٹپکا دیا۔

''شش...... شش...... شاکر!'' ناصر کے لب وا ہوئے۔ ''تت...... تت...... تم نے دیر کر دی آنے میں۔'' درد کی اذیت اس کے بولنے میں دقت پیدا کر رہی تھی، اس کے منہ سے بہت ہلکی آواز نکل رہی تھی۔ شاکر فضا میں منڈلاتے ہوئے گِدھوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ اس پر جھکتے ہوئے بولا۔

''مجھے یہاں پہنچنے میں طے شدہ وقت سے ایک گھنٹے کی تاخیر ہوئی ہے میں تمہیں ڈھونڈتا رہا کیونکہ تمہارا موبائل آف جا رہا تھا، کیا تم بتا سکتے ہو یہ سب کچھ کیسے ہوا؟'' ناصر کے حلق سے ایک بار پھر خرخراہٹ کی سی آواز نکلی، شاکر نے اس کے حلق میں تھوڑا سا پانی ٹپکایا، ناصر نے دور جھونپڑیوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''جھ...... جھ...... جھونپڑ...''

یزدانی آخری لفظ پوری طرح ادا نہیں کر سکا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی، بغیر پپوٹوں کے کھلی ہوئی آنکھیں اب بھی خلا میں گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر اب ان آنکھوں میں زندگی کی چمک معدوم ہو چکی تھی۔ شاکر کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جسم اور روح کا رابطہ ختم ہو چکا ہے۔

شاکر اور یزدانی ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ میٹرک تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی، دونوں ہی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ میٹرک کے بعد دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں، ناصر کے والد پاکستان ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کا تبادلہ ہوا تو وہ دوسرے شہر چلے گئے کچھ دن بعد بچوں کو بھی بلوا لیا یوں دونوں دوست ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور کئی سال تک رابطہ نہیں رہا ایک سال قبل اتفاقیہ ملاقات نے دونوں کو پھر سے ملا دیا، ناصر کے والد اور والدہ یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے تھے، وہ تنہا رہ گیا۔ ایک معروف اخبار میں بطور صحافی اپنی صحافتی ذمے داریاں نبھا رہا تھا اور اس کے کالم اس کی شہرت میں اضافہ کر رہے تھے جب کہ شاکر نے گریجویشن کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے والد کا بزنس سنبھال لیا تھا، دونوں عملی زندگی میں اپنے اپنے مقام پر خوب پھل پھول رہے تھے۔

وہ تا دیر غم و غصے کی کیفیت میں اپنی مٹھیاں بھینچتا رہا۔ اس کی زخم خوردہ لاش دیکھ کر شاکر کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ سب سے پیار کرنے والا انسان یوں درندگی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا یہ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھا۔ ناصر کی خون سے تر لاش کاندھے پر لادی اور جیپ کی طرف چل پڑا، وہ ایک پوٹھوہار ماڈل کی جیپ تھی۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا اس نے راستے میں ثانیہ کو کال کر کے مختصراً صورتِ حال بتائی اور تاکید کی کہ فی الحال اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ ثانیہ نے شاکر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو اور جہاں میری ضرورت محسوس ہو مجھے ضرور بتانا اور اپنا خیال رکھنا۔''

''ٹھیک ہے تم بھی اپنا خیال رکھنا۔'' شاکر نے کال ڈراپ کر دی۔ اس کے ذہن میں مختلف سوالات سنپولیے کی طرح کلبلا رہے تھے۔

اتنا تو پتا تھا کہ ناصر چولستان کے باسیوں پر ایک فیچر لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن آخر اس کا ایسا کون سا دشمن تھا جو اس تپتے ریگزار میں ناصر کو درندگی کے ساتھ قتل کر گیا تھا۔ اور جھونپڑیوں کی طرف ناصر اشارہ کر کے کیا بتانا چاہتا تھا۔ ایسے کئی سوال شاکر کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ تاہم شہر پہنچ کر اس نے یزدانی کی لاش ایک ٹرسٹ کے سرد خانے میں رکھوا دی۔ سورج اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا، دوپہر سہ پہر میں ڈھل گئی۔ شاکر سب سے پہلے ناصر کے اخبار کے دفتر گیا، ایڈیٹر اپنے آفس میں موجود تھا۔

''جی فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

ایڈیٹر عدنان زبیری نے شاکر کی طرف سوالیہ نظروں سے

دیکھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”پلیز بیٹھیے۔“ وہ ایک کیم شحیم اور قوی الجثہ آدمی تھا۔

”جی بہت شکریہ۔“ شاکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے شاکر علی کہتے ہیں، میں ناصر یزدانی کا قریبی دوست ہوں۔“

”اوہ! اچھا تو آپ شاکر علی ہیں۔“ زبیری نے کھڑے ہو کر ایک بار پھر اس سے مصافحہ کیا ”ناصر اکثر آپ کا ذکر کرتا رہتا ہے، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، کیا لیں گے آپ چائے یا ٹھنڈا۔“ اس نے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”بہت شکریہ جی! مجھے اس وقت آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ شاکر نے اپنا حوصلہ مجتمع کیا۔

”جی ضرور شاکر صاحب! آپ بولیں۔“ زبیری سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

شاکر کچھ دیر اُسے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ”زبیری صاحب مجھے بہت افسوس کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ آپ کے اخبار کا معروف کالم نگار ناصر یزدانی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“ شاکر کے لہجے میں صدیوں کا کرب شامل تھا۔

”وہاٹ؟“ عدنان زبیری اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ ”او مائی گاڈ! شاکر صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنا سر پکڑ لیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں زبیری صاحب!“

پھر شاکر نے زبیری کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

وہ کافی دیر صدمے کی کیفیت میں بیٹھا رہا پھر حواس بحال ہونے کے بعد تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ ”بہت افسوس ناک خبر ہے۔ ناصر ہمارے اخبار کا ایک ایکٹو ورکر تھا اور اس سے بڑھ کر بہت اچھا انسان، یہ کیسے ہو گیا؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

وہ بے یقینی کی کیفیت میں بولتا رہا۔

”زبیری صاحب! اس حوالے سے اب کیا کیا جائے؟“ شاکر نے پوچھا۔

زبیری کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”اس حوالے سے ضرور کچھ کرتے ہیں۔ ناصر کا قتل ہو جانا معمولی بات نہیں ہے، کیا آپ نے پولیس سے رابطہ کیا؟“ پھر کسی سے موبائل فون پر بات کرنے لگا۔

”میں سب سے پہلے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ شاکر نے کہا۔ ”اور میں چاہتا ہوں فی الحال پولیس کو یہ بات نہ بتائی جائے کیونکہ پولیس کی کارروائی سے قاتل چوکنے ہو جائیں گے۔“

”آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ زبیری نے شاکر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں قاتلوں تک پہنچنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ میری مدد کریں۔“ شاکر نے اسے مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

زبیری نے کہا۔ ”میں ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن!“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر میز پر جھکتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہمیں پولیس کو ناصر کے قتل کی بابت آگاہ کرنا پڑے گا۔ یہ قتل کا معاملہ ہے۔ ویسے بھی زیادہ دن تک یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ ناصر کے کالمز اور آرٹیکلز پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ چند دن بعد ہی قارئین کے فون آنا شروع ہو جائیں گے۔ ناصر کے کالمز کی عدم اشاعت پر، لہٰذا پولیس کو بتانا بہت ضروری ہے، پولیس اپنا کام کرتی رہے گی ہم اپنا کام کرتے رہیں گے، کیا خیال ہے؟“ زبیری نے بات ختم کرتے ہوئے شاکر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں، کریں۔“ شاکر، زبیری کی وضاحت سے مطمئن ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے میرے ایک ایس پی سے بہت اچھے تعلقات ہیں میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ زبیری نے کہا۔ ”ان شاء اللہ اچھے نتائج برآمد ہوں، آپ بے فکر رہیں اور آج ناصر کی تدفین بھی کروا دیں گے۔“

”بہت شکریہ زبیری صاحب۔ میں آپ کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔“ زبیری سے ہاتھ ملا کر وہ باہر نکل آیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے شہر کے مرکز کی طرف موڑ لی۔ چند گز دور ایک گرے کلر کی کار گلی کے موڑ سے نمودار ہوئی اور شاکر کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

بوائز اسکول کی بس ایک سگنل پر رکی تو کھلے ہوئے گیٹ سے ایک فقیر بس پر سوار ہو گیا۔ وہ سکندر تھا۔ ”اللہ کے نام پہ پانچ روپے دے دو بابا۔“ اس نے ڈرائیور کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیا۔ جتنی دیر میں کلینر اسے اتارتا، سگنل کھل گیا اور بس چل پڑی، سگنل کراس کر کے ڈرائیور نے بریک لگایا ہی تھا کہ سکندر نے گدڑی میں ہاتھ ڈالا اور ایک پسٹل نکال کر ڈرائیور پر تان لیا۔ ”خبردار کوئی چالاکی مت کرنا، خاموشی سے گاڑی آگے بڑھاتے رہو ورنہ اس پسٹل کی ساری

گولیاں تمہارے سر میں اتار دوں گا اور تمہارے ساتھ یہ بچے بھی موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔"

پسٹل دیکھ کر بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ "خاموش!" سکندر خان دہاڑا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بچوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بچے سہم کر چپ ہو گئے، وہ چوکنا ہو کر ڈرائیور پر پسٹل تانے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈرائیور کو انگلی سے ٹہوکا دیا۔ "گاڑی شہر سے باہر لے چلو۔" ڈرائیور نے گاڑی شہر سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دی۔

جب شہر دور رہ گیا، تو سکندر نے بس ایک کچی سڑک پر موڑنے کو کہا، کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی بس ایک ویران جگہ پر رک گئی۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا سامنے ایک کھال بہہ رہا تھا۔ "چلو سب ہاتھ اٹھا کر بس سے نیچے اترو۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

تمام بچے ایک ایک کر کے اتر گئے وہ ڈیڑھ درجن کے قریب بچے تھے۔ اس نے ڈرائیور اور کلینر کو بھی نیچے اترنے کا حکم دیا اور خود بھی بس سے اتر آیا۔ گدڑی میں ہاتھ ڈال کر اس نے سوت کی پتلی رسیاں نکالیں جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل تھیں۔ گدڑی کاندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ کر کلینر اور ڈرائیور کو اشارے سے بلایا۔ دونوں نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا پھر ڈرتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔

"یہ رسیاں اٹھا کر ان سب بچوں کے پیچھے سے ہاتھ باندھ دو۔" اس نے رسیاں زمین پر پھینک دیں۔ "ہری اپ، جلدی کرو۔" اس کے انداز میں تحکم پایا جاتا تھا۔ وہ ان سب کو پسٹل کی زد میں رکھتے ہوئے الٹے قدموں چلتا ہوا تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب تمام بچوں کے ہاتھ باندھ دیے گئے تو اس نے کلینر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ڈرائیور کے ہاتھ باندھ دو۔" کلینر کے ہاتھ اس نے خود باندھ دیے، اسی دوران دھول اُڑاتی ہوئی ایک سفید رنگ کی ہائی روف کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی، دو افراد ہائی روف سے اترے اور مستعدی سے سکندر کے پاس پہنچ گئے۔ وہ دونوں اشفاق شاقی اور خالد مکرانی تھے۔ ان دونوں نے شرٹس کے نیچے سے جرمن ساختہ پسٹل نکالے اور دست بستہ افراد پر تان لیے۔

"شاقی! ان میں سے اپنے مطلب کے چند بچے منتخب کرلو۔" سکندر نے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے تولتی ہوئی نگاہوں سے ایک ایک بچے کو دیکھنا شروع کیا جیسے قسائی قربانی کے جانور کو دیکھتا ہے، دس سے بارہ سال کے چند بچوں کو الگ کیا اور انہیں ہائی روف کی طرف لے جانے لگا۔ بچوں کے چہرے پیلے زرد پڑ گئے۔ باقی... بچے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ شاقی نے منتخب کردہ بچوں کو ہائی روف میں ٹھونسا اور ان کے منہ پر ٹیپ چپکانے کے بعد ہائی روف اسٹارٹ کی اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اس کے ساتھی بھاگ کر وہاں پہنچے، ان کے بیٹھتے ہی شاقی نے ایکسیلریٹر پر دباؤ ڈالا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ "کہاں چلنا ہے سکندر خان؟" شاقی نے ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

سکندر نے ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا، ایک گہرا کش لے کر شاقی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی ہم احسان گڑھ جا رہے ہیں، وہاں ایک پارٹی ہماری منتظر ہے۔ ہم بچے ان کے حوالے کریں گے اور اپنے دام کھرے کر کے واپس آ جائیں گے، اس کے بعد ہمارا کام ختم ہو جائے گا۔ تو ذرا گاڑی تیز چلا اس سے پہلے کہ بچوں کے اغوا کی خبر میڈیا تک پہنچے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے جا رہی تھی۔ بچے سہمے بیٹھے تھے۔

ان کی معصوم آنکھوں میں خوف و ہراس کے گہرے سائے تھے۔ گاڑی کی رفتار میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کے ازدحام میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس گاڑی میں نہ جانے کتنے ماں باپ کے ارمان رو رہے ہیں۔ سسک رہے ہیں، دفعتاً گاڑی کو جھٹکے لگنے لگے۔

"اوہ شٹ۔ لگتا ہے فیول ختم ہو رہا ہے۔" شاقی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"تم سے یہی امید تھی گدھے کے بچے۔" سکندر غرا کر بولا۔ "کوئی کام تو ڈھنگ سے کرلیا کرو۔"

دم بہ دم اس کے غصے کا گراف بڑھ رہا تھا۔ اس کی سلگتی ہوئی خونخوار آنکھیں شاقی پر مرتکز تھیں یوں کہ جیسے وہ اسے کھا جائے گا۔

شاقی بولا۔ "ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود ٹینک فل کروایا تھا۔"

"اچھا تو پھر میں.... پی گیا ہوں گا۔" وہ پستول نکالتے ہوئے بولا۔ شاقی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ جھٹکے مسلسل لگ رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ "لگتا ہے فیول میں کچرا ہے۔" شاقی نے امکان ظاہر کیا۔ "امید ہے کچھ دیر میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" سکندر محض اسے گھور کر رہ گیا۔

"اسکول بس ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔" مکرانی نے

گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ سکندر نے بیک ویو مرر سے دیکھا۔ اسکول بس تیزی سے ان کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔

''ہم نے ڈرائیور اور کلینرز کے موبائل فون چھین لیے تھے۔'' سکندر بولا۔ ''انہوں نے کسی کو نہیں بتایا ہوگا لیکن وہ ہمارے پیچھے کیوں آرہے ہیں؟''

''اب کیا ارادہ ہے۔'' شاقی نے پوچھا۔ سکندر کی عقابی نگاہیں چاروں اطراف دیکھ رہی تھیں۔ اب وہ قدرے غیر آباد مقام سے گزر رہے تھے۔ آس پاس اِکا دُکا گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ سڑک کے دائیں جانب کماد کے گھنے کھیت نظر آرہے تھے۔ اس کی مکروہ آنکھوں میں چمک سی عود کر آئی۔

''گاڑی یہیں روک دو اور اندر ہی بیٹھے رہو۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ شاقی نے فوراً تعمیل کی۔ وین ایک جھٹکے سے سڑک کے کنارے رک گئی۔

اسی اثنا میں بس ان کے عقب میں پہنچ گئی۔

''نیچے اترو۔'' وہ مکرانی سے مخاطب ہوا اور خود بھی متحرک ہوگیا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں بس کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے لوڈڈ پستول موت اگلنے کے لیے بیتاب تھے۔ شاقی بچوں کی نگرانی پر مامور تھا۔

بس میں اب کوئی بچہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ڈرائیور چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور سکندر کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

''کیا تکلیف ہے اب پیچھا کیوں کر رہے ہو گدھے کہیں کے، پیسے تو تمہیں کل ہی مل گئے تھے؟''

''وہ...... وہ صاب جی!'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں گھگیایا۔ ''وہ جی جلدی میں آپ میرا بچہ بھی لے آئے ہیں جبکہ یہ طے نہیں ہوا تھا۔''

''اب جو ہوا سو ہوا۔'' وہ سرد لہجے میں پھنکار کر بولا۔ ''تمہارے بچے کی طرح یہ بھی کسی کے بچے ہیں۔ اب چلتے بنو۔''

''صاب جی رحم کریں۔'' وہ رونے لگا۔ ''میرا ایک ہی بچہ ہے۔ میری بیوی مرجائے گی۔''

''بچوں کو اسکول بس میں لاؤ۔'' وہ شاقی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور تم اس وین کا ٹائر کھولنے بیٹھ جاؤ صرف دکھاوا کرنا ہے۔ کھولنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے بس ڈرائیور سے کہا۔

''وہ صاب جی وہ!'' ڈرائیور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ کلینر اُلجھی ہوئی نظروں سے سکندر اور ڈرائیور کو دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ نہایت پھرتی سے مغوی بچوں کو دوبارہ اسکول بس میں منتقل کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ان کے ہاتھ اور منہ کھول دیے گئے۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں بچو!'' مکرانی نے مکاری سے کہا۔ ''ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں۔ جاؤ اپنی بس میں بیٹھ جاؤ۔'' یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ بچے مطمئن ہو کر اسکول بس میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ مکرانی نے سنبھال لی۔ مزید چند کلومیٹرز طے کرنے کے بعد ڈرائیور اور کلینرز کو بے آواز گولیوں سے ابدی نیند سلا دیا گیا۔ بچوں کے رنگ ہلدی کی طرح ہورہے تھے۔ انہوں نے چیخنا چلانا چاہا لیکن پستول کی مہیب نال دیکھ کر سہم گئے۔ ایک ویران علاقے میں دونوں لاشوں کو پھینک دیا گیا۔ سکندر کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسکول بس برق رفتاری سے احسان گڑھ کی جانب گامزن تھی۔

☆☆☆

شاکر علی نے فلک ہائٹس کے پارکنگ ایریا میں جیپ پارک کی اور جیپ سے اتر کر تانیہ کے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ تعاقب کرنے والی گرے کلر کی کار سے درمیانی عمر کا ایک شخص اترا اس کے ہاتھ میں کسی انعامی اسکیم کے پمفلٹس کا بنڈل تھا۔ وہ ٹہلنے کے سے انداز میں شاکر کے پیچھے گیا۔ شاکر بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک فلیٹ کے سامنے رک کر ڈور بیل کا بٹن دبانے لگا تعاقب کرنے والے شخص نے کن انکھیوں سے فلیٹ نمبر پر نظر ڈالی اور بظاہر بے نیازی سے چلتا ہوا پارکنگ ایریا کی طرف آیا اور وہاں کھڑی گاڑیوں کے وائپرز کے نیچے ایک ایک پمفلٹ اُڑسنے لگا۔ شاکر کی جیپ کے قریب پہنچ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور بال پین نکال کر ایک پمفلٹ پر جیپ کا اور فلیٹ کا نمبر نوٹ کر لیا۔ نمبر نوٹ کر کے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، لوگ آجا رہے تھے مگر کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے پمفلٹ تہ کر کے پتلون کی جیب میں ڈالا اور بہ عجلت وہاں سے روانہ ہوگیا۔

شاکر اور تانیہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ تانیہ کی ماں کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ شاکر نے تفصیل کے ساتھ تانیہ کو یزدانی کے بہیمانہ قتل کے بارے میں بتایا تو وہ سکتے کی کیفیت میں آگئی۔ وہ چوبیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ شاکر سے اس کی ملاقات پینٹنگز کی ایک نمائش میں ہوئی تھی جو بعد ازاں بڑھ کر دوستی اور پھر محبت میں بدل گئی۔

کافی دیر بعد تانیہ کا سکتہ ٹوٹا تو اس نے شاکر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

شاکر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''آج شام کو ناصر کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تدفین ہو جائے گی۔ کل سے میں اس کے قاتلوں کی تلاش میں نکلوں گا، میں اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے صرف اور صرف ناصر کے قاتلوں کو تلاش کروں گا۔"

"تمہارے خیال میں ناصر کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟" تانیہ نے ماں کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے لیتے ہوئے ایک کپ اٹھا کر شاکر کو دیتے ہوئے پوچھا۔

"میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ناصر کا ایسا کون سا دشمن ہے جس نے انتہائی درندگی کے ساتھ اسے قتل کر دیا اور وہ بھی اس تپتے ویرانے میں۔" شاکر نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا، اس نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"تانیہ مجھے ایک بندے پر شک ہے۔" اس نے تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس بندے پر شک ہے؟" تانیہ نے تحیّر زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم نے ہاشم داد خان کا نام سنا ہے؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے تانیہ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "ہاشم داد خان جو سیاست دان ہے؟"

"ہاں وہی ہے۔" ناصر نے ٹھنڈی ہوتی ہوئی چائے کا کپ اٹھا کر باقی کی چائے پی اور کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے بولا۔ "چھ ماہ قبل ناصر نے اپنے ایک کالم میں ہاشم داد خان کو ایک کرپٹ سیاست دان ظاہر کیا تھا اور اس کے خلاف ثبوت بھی اپنے اخبار کو مہیا کیے تھے۔ کچھ دن بعد ہاشم داد خان کی طرف سے ناصر کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں۔" شاکر کچھ دیر سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے پورا یقین ہے ناصر کے قتل میں ہاشم داد خان کا ہاتھ ہے۔"

شاکر نے بات مکمل کی ہی تھی کہ اس کے موبائل فون کی بیل بجی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا، اس کے والد شیخ باقر علی کی کال تھی۔

کال ریسیو کر کے اس نے سلام کیا اور دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ "جی ٹھیک ہے بابا آپ چلے جائیں، جی اچھا، جی ٹھیک ہے میں جلدی گھر چلا جاؤں گا۔" اس نے خدا حافظ کہہ کر کال ڈراپ کر دی۔

"کیا کہہ رہے تھے انکل؟" تانیہ نے پوچھا۔

"امی اور ابو چھوٹی بہن کے پاس آسٹریلیا جا رہے ہیں۔ وہ کافی دن سے سیٹوں کی بکنگ کروانا چاہ رہے تھے لیکن کسی فلائٹ میں فوری طور پر سیٹیں نہیں مل رہی تھیں آج اچانک سیٹیں کنفرم ہو گئی ہیں۔" شاکر نے بتایا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم اپنا خیال رکھنا۔ اپنا موبائل فون آن رکھ کر مجھ سے رابطے میں رہنا۔" اس نے تانیہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تانیہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"تم بھی اپنا خیال رکھنا اور جو بھی قدم اٹھانا سوچ سمجھ کر اٹھانا۔"

شاکر فلیٹ سے نکل کر جیپ میں بیٹھا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا ارادہ ہاشم داد خان کی طرف جانے کا تھا۔ اس نے گاڑی میں لگی گھڑی میں وقت دیکھا شام کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ ہاشم داد خان کے پاس جانے کا وقت نہیں تھا۔ چھ بجے ناصر یزدانی کی تدفین تھی لہٰذا اس نے گاڑی زبیری کے دفتر کی طرف موڑ لی۔

زبیری نے تمام انتظامات سے متعلق شاکر کو آگاہ کر دیا۔ ناصر یزدانی کی میّت سرد خانے سے منگوا کر سپردِ خاک کر دی گئی۔

شاکر نے ناصر کے قتل کی تحقیقات کے بارے میں زبیری سے کچھ دیر بات کی اور گھر آ گیا۔

اس کے ماں باپ اس کی بہن کے پاس آسٹریلیا جا چکے تھے۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ وہاں چلے جائیں کیونکہ ان کی موجودگی ان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔

اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور مگ لے کر گھر کی لائبریری میں آ گیا اور ناصر کے قتل کے محرکات پر غور کرنے لگا۔

وہ رات شاکر نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح دم اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ ڈور بیل کی آواز سے پھر کھل گئی۔ وہ چند لمحے یونہی لیٹا رہا ڈور بیل کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

وہ اٹھ کر دروازے پر گیا اس نے کی ہول سے جھانک کر دیکھا سوٹڈ بوٹڈ کلین شیو ایک شخص ایک چرمی بیگ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ شاکر نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس سے تیس سال تک ہوگی۔

شاکر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر دروازہ کھول کر اس شخص کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"السلام علیکم! مجھے سلمان پاشا کہتے ہیں۔" اس شخص نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ شاکر علی ہیں ناں؟"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''وعلیکم السلام جی میں ہی شاکر علی ہوں۔'' اس نے مصافحہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟''

وہ شخص شاکر علی کے قریب ہو کر اپنا سروس کارڈ دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میں باغبان تھانے کا ایس ایچ او ہوں۔''

شاکر ایک دم سے چونکا پھر اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے دروازے سے ایک طرف ہو گیا۔ ''آئیں ایس ایچ او صاحب اندر آجائیں۔'' ایس ایچ او سلمان پاشا نے چرمی بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور اندر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

شاکر نے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''جی پاشا صاحب، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

سلمان پاشا چند لمحے سوچتی ہوئی نگاہوں سے غیر مرئی چیز کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''شاکر علی، آپ یہاں میری آمد کا مقصد جان گئے ہوں گے لہٰذا بلاتمہید آپ کو چند سوالات کے جواب دینے کی زحمت دوں گا۔''

''جی ضرور۔'' شاکر نے مختصراً کہا۔

''آپ ناصر یزدانی کو کب سے جانتے ہیں؟''

''بچپن سے۔'' شاکر علی نے جواب دیا۔

''ناصر یزدانی کی کوئی ایسی عادت جس پر آپ اُسے روکتے ہوں؟'' پاشا نے دوسرا سوال کیا۔

''اس کی مہم جوئی کی عادت مجھے پسند تو تھی لیکن بلاخوف خطرات میں کود پڑنے والی عادت پر میں اسے روکتا تھا۔'' شاکر نے بتایا۔

''ہمم۔'' پاشا کچھ دیر چپ رہا پھر شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میری معلومات کے مطابق جائے وقوعہ سے اس کی لاش آپ لائے تھے۔ لاش اٹھانے سے پہلے آپ نے فوراً پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی؟''

''دیکھیں پاشا صاحب......!'' وہاں صحرا میں سخت گرمی تھی، ناصر کی لاش ریت میں جھلس رہی تھی۔ میں پولیس کو اطلاع دیتا تو وہ علاقہ شہر سے اتنا دور ہے کہ پولیس کم از کم وہاں دو گھنٹے بعد پہنچتی اتنی دیر میں لاش سے تعفن اٹھنے لگتا۔

''میں نے شہر پہنچ کر لاش ایک ٹرسٹ کے سرد خانے میں رکھوا دی اور جس اخبار میں ناصر کام کرتا تھا اس کے ایڈیٹر کو تفصیل بتا دی تھی۔'' شاکر نے وضاحت سے بتایا۔

سلمان پاشا...... شاکر علی کو کچھ دیر تولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

''شاکر صاحب آپ کی ایک دوست ثانیہ نامی لڑکی کو ناصر یزدانی جانتا تھا؟'' پاشا نے اچانک غیر متوقع سوال کر دیا۔

شاکر، ثانیہ کے نام پر چونک گیا تاہم پاشا سے وہ اپنی کیفیت چھپانے میں کامیاب رہا۔

''جی ناصر جانتا تھا ثانیہ کو، ہم کئی بار ایک ساتھ ملے بھی تھے۔''

سلمان پاشا نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو ناصر کے قتل میں کن لوگوں پر شبہ ہے؟''

شاکر نے ہاشم داد کے حوالے سے اپنے شبے کا اظہار کیا اور ناصر کے قتل کے محرکات بھی بتا دیے۔

''بہت شکریہ شاکر علی صاحب......!'' پاشا مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اگر ناصر کے قتل کی کوئی اور وجہ سامنے آئے تو ضرور بتائیے گا۔''

شاکر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''جی پاشا صاحب ضرور بتاؤں گا۔''

''اللہ حافظ۔'' پاشا وہاں سے رخصت ہونے لگا۔ دو قدم چل کر رکا پھر پیچھے مڑ کر بولا۔

''امید ہے آپ شہر سے باہر کہیں جاتے وقت پولیس اسٹیشن میں اطلاع ضرور دیں گے۔'' پاشا اپنی بات مکمل کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

پاشا کے رخصت ہونے کے بعد کئی سوال شاکر علی کے ذہن کو کن کھجوروں کی طرح اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔

پاشا نے ثانیہ اور ناصر کی واقفیت کے حوالے سے کیا تاثر دینے کی کوشش کی تھی؟ اور شہر سے باہر جانے پر تھانے اطلاع دینے کا کیا مطلب تھا؟

شاکر علی کا سارا دن ناصر کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے کی منصوبہ بندی میں گزر گیا۔

☆☆☆

دوپہر سہ پہر میں ڈھل چکی تھی۔ احسان گڑھ کے آثار نظر آتے ہی سکندر خان نے خالد مکرانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''گاڑی دائیں طرف کچی سڑک پر موڑ لو اور آگے چل کر جڑواں ٹیلوں کے پاس روک لینا۔''

مکرانی نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے گاڑی جڑواں ٹیلوں کے پاس روک دی۔ کچی سڑک سے یہ جگہ اوجھل تھی اور آگے تاحدِ نگاہ ریت کے ٹیلے نظر آتے تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سکندر نے موبائل فون جیب سے نکالا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔

''ہم احسان گڑھ کے شروع میں جڑواں ٹیلوں کے پاس کھڑے ہیں۔'' ''مال'' لے جاؤ اور دام دے جاؤ، اور ہاں ساتھ کوئی ایکسٹرا گاڑی بھی لے آنا۔''

وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ اچانک اس کے چہرے پر غصے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ تاہم اس نے اپنا لہجہ معتدل رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسکول بس میں نہیں گھوم سکتے اس میں ہم سب کے لیے خطرہ ہے۔ میڈیا پر بچوں کے اغوا کی خبر چل گئی ہوگی جتنی جلدی ہو سکے پہنچو......!''

اس نے کال ڈراپ کر کے موبائل فون جیب میں ڈالا اور سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

بچوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ان کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے تھے۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ کچھ دیر بعد دھول اُڑاتی ہوئی دو گاڑیاں ان کے قریب آکر رک گئیں۔

تین آدمی کار اور تین ہائی ایس سے باہر نکلے۔ وہ چھ کے چھ مسلح تھے۔ ان کے چہروں سے خونخواری جھلکتی تھی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص باہر نہیں نکلا، وہ ادھیڑ عمر تھا اور اس کے چہرے پر درشتی کے آثار تھے۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔

اس نے اشارے سے سکندر کو اپنے پاس بلایا۔

سکندر چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے پچھلی سیٹ اوپر اٹھا کر خفیہ خانے سے ایک بریف کیس نکالا اور سکندر کی گود میں رکھ دیا۔ اس کا نام تو کوئی اور تھا لیکن کالے دھندوں میں اسے چیف کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ وہ زیادہ تر زیر زمین ہی رہتا تھا۔ اس کے کام اس کے کارندے ہی کرتے تھے۔ تاہم خاص قسم کے لین دین کے لیے وہ خود آتا تھا۔

''پورے بیس لاکھ روپے ہیں۔ چار لاکھ روپے فی کس کے حساب سے گن لو۔'' چیف نے کھردرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

سکندر نے بریف کیس کھول کر دیکھا، ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کی بیس گڈیاں اوپر تلے رکھی تھیں۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور بریف کیس بند کر دیا۔

چیف نے چند گز دور کھڑے خالد مکرانی اور اشفاق شاقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کارٹون کہاں سے پکڑ لائے ہو؟''

''یہ بڑے کام کے پرزے ہیں چیف صاحب!'' سکندر بولا۔ ''ان سے بڑے کام لینے ہیں۔''

چیف نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات یاد رکھو سکندر خان! چھوٹے موٹے ٹٹ پونجیوں کو قربانی کے بکرے سے زیادہ اہمیت مت دیا کرو ورنہ یہ سر پر بیٹھ کر سر کو طبلے کی طرح بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگلے ٹاسک کے بعد انہیں ''ضائع'' کر دینا اور یہ گاڑی لے جاؤ شہر میں غریب آباد کے فلائی اوور کی پارکنگ کے پاس رک کر انتظار کرنا وہاں کالے کوٹ اور سرخ ٹائی والا ایک آدمی تم سے گاڑی لے جائے گا۔'' بات مکمل کر کے وہ گاڑی سے اتر گیا۔

سکندر بھی گاڑی سے اتر کر مکرانی اور شاقی کو اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

وہ جب گاڑی میں بیٹھ چکے تو سکندر خان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پکی سڑک کی طرف موڑ لی۔

☆☆☆

قیامِ پاکستان سے قبل ریاست کے ایک نواب نے وہ جھیل دریافت کی تھی۔ وہ قدرتی جھیل تھی جو ارضیاتی تغیر کے باعث وجود میں آئی تھی۔ ایک دن نواب شکار کی غرض سے وہاں آنکلا جب اس نے سرکنڈوں میں گھری اتنی بڑی جھیل دیکھی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہاں مرغابیوں کے غول کے غول اترتے تھے۔ چونکہ وہ جھیل نواب کی جاگیر میں تھی اس لیے اس نے جھیل سے قدرے ہٹ کر ایک ریسٹ ہاؤس تعمیر کروایا اور اسے اپنا مسکن بنا لیا۔

وہ بھی اکتوبر کی ایک خوشگوار صبح کا آغاز تھا، ان دنوں جھیل کا پانی کناروں تک آجاتا ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ پارک میں معمول سے زیادہ رش تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے اردگرد کے علاقوں کے تمام لوگ پارک میں امڈ آئے ہوں۔ بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ پلے لینڈ کی طرف کچھ بچے جھولا جھول رہے تھے۔ کچھ پکڑن پکڑائی کھیل رہے تھے۔ اور کچھ پھسلن پر پھسل کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے والدین انہیں کھیلتا دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

اچانک ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ بہت سے لوگوں نے چیخ کے ماخذ کی طرف دیکھا۔ ایک جواں سال لڑکی جھیل کے پاس کھڑی چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنے پاس بلا رہی تھی۔

کئی لوگ اٹھ کر اس کے پاس بھاگے۔

''میرا بھائی جھیل میں ڈوب گیا ہے۔'' اس نے روتے ہوئے جھیل کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے نظریں اٹھا کر اس

طرف دیکھا جہاں پانی کے بلبلے اٹھ رہے تھے۔

ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا۔ ”یہ جھیل بہت گہری ہے آپ نے اسے اس طرف آنے کیوں دیا؟“

”مجھے نہیں معلوم کیسے آیا۔“ لڑکی روتے ہوئے بولی۔

”کچھ دیر پہلے وہ جھولا جھول رہا تھا۔ میں اس وقت چائے پی رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اچانک جھیل کی طرف میری نظر پڑی تو وہ کنارے پر کھڑا تھا۔ میں اسے واپس لانے کے لیے بھاگی تو وہ کنارے پر ایک طرف بھاگا اس کا پاؤں پھسلا اور وہ جھیل میں گر گیا...... ہائے میرا بھائی...... میرا ایک ہی بھائی تھا۔ بچاؤ اسے پلیز میرے بھائی کو بچالو۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بچے اپنی دُھن میں کھیل رہے تھے۔ جب تمام لوگ بشمول پارک کی انتظامیہ جھیل کی طرف چلے گئے تو اسی دوران ہجوم میں سے چند لڑکے نکلے اور مختلف سمتوں کی طرف بڑھ گئے جہاں ایک ایک بچہ کھیل رہا تھا۔ انہوں نے جیب سے کلوروفارم میں بسے رومال نکالے اور بچوں کے منہ پر رکھ کر انہیں اٹھا کر گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

ادھر سب لوگ جھیل میں ڈوبنے والے بچے پر افسوس کر رہے تھے۔ تین آدمی جھیل میں اترے اور ناکام ہو کر واپس آگئے۔ لڑکی کی رو رو کر حالت غیر ہو رہی تھی۔

اچانک پیچھے سے ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔ ”میرا بچہ کہاں ہے؟“

سب لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے بچوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نسوانی آواز سنائی دی میرا بھی بچہ نہیں ہے۔ اچانک بھگدڑ مچ گئی سب لوگ جھیل میں ڈوب جانے والے بچے کو بھول کر اپنے اپنے بچوں کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ افراتفری کا عالم تھا جواں سال لڑکی کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی، وہ تیزی سے چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ گیٹ پر نیلے رنگ کی ہنڈا کار اس کی منتظر تھی۔ وہ جلدی سے کار میں بیٹھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کھردرے چہرے والے شخص نے ایک دم سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

ملک کے تمام نیوز چینلز پر ایک ہی خبر بار بار چل رہی تھی۔

ٹی وی اسکرین پر نیوز کاسٹر کا چہرہ نمودار ہوا۔ ”جنوبی علاقے کی جھیل پارک سے کئی بچے اغوا اور ایک بچہ جھیل میں ڈوب گیا۔ ذرائع کے مطابق مغویوں کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہے جب کہ جھیل میں ڈوب جانے والا بچہ تاحال نہیں مل سکا۔ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں نے جھیل اور پارک کے داخلی اور خارجی راستوں پر ناکا بندی کر رکھی ہے۔“

اسکرین پر پارک کا منظر بار بار دکھایا جا رہا تھا۔ والدین اپنے بچوں کی تلاش میں پولیس سے مدد کی اپیل کر رہے تھے۔ تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہان کے مذمتی بیانات کی ویڈیوز وقفے وقفے سے دکھائی جا رہی تھیں۔

شاکر علی ٹی وی بند کر کے اور لائٹ بجھا کر ٹہلنے لگا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے بیڈ پر بیٹھ جاتا پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ باہر رات خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کئی سوال ذہن کے پردے پر نمودار ہوتے پھر گڈمڈ ہو جاتے۔ وہ ان وارداتوں کی کڑیاں ملانے لگا۔ اسے اس بات کا پختہ یقین تھا کہ ناصر یزدانی کے قتل میں ہاشم داود خان کا ہاتھ تھا۔

ناصر کا قتل اور بچوں کا اغوا چولستان کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو یقیناً معصوم بچوں کے اغوا میں بھی اس کا ہاتھ ہو گا۔ اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

پھر ذہن سلمان پاشا کے معنی خیز سوالوں کی طرف چلا گیا۔ بیڈ پر لیٹ کر اس نے آنکھیں موند لیں اور ان سوالوں کی معنویت پر غور کرنے لگا۔

لمحہ بہ لمحہ سرکتی رات کا سناٹا ایک کھٹکے کی آواز سے درہم برہم ہو گیا۔ شاکر علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ”کون ہے؟“ اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہاں کوئی نہیں تھا۔ رات کا گہرا سناٹا اور کھڑکی سے جھانکتا ہوا اندھیرا...... وہ تیزی سے اٹھا اور کمرے کی ساری کھڑکیاں غور سے دیکھنے لگا۔ سب کی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔

گھر میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

”چوکیدار سے کتنی بار کہا ہے زیرو پاور کے بلب جلتے رہنے دیا کرو۔“ اس نے غصے کے ساتھ سوچا۔

وہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کا ہاتھ سیڑھیوں کی ریلنگ پر پڑا۔ اگلے ہی لمحے وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔ اچانک ایک کھڑکی سے اسے باہر لان دکھائی دیا۔ لان بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ اسے رات کا سناٹا کچھ زیادہ ہی گہرا معلوم ہو رہا تھا۔ نیچے اتر کر وہ سب سے پہلے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ چند لمحے ٹٹولنے کے بعد اس کا ہاتھ سوئچ بورڈ پر پڑا۔ اس نے

بیک وقت تمام سوئچ آن کردیے۔ مگر کچھ نہیں ہوا کوئی بلب نہ جلا۔ شاید کسی نے مین سوئچ ہی بند کر دیا تھا ہال میں بھی سیاہ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

”اس کا مطلب ہے ناصر کے قاتلوں کو میرے ارادوں کا علم ہو گیا ہے لیکن کیسے؟“ یہ خیال شاکر کے ذہن میں بڑی سرعت کے ساتھ گزرا۔ وہ خاصا جاندار اور بہادر جوان تھا۔ تاہم نہتی حالت میں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے تھوک نگلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس نے بیڈ روم سے آکر غلطی کی ہے۔ یہاں اس کی موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ ٹٹولتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے گھپ اندھیرے میں اندازہ لگایا کہ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں ہے وہ آگے بڑھا۔ اچانک اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ منہ کے بل گرا۔ اگلے ہی لمحے اس کے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ بھر گیا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا صوفہ الٹا پڑا تھا۔

”اوہ میرے خدایا...... !یہ کیا ہوتا رہا ہے یہاں؟“ اس نے خوفزدہ انداز میں سوچا۔ اسی وقت کمرے میں کلک کی آواز گونجی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ”کون ہے۔ کون ہے یہاں؟“ اس نے کہنا چاہا مگر آواز حلق میں پھنس گئی۔ وہ کچھ دیر وہاں پڑا کسی آواز کا منتظر رہا۔ مگر نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ کمرے میں سکوت ٹھہرا رہا۔

”ہوں...... ہر جگہ تلاش کیا ہے؟“ ایک سرسراہٹ سی سنائی دی۔

”جی ہاں۔“

”ہم...... تو چلو...... پھر سہی۔“ وہی سرسراہٹ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد دو آدمیوں کے قدموں کی چاپ ابھری جو آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ شاکر علی یونہی دم سادھے پڑا رہا۔ باہر کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے معلوم ہوا حملہ آور چلے گئے ہیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور نڈھال ہو کر فرش پر ڈھے گیا۔ موت اس سے چند فٹ کے فاصلے سے ہو کر چلی گئی تھی۔ لیکن موت کی دہشت بھی موت سے کم نہیں ہوتی۔ وہ اس وقت جس اعصابی تناؤ سے گزرا تھا اس نے اس کا بند بند ڈھیلا کر دیا تھا۔ وہ یونہی لیٹا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔

☆☆☆

سورج مغربی افق میں غروب ہو چکا تھا۔ شام کے سائے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے تھے۔ شاقی اور مکرانی ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ”شاقی بھائی یہ کام تو زیادہ ٹیڑھا ہے۔“ خالد مکرانی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”کام ٹیڑھا ضرور ہے مگر مال بھی تو زیادہ ہے۔“ شاقی نے پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات ذہن میں رکھ لے غلط کام سارے ہی ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ بھلے چھوٹی موٹی چوری ہو یا کسی کا قتل۔“

خالد مکرانی کو رہ رہ کر اپنے گھر والوں کی یاد آتی تھی۔ کئی دن سے وہ گھر نہیں گیا تھا۔ آج اسے ماں بہت یاد آرہی تھی۔ اس نے شاقی کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”شاقی بھائی...... !مجھے ایک بار گھر جانے کی اجازت دلا دو سکندر خان سے۔ صرف ایک دن کے لیے میرا وعدہ ہے میں دوسرے دن واپس آجاؤں گا۔“

شاقی ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”باؤلا ہو گیا ہے تو اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا۔ یاد نہیں ہے سکندر نے معاہدہ کرتے وقت کہا تھا، ہماری طرف آنے والے سارے راستے کھلے ہیں لیکن جانے والے تمام راستے بند ہیں۔“ مکرانی بظاہر ڈھیلا پڑ گیا لیکن اس نے دل میں ارادہ کر لیا کہ وہ ایک دو دن تک یہاں سے نکل جائے گا۔ پھر بات بناتے ہوئے بولا۔

”بس شاقی بھائی کیا بتاؤں اماں کی بہت یاد آتی ہے، چل جیسے تو کہتا ہے اب میں ویسے ہی کروں گا۔“

شاقی نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا، چپ بیٹھا رہا۔ اسی دوران باہر مین گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے بیک وقت کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پرانے ماڈل کی ایک کرولا کار اندر آئی اور پورچ میں آکر رک گئی۔ سکندر کار سے باہر نکلا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاقی اور مکرانی کمرے سے باہر نکلے اور سکندر کے پاس پہنچ گئے۔

”کار کی پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی بے ہوش پڑی ہے، اسے اٹھا کر کمرے میں لے جاؤ اور خبردار اس کے ہوش میں آنے کے بعد اگر کسی نے اس کے ساتھ دست درازی کرنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“ سکندر نے تنبیہی انداز میں کہا اور پورچ کے ساتھ بنے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

ان دونوں نے لڑکی کے ذکر پر ایک پل کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور لڑکی کو باہر نکالنے لگے۔ لڑکی کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کے جسم پر پھول دار لباس تھا۔ دونوں نے مل کر لڑکی کو باہر نکالا اور کمرے کی طرف لے جانے لگے۔ اسے بیڈ پر لٹا کر اس کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہاتھ کھولے اور منہ سے ٹیپ ہٹانے کے بعد دونوں باہر نکل آئے پھر شاقی نے باہر سے کنڈی لگادی۔

سکندر واش روم سے واپس آگیا تھا۔ اس نے جیب سے ایک تالا اور چابی نکالی۔ تالا خالد مکرانی کو دیتے ہوئے بولا۔ ''جس کمرے میں لڑکی کو رکھا ہے اس کے دروازے پر باہر سے تالا لگا دو ہری اَپ جلدی کرو۔'' وہ چائنا ساخت کا کھٹکے والا تالا تھا جو بغیر چابی کے بند ہو جاتا ہے مکرانی تالا ہاتھ میں لیے دروازے تک گیا، وہ تالا لگانے ہی والا تھا کہ کسی خیال کے تحت رک گیا، اس نے تالا بند نہیں کیا اور ایسے ہی لٹکا کر واپس آگیا۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے تالا لگا ہوا ہے۔ اسی دوران شاقی اور سکندر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ مکرانی پچھلی والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سکندر نے گاڑی باہر نکالی اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ گاڑی کا رخ چولستان کے بلند و بالا ٹیلوں کی طرف تھا۔ شام کی ملگجی روشنی پر رات کی تاریکی غالب آنے لگی تھی۔ چھوٹے موٹے ٹیلوں کے آغاز پر سکندر نے موبائل فون نکال کر کسی سے رابطہ کیا اور اسے احسان گڑھ پہنچنے کی اطلاع دی۔ مکرانی اور شاقی چپ بیٹھے رہے۔ مکرانی کے ذہن میں فرار کا منصوبہ جنم لے رہا تھا۔ احسان گڑھ کی آبادی ختم ہوتے ہی سکندر خان نے گاڑی پکی سڑک سے قدرے نشیب کی طرف کچے راستے پر موڑ لی اور چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد سفید رنگ کی ایک عمارت کے پاس روک دی۔ گاڑی رکتے ہی عمارت کا گیٹ کھلا ایک شخص نے باہر نکل کر گاڑی کو اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ سکندر نے گاڑی آگے بڑھائی ہی تھی کہ مکرانی پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر جلدی سے نیچے اتر گیا۔ جب تک سکندر خان گاڑی روکتا مکرانی بھاگتا ہوا ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھپ گیا اور سرپٹ ایک طرف بھاگتا چلا گیا۔ پیچھے گولی چلنے کی آواز سنائی دی جو شاید عمارت کے واچ ٹاور پر کھڑے گارڈ نے چلائی تھی۔ گولی مکرانی کے پاس سے گزرتی ہوئی ریت میں گھس گئی۔ مکرانی اونچے نیچے ٹیلوں پر بھاگتا چلا گیا۔

☆☆☆

صبح کا اُجالا رات کی تاریکی پر اپنا تسلط جما چکا تھا۔ شاکر خلافِ معمول جلدی اٹھ گیا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا، صبح کے چھ بجے تھے۔ نیند کی کمی کی وجہ سے اسے اپنا سر بھاری بھاری محسوس ہوا۔ رات والے واقعے نے اس کے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ ''آخر وہ لوگ کون تھے اور مجھے کیوں مارنا چاہتے تھے؟'' اس سوال کی اذیت اچانک تاریکی سے نکل آنے والے سانپ کی طرح ڈس رہی تھی۔ ''کہیں ان لوگوں کا تعلق ناصر کے قاتلوں سے تو نہیں؟'' شاکر نے سوچا۔ ایسے بہت سے سوال، جواب کے متقاضی تھے لیکن تمام سوال ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے اور کوئی سرا ہاتھ نہ آتا۔ شاکر علی نے سر جھٹکا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ نہانے کے دوران ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

''اس کا مطلب ہے نادیدہ دشمن میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے اور یہ تعاقب ناصر کے قتل کے دن سے جاری ہے۔'' اگلے بیس منٹ میں وہ نہا دھو کر تیار ہو گیا اور چائے کا ایک کپ پی کر نکلا تو ساڑھے سات بج گئے۔ سب سے پہلے اس نے ایک سکیورٹی کمپنی سے تین گارڈ منگوائے اور پہلے والے چوکیدار کو فارغ کر دیا۔ گھر میں مختلف جگہوں پر سی سی ٹی وی کیمرے لگوائے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر اس نے ناصر کے قتل کی تحقیقات کے حوالے سے ایس ایچ او سلمان پاشا کو فون کیا۔ اس نے بتایا۔

''ہم قاتلوں کو ڈھونڈنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں جونہی کوئی پیش رفت ہوئی آپ کو آگاہ کر دیں گے۔''

''آپ نے ہاشم داد والے کلیو پر تحقیقات کیں؟'' شاکر نے پوچھا۔

''جی شاکر صاحب......! ہم نے ہاشم داد کے بارے میں پوری تحقیق کی ہے، وہ علاج کی غرض سے پچھلے ایک ماہ سے بیرونِ ملک مقیم ہے۔'' سلمان پاشا نے بتایا۔ ''مجھے نہیں لگتا جس شخص پر فالج کا اٹیک ہوا ہو وہ کسی کو قتل کرے یا کروا سکے، وہ خود زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔''

''کیا......؟ فالج کا اٹیک؟'' شاکر علی حیران ہوا۔

''جی فالج کا اٹیک۔'' سلمان پاشا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''اور یہ گزشتہ ماہ کی بات ہے۔ بہرحال آپ مطمئن رہیں ہم نے از سر نو دوسرے محرکات پر تحقیقات شروع کی ہیں۔ امید ہے بہت جلد قاتلوں تک پہنچ جائیں گے۔''

شاکر نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ اس نے سلمان پاشا کی باتوں پر غور کیا۔ اس کی باتوں سے دروغ گوئی یا جانبداری کا تاثر نہیں ملتا تھا۔ تاہم شاکر نے مختلف لوگوں کو فون کر کے سن گن لینے کی کوشش کی۔ اکثریت نے سلمان پاشا کی باتوں کی تصدیق کر دی۔

شاکر علی کا دماغ چکرانے لگا۔ اگر ہاشم داد قاتل نہیں تو پھر ناصر یزدانی کا قتل کس نے کیا ہے؟ سوالات کا ہجوم ذہن پر یلغار کرتا رہا۔ شاکر علی کچھ دیر کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا۔ سوچتے

سوچتے بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے ناصر یزدانی کے فلیٹ کی چابی دراز سے نکالی، ایک چابی اس کے پاس بھی رہتی تھی۔ وہ ملازمین اور گارڈز کو ہدایت دے کر گھر کے پچھلے گیٹ سے باہر نکل آیا اور پیدل ہی مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک پارک کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے پاس سے گزرنے والے تین آدمیوں نے اسے ایک پل کے لیے گھور کر دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ اسی دوران میں شاکر کی نظر بھی اچانک ان پر پڑ گئی۔ اسے ان کے گھورنے پر شک ضرور ہوا تھا۔ تاہم وہ انہیں راہگیر سمجھتے ہوئے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ گھورنے والے چند قدم اس کی مخالف سمت میں آگے تک گئے پھر ایک دم سے مڑ کر شاکر کے پیچھے آنے لگے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کا شک تقویت پکڑنے لگا، وہ اس کے تعاقب میں تھے۔

وہ چوکنا ہو گیا اور اپنا شک دور کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا، وہ مڑ کر یونہی ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ آگے جا کر گلی تین مختلف گلیوں میں مل گئی۔ وہ بائیں جانب مڑ گیا۔ آگے جا کر وہ دائیں جانب مڑا اور تھوڑی دیر چلتے رہنے کے بعد ایک بازار میں نکل آیا۔ وہ شہر کا ایک پرانا علاقہ تھا گھر اور دکانیں بھی قدیم طرز کی بنی ہوئی تھیں۔ چلتے چلتے وہ پھر دائیں جانب مڑا اور قریب کی ایک دکان میں کھڑا ہو کر مختلف اشیا دیکھنے لگا۔ دو منٹ بعد اس گلی سے وہ تینوں برآمد ہوئے۔

شاکر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ایک دم دکان سے نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک جانب چل پڑا۔ تعاقب کرنے والے تینوں افراد نے شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کی قمیصوں کے نیچے کمر کے ساتھ پہلو پر ابھار سے تھے جیسے انہوں نے وہاں ہتھیار چھپا رکھے ہوں۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کی ہتھیلیاں گیلی ہو گئی ہیں۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ وہ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا مسلسل چل رہا تھا، ان کے اور اس کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل جاری تھا۔

وہ ناصر کے قاتلوں تک پہنچنے سے پہلے موت کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جس گلی میں شاکر مڑا تھا وہ زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دونوں طرف اونچے اونچے مکانات تھے۔ جن کے باہر دھلے ہوئے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ آگے جا کر گلی ایک اور گلی میں مڑ گئی جو بالکل سنسان تھی۔ یہاں آ کر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ لیکن گلی میں مڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔ وہ گلی پھر ایک گلی میں مڑ گئی۔ اس گلی میں دروازوں کے سامنے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ان کے اوپر سے پھلانگتا ہوا دوڑنے کے سے انداز میں چل رہا تھا۔ آگے جا کر یہ گلی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ابھی شاکر سوچ ہی رہا تھا کہ کون سی گلی میں جائے کہ ایک جانب سے ان تینوں میں سے ایک بھاگتا ہوا آتا نظر آیا۔ شاکر دوسری گلی میں مڑ گیا۔ پیچھے قدموں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا ان تینوں میں سے دو اس کے پیچھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ اس گلی میں صرف تین افراد تھے۔ ایک شاکر اور دو وہ۔ شاکر بھاگنے لگا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے بھاگے۔

شاکر پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ اس کی زندگی کی دوڑ ہے اگر وہ اس دوڑ میں ہار جاتا تو زندگی سے بھی ہار جاتا۔ وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ ناصر کے قاتلوں تک پہنچنے کے لیے اس کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

وہ دونوں مسلسل اس کے پیچھے تھے۔ آگے جا کر گلی تنگ سی ہو گئی۔ اچانک پیچھے سے بھاگتے قدموں کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ تعاقب کرنے والوں نے اپنی رفتار آہستہ کر دی تھی۔

''شاید وہ تھک گئے ہیں۔'' شاکر نے خوش ہو کر سوچا اور اپنی چلنے کی رفتار بڑھا دی۔

لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ آگے یہ گلی بند تھی۔ سامنے ایک اونچی سی دیوار اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ شہر کے پرانے علاقے میں ایسی بند گلیوں کی بھرمار ہے۔ وہ تیزی سے مڑا۔ تعاقب کرنے والے دونوں افراد نہایت اطمینان سے چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ دونوں میں سے ایک مسکرا رہا تھا۔ شاکر نے پہلی بار قاتل کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس نے بوکھلا کر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے بائیں جانب ایک اونچی اور لمبی دیوار تھی۔ جس میں صرف روشن دان بنے ہوئے تھے۔ یہ غالباً کوئی طویل ہال تھا۔ اس کے دائیں جانب قطار سے ایک ہی طرز کے بنے ہوئے مکان تھے۔ اس کا اور تعاقب کرنے والوں کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

شاکر کو جو بھی فیصلہ کرنا تھا، لمحوں میں کرنا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ تیزی سے اپنے دائیں جانب مڑا اور پہلے مکان کے دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ بند تھا۔ دونوں ریوالور بردار رک گئے اور حیرت سے اُسے دیکھنے لگے۔

''یہی موقع ہے۔'' اس نے سوچا اور اگلے دروازے کی

جانب بڑھا۔ وہ بھی بند تھا۔ ایک ریوالور بردار اپنی حیرت پر قابو پا چکا تھا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ سیدھا ہوا۔ شاکر تیسرے دروازے کی طرف بڑھا۔

پھر دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ ریوالور نے ایک شعلہ اُگلا اور شاکر نے دروازے پر چھلانگ لگا دی۔ اندر لگی کنڈی شاید اتنی مضبوط نہیں تھی یا اس وقت شاکر میں ضرورت سے زیادہ طاقت آگئی تھی۔ بہرحال دروازہ کھلا اور شاکر اندر جا پڑا۔ گولی دروازے کی دہلیز میں پیوست ہوگئی۔

وہ تیزی سے اٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازے پر دو کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے تیزی سے کنڈی بند کر دی۔ اور اب دروازے کے ساتھ کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ باہر سے تعاقب کرنے والوں نے دروازے پر دھکے مارے مگر کنڈی لگی ہونے کی وجہ سے دروازہ نہیں کھلا۔ ”دوسری طرف سے آنا ہوگا۔“ ان میں سے ایک کی آواز سنائی دی پھر قدموں کی چاپ ابھری جو معدوم ہوتی گئی شاید وہ دوسری طرف سے آنے کے لیے واپس پلٹ گئے تھے۔ شاکر کو اس مختصر وقت میں یہاں سے انہیں جُل دے کر نکلنا تھا۔

دن ہونے کے باوجود کمرے میں خاصا اندھیرا تھا اس نے اندازے سے دیوار کو ٹٹولنا شروع کیا بالآخر اس کا ہاتھ سوئچ بورڈ سے ٹکرایا، اس نے تمام بٹن آن کر دیے ایک بلب جلا اور زرد سی روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک دروازہ صحن کی طرف کھلتا تھا۔ شاکر دروازہ کھول کر صحن میں آگیا۔ پورا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ گھر کی حالت زار بتا رہی تھی کہ یہاں کے مکین نقل مکانی کر چکے ہیں۔ صحن سے اسے مین گیٹ نظر آیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

وہ بھاگنے کے سے انداز میں چلتا ہوا گلی کے ایک طرف چل پڑا اس گلی کا اختتام مین روڈ پر ہوا۔ مین روڈ پر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی رکوائی اور بہ عجلت ناصر یزدانی کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

بلیو کلر کی ہنڈا سوک آگے تھی اور ہائی ایس وین پیچھے۔ دونوں گاڑیاں دھول اُڑاتی ہوئی چولستانی ٹیلوں میں واقع کھنڈرات کے پاس رک گئیں۔

کھردرے چہرے والا چیف گاڑی سے اترا اور ہائی ایس وین میں جھانک کر ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ بچے سہمے بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چیف کے ہاتھ میں جدید لینز کی ایک دوربین تھی۔ ٹیلے پر چڑھ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

جب اسے اطمینان ہوگیا کہ دور دور تک کوئی متنفس موجود نہیں ہے تو وہ ٹیلے سے اتر آیا اور اپنے آدمیوں کو بچوں کی آنکھوں سے پٹیاں ہٹانے کی ہدایات دینے لگا۔ جب تمام بچوں کی آنکھوں سے پٹیاں اتر گئیں تو وہ قدرے نشیب میں واقع کھنڈرات کی طرف بڑھ گیا۔ اور بچوں کو اپنے پیچھے لے آنے کا اشارہ کیا۔

چند سال قبل چیف چولستان میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اِدھر آنکلا۔ اس نے اپنی متجسّس طبیعت کے باعث گھوم پھر کر کھنڈرات کا جائزہ لیا اور کھنڈرات کے نیچے بنے زیر زمین کمرے دریافت کر لیے۔ بعد میں ان کمروں کی صفائی کر کے وہ انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگا۔

اب وہ بچوں اور کارندوں سمیت ان زیرزمین بنے کمروں (تہ خانوں) کی طرف جا رہا تھا۔ مختلف بھول بھلیوں سے ہوتا ہوا وہ ایک جگہ پر رک گیا۔ سامنے ایک دیوار تھی۔ چیف نے دیوار کے پاس ایک کونے میں پاؤں کا دباؤ ڈالا تو دیوار اندر کی طرف کھسکنا شروع ہوگئی۔ وہ دس فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا موٹی لکڑی کا ایک گیٹ تھا جسے باہر سے کسی ماہر مصور نے اس انداز سے پینٹ کیا تھا کہ وہ دیوار کا حصہ نظر آتا تھا۔ قریب کھڑا ہوا کوئی بھی بندہ اسے دیکھ کر دھوکا کھا سکتا تھا۔ نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ پہلے چیف اندر داخل ہوا اور ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ پھر اس کے آدمی بچوں کو نیچے لے گئے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی چیف نے گیٹ بند کر دیا۔ بچوں کو وسیع ہال میں لایا گیا۔ جس میں درجن بھر بیڈ پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف سرجری کے کچھ آلات اسٹیل کی پلیٹوں میں رکھے تھے۔ ہال کے ایک کونے میں ایک بیڈ کے اوپر متعدد لائٹس لگی ہوئی تھیں جو اس وقت بند تھیں۔ ایک دیوار گیر الماری میں ادویات پڑی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ہال کسی اسپتال کے وارڈ اور آپریشن تھیٹر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سہمے ہوئے بچوں نے جب وہاں کا ماحول دیکھا تو ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ ان کے چہروں پر زردی پھیل گئی۔

☆☆☆

رات کا سناٹا ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ دور دور تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کسی وقت کوئی جھینگر اپنی بے ہنگم آواز سے سناٹے کو درہم برہم کرتا۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔ خالد مکرانی چلتے چلتے تھک کر ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ اسے چلتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا۔ لیکن تا حال وہ کسی آبادی کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

JBD

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پاس نہیں پہنچ سکا تھا۔ مسلسل چلتے رہنے سے اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پکڑے جانے کا خوف الگ عذابِ جاں بنا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس کے ذہن میں وہاں سے بھاگنے کا خیال آیا تھا۔ ”نجانے شاقی بھائی کس حال میں ہو گا؟ وہ لوگ اسے مار مار کر میرے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے۔ بیچارہ شاقی بھائی!“ اس نے دکھ کے ساتھ شاقی کے بارے میں سوچا۔

مکرانی جانتا تھا کہ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ ان سے بغاوت کا مطلب موت ہے صرف موت۔ اچانک ایک خیال اسے سانپ بن کر ڈسنے لگا۔ سکندر اپنے پاس کام کرنے والے ہر شخص کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا تھا۔ ان کے گھر کا مکمل اتا پتا۔ گھر کے ایک ایک فرد کے معمولات اس کی نظر میں رہتے تھے۔ مکرانی اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو گیا۔ ہوسکتا ہے اب تک سکندر اس کے گھر والوں تک پہنچ گیا ہو گا۔ اس کی ماں اور دادی تو بوڑھی تھیں ممکن ہے اس نے ان کے ساتھ کچھ نہ کیا ہو لیکن مکرانی کو زیادہ پریشانی اپنے چھوٹے بھائی اور جوان بہن کی تھی۔ جوان لڑکیاں سکندر کی کمزوری تھیں، اکثر انہیں دیکھ کر وہ اپنے اہم کام بھی چھوڑ دیتا تھا۔ مکرانی اچانک وہاں سے اٹھا اور ٹیلے سے اترنے لگا۔ اسے متوقع خطرات نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ بھاگتا رہا بھاگتا رہا ایک ٹیلے سے اترتے ہوئے اچانک اسے ٹھوکر لگی وہ منہ کے بل گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ اس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

شاکر، ناصر یزدانی کے گھر سے ایک اسٹاپ پہلے اتر گیا۔ ان حالات میں وہ ٹیکسی ڈرائیور پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ پیدل چلتا ہوا وہ ناصر کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں دروازے کا تالا غائب تھا۔ اور دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اندر کی طرف بھاگا۔ لاؤنج اور ناصر کے بیڈروم کی ہر چیز اتھل پتھل پڑی تھی۔ اس کا مطلب ہے قاتل، شاکر سے پہلے ناصر کے گھر کی تلاشی لے چکے تھے۔ شاکر نے پھر بھی ہر اس جگہ پر کوئی نہ کوئی ثبوت ڈھونڈنے کی کوشش کی جہاں ان کے ملنے کے امکانات تھے اور وہی ثبوت... قاتلوں تک رسائی کا ذریعہ بنتے۔ دراصل شاکر یہاں ناصر کی ڈائری کی تلاش میں آیا تھا جو وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے لکھتا تھا۔ مگر ناصر کے چند رف پیڈز کے سوا کچھ نہ ملا جن پر آدھے ادھورے کالم تحریر تھے۔ اور ان کالمز کے مندرجات کسی طرح بھی ناصر کے قتل کے محرکات پر روشنی نہیں ڈالتے تھے۔ ناصر نے وہ پیڈز واپس اپنی جگہ پر رکھے اور گھر کی بکھری چیزوں کو سمیٹنے لگا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ ہارڈ ویئر کی دکان سے ایک نیا تالا خریدا اور ناصر کے گھر کے مین دروازے پر لگا دیا۔ ایک موبائل شاپ سے اس نے موبائل کارڈ خرید کر کریڈٹ لوڈ کیا اور رینٹ اے کار والوں کو کال کر کے سیلف ڈرائیو پر ایک گاڑی منگوالی۔

شام کے سوا پانچ بجے اس نے گاڑی کا رخ چولستان کی طرف موڑ لیا۔ سورج مغرب کی جانب جھکا جا رہا تھا۔ چولستانی علاقہ شہر سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ شاکر نے راستے میں کہیں قیام کیے بغیر وہ فاصلہ دو گھنٹوں میں طے کر لیا۔ اس کی منزل سرکنڈوں سے بنی وہ جھونپڑیاں تھیں جن کی طرف اشارہ ناصر نے کیا تھا۔ شاکر نے آج تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ ان جھونپڑیوں سے ناصر کے قتل کا محرک تلاش کر کے رہے گا۔

جب شاکر وہاں پہنچا تو شام ڈھل چکی تھی۔ آسمان پر ابتدائی تاریخوں کا چاند غروب ہونے والا تھا۔ اس نے گاڑی سڑک سے ہٹا کر ایک ٹیلے کے نشیب میں کھڑی کی اور گاڑی سے اتر کر پیدل چلتا ہوا ان جھونپڑیوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ تاروں بھری رات کے ملگجے اندھیرے میں جہاں تک نظریں کام کرتی تھیں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ شاکر نے موبائل فون کی ٹارچ روشن کی اور اس کے آگے ہاتھ رکھ کر روشنی کو محدود کر دیا۔ پہلے وہ ایک جھونپڑی میں گھسا۔ اس جھونپڑی میں چند دن قبل ایک میلا کچیلا بستر، ایک گھڑا اور ایلومینیم کا گلاس موجود تھا مگر اس وقت وہ جھونپڑی اندر سے خالی تھی۔ وہاں کا مکین شاید کہیں نقل مکانی کر گیا تھا۔ البتہ پرالی جوں کی توں ریتیلی زمین پر بچھی ہوئی تھی۔ شاکر نے بہ نظرِ غور ٹارچ کی روشنی میں ایک ایک جگہ دیکھ لی اور مایوسی سے سر ہلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اب امید کی آخری کرن دوسری جھونپڑی رہ گئی تھی۔ شاکر اس کے اندر چلا گیا۔ وہ جھونپڑی پہلے ہی خالی تھی اور وہاں زمین پر پرالی بھی نہیں بچھی تھی۔ اس نے وہاں بھی اردگرد، اوپر نیچے، آگے پیچھے ہر جگہ دیکھ لی مگر امید بر نہیں آئی۔ وہ اس جھونپڑی سے بھی مایوس ہو کر نکل رہا تھا کہ ٹارچ کی روشنی اچانک جھونپڑی کے کونے پر پڑی جہاں کوئی چیز چمکی تھی۔ ناصر نے جلدی سے ٹارچ بند کر دی۔ کونے میں جو چیز ایک پل کے لیے جگنو کی طرح چمکی تھی یکلخت تاریکی میں ڈوب گئی۔ اس نے دوبارہ ٹارچ روشن کی اور اس طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ کسی کا شیشے کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک بٹن تھا جو روشنی میں چمکا تھا۔ شاکر نے جھک کر وہ بٹن اٹھانا چاہا لیکن بٹن ہاتھ میں آ کر بھی اوپر نہیں اٹھا۔ شاکر تجسّس کے مارے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اور زور لگا کر بٹن کو کھینچنے لگا۔ روشنی بدستور اس جگہ پر پڑ رہی تھی۔ وہ بٹن ایک کپڑے کے ساتھ ٹانکا ہوا تھا۔ اس نے تھوڑا سا مزید زور لگا کر وہ کپڑا اوپر کھینچ لیا۔ وہ قمیص کا ایک بازو تھا اور وہ بٹن اس کے کف پر لگا ہوا تھا۔ شاکر نے باقی کا کپڑا بھی کھینچ لیا۔ گرد سی اٹھی۔ چند لمحے وہ یونہی بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں، گرد بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا وہ ایک مردانہ قمیص تھی جو گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ قمیص اٹھاتے ہوئے شاکر کو وہ بھاری بھاری سی محسوس ہوئی۔ اس نے قمیص سیدھی کر کے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اس کا ہاتھ پولیتھین میں لپٹی کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ اس نے وہ چیز پولیتھین کے لفافے سمیت باہر نکال لی۔ اس لفافے پر ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی شاکر کی حیرت دو چند ہوگئی وہ ایک موبائل فون تھا اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ موبائل فون ناصر یزدانی کا تھا اور قمیص بھی یقیناً اسی کی تھی۔ شاکر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے ٹارچ بند کر کے موبائل فون جیب میں ڈالا اور ایک ہاتھ میں ناصر کا قمیص اور دوسرے ہاتھ میں اس کا موبائل لے کر باہر نکل آیا۔

چاند اپنا سفر طے کرتا ہوا غروب ہو چکا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا گاڑی تک آیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے شہر کی طرف جانے لگا۔ اس نے چند کلومیٹر ہی سفر طے کیا تھا کہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس ایک انسانی جسم پر پڑیں۔ شاکر نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا ایک خاک آلود شخص سڑک کے ایک طرف اوندھا پڑا تھا اور اس کے سر کے قریب سیاہی مائل سرخ دھبے بھی نظر آ رہے تھے جو یقیناً خون کے تھے۔ ”یہ کون مرا پڑا ہے۔“ اس نے سوچا۔ وہ چند لمحے اس طرف دیکھتا رہا۔ اوندھے پڑے ہوئے شخص کے جسم میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ شاکر ہیڈ لائٹس جلتی چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ وہ فطری طور پر رحم دل تھا۔ وہ کسی بھی انسان کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ انسان بھی ایسا جو قریب المرگ ہو۔ اس شخص کے قریب پہنچ کر شاکر نے اسے سیدھا کیا۔ وہ گھنگھریالے بالوں والا شخص خالد مکرانی تھا۔ اس کے ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔ شاکر نے اسے آہستگی سے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

مکرانی کی آنکھیں بند تھیں، سانس دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ شاکر نے اپنا سوال دہرایا۔ مکرانی کے لب تھوڑے سے وا ہوئے اور دھیمی آواز نکلی۔ ”پپ...... پپ پا...... نی۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ شاکر کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ وہ شہر سے چلتے وقت پانی کی بوتل اپنے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ وہ عجیب سی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ ایک انسان کو بچانے کی کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اکثر ڈرائیور ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کے لیے پانی کی بوتلیں ڈکی میں رکھتے ہیں۔ وہ اٹھا اور جلدی سے گاڑی کی طرف بھاگا۔ ڈکی میں پانی کی ایک بوتل موجود تھی جس میں ایک گلاس جتنا پانی بچا ہوا تھا جو گاڑی کی حرارت سے گرم ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ پانی کتنے دن پرانا تھا مگر اس وقت وہ آبِ حیات تھا۔ وہ پانی لے کر مکرانی کے پاس آیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے سہارا دے کر اٹھایا اور بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ کچھ پانی اس کے حلق میں گیا اور کچھ اس کے کپڑوں پر بہہ گیا۔ چند لمحے بعد اس کی سانسیں بحال ہو گئیں۔ شاکر اسے سہارا دے کر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد مکرانی نے آنکھیں کھول دیں اور ایک اجنبی کو اپنے پاس دیکھ کر ایک دم سے سہم گیا۔ وہ بہت نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ شاکر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈرو نہیں، مجھے اپنا دوست سمجھو۔“

مکرانی کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا مگر بولا کچھ نہیں۔ اس کی توانائی آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔

شاکر نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے کھڑا کر دیا اور سہارا دے کر گاڑی تک لے آیا۔ گاڑی اسٹارٹ تھی۔ اسے پسنجر سیٹ پر بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

”اب بتاؤ کون ہو تم اور اس ویران صحرائی علاقے میں کیا کر رہے تھے؟“ شاکر نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مکرانی کے حواس پوری طرح بحال ہو چکے تھے تاہم وہ مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے اپنے جسم میں بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ شاکر اپنا سوال دہراتا اس کے موبائل فون کی بیل بجی۔ اس نے موبائل فون جیب سے نکال کر نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔

”السلام علیکم۔“

”جی شاکر بات کر رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے ایک خاتون کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کیا......؟ تانیہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔“ شاکر نے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گاڑی میں لگی گھڑی میں وقت دیکھا۔اس وقت رات کے نو بجے تھے۔اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔

''اچھا ٹھیک ہے آنٹی آپ پریشان نہ ہوں' میں کچھ کرتا ہوں۔''

شاکر نے گاڑی سڑک کے ایک طرف روک دی۔اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں لحہ بہ لحہ گہری ہو رہی تھیں۔مکرانی کے حواس مکمل طور پر بحال ہو چکے تھے۔اس نے شاکر کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر پوچھا۔''صاحب! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

شاکر نے ایک نظر مکرانی کی طرف دیکھا پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔''کچھ خاص نہیں بس تھوڑا سا گھریلو مسئلہ ہے۔'' وہ مکرانی کو ناصر کے قتل، اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور تانیہ کے غیاب سے متعلق کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

''صاحب جی آپ نے میری بہت مدد کی، آپ کی وجہ سے مجھے نئی زندگی ملی ہے۔'' مکرانی شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی پریشانی بتا سکتے ہیں۔ممکن ہے میں آپ کی مدد کرسکوں۔آپ کی فون پر ہونے والی باتوں سے لگتا ہے۔آپ کی کوئی عزیزہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔'' مکرانی اچانک خاموش ہوگیا۔

شاکر نے چونک کر مکرانی کی طرف دیکھا۔مکرانی نظریں جھکائے چپ بیٹھا تھا۔شاکر بھی کچھ دیر چپ بیٹھا رہا۔گاڑی سے باہر حبس زدہ رات صبح کے تعاقب میں بھاگی جا رہی تھی۔پھر شاکر نے اسے مختصراً تانیہ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔''مجھے سو فیصد امید ہے تانیہ کو اغوا کیا گیا ہے۔اس کی والدہ پریشان ہو رہی تھیں۔'' شاکر نے تاسف سے سر ہلایا۔

''میرے خیال سے میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔'' مکرانی نے کہا۔''کیا آپ کے پاس اس لڑکی کی کوئی تصویر ہے؟''

اس کے ذہن میں اس لڑکی کی شبیہ ابھر آئی جسے سرِ شام سکندر لایا تھا۔

''تم.....تم کیسے مدد کرسکتے ہو؟'' شاکر نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

''آپ پہلے تصویر تو دکھائیں صاحب جی!''

شاکر نے موبائل فون کی گیلری سے اسے تانیہ کی ایک تصویر زوم کر کے دکھائی۔

مکرانی، تانیہ کی تصویر دیکھ کر اچھل پڑا۔''صاحب جی جلدی سے گاڑی پیچھے موڑیں، اس سے پہلے کہ لڑکی کو کہیں اور منتقل کیا جائے۔چلیں یہاں سے۔''

شاکر یقین بے یقینی کی کیفیت میں مکرانی کو دیکھتا رہا۔

مکرانی چیخنے کے سے انداز میں بولا۔''یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے گاڑی پیچھے موڑیں، مجھے معلوم ہے لڑکی اس وقت کہاں ہے۔''

شاکر علی نے گاڑی موڑی۔بیس منٹ کا سفر طے کرنے کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں تانیہ قید تھی۔مکرانی نے شاکر کو دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہونے کو کہا اور خود گیٹ پر دستک دینے لگا۔تیسری دستک پر وہاں موجود چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔وہ مکرانی کے فرار سے لاعلم نہیں تھا۔اس نے جب مکرانی کو دیکھا تو اس پر بندوق تان لی تاہم وہ شاکر کی موجودگی سے بے خبر تھا۔کیونکہ وہ دیوار کی اوٹ میں کھڑا تھا۔

مکرانی سمجھ رہا تھا، جمعہ خان تک اس کے فرار کی اطلاع نہیں پہنچی ہوگی۔اور یہیں پر اس سے غلطی ہوگئی۔وہ اور شاکر دونوں نہتی حالت میں تھے جبکہ جمعہ خان ان کے مقابلے میں مسلح تھا۔مکرانی کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔اس نے عاجزانہ لہجے میں پوچھا۔''کیا ہوا جمعہ خان مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟''

جمعہ خان نے بندوق کی نال سے اسے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

''تم جانتا اے سکندر نے ہمیں غدار کو مارنا سکھایا اے۔'' اس نے بندوق کے گھوڑے پر انگلی کا دباؤ بڑھایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''ام تمہیں اپنے ہاتھوں سے مارے گا۔'' مکرانی، جمعہ خان کا جارحانہ انداز دیکھ کر پریشان ہوگیا۔اس نے اندھیرے میں تیر چلانے کی کوشش کی۔جمعہ خان کے عقب میں اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

''خبردار وہیں رک جاؤ جمعہ خان کو پیچھے سے مت مارنا۔'' یہی وقت تھا جمعہ خان نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مکرانی اس کی بندوق پر جا پڑا اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھین لی۔اس نے جلدی سے شاکر کو آواز دی۔''آجائیں صاحب جی!'' شاکر اندر آیا اور پھر دونوں نے مل کر جمعہ خان کو قابو کرلیا، وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کچن کی طرف لائے۔مکرانی نے اس پر بندوق تانتے ہوئے شاکر سے کہا۔

''صاحب جی آپ ادھر کسی کمرے سے کوئی رسی ڈھونڈ لائیں، میں اس پر نظر رکھتا ہوں۔شاکر علی کچن سے باہر نکل گیا اور کچھ دیر بعد ایک رسی ڈھونڈ لایا اور مضبوطی سے جمعہ خان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔اس کام سے فارغ ہونے کے

بعد دونوں کچن سے نکل آئے اور کچن کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ مکرانی بھاگ کر جمعہ خان کے کیبن میں گیا اور اس کا موبائل فون وہاں رکھی میز سے اٹھا کر بند کر دیا۔ کیبن سے نکل کر وہ شاکر کے پاس آیا اور پھر دونوں اس کمرے کی جانب بڑھ گئے جہاں تانیہ قید تھی۔

☆☆☆

تانیہ کو ہوش آیا تو اس نے آنکھیں ملتے ہوئے اردگرد دیکھا۔ وہ جگہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ کمرے میں زیرو پاور کا زرد روشنی والا بلب تاریکی سے لڑ رہا تھا۔ وہ مختصر سا کمرا تھا جس میں فرنیچر کے نام پر ایک میز ایک صوفہ سیٹ اور ایک بیڈ تھا جس پر تانیہ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گئی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی کھولی، وہ آہنی سلاخوں والی کھڑکی تھی جس کے پٹ لکڑی کے تھے۔ باہر گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ واپس آکر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بے بسی اور لاچاری کے احساس سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ دن دہاڑے اغوا ہو جائے گی۔

شام چار بجے جب وہ بیوٹی پارلر سے نکل کر پیدل اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک ایک ہائی روف اس کے قریب آکر رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی، ہائی روف کا دروازہ کھلا اور کسی نے اسے اندر کھینچ لیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ اغوا کاروں کے نرغے میں تھی۔ ہائی روف میں کل تین افراد تھے۔ ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اور دو پچھلی سیٹوں پر تانیہ کو قابو کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک نے کلوروفارم میں بسا ہوا رومال نکالا اور تانیہ کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ لمبا تڑنگا لمبوترے چہرے والا شخص تھا۔ اس کا سر گاڑی کی چھت سے ٹکرا رہا تھا۔ تانیہ نے حواس گم ہونے سے پہلے بہت ہاتھ پاؤں چلائے مگر اس شخص کی گرفت مضبوط تھی۔ تانیہ کی ہر کوشش ناکام رہی بالآخر وہ اس کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد اس نے خود کو اس کمرے میں پایا۔ اسے رہ رہ کر اپنی ماں کی پریشانی کا خیال ستا رہا تھا۔ اس کا ہینڈ بیگ اور موبائل فون بھی اغوا کاروں کے پاس تھا۔ ماں کے خیال سے اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔ اپنی عزت کا دفاع کرنا جانتی تھی۔ بس ماں کی پریشانی کا خیال اسے کمزور کر رہا تھا۔ تمام پریشان کن خیالات کی تیز دھوپ میں ایک خیال اچانک سایہ بن کر لہرایا۔ وہ یہ کہ اس کی ماں نے شاکر کے ساتھ ضرور رابطہ کیا ہوگا اور شاکر اسے ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کو بھی تسلیاں دے رہا ہوگا۔ وہ کافی دیر خیالات کے ہجوم میں گھری رہی۔ معاً باہر کہیں کھٹکا ہوا۔ وہ چونک کر اٹھی اور دروازے کی طرف بھاگی۔ کسی کے قدموں کی آہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی پھر معدوم ہوگئی۔ شاید آنے والے چلتے ہوئے اچانک رک گئے تھے۔ تانیہ کی تمام حسیات سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہوگئیں۔ قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ دروازے کی طرف آرہے تھے۔ تانیہ جلدی سے بیڈ کے نیچے چھپ گئی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ باہر دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی دروازہ کھول کر ایک آدمی اندر آیا اس کی صرف ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ وہ شخص آگے بڑھا اس کے پیچھے ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوا۔ پہلے اندر آنے والے شخص نے پینٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی جب کہ دوسرے نے شلوار قمیص۔ تانیہ ٹھٹھری بنی دم سادھے بیٹھی رہی۔

''تانیہ یہاں تو نہیں ہے۔'' دونوں میں سے ایک نے کہا۔

تانیہ وہ آواز لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتی تھی۔ ''یہ تو شاکر کی آواز ہے۔'' اس نے خوش ہو کر سوچا۔

اس سے پہلے کہ تانیہ بیڈ کے نیچے سے نکلتی، دوسرے شخص کی آواز سنائی دی۔ ''صاحب جی! لڑکی کہاں جا سکتی ہے؟ وہ بے ہوش تھی اور میں نے خود اسے اس بیڈ پر لٹایا تھا۔'' اس شخص نے لمحاتی توقف کیا پھر بولا۔ ''میں نے آپ کے سامنے دروازہ کھولا ہے باہر سے کنڈی میں تالا لگا ہوا تھا۔'' وہ شخص جو خالد مکرانی تھا اچانک چپ ہوگیا۔ دوسری طرف کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔

تانیہ بیڈ کے نیچے سے باہر نکل آئی۔ شاکر اور مکرانی تانیہ کو بیڈ کے نیچے سے نکلتا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تانیہ مکرانی کی موجودگی کی پروا کیے بغیر شاکر سے لپٹ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔ شاکر اسے تسلی دینے لگا۔ خالد مکرانی نے کہا۔ ''آپ لوگ جلدی سے باہر آجائیں یہاں زیادہ دیر رکنا خطرے سے خالی نہیں۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

سکندر غصے میں آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ وہ ایک کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے صوفے پر بیٹھ گیا، کچھ دیر بیٹھا وہ دانتوں سے اپنے ناخن کترتا رہا، پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ گاہے گاہے وہ بیرونی دروازے کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ شانی ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ چند اسلحہ بردار کمرے میں آئے اور ایک طرف لائن میں

کھڑے ہوگئے۔ سکندر نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سب کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

''کسی کام کے نہیں ہو تم لوگ۔'' سکندر خان اچانک پھٹ پڑا۔ ''اتنے سارے سانڈ صرف جگالی کرنے کے لیے پال رکھے ہیں میں نے، تم صرف ایک شخص کو نہیں ڈھونڈ سکے۔'' لائن میں کھڑے کارندوں سے کہا۔

سکندر عالم طیش میں چلتا ہوا شاقی کے پاس گیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے گرجتے کے سے انداز میں بولا۔ ''بتا! تم سے اس نے فرار کے بارے میں ضرور بات کی ہوگی، وہ زیادہ تر تمہارے ساتھ رہتا تھا۔'' شاقی جو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا، بالوں سے پکڑے جانے پر شدتِ درد سے بلبلانے لگا۔

''سکندر! میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ مجھے نہیں پتا وہ فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا سوائے اس بات کے کہ وہ آج شام کو تم سے چھٹی لینے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔'' سکندر نے اس کے بالوں کو دو تین جھٹکے دیے پھر بال چھوڑ دیے۔ درد کی اذیت سے شاقی کا چہرہ بگڑ گیا۔ سکندر خان نے کارندوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جلدی سے جمعہ خان کا نمبر ملاؤ، کافی دیر سے اس کی کال نہیں آئی مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

ایک کارندے نے موبائل فون جیب سے نکالا اور جمعہ خان کا نمبر ڈائل کر کے فون کان سے لگا لیا۔ آپریٹر کی آواز سنتے ہی سکندر خان سے مخاطب ہوا خان جی اس کا موبائل بند ہے۔''

سکندر ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی اگنیشن میں لگائی ہی تھی کہ ... موبائل کی بیل بجنے لگی۔ موبائل جیب سے نکال کر اسکرین پر نمبر دیکھا، چیف کی کال آرہی تھی۔ کال ریسیو کرتے ہی اس کے ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے کچھ ہدایات دی گئیں۔ وہ پہلے ہی جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے کال ڈراپ کر کے غصے میں موبائل فون ڈیش بورڈ میں رکھا اور گاڑی سے اتر گیا۔ اس کے کارندے اسے گاڑی سے اترتا دیکھ کر بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ تمام کارندوں میں سے چند کو جمعہ خان کی طرف کے حالات جاننے کا حکم دیا اور باقیوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے کھنڈرات کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں چیف اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

مکرانی کو شہر کے پرانے علاقے کی ایک سڑک کے پاس اتارتے ہوئے شاکر علی نے کہا۔ ''تم اپنے گھر والوں کو محفوظ مقام پر چھوڑ کر کل صبح آٹھ بجے پیراڈائز پارک میں آجانا، میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔''

خالد مکرانی نے خدا حافظ کہا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

تانیہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اسے ماں کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔

''ہم کتنی دیر میں امی کے پاس پہنچ جائیں گے؟'' اس نے شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بس پندرہ منٹ تک ہم ان کے پاس ہوں گے، تم آنٹی کو کال کر کے کہہ دو کہ ضروری تیاری کر لیں ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رکیں گے۔'' شاکر نے موبائل فون تانیہ کے ہاتھ میں دے کر گاڑی آگے بڑھائی۔

تانیہ نے ماں کو کال کرنے کے بعد پوچھا۔ ''ناصر کے قتل کیس میں کوئی پیش رفت ہوئی؟''

''پولیس تو ابھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔'' پھر لحاتی توقف کے بعد بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''البتہ میں نے اپنے طور پر کچھ ثبوت اکٹھے کیے ہیں، امید ہے بہت جلد میں قاتلوں تک پہنچ جاؤں گا۔''

تانیہ نے حیرت اور خوشی سے شاکر کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیسے ثبوت؟''

شاکر نے کہا۔ ''تفصیل تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا، فی الحال اتنا بتا سکتا ہوں کہ ناصر یزدانی کا موبائل فون میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔''

تانیہ اس کی بات کے جواب میں خاموش رہی۔

شاکر نے تانیہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس ناصر کے قاتل آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائیں اور امی ابو بھی آسٹریلیا سے واپس آجائیں پھر امی کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔''

تانیہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ شاکر کی بات سن کر اس کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے۔ وہ شرما کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ باقی کا سفر خاموشی سے گزر گیا۔

تانیہ کی امی ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ بیٹی کو سلامت اور خوش دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئی تھیں۔ وہ بار بار تانیہ کا ماتھا چوم رہی تھیں اور شاکر کی بلائیں لے رہی تھیں۔ انہوں نے شاکر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! کتنی خوش نصیب ہے وہ ماں جس نے تمہارے جیسے بیٹے کو جنم دیا ...'' آنسو ان کی آنکھوں سے نکلے دراں کے آنچل

میں گم ہوگئے، انہوں نے بڑھ کر شاکر کی پیشانی چوم لی۔

شاکر نے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''آنٹی میں آپ کا بھی بیٹا ہوں، مجھے آپ ہمیشہ اپنے ساتھ پائیں گی۔''

پھر وہ تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''جلدی سے آنٹی کو لے کر باہر آجاؤ۔'' وہ تانیہ اور اس کی ماں کا بیگ لے کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد تانیہ ماں کو لے کر باہر آگئی۔ ان کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد شاکر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک طرف روانہ ہوگیا۔ ان کی منزل شہر کا علاقہ قاسم آباد تھا۔

تانیہ اور آنٹی کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک ہوٹل میں کمرا بک کروایا اور رینٹ اے کار والوں کو پہلے والی گاڑی واپس کرکے دوسری گاڑی لے لی۔ یہ ایک مضبوط ساخت کی لینڈ روور تھی جو بہترین حالت میں تھی اور چلتے وقت فل اسپیڈ میں بھی پُرسکون رہتی تھی۔ شاکر علی جب ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ وہ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے اتنا تھکا ہوا تھا کہ ناصر یزدانی کا موبائل فون چارجنگ پر لگانے کے بعد لیٹتے ہی سو گیا۔

☆☆☆

چیف آج ہی بچوں کے آپریشن کر کے اُن کے اعضا نکالنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اسے ایک کال موصول ہوئی۔۔۔۔ ''آپریشن ایک دو دن کے لیے موخر کردو اور کل بارڈر سے کچھ تربیت یافتہ ''مال'' وصول کر کے انہیں ملک کے تمام صوبوں میں پہنچا دو۔'' چیف نے کال کرنے والے کے احکامات توجہ سے سنے پھر فون ایک کان سے دوسرے کان پر رکھتے ہوئے بولا۔''ٹھیک ہے جناب میں دو دن تک آپریشن نہیں کرتا، آپ اس بار کتنا مال بھیج رہے ہیں؟''

دوسری طرف سے مال کی تعداد بتائی گئی جسے سن کر چیف کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ چیف کے تمام بُرے کاموں میں سے سب سے زیادہ بُرا کام یہ بھی تھا کہ وہ سرحد کے اِس پار سے بارہ سے پندرہ سال کے بچوں کو اغوا کر کے سرحد کے اُس پار بھیجتا تھا جنہیں دہشت گردی اور خودکش حملوں کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔

تربیت کے بعد ان بچوں کو واپس بھیج دیا جاتا تھا اور انہیں ملک کے تمام حصوں میں پھیلا دیا جاتا تھا۔ جہاں وہ پبلک پوائنٹس، اسکولوں اور مزاروں کو نشانہ بناتے تھے۔ دورانِ تربیت ان بچوں کو مسلسل ایسے انجیکشنز لگائے جاتے تھے کہ وہ اپنا ماضی یکسر بھول جاتے تھے۔ یہ کام ایسا ہی تھا جیسے ایک کمپیوٹر کا پرانا ڈیٹا ختم کر کے نیا ڈیٹا انسٹال کیا جائے۔ وہ بچے بھی جب تربیت لے کر آتے تھے تو ان کے ذہن میں صرف ایک ہی بات ہوتی تھی کہ اپنے آقا کی حکم عدولی گناہِ عظیم کے مترادف ہے۔

چیف کو اِس کام کے عوض لاکھوں ڈالرز ملتے تھے۔

اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔''آپریشن دو دن کے لیے ملتوی کر دیا ہے لہٰذا فی الحال آپریشن کی تیاریاں روک دی جائیں۔'' پھر اس نے سکندر اور اس کے آدمیوں کو بھی بلوا لیا اور ان کے انتظار میں راہداری میں ٹہلنے لگا۔ وارڈ میں موجود تمام بچوں پر غنودگی طاری تھی۔ کیونکہ کچھ دیر قبل انہیں جسم سن کر دینے والے انجیکشنز لگائے گئے تھے۔ بچے جو دنیا کے گلشن میں پھولوں کے مانند ہوتے ہیں، اس وقت ایک انسان نما درندے کے رحم و کرم پر تھے۔ جو اس سے پہلے سیکڑوں بچوں کے اعضا نکال کر انہیں موت کی نیند سلا چکا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے موبائل پر سکندر کا میسج موصول ہوا۔ ۔۔۔''ہم کھنڈرات کے پاس پہنچنے والے ہیں بتاؤ کہاں ملنا ہے؟''

چیف اپنے تین چار آدمیوں کے ساتھ تہ خانے سے باہر نکل گیا اور پندرہ منٹ پیدل چلتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں سرکنڈوں سے بنی دو جھونپڑیاں تھیں۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ رات کا سناٹا ماحول پر چادر کی طرح تنا ہوا تھا۔ نظر کی آخری حد پر شمال کی طرف روشنی کے دو نقطے سے نمودار ہوئے جو لحظہ بہ لحظہ بڑے ہوتے گئے۔ امکان غالب تھا کہ وہ سکندر کی گاڑی ہے۔ چند منٹ بعد ایک گاڑی کچھ دور آکر رک گئی۔ گاڑی کے ڈرائیور نے باہر نکل کر ایک جیبی لیزر ٹارچ جلا کر روشنی دائرے میں گھمائی۔ چیف سمجھ گیا کہ یہ سکندر ہے۔ اس نے بھی جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی اس کی روشنی سبز رنگ کی تھی۔ اس نے بھی روشنی دائرے میں گھمائی جس کا مطلب گرین سگنل تھا۔

سکندر اپنے آدمیوں کے ساتھ چلتا ہوا اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں چیف اور اس کے آدمی کھڑے تھے۔

رسمی سلام دعا کے بعد وہ کھنڈرات کی طرف بڑھ گئے۔

کھنڈرات میں پہنچ کر سکندر خان نے چیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''ایک تو مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ تم ہر بار میٹنگ ان کھنڈرات میں کیوں رکھتے ہو؟'' وہ چیف کی زیرزمین سرگرمیوں سے ناواقف تھا۔

چیف کچھ دیر سکندر خان کی طرف دیکھتا رہا پھر ہنستے ہوئے بولا۔''تم نے نوٹ کیا ہوگا یہاں کا ماحول پُرسکون ہے

دور دور تک کوئی غیر متعلقہ بندہ نہیں ہوتا، کام کی باتیں ایسے ہی الگ تھلگ اور پُرسکون ماحول میں ہونی چاہئیں۔‘‘

چیف کی بات کے جواب میں سکندر زیرِ لب مسکراتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ اصل موضوع کی طرف آگئے۔ اس دوران شراب کے جام بھی چڑھائے گئے۔ چیف نے اسے ساری بات سمجھائی اور تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ’’کل رات بارڈر پر متعین گارڈز کی تبدیلی کے وقت ’’مال‘‘ کی وصولی عمل میں لائی جائے گی، لہٰذا ہر پل چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔‘‘

سکندر نے اسے محتاط رہنے کی یقین دہانی کروائی اور اپنے آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔

جب سکندر خان کی گاڑی کی عقبی بتیاں بھی نظر سے اوجھل ہوگئیں تو چیف اپنے آدمیوں سمیت تہ خانے میں چلا گیا۔

☆☆☆

شاکر علی کی آنکھ صبح سات بجے کھلی۔ گزشتہ دن کی بھاگ دوڑ نے اس کے اعصاب ڈھیلے کردیے تھے۔ اس نے انٹرکام پر چائے کا آرڈر دیا اور ناصر یزدانی کے موبائل فون سے چارجر کی پن نکال کر واش روم میں چلا گیا۔ ٹھنڈے پانی سے نہا کر باہر نکلا تو اس کی ساری کسلمندی دور ہوچکی تھی۔

جب ویٹر چائے دے کر چلا گیا تو اس نے دروازہ بند کرکے چٹخنی لگادی اور ناصر کا موبائل آن کرلیا۔

سب سے پہلے اس نے فون کی گیلری کی تصویریں دیکھنا شروع کیں۔ ساتھ ساتھ وہ چائے کے سپ بھی لے رہا تھا۔

زیادہ تر تصاویر ناصر یزدانی کے اشاعت شدہ کالموں کی تھیں۔ ایک فولڈر کی تصاویر دیکھنے کے بعد شاکر علی نے دوسرا فولڈر کھولا اس میں بھی ناصر کی کچھ تصاویر دوستوں کے ساتھ تھیں اور کچھ کولیگز کے ساتھ۔

تصاویر والے فولڈرز دیکھنے کے بعد شاکر نے نوٹ پیڈ کی ایپ کھولی۔ اس ایپ کے ایک فولڈر کی تحریر کے عنوان نے اسے چونکا دیا۔ ’’بچے ہمارے عہد کے۔‘‘ شاکر نے موجودہ حالات کے تناظر میں سوچا یہ عنوان اس حوالے سے گہری معنویت کا حامل تھا۔ اس کی چائے ختم ہوچکی تھی اس نے خالی کپ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور متجسس ہوکر وہ فولڈر کھولا تو ایک چند سطری تحریر سامنے آگئی۔ جو خبر کی صورت میں تھی۔

اس تحریر میں بچوں کے اغوا اور اغوا کے بعد ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر روشنی ڈالی گئی تھی اور لکھا تھا کہ بہت جلد اغوا کاروں کی تصاویر اور ویڈیوز الیکٹرونک میڈیا اور پرنٹ میڈیا پر سامنے لائی جائیں گی۔ شاکر نے وہ فولڈر بند کردیا اور چند لمحے خبر کی آخری سطر کے بارے میں سوچنے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے سائڈ پر لگا بٹن دبا کر اسکرین روشن کی اور موبائل فون میں انسٹال ایپس کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظر والٹ کی ایپ پر پڑی، اس نے وہ ایپ کھولی لیکن اسے مایوسی ہوئی اس ایپ پر پاس ورڈ لگا ہوا تھا۔

اس نے اندازے سے کچھ نمبر ملائے لیکن ایپ نہیں کھلی۔

اچانک اسے ناصر کے اے ٹی ایم کارڈ کا پاس ورڈ یاد آیا جو ایک مرتبہ اے ٹی ایم سے پیسے نکالنے کے لیے ناصر نے اسے بتایا تھا۔ شاکر نے امید نا امیدی کے ساتھ وہ پاس ورڈ ملایا تو ایپ کھل گئی۔ شاکر کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے۔ ایپ کے فولڈرز میں تصاویر اور ویڈیوز کا ایک جہان آباد تھا۔ سب سے پہلے اس نے تصاویر والا فولڈر کھولا۔ پہلی، دوسری اور تیسری تصویر غیر متعلقہ تھی۔

چوتھی تصویر دیکھ کر ناصر چونک گیا۔ وہ تصویر ایک بچے کی تھی جس کی آنکھیں بند تھیں، اس پر ایک شخص جھکا اس کا پیٹ چاک کررہا تھا۔ پیٹ چاک کرنے والے کی پیٹھ نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ مزید چند تصاویر بھی اس قسم کی تھیں وہی شخص مختلف بچوں کے پیٹ چاک کرکے ان کے اعضا نکال رہا تھا۔ ہر تصویر میں اس شخص کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔

شاکر نے تصاویر والا فولڈر بند کرکے ویڈیوز والا فولڈر کھول لیا۔ ایک ایک، دو دو اور چار چار منٹ کے آٹھ ویڈیو کلپ تھے۔ جب کہ ایک کلپ پندرہ منٹ دورانیے کا تھا۔

شاکر نے چار منٹ والی ویڈیو پلے کی۔

وہ ویڈیو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے اس کے مساموں سے نمودار ہوگئے۔ اس ویڈیو میں ایک دس سالہ بچے کا پیٹ چاک کرکے بڑی بے دردی سے انتڑیاں باہر نکال کر ایک طرف رکھی ڈسٹ بِن میں ڈال دی گئیں۔ بعد ازاں آنکھیں اور گردے بھی نکال لیے گئے جنہیں کوئی کیمیکل لگا کر پولی تھین کے لفافوں میں ڈال کر فریزر میں رکھ دیا گیا۔ شاکر یہ منظر دیکھ کر لرز کر رہ گیا۔ بے اختیار اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور باقی کی ویڈیوز دیکھنے لگا۔ ہر ویڈیو میں دل کو درد سے بھر دینے والے مناظر تھے۔ بے ہوشی کی حالت میں معصوم بچوں کے جسموں کی چیر پھاڑ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے شاکر علی کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

وہ کچھ دیر موبائل فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن ان ویڈیوز میں معصوم بچوں کے ساتھ درندگی کے مظاہرے نے اس کے اعصاب سن کر دیے تھے۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔

بالآخر وہ اٹھا، پانی کی بوتل فریج سے نکالی اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گیا۔

وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھا اور پندرہ منٹ والی ویڈیو چلے کی۔ اسکرین پر کچھ دیر اندھیرا چھایا رہا پھر اچانک ایک منظر سامنے آیا جیسے کسی نے ایک دم سے کیمرے کے لینز کے اوپر رکھی انگلی اٹھا لی ہو۔ وہ ریتیلے ٹیلوں کا منظر تھا۔ کیمرا دائرے میں گھومتا ہوا ایک جگہ پر رک گیا۔ دور دو دھبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ان دھبوں کو زوم کر کے دکھایا گیا۔ وہ سرکنڈوں سے بنی دو جھونپڑیاں تھیں۔ کیمرا ایک بار پھر نیم دائرے میں گھوما اور ایک جگہ پر رک گیا۔ چند گز کے فاصلے پر شکستہ کھنڈرات نظر آرہے تھے۔ کیمرے والا آدمی جو ناصر یزدانی تھا، ان کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ گاہے گاہے اردگرد کے منظر بھی دکھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کھنڈرات کے شکستہ در و بام دکھائی دینے لگے۔ ناصر یزدانی مختلف بھول بھلیوں سے ہوتا ہوا ایک مچان نما دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سامنے ایک راستہ سا نظر آرہا تھا جو کچھ فاصلے پر ایک طرف مڑ جاتا تھا۔ کیمرا کچھ دیر اس راستے کی عکاسی کرتا رہا۔ پھر کچھ آوازیں سنائی دینے لگیں جو لحہ بہ لحہ واضح ہوتی گئیں، وہ مختلف لوگوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ پھر اس موڑ سے ایک شخص نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں جدید ساخت کی گن تھی۔ وہ چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد گردسی اٹھی چند مزید لوگ سامنے آئے جن میں بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ مختلف عمروں کے بچے تھے۔ جن کے پیچھے مسلح افراد چل رہے تھے۔ ان سب کے پیچھے ایک اور شخص نمودار ہوا جس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ شخص کچھ دیر کے لیے وہاں رکا۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں اور آگے بڑھ گیا۔ اس کا انداز مشکوک تھا۔ شاکر اس شخص کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس کا چہرہ شاکر کو جانا پہچانا لگا۔ اس نے ویڈیو تھوڑی سی ریوائنڈ کی اور اس جگہ روک دی جہاں اس شخص کا چہرہ واضح نظر آرہا تھا۔

شاکر نے زوم کر کے اس کے چہرے کا اسکرین شوٹ لیا اور ویڈیو وہاں سے چلے کی جہاں سے ریوائنڈ کی تھی۔ چند لمحے بعد کیمرے کا رخ اس طرف ہو گیا۔ جس طرف وہ لوگ گئے تھے۔ وہ سب لوگ ایک دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔

سفاری سوٹ والے نے دیوار کے کونے پر پاؤں کا دباؤ ڈالا تو وہ دیوار ایک طرف کو کھسکنے لگی۔ مسلح افراد بچوں کو لے کر اندر چلے گئے۔ جب سفاری سوٹ والا اکیلا رہ گیا تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک جگہ پر نظریں لگا دیں۔ واضح طور پر اس کی مرکزِ نگاہ کیمرے والی جگہ تھی۔ شاید اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا موبائل فون دیکھ لیا تھا اس نے اندر کی طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی۔ دوری کی وجہ سے آواز تو سنائی نہیں دی لیکن انداز سے لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی کو بلایا ہو۔ آدھے منٹ سے کم وقت میں تین مسلح افراد باہر آئے۔ سفاری سوٹ والے نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اس طرف آنے لگے۔ جہاں ناصر یزدانی بیٹھا ہوا تھا۔ پھر کیمرے میں لرزش پیدا ہوئی اور بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ناصر بھاگ رہا تھا۔ کیمرا کبھی ریتیلی زمین کا منظر پیش کرنے لگتا اور کبھی اردگرد کا۔ بالآخر کیمرے کی اسکرین تاریک ہو گئی اور ویڈیو بھی رک گئی۔ شاکر نے موبائل فون بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور اس ویڈیو کے بارے میں سوچنے لگا۔ یقیناً سفاری سوٹ والے نے ناصر کو وہاں بیٹھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ ناصر نے انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر دوڑ لگا دی۔ بھاگتے بھاگتے ہی اس نے موبائل فون جیب میں ڈالا ہو گا اور قمیص اتار کر جھونپڑی کی ریتیلی زمین میں دفن کر دی ہو گی۔ شاکر نے فون اٹھایا اور سلمان پاشا کو کال کرنے لگا۔

☆☆☆

سکندر خان واپس پہنچا تو چوکیدار کو اپنی جگہ پر نہ پا کر دندناتا ہوا اس کمرے کی طرف بھاگا جہاں تانیہ قید تھی لیکن جب وہ کمرے میں پہنچا تو خالی کمرا دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکل کر چوکیدار کو آوازیں دینے لگا۔

اس کی آواز کے جواب میں خاموشی رہی۔ وہ کچھ دیر کھڑا جمعہ خان کے غیاب کے بارے میں سوچتا رہا۔

اچانک اسے ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی دروازہ دھڑ دھڑایا ہو۔ اس نے آواز کے ماخذ پر غور کیا۔ وہ آواز کچن کی طرف سے آرہی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو چوکیدار رسیوں سے بندھا ایک طرف پڑا پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

اس نے جمعہ خان کو رسیوں سے آزاد کرتے ہوئے پوچھا۔ ”لڑکی کہاں ہے جمعہ خان؟“

جمعہ خان گھٹنوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا پھر ہانپتے ہوئے بولا۔ ”خان جی......! وہ لوگ ام کو رسیوں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے باندھ کر لڑکی کو لے گئے ہیں۔"

سکندر نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ "کون لوگ لے گئے ہیں؟ اور وہ کتنے آدمی تھے؟" وہ دونوں چلتے ہوئے ایک کمرے میں آ گئے۔

"وہ دو آدمی تھے خان جی! ایک خالد مکرانی تھا اور دوسرا اس کے ساتھ پینٹ شرٹ والا جوان آدمی تھا، ظالم کے بچوں نے بہت کس کے باندھا تھا ام کو۔" جمعہ خان اپنے بازو سہلاتے ہوئے بولا۔

مکرانی کا نام سن کر سکندر چونک گیا۔

"جمعہ خان مجھے دوسرے آدمی کا حلیہ بتاؤ جلدی سے۔" جمعہ خان نے ساری بات تفصیل سے بتانے کے بعد کہا۔ "خان جی اس میں امارا غلطی نہیں اے وہ خنزیر کا بچہ امارے ساتھ چالاکی کر گیا اے۔"

سکندر نے ہولسٹر میں لگا ہوا پسٹل نکالا اور جمعہ خان پر تانتے ہوئے پُرطیش لہجے میں بولا۔ "جمعہ خان میرے ساتھ کام کرنے والے بندے کی غلطی کی سزا صرف موت ہے...... صرف موت، دوسری بار اُسے غلطی کی مہلت ہی نہیں ملتی۔"

جمعہ خان، سکندر خان کو مشتعل دیکھ کر گھگیانے لگا۔

"خان جی امارا پہلا غلطی ماف کر دو، ام سے دوبارہ کوئی غلطی نہیں ہوگا۔"

سکندر ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "جمعہ خان ہمارا اور تمہارا سفر یہیں تک تھا، اب اپنے آخری سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

جمعہ خان نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سکندر خان نے ایک جھٹکے سے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا اگلے ہی لمحے ایک سنسناتی ہوئی گولی جمعہ خان کے دل میں گھس گئی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے گرا اور تڑپنے لگا۔ سکندر نے اس پر بس نہیں کیا دو گولیاں مزید داغ دیں۔

پسٹل کے دھماکوں کی آوازیں سن کر سکندر خان کے دو کارندے آئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے جمعہ خان کو تڑپتا ہوا دیکھنے لگے۔ "اسے اٹھا کر ویرانے میں پھینک آؤ اور فرش سے خون صاف کر دینا۔" سکندر نے کارندوں کو حکم دیتے ہوئے کہا اور موبائل جیب سے نکال کر شہر میں موجود کارندوں کو خالد مکرانی اور تانیہ کے گھر کا پتا سمجھاتے ہوئے تاکید کی۔

"اگر وہ گھروں پر نہ ہوں تو ہر اس جگہ تلاش کرو جہاں ان کے ملنے کی امید ہو، ہری اَپ مجھے ایک گھنٹے میں رپورٹ چاہیے۔" اس نے کال ڈراپ کر کے موبائل فون جیب میں ڈالا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

خالد مکرانی گھر والوں سے مل کر بہت خوش تھا۔ وہ ماں کی نظروں میں جتنا آوارہ سہی لیکن تھا تو اس کا بیٹا۔ ناخن بھلا گوشت سے کب الگ ہو سکتا ہے۔ وہ بار بار بیٹے کا منہ ماتھا چوم رہی تھی۔ ماں کی ممتا نے مکرانی کی آنکھیں نم کر دیں۔ "اگر ماں کو میری سرگرمیوں کا علم ہو جاتا کہ میں بچوں کو اغوا کرنے کا کام کرتا رہا ہوں تو وہ تو جیتے جی مر جاتی۔" اس نے گہرے دکھ کے ساتھ سوچا۔

پھر جیب سے رومال نکال کر آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے ماں سے بولا۔ "اماں دس منٹ میں گھر سے جو ضروری چیزیں لینی ہیں لے لو ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

اس کی ماں اور بہن نے بیک وقت اسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"میں پوچھتی ہوں کیا ہو گیا؟ اس کی ماں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "ہائے ہائے کیا قیامت آ گئی، ہم اپنے گھر میں نہیں رہیں گے تو کہاں رہیں گے؟"

مکرانی نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اماں سوال جواب بعد میں کرنا، ابھی وقت ضائع مت کرو! ہم چند دن کے لیے گھر سے جا رہے ہیں ساری زندگی کے لیے نہیں، بس جلدی سے سامان پیک کر لو۔"

ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تاہم وہ خاموشی سے سامان پیک کرنے لگی۔

مکرانی کے چھوٹے بھائی نے معصومیت سے پوچھا۔

"بھائی ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

مکرانی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "منے میں نے اور جگہ پر مکان لیا ہے ہم وہاں جا رہے ہیں۔" منا خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ مکرانی ایک سوزوکی وین لے آیا اور اگلے دس منٹ میں پورا گھرانا رات کے پچھلے پہر مع سامان شہر کے مرکزی حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔

انہیں گئے وہاں سے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے گھر کے قریب ایک کار آ رکی جس میں سے تین افراد باہر نکلے اور مکرانی کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ جلدی سے کار میں بیٹھے اور ایک طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

شاکر، ایس ایچ او سلمان پاشا کے سامنے بیٹھا اسے اور اس کے ساتھ بیٹھے دیگر عہدیداروں کو تفصیل بتا رہا تھا۔ تاہم اس نے اغوا کاروں کے سرغنہ کا نام انہیں نہیں بتایا۔ اس کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ارادہ تھا وہ گرفتاری کے وقت یا عدالت میں اس شخص کو بے نقاب کرے گا۔ اپنی بات مکمل کر کے شاکر چپ ہو گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر سکوت ٹھہرا رہا پھر ایک عہدیدار نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت ہی منظم گروہ ہے جن کا سرغنہ بہت ہی شاطر لگ رہا ہے۔ ہمیں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ اس پر ہاتھ ڈالنا چاہیے۔ ہماری تھوڑی سی غلطی اسے چوکنا کر سکتی ہے۔''

سلمان پاشا نے شاکر کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا۔ ''شاکر صاحب نے صحیح معنوں میں دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے دوست کے قاتلوں کو ڈھونڈ نکالا ہے، اور ان کے بقول ان کے پاس ثبوت بھی ہیں، میں امید کرتا ہوں یہ ہمارے ساتھ مزید تعاون بھی کریں گے، ویلڈن شاکر صاحب میں آپ کو سلیوٹ کرتا ہوں۔'' پاشا نے باقاعدہ اٹھ کر شاکر کو سلیوٹ کیا۔

شاکر نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''پاشا صاحب میری ایک خواہش ہے اگر آپ میری وہ خواہش پوری کر دیں گے تو میں آپ کا بےحد ممنون ہوں گا۔''

سلمان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''شاکر صاحب میں آپ کی ہر بات آنکھیں بند کر کے ماننے کے لیے تیار ہوں، آپ حکم کریں۔''

شاکر کچھ دیر اُسے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میری خواہش ہے کہ اغوا کاروں اور ناصر کے قاتلوں کی گرفتاری اور عدالتی کارروائی سے پہلے میڈیا کو پتا نہیں چلنا چاہیے، خبر بریک ہوگئی تو ان کی گرفتاری سے پہلے کئی مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں، یہ معاملہ حساس نوعیت کا ہے، ہماری چھوٹی سی غلطی معصوم بچوں کی زندگی کے لیے خطرہ بن جائے گی جو اُن کے نرغے میں ہیں۔''

شاکر نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ ''چھاپے کے لیے کون سا وقت ٹھیک رہے گا؟''

ایک دوسرے عہدیدار نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اغوا کاروں کی گرفتاری میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے، میرے خیال سے آج رات نو بجے کے بعد چھاپا مارنا چاہیے۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ باری باری سب کو دیکھنے لگا۔

وہاں بیٹھے تمام افراد نے اس کے خیال کی تائید کی اور مزید لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔

☆☆☆

سورج اپنی تمازت کھو کر غروب ہو گیا تھا۔ صحرائی ٹیلوں پر شام کے سائے ملگجے اندھیرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ چیف ایک ٹیلے پر بیٹھا۔ ''مال'' کی وصولی کے طریقۂ کار پر غور کر رہا تھا۔ اس بار سرحد پار سے بھیجے جانے والے تربیت یافتہ بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن اس کام کے عوض ملنے والی رقم لاکھوں ڈالر میں تھی۔ رقم کا تصور ذہن میں آتے ہی چیف کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ رقم ملنے کے بعد اس کا ارادہ اس کام کو چھوڑنے کا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یورپ یا امریکا جا کر سیٹل ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے یہاں کے جائز و ناجائز کاروبار کا دائرہ محدود کر دیا تھا۔ اس نے امریکا اور یورپ کی مختلف کمپنیز کے شیئرز خریدنے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ وہ کافی دیر سہانے مستقبل کے تانے بانے بُنتا رہا۔

شام کا اندھیرا شب کی سیاہی میں ڈھل گیا تو اس نے اپنی ریڈیم ڈائل کی گھڑی میں وقت دیکھا۔

آٹھ بج گئے تھے۔ وہ اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کھنڈرات کی طرف جانے لگا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے آدمیوں کو تیار ہونے کے لیے کہا پھر جیب سے موبائل نکال کر سکندر کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے بات کرنے لگا۔

سکندر نے آدھے گھنٹے میں اپنے آدمیوں سمیت پہنچنے کا بتایا۔ چیف نے کال ڈراپ کر کے موبائل فون جیب میں ڈالا اور وارڈ کی طرف چل پڑا۔

مغوی بچے سہمے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ناکافی خوراک...... خوراک میں عدم دلچسپی اور خوف کی وجہ سے بچوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ ایک بچے نے ڈرتے ڈرتے چیف سے کہا۔ ''انکل ہمیں اپنے امی ابو کے پاس چھوڑ آئیں، ہمیں ان کی بہت یاد آتی ہے۔''

چیف کچھ دیر اس بچے کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''ضرور بیٹا! پرسوں تم سب کی یہاں سے رخصتی کا دن ہے۔'' وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوا پھر تمام بچوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''پرسوں تم سب کو یہاں سے رخصت کر دوں گا۔'' بات مکمل کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ بچے اس کی بات کی معنویت نہ سمجھ سکے، رخصتی کا لفظ سن کر وہ سمجھ بیٹھے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ خوش ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔

چیف کچھ دیر زیرِ زمین طویل راہداری میں ٹہلتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

ٹمٹماتے ہوئے تاروں بھری رات کا فسوں فضا پر اپنا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تسلط جما چکا تھا۔ چیف کو موبائل پر میسج کی بیپ سنائی دی۔

اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ سکندر کا میسج تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''ہم احسان گڑھ سے نکل آئے ہیں اپنے آدمیوں سمیت پوری تیاری کر لو، ضرورت سے زیادہ تاخیر مشکلات کا سبب بن سکتی ہے۔''

چیف نے جوابی پیغام ٹائپ کر کے موبائل دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور چلتا ہوا اس راستے پر جا کھڑا ہوا جس راستے سے سکندر اپنے آدمیوں سمیت آنے والا تھا۔ کچھ دیر بعد احسان گڑھ کی طرف سے آنے والے راستے پر کچھ روشنی کے نقطے سے نمودار ہوئے۔ چیف سمجھ گیا کہ سکندر اپنے آدمیوں کے ہمراہ پہنچ چکا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اس طرف دیکھنے لگا جہاں روشنی کے نقطے نمودار ہوئے تھے جو اب بڑھ کر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کا پتا دے رہے تھے۔ وہ تعداد میں تین گاڑیاں تھیں۔

کچھ دیر بعد گاڑیاں اس جگہ سے کچھ آگے جا کر رک گئیں جہاں کچھ دیر پہلے چیف کھڑا ہوا تھا۔ ان گاڑیوں میں ایک جیپ تھی، ایک منی پجیرو اور ایک ڈمپر ٹرک تھا۔ منی پجیرو سے اترنے والے ایک شخص نے جیب سے لیزر لائٹ نکال کر آسمان کی طرف دائرے میں گھمائی۔ چیف سمجھ گیا کہ یہ سکندر ہے اس نے بھی جیب سے سبز روشنی والی لیزر لائٹ نکال کر دائرے میں گھمائی اور ٹیلے سے اتر کر سکندر کے پاس پہنچ گیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد چیف نے تین گارڈز کھنڈرات اور تہ خانے کی نگرانی کے لیے چھوڑے اور باقی آدمیوں کو لے کر سکندر خان کے ساتھ منی پجیرو میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے اور سکندر خان کے آدمی جدید اسلحے سے لیس تھے۔ جب چیف کے آدمی ڈمپر ٹرک میں بیٹھ گئے تو تینوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئیں اور وہ قافلہ وہاں سے سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ تعداد میں تین گاڑیاں تھیں۔ ایک کار، ایک لینڈ روور، ایک منی بس۔ سب سے آگے والی کار پھولوں سے سجی ہوئی تھی، اس میں دو آدمی سوار تھے۔ پسنجر سیٹ پر ایک شخص دولھا کے روپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پیچھے والی گاڑی لینڈ روور میں بھی تین آدمی سوار تھے۔ وہ سب کی سب ائر کنڈیشنڈ گاڑیاں تھیں جن کے شیشے سیاہ رنگ کے تھے، یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ گاڑیوں میں کون سوار ہیں۔ مجموعی طور پر وہ قافلہ ایک برات کا تاثر دیتا تھا۔ تمام گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی احسان گڑھ کے قصبے میں ایک جگہ پر رکیں۔ دولھا والی کار سے ایک شخص اترا اور چلتا ہوا ایک کولڈ کارنر سے چند ٹھنڈے جوس کے پیک خرید لایا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ قافلہ پھر چل پڑا۔ صحرائی ٹیلوں کی آمد پر وہ قافلہ ایک بار پھر رک گیا۔ دولھے والی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک شخص اترا اور لینڈ روور کے پاس آیا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور چلتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ لینڈ روور سے اترنے والا شخص بھی اس کے پیچھے چلتا ہوا ٹیلے پر چڑھ گیا۔ ٹیلے پر چڑھنے والے دونوں افراد میں سے ایک شاکر تھا اور دوسرا سلمان پاشا۔ وہ دونوں اندازے سے افق پر کچھ دیکھ رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں نگاہیں دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں لیکن ان دونوں کی مرکزِ نگاہ افق پر پھیلی روشنی پر تھی۔ کچھ دیر بعد آسمان پر ایک سرخ رنگ کی روشنی لہرائی اور بجھ گئی۔ اس کے پانچ سیکنڈ بعد فضا میں سبز رنگ کی روشنی دائرے میں گھومی اور بجھ کر اندھیرے کا حصہ بن گئی۔

شاکر علی نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''پاشا صاحب! یہ روشنیاں کیسی تھیں؟''

پاشا زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ٹریفک کے قوانین کے مطابق سرخ روشنی اور سبز روشنی کی بڑی اہمیت ہے۔ سگنل پر جب بتی سرخ ہوتی ہے تو گاڑیاں رک جاتی ہیں پھر جب سبز ہوتی ہے تو گاڑیاں چل پڑتی ہیں۔ انہی قوانین کی روشنی میں جرائم پیشہ افراد نے بھی کچھ اشارے بنائے ہوئے ہوتے ہیں جن سے وہ رات کی تاریکی میں ایک دوسرے کی شناخت کرتے ہیں۔'' پاشا کچھ دیر کے لیے رکا پھر سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پولیس کی نوکری میں میرا تجربہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جرائم پیشہ افراد ایک دوسرے کی پہچان کے لیے کچھ کوڈ ورڈز، کچھ اشارے بنا لیتے ہیں۔'' پھر دور افق پر روشنی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ جو ہلکی ہلکی سی روشنی، روشنی کے بے قاعدہ انعکاس کی وجہ سے نظر آ رہی ہے وہ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی ہو سکتی ہے کیونکہ روشنی ایک جگہ پر ساکت نہیں متحرک ہے۔''

پاشا اپنی بات مکمل کر کے چپ ہو گیا۔

وہ ٹیلے سے اتر کر نیچے گیا تمام گاڑیوں کے ڈرائیورز کو ہدایات دینے لگا کہ ''گاڑیاں سامنے والے ٹیلے کے نشیب میں اتار کر ایسی جگہ کھڑی کی جائیں کہ سڑک سے وہ نظر نہ آئیں۔ جب گاڑیاں ٹیلے کی اوٹ میں پارک ہو گئیں تو پاشا نے اس راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ''آپ لوگ ایک فرلانگ دور جا کر اس راستے کے متوازی چلنا شروع کر دیں، اور کسی بھی خطرناک صورت حال میں مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ اب آپ جائیں اور اپنے موبائل

فون وائبریشن موڈ پر لگالیں، اس ویرانے میں موبائل فون کی بیل دشمن کو چوکنا کرسکتی ہے۔ ہری اپ ناؤ گو۔" سپاہیوں نے اپنی رائفلوں پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور چل پڑے۔

☆☆☆

سپاہیوں کو ہدایات دینے کے بعد اس نے منی بس کے ڈرائیور اور کلینر سے کہا۔ "آپ دونوں گاڑیوں کے پاس رکیں اور کسی گڑبڑ کی صورت میں مجھ سے رابطہ ضرور کیجیے گا۔" ڈرائیور اور کلینر دونوں پولیس کے آدمی تھے۔ اور دونوں ہی با اعتماد تھے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ باقی افراد میں پاشا سمیت پانچ آدمی تھے۔ سلمان پاشا، شاکر علی، خالد مکرانی اور دو پولیس اہلکار۔ پانچ افراد کا قافلہ کھنڈرات کی طرف چلنے لگا۔ سب سے آگے شاکر تھا۔ کیونکہ کھنڈرات کی طرف جانے والے راستہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ باقی لوگ اس کے پیچھے آگے بڑھتے رہے۔ دو گھنٹے صحرائی راستے کی خاک چھانتے ہوئے جھونپڑیوں کے پاس پہنچ گئے۔ ستاروں کی پھیکی پھیکی روشنی میں وہاں سے تین سو گز دور کھنڈرات پُراسرار لگ رہے تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔

پاشا نے دونوں پولیس اہلکاروں اور مکرانی کو وہیں رکنے کے لیے کہا اور انہیں بھی کسی صورتِ حال میں رابطہ کرنے کی تاکید کی پھر شاکر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "چلیں شاکر صاحب!" دونوں چوکنے ہو کر کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگے۔ دونوں کے ہاتھ میں جدید ساخت کے پسٹل تھے اور ایک ایک فاضل میگزین جیبوں میں تھا۔ کھنڈرات کے قریب پہنچ کر دونوں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ تاریکی میں ڈوبے کھنڈرات میں دو تین چمگادڑیں اڑیں اور ایک طرف پرواز کر گئیں۔ وہ پیٹھ سے پیٹھ ملا کر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد چند ہیولے سے کھنڈرات کی جانب بڑھتے دکھائی دیے۔

"شاکر صاحب کچھ لوگ اس طرف آرہے ہیں، الرٹ ہوجائیں۔" پاشا نے دھیمی آواز میں کہا اور جلدی سے ایک پلر کی اوٹ میں چھپ کر اس طرف دیکھنے لگا۔ شاکر بھی ایک پلر کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا۔ ہیولے مزید نزدیک آگئے۔ پاشا نے پسٹل پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ ہیولے لحظہ بہ لحظہ نزدیک ہورہے تھے۔ جب وہ قریب آگئے تو پاشا نے انہیں پہچان لیا وہ پولیس کے چار سپاہی تھے۔ جو متبادل راستے سے وہاں پہنچے تھے۔ پاشا نے آہستگی سے ٹیم کے سربراہ کو آواز دی اور ان کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ چاروں اتنے چوکنے تھے کہ آواز سنتے ہی رائفلیں آواز کے ماخذ پر تان لیں لیکن جب پاشا کو دیکھا تو رائفلیں نیچے کرلیں۔

"سناؤ بھئی کوئی پیش رفت ہوئی۔" پاشا نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

ٹیم کے سربراہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک کسی سے ٹاکرا نہیں ہوا۔"

سلمان پاشا جھونپڑیوں کے پاس گیا اور وہاں کھڑے دو پولیس اہلکاروں کو اردگرد نظر رکھنے کو کہا اور خالد مکرانی کو ساتھ لے کر آگیا۔

"شاکر صاحب آپ نے یہاں کے کسی خفیہ دروازے کا ذکر کیا تھا، وہ کس طرف ہوسکتا ہے؟" پاشا نے شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شاکر نے اردگرد نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "وہ خفیہ دروازہ کھنڈرات کی قدرے بلند دیواروں کے عقب میں ہوسکتا ہے۔"

سلمان پاشا نے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ اس طرف سے کھنڈرات کے عقب میں آئیں۔" اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا اور خود شاکر علی اور خالد مکرانی کو اشارہ کرتا ہوا مخالف سمت میں چل پڑا۔ وہ چلتے ہوئے کھنڈرات سے نکل کر ایک پگڈنڈی کی طرف مڑ گئے، وہ پگڈنڈی بہت آگے کہیں چلی گئی تھی۔ وہ پگڈنڈی کی سیدھ میں نہیں گئے بلکہ کھنڈرات کی دیوار کے ساتھ چلنے لگے۔ وہ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ رات کا سناٹا ایک فائر کی آواز سے درہم برہم ہوگیا۔ وہ تینوں ٹھٹک کر رک گئے۔ سلمان پاشا نے کہا یہ فائر دشمن کی طرف سے کیا گیا ہے کیونکہ اپنے تمام آدمیوں کے پاس جو رائفلیں ہیں، ان پر سائلنسر لگے ہوئے ہیں، چلو واپس چلو۔" وہ تینوں واپس مڑ کر کھنڈرات میں اس جگہ پر آگئے جہاں کچھ دیر پہلے وہ سپاہیوں کے ساتھ کھڑے تھے لیکن وہ وہاں رکے نہیں بھاگ کر اس طرف جانے لگے جس طرف سپاہی گئے تھے۔ اس طرف کھنڈرات کے اختتام پر رک کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے وہاں جا بہ جا صحرائی جھاڑیاں تھیں، وہ جھاڑیاں کھنڈرات کی دیواروں کے ساتھ آگے تک چلی گئی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ جھاڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہیں تھیں۔ اس لیے انہیں چلنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ سپاہیوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھنڈرات کی عقبی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے کافی آگے نکل آئے۔ اچانک بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی اور تین سائے سے ان کے پاس سے گزر گئے۔ پاشا نے انہیں

آوازدی۔ وہ تینوں کچھ فاصلے پر رک کر ارد گرد دیکھنے لگے۔ وہ تینوں سپاہی تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے کاندھے پر گٹھری سی اٹھائی ہوئی تھی۔ پاشا چلتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ کاندھے پر لدی گٹھری نہیں ایک پولیس اہلکار تھا۔

''کیا ہوا؟ یہ فائر کی آواز کیسی تھی؟ اور یہ کاندھے پر کس کو اٹھایا ہوا ہے؟'' پاشا نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

تینوں سپاہیوں میں سے ایک نے کہا۔ ''سر ہم یہاں سے کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ اچانک فائر ہوا اور میرے ساتھ چلتا ہوا شیر دل گر پڑا گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی ہے۔'' وہ چند لمحے چپ رہا پھر سر جھکاتے ہوئے بولا۔ ''سر جی! شیر دل اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' اس نے آہستگی کے ساتھ شیر دل کا جسدِ خاکی زمین پر رکھ دیا اور اس کی ٹانگیں سیدھی کر دیں۔

''او مائی گاڈ!'' پاشا کے لہجے میں دکھ سمٹ آیا۔

تینوں پولیس والے افسردہ سے کھڑے رہے۔ پاشا نے دو سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں شیر دل کی لاش لے کر گاڑیوں کی طرف جاؤ۔''

جس سپاہی نے پہلے شیر دل کی لاش اٹھائی تھی، اس کے ساتھ کھڑا ہوا سپاہی آگے بڑھا اور شیر دل کی لاش اٹھانے لگا۔ پہلے والے سپاہی نے اس کی مدد کی اور وہ دونوں لاش لے کر ایک طرف چل پڑے۔ اس دوران کہیں سے کوئی فائر نہیں ہوا۔ شاید فائر کرنے والے نے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔

وہ چاروں یعنی شاکر علی، سلمان پاشا، خالد مکرانی اور ایک سپاہی کچھ دیر کھڑے رہے۔ سلمان پاشا نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''ہمیں زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں دشمن کے مورچے کا علم نہیں ہے۔ سب لوگ اپنے ارد گرد کڑی نظر رکھیے گا۔'' وہ بات مکمل کر کے آگے بڑھا اور کھنڈرات کی عقبی دیوار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ پر اچانک پاشا ٹھٹک کر رک گیا۔ باقی افراد بھی اس کے پیچھے رک گئے۔

''شاکر صاحب! ادھر آئیں ذرا یہ دیکھیں۔'' پاشا نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ شاکر نے اشارے کی سمت میں دیکھا تو پاشا کے اچانک رک جانے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ زمین سے جہاں دیوار اوپر جا رہی تھی وہاں آٹھ انچ قطر کا ایک روشندان نما خلا تھا جس پر پتلی پتلی سلاخوں کی جالی لگی ہوئی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس خلا سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ شاکر نیچے بیٹھ کر خلا کے ساتھ آنکھ لگا کر اندر دیکھنے لگا۔ وہ ایک ہال کمرا تھا جو کسی اسپتال کے وارڈ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہال میں متعدد بیڈ پڑے تھے جن پر بچے سو رہے تھے۔ تین بچے سراسیمہ حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ یا تو وہ سوئے نہیں تھے، یا فائر کی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ایک کونے میں ایک بیڈ کے اوپر لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ بیڈ خالی تھا۔ بیڈ اور لائٹس کو دیکھ کر شاکر کے ذہن میں ناصر یزدانی کے موبائل کا ویڈیو کلپ ذہن میں گھوم گیا۔

''اس کا مطلب ہے ناصر نے یہیں سے ویڈیو بنائی تھی۔'' شاکر نے سوچا اور پاشا کو اندر کا منظر دکھانے لگا۔

پاشا نے اندر کا منظر دیکھ کر کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ گہرے سناٹے کی چادر ایک بار پھر فائر کی آواز سے تار تار ہو گئی۔

''لیٹ جاؤ سب۔'' پاشا نے جلدی سے کہا اور خود بھی نیچے لیٹ گیا۔ وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کرتے تو دشمن کی رائفل سے نکلی گولی خالد مکرانی کا کام تمام کر دیتی۔ گولی اس کے سر سے ایک فٹ اوپر کھنڈرات کی دیوار میں لگی تھی۔ اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ کر اس کے سر پر گرے تھے۔

پاشا نے کہا ''سب لوگ کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ میں دشمن پر نظر رکھتا ہوں۔'' پھر شاکر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''جتنی جلدی ہو سکے وہ خفیہ دروازہ ڈھونڈیں، ہمیں ان بچوں کو زندہ بازیاب کروانا ہے۔'' شاکر علی اوکے کہہ کر کرالنگ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خالد مکرانی اور سپاہی بھی اس کے پیچھے جانے لگے۔ سلمان پاشا نے اٹھ کر پیچھے کی طرف دیکھا وہاں سے کچھ ٹیلے چند گز کی دوری پر تھے۔ ان میں سے ایک ٹیلے کی چوٹی قدرے بلند تھی۔ پاشا کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ فائر کرنے والے نے وہاں مورچا بنایا ہوا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے چل کر چند قدم آگے بڑھا اور ایک جگہ پر بیٹھ کر چوٹی کی طرف دیکھنے لگا اس چوٹی پر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ پاشا کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، اس نے بیٹھے بیٹھے زمین پر ادھر ادھر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ جلد ہی اس کا ہاتھ ایک ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ وہ ایک اینٹ کا آدھا ٹکڑا تھا۔ اس نے وہ ٹکڑا اٹھا کر چند فٹ دور زور سے دیوار پر مارا اور ٹیلے کی چوٹی کو دیکھنے لگا اینٹ کے ٹکڑے کی دیوار کے ساتھ رگڑ سے چنگاریاں سی پیدا ہوئیں۔ چند سیکنڈ بعد چوٹی کی طرف سے رائفل نے شعلہ سا اگلا اور ایک سنسناتی ہوئی گولی اس جگہ لگی جہاں رگڑ سے چنگاریاں پیدا ہوئی تھیں۔

پاشا نے فائر کرنے والے کا مورچا دیکھ لیا تھا۔ اس نے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ اگلے لمحے چوٹی پر ایک گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ مورچا بنا کر فائر کرنے والا دشمن اپنے

انجام کو پہنچ گیا تھا۔ پاشا اس طرف بھاگا جس طرف اس کے ساتھی گئے تھے۔ دیوار کے اختتام پر ایک چھوٹی سی دیوار مڑ کر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ بارہ فٹ لمبی دیوار تھی۔ وہاں سے ایک اور دیوار مڑ کر سیدھی چلی گئی تھی۔ وہاں پاشا کو اس کے ساتھی مل گئے۔ شاکر ایک جگہ پر دیوار کو گھور رہا تھا پھر پاشا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا وہ خفیہ دروازہ یہیں ہوسکتا ہے۔

پاشا تینوں دیواروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل سے دیواروں کو مختلف جگہوں سے بجانا شروع کیا، بارہ فٹ والی دیوار سے مختلف سی آواز برآمد ہوئی۔

پاشا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ''مل گیا دروازہ۔'' اس نے شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔ شاکر علی آگے بڑھا اور اس دیوار کے کونوں پر اندازے سے پاؤں کا دباؤ ڈالنے لگا۔ ایک جگہ پاؤں کے دباؤ سے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور دیوار تھوڑی سی اندر کی طرف سرک گئی۔ اس نے اس جگہ پر دوبارہ دباؤ ڈالا اور اس وقت تک پاؤں نہیں ہٹایا جب تک دیوار مکمل طور پر اندر کی طرف نہیں سرک گئی۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ شاکر نے موبائل فون کی اسکرین روشن کی اور اس کا رخ زمین کی طرف کردیا۔ روشنی میں اندر کی طرف سیڑھی نیچے جاتی دکھائی دی۔ سلمان پاشا نے سب لوگوں کو چوکنا ہوکر نیچے جانے کو کہا۔ اور خود باہر کھڑا اردگرد دیکھنے لگا۔ ایک جگہ اس کی نظریں ساکت ہوگئیں۔ وہاں ایک سایہ سا لہرایا اور غائب ہو گیا۔ پاشا جلدی سے دوزینے اتر کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ سایہ جھاڑیوں سے نکلا اور خفیہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ پاشا مزید ایک زینہ اتر کر دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ وہ سایہ دروازے کے پاس آیا اور اس جگہ رک گیا جہاں زمین پر دروازے کو کھولنے والا خفیہ بٹن نصب تھا، وہ ایک لمبا تڑنگا سا آدمی تھا۔ اندھیرے میں اس کے نقوش نظر نہیں آرہے تھے۔ اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور دیوار باہر نکلنا شروع ہوگئی۔ وہ شخص پاشا اور اس کے ساتھیوں کو اندر قید کرنا چاہتا تھا۔ اندر دروازے کو کھولنے والا بٹن کس طرف تھا پاشا اور اس کے ساتھی نہیں جانتے تھے۔ دیوار آدھی باہر نکل آئی تھی۔ اور اگلے چند سیکنڈ میں مکمل طور پر وہ دیوار نما دروازہ بند ہوجاتا۔ پاشا ایک دم تیزی سے اٹھا اور نپے تلے ہاتھوں سے اس شخص کو اندر کی جانب کھینچ لیا اور اس کی کنپٹی کی خاص رگ پر ایک گھونسا مارا پھر اسے مضبوطی سے پکڑے کھڑا رہا۔ چند سیکنڈ بعد وہ شخص بے ہوش ہوکر اس کی بانہوں میں جھول گیا۔ پاشا اُسے گھسیٹتا ہوا نیچے راہداری میں لے آیا۔ راہداری مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی اور دیواروں پر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک سوئچ بورڈ پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے بورڈ کے تمام بٹن آن کردیے اچانک دو بلب جل اٹھے جن کی روشنی راہداری میں پڑنے لگی۔ اس نے بے ہوش شخص کی طرف دیکھا۔ وہ لمبا تڑنگا سانولی رنگت کا ایک شخص تھا جس نے موٹی موٹی مونچھیں پال رکھی تھیں۔

وہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتا تھا۔ تاہم سلمان پاشا نے اس کی قمیص اتار کر اس سے اس کے ہاتھ پیچھے سے باندھ دیے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس جانب بڑھا جہاں اس کے ساتھی ایک دروازے کے ساتھ زور آزمائی کررہے تھے۔

پاشا کچھ دیر سوچتی ہوئی نگاہوں سے تالے کو دیکھتا رہا پھر پسٹل تالے کے ساتھ لگا کے دو گولیاں ایک ساتھ چلا دیں۔ سائلنسر لگے پسٹل سے ٹھس ٹھس کی آواز نکلی اور گولیاں لاک کو توڑتی ہوئیں لکڑی کے دروازے میں گھس گئیں۔ اس نے جلدی سے تالا نکال کر ایک طرف پھینکا اور کنڈی کھول کر پورا دروازہ کھول دیا۔ لیکن وہ اندر گھسا نہیں۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر وہ چوکس ہوکر اندر چلا گیا۔ اس نے کمرے میں اردگرد نظر دوڑائی وہاں کوئی اسلحہ بردار دشمن نہیں تھا ایک طرف تین بیڈوں پر بچے بیٹھے تھے اور پاشا کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پاشا نے اشارہ کرکے کمرے کے باہر راہداری میں کھڑے ہوئے ساتھیوں کو اندر بُلا لیا۔ اور خود چلتا ہوا بچوں کے پاس پہنچ گیا۔ بچے سہم کر ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔

''ڈرو نہیں بیٹا'' اس نے ایک بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ''ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔'' بچے کچھ دیر حیرت اور خوف سے اسے اور اندر آنے والے دوسرے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ لیکن جب پاشا نے پیار اور شفقت سے انہیں سمجھایا کہ ہم تم سب کو تمہارے والدین تک پہنچائیں گے تو بچوں کا خوف کسی حد تک کم ہوگیا۔

اسی دوران پاشا کا موبائل تھرتھرانے لگا جو وائبریشن موڈ پر لگا ہوا تھا۔ اس نے موبائل جیب سے نکال کر کال ریسیو کرلی۔ کچھ دیر دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ پھر اوکے کہہ کر کال ڈراپ کردی۔

موبائل فون جیب میں رکھ کر شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے نکلیں۔ گاڑیوں کے پاس کھڑے اہلکاروں کا کہنا ہے کہ کچھ گاڑیاں کھنڈرات کی طرف بڑھ رہی ہیں۔'' وہ کچھ دیر رُکا پھر بات آگے

بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ان کا کہنا ہے کہ گاڑیاں ابھی دور ہیں لیکن اگلے آدھے گھنٹے میں میں وہ یہاں پہنچ جائیں گی، ہری اَپ جلدی کرو، چلو بچو اٹھو۔“ اس نے بچوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

وہ تمام بچوں کو ساتھ لے کر راہداری میں آ گئے۔ بے ہوش پڑے ہوئے شخص کے پاس پہنچ کر پاشا نے مکرانی اور ایک پولیس اہلکار سے کہا۔ ”تم دونوں اسے ہاتھوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر باہر لے چلو۔“ وہ لمبا تڑنگا قدرے بھاری بھرکم تھا تاہم دونوں نے اٹھالیا۔ راہداری میں آگے جا کر پاشا ٹھٹک کر رک گیا۔ سیڑھیوں سے اوپر خفیہ گیٹ بند تھا۔

شاکر نے اندازے سے مختلف جگہوں پر پاؤں کا دباؤ ڈالا مگر گیٹ نہ کھلا۔

دس منٹ مزید گزر گئے۔

پاشا نے ایک پولیس اہلکار سے کہا۔ ”بھاگ کر جاؤ اور جس کمرے میں بچے تھے وہاں سے پانی کا ایک گلاس بھر لاؤ۔“ اہلکار بھاگ کر گیا اور پانی کا گلاس بھر لایا۔ پاشا بے ہوش شخص پر پانی چھڑکنے لگا۔ اس دوران پولیس اہلکار الرٹ ہو گئے اور اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں کہ کہیں ہوش میں آنے کے بعد وہ شخص کوئی حرکت نہ کر بیٹھے۔ دو منٹ بعد وہ شخص آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

پاشا نے جلدی سے کہا۔ ”ہم نے اس تہ خانے میں ٹائم بم لگا دیا ہے جو اگلے تین منٹ میں پھٹ جائے گا۔ اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو جتنی جلدی ہو سکے گیٹ کھول کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

وہ شخص، پاشا کی چال نہ سمجھ پایا اور بوکھلاہٹ میں سیڑھیوں کے نیچے ایک جگہ پر پاؤں کا دباؤ ڈالنے لگا۔ اگلے ہی لمحے گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ گیٹ کھل گیا۔ پولیس اہلکاروں نے جلدی سے اپنی رائفلیں اس کی پسلیوں کے ساتھ لگا دیں۔ ایک اہلکار نے رائفل سے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”خبردار کوئی حرکت مت کرنا ورنہ گولی مار کر تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا، آگے چلو۔“ وہ سب بچوں سمیت تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ سپاہیوں نے بچوں کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ پاشا ان کے تیسرے ساتھی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو گیٹ بند کر کے انہیں محصور کر گیا تھا۔ اسے ان کی صحیح تعداد کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ سب چلتے ہوئے کھنڈرات سے باہر نکل آئے۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ صحرائی ٹیلوں کی اوٹ سے زردی مائل چاند نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی پھیکی پھیکی روشنی سے راستہ قدرے صاف نظر آ رہا تھا۔ جھونپڑیوں کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔

پاشا نے پہلے سے وہاں کھڑے اہلکاروں کو چند گز دور ایک بلند ٹیلے پر مورچا بنانے کو کہا اور باقی چار سپاہیوں کو متبادل راستے سے بچوں کو گاڑیوں کی طرف لے جانے کی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ”بچوں کو بس کے ڈرائیور اور کلینر کے پاس چھوڑ کر جلدی سے واپس آؤ اور ان جھونپڑیوں کے ایک طرف مورچا بنا لینا۔“ سپاہیوں نے اثبات میں سر ہلایا اور سیلیوٹ کرتے ہوئے بچوں کو لے کر اس طرف چل پڑے جہاں سے وہ آئے تھے۔

پاشا نے جیب سے کلوروفارم کی شیشی نکالی اور ایک رومال پر اس کے چند قطرے ٹپکا کر شیشی جیب میں رکھی اور خالد مکرانی کی گن کی زد میں کھڑے شخص کی طرف بڑھ گیا۔ اس شخص نے گھوم کر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پاشا نے کلوروفارم میں بسا رومال جلدی سے اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس شخص نے مزاحمت کے لیے ہاتھ پاؤں چلائے مگر جلد ہی اس کا شقل ہو گیا۔

”اسے لے جا کر دور ان جھونپڑیوں میں کسی کپڑے سے باندھ دو۔“ پاشا نے سرکنڈوں سے بنی جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مکرانی سے کہا۔

”اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دینا تاکہ ہوش میں آنے کے بعد یہ شور نہ کر سکے۔“

مکرانی بے ہوش شخص کو گھسیٹتا ہوا جھونپڑیوں کی طرف لے جانے لگا۔ وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اچانک فائر کی آواز سے صحرائی خاموشی کا دامن تار تار ہو گیا۔ مکرانی ایک فٹ زمین سے اچھلا اور بے ہوش شخص کے اوپر ڈھے گیا۔ پاشا اور شاکر جلدی سے ریتیلی زمین پر لیٹ گئے اور کرالنگ کرتے ہوئے مکرانی کی طرف بڑھنے لگے۔ اسی دوران دوسرا فائر ہوا اور گولی پاشا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ پاشا نے لیٹے لیٹے فائر کی آواز کے ماخذ پر غور کیا اور سپاہیوں کے مورچے کی طرف دیکھنے لگا۔ مورچے پر بیٹھے ہوئے ایک سپاہی کی سائلنسر لگی رائفل سے چنگاریاں پھوٹیں اور اگلے ہی لمحے چند گز دور ایک نادیدہ شخص کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔

پاشا نے جلدی سے اٹھ کر شاکر سے کہا۔ ”آپ خالد کو دیکھیں میں بس ابھی آیا۔“ وہ بھاگ کر اس طرف گیا جہاں ٹیلے کی اوٹ میں چھپا شخص، سپاہی کی گولی کا شکار ہوا تھا۔ وہ محتاط انداز سے چلتا ہوا ٹیلے کے پاس پہنچ گیا اور نیچے بیٹھ کر

اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کہیں دشمن کا کوئی اور ساتھی ان کی تاک میں نہ بیٹھا ہو۔

چند لمحے وہ کسی آہٹ، کسی آواز کا منتظر رہا لیکن وہاں نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ پاشا اٹھا اور چند قدم آگے بڑھ گیا۔ چاند کافی اوپر آ گیا تھا۔ اس کی دودھیا چاندنی میں اردگرد کا ماحول قدرے روشن ہو گیا تھا۔

گولی کا شکار شخص یقیناً مر چکا تھا کیونکہ اس کے کراہنے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پاشا چلتا ہوا ریت پر پڑے ہوئے شخص کے پاس آ کر رک گیا۔ کچھ دیر وہ اس پر پسٹل تانے کھڑا رہا۔ جب اس کے جسم میں خفیف سی حرکت بھی نہ ہوئی تو پاشا نے پاؤں سے اسے تھوڑا سا دھکیلا، وہ شخص ایک طرف لڑھک گیا۔ دو قدم کی دوری پر اس کی گن پڑی تھی۔ پاشا نے اپنا پسٹل ہولسٹر میں رکھا اس کی گن اٹھائی اور واپس آ گیا۔

شاکر زمین پر پڑے ہوئے مکرانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ چاند کی روشنی میں شاکر کا چہرہ مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ پاشا سمجھ گیا کہ مکرانی کی زندگی کی ڈور ٹوٹ چکی ہے۔

”اوہ مائی گاڈ۔“ پاشا زیرِ لب بولا اور مکرانی کی ادھ کھلی آنکھیں بند کر دیں۔

شاکر اور مکرانی کا ساتھ محض دو دن کا تھا مگر ان دو دنوں میں اسے مکرانی سے انسیت سی ہو گئی تھی۔ وہ شخص جو جرائم کی دنیا سے نکل کر شاکر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلا تھا، وہ اسے چھوڑ کر عدم کی دنیا کا باسی ہو گیا۔ پاشا نے شاکر کے کاندھے پر تھپکی دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شاکر نے ہتھیلی سے پلکوں پر آ جانے والے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر مکرانی کی لاش اٹھانے لگا۔ لاش بانہوں پر اٹھا کر وہ جھونپڑیوں کی طرف چلا گیا اور ایک جھونپڑی کے کونے میں لٹا کر آ گیا۔ اسی دوران پاشا بے ہوش شخص کو گھسیٹتا ہوا دوسری جھونپڑی میں لے گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں اس جگہ جا کر کھڑے ہو گئے جہاں مکرانی کو گولی لگی تھی۔

اچانک ایک ٹیلے کی اوٹ سے کچھ روشنیاں نمودار ہوئیں اور گھرر گھرر کی آواز نکالتی ہوئی گاڑیاں کھنڈرات کی طرف آنے لگیں۔ شاکر اور پاشا ایک طرف بھاگے اور ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھپ کر کھنڈرات کی طرف دیکھنے لگے۔

☆☆☆

چیف کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

”زندگی میں پہلی بار مجھے آج ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“ اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجھے تھوڑی سی بھی سن گن مل جاتی کہ وکرم میرے ساتھ غداری کرے گا تو میں پہلے ہی اس کا پتا صاف کر دیتا لیکن یہاں بیٹھ کر میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا، حالات موافق نہیں ہیں، بارڈر پر سیکورٹی بڑھا دی گئی ہے ورنہ میں وہیں جا کر اس کی تکا بوٹی کرتا۔“ اس کا لہجہ تلخی سے لبریز تھا۔ وہ بارڈر پر پہنچنے سے پہلے ہی واپس آ گئے تھے۔ کوئی وکرم نامی بندہ تربیت یافتہ بچوں کو لے کر زیرِ زمین چلا گیا تھا۔ یہ اطلاع چیف کو کسی دوسرے ایجنٹ نے دی تھی۔ چیف کافی دیر تلملاتا رہا۔

وہ سرحدی پٹی سے نکل کر اپنے علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی گاڑیاں ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک جگہ پر گاڑی بند کر کے چیف گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ باقی گاڑیوں کے انجن بھی خاموش ہو گئے۔ سکندر بھی اپنی گاڑی سے نکل کر چیف کی طرف بڑھ گیا۔ ”خیریت یہاں گاڑیاں کیوں روک دیں۔“ اس نے چیف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میری شروع سے یہ عادت ہے کہ میں جب بھی اپنے علاقے میں آتا ہوں، کم از کم ایک دو فرلانگ پہلے رک کر اردگرد کا جائزہ لیتا ہوں، یہاں کے ماحول میں تھوڑی سی تبدیلی سے مجھے سمجھ آ جاتی ہے کہ یہاں کچھ غیر معمولی ہے۔“ بات مکمل کر کے وہ قدرے بلند ٹیلے پر چڑھ گیا اور اردگرد دیکھنے لگا۔ اچانک وہ چونک کر ٹیلے سے نیچے اترا۔ ”سکندر تیار ہو جاؤ، کھنڈرات کے حالات مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

”کیا ہوا؟“ سکندر نے حیرانی سے پوچھا۔

”کھنڈرات کی طرف مجھے چنگاریاں سی نظر آئی ہیں جیسے کسی نے آتشیں ہتھیار سے فائر کیا ہو۔ آواز تو سنائی نہیں دی لیکن مجھے لگتا ہے کسی نے ...... فائر کیا ہے۔“ چیف نے بات مکمل کر کے گاڑی کی سیٹ کے نیچے سے گن نکال لی۔

چیف نے اپنے آدمیوں کو گاڑی سے اتر کر کھنڈرات کے گھیراؤ کی ہدایت کی اور پیدل ہی کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگا۔

آسمان پر چاند کی روشنی میں صحرائی ماحول روشن ہو گیا تھا۔ وہ ٹھنڈی ریت پر آگے بڑھتے رہے۔ چیف نے سرکنڈوں سے بنی جھونپڑیوں سے کچھ پہلے اپنا رخ شمال کی طرف کر لیا۔ وہ جھونپڑیوں کے راستے سے آگے نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ عام گزرگاہ تو نہیں تھی تاہم وہاں نظر میں آ جانے والا خطرہ تھا۔

''سکندر! میری سلطنت سے غیر متعلقہ آدمی آج تک زندہ واپس نہیں گیا۔'' چیف نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ پھر مشین گن کا لیور کھینچتے ہوئے بولا۔ ''اس بار بھی کوئی آدمی زندہ بچ کر نہ جائے، کیا سمجھے؟''

سکندر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ گیا ہوں سب سمجھ گیا ہوں۔''

وہ محتاط انداز میں چلتے ہوئے ایک جگہ پر رک گئے۔ چیف نے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''مجھے اس طرف سے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی ہے، کیا تمہیں سنائی دی؟''

سکندر چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''نہیں مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی، تمہارا وہم ہے، چلو آگے چلو۔''

چیف نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''سکندر! یہ میرا وہم نہیں ہے، میری سماعتیں کسی وہم کو قبول نہیں کرتیں۔'' وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک منٹ یہیں رکو میں اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھتا ہوں۔'' بات مکمل کر کے وہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ ریت کو پیروں تلے روندتا ہوا وہ ٹیلے کے ٹاپ پر پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک اسے قریباً پچاس گز دور چند انسانی ہیولے متحرک نظر آئے۔ چاند کی محدود روشنی میں انہیں دور سے پہچاننا مشکل تھا کہ وہ اپنے آدمی ہیں یا مخالف گروپ کے۔ وہ کچھ دیر اس طرف دیکھتا رہا پھر سکندر کو آہستگی سے آواز دے کر اوپر بلا لیا۔ ہیولے آہستہ روی سے چلتے ہوئے۔ ایک ٹیلے کی اوٹ میں چلے گئے۔

سکندر اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ میری سماعتیں وہم قبول نہیں کرتیں۔ اس ٹیلے کی اوٹ میں چند آدمی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔'' چیف نے ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر تم نے انہیں نشانہ کیوں نہیں بنایا؟'' سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ کہیں وہ اپنے آدمی نہ ہوں۔''

سکندر نے جلدی سے کہا۔ ''لیکن اپنے آدمیوں کو تو میں نے مخالف سمت سے آنے کا کہا تھا۔''

''کیا؟'' چیف پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے یہ مخالف گروپ کے آدمی تھے۔ چلو ان کا پیچھا کرتے ہیں۔'' وہ تیزی سے اس طرف جانے لگا۔

سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چیف جلد بازی سے کام مت لو، وہ لوگ کھنڈرات کی طرف گئے ہیں، ہم متبادل راستے سے جا کر ان سے پہلے کھنڈرات میں پہنچ جاتے ہیں۔''

چیف کچھ دیر اسے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے چلو۔''

☆☆☆

پاشا اور شاکر کچھ دیر اس طرف دیکھتے رہے جہاں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ دونوں نے اچانک چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا ہیڈ لائٹس کیوں بجھ گئی ہیں؟'' شاکر علی نے پوچھا۔

''میرے خیال سے انہیں یہاں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا ہے۔'' پاشا نے کہا۔ ''گاڑیوں کے انجن بھی اچانک خاموش ہو گئے ہیں، شاید وہ ہم پر بے خبری میں وار کرنا چاہتے ہیں۔''

اس نے بات مکمل کر کے موبائل فون پر ایک پیغام لکھا ... ''دشمن خاموشی سے آگے بڑھ رہا ہے، ہر لمحہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور کوشش یہی ہونی چاہیے کہ تصادم سے گریز کرتے ہوئے انہیں زندہ گرفتار کیا جائے۔'' اہلکاروں کو پیغام بھیجنے کے بعد وہ شاکر کو اشارہ کر کے کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگا۔

معاً صحرائی خاموشی کا دامن گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے شور سے بھر گیا۔ ایک راؤنڈ کے بعد خاموشی چھا گئی۔

''شاکر صاحب! دشمن کی نظر میں ہمارے آدمی آ گئے ہیں۔'' پاشا نے کہا۔ ''کلاشنکوف کا راؤنڈ ان کی طرف سے چلایا گیا ہے۔'' وہ آواز کے ماخذ کی طرف جانے لگا۔ شاکر علی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں محتاط انداز میں چلتے ہوئے ایک گھنی جھاڑی کے نیچے بیٹھ گئے۔

اچانک ایک طرف سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔

''اس طرف کوئی ہے۔'' پاشا نے جھاڑی کے دوسری طرف اشارہ کیا اور اٹھ کر اس طرف دیکھنے لگا۔

چند گز دور کچھ متحرک سائے جھاڑی کی طرف آتے دکھائی دیے۔ پاشا اچانک نیچے بیٹھ گیا۔

آنے والے مزید قریب آ گئے اور جھاڑی کے پاس رک گئے۔ پاشا اور شاکر دم سادھے بیٹھے رہے۔ دشمن کے آدمی تعداد میں پانچ تھے۔

ایک آدمی گن رکھ کے رفعِ حاجت کے لیے ایک طرف

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہو گیا...... پاشا نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس پر گن تان لی۔ ”خبردار کوئی حرکت نہ کرے ورنہ اس گن کی ساری گولیاں اس آدمی کی کھوپڑی میں اتار دوں گا۔“ باقی چاروں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس دوران شاکر نے اٹھ کر کہا۔
”اپنے ہتھیار نیچے رکھ کر ہاتھ اوپر کر لو، ہری اَپ۔“
اس نے اپنے پسٹل سے اشارہ کیا۔
انہوں نے اپنے ہتھیار نیچے رکھ دیے۔ شاکر ان کے ہتھیار اٹھا کر جھاڑی کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب زمین پر لیٹ کر سب اپنے ہاتھ پیچھے کر لو۔“ وہ سب زمین پر لیٹ گئے۔ اس نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی مگر... کسی کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا، موبائل فون صرف ایک کی جیب سے نکلا تھا۔ شاکر نے موبائل فون بند کر کے سم نکالی اور موبائل دور جھاڑیوں کی طرف پھینک دیا۔ پاشا نے کلوروفارم سے بسا ہوا رومال باری باری ان کے نتھنوں پر رکھ کر انہیں بے ہوش کر دیا۔

☆☆☆

چیف اور سکندر رات کی تاریکی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک چیف کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ اس کے ہاتھ سے گن بھی گر گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر پیچھے دیکھا تو اسے ٹھوکر لگنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے اٹھا اور اس طرف بڑھ گیا جہاں پانچ آدمی اوندھے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ سکندر رک گیا۔ اس نے بھی ان آدمیوں کو دیکھ لیا تھا۔ چیف نے جیبی ٹارچ نکال کر ان کے چہروں پر روشنی ڈالی۔ ”یہ تو اپنے آدمی ہیں۔“ وہ حیران ہوا۔ ”لیکن یہ یہاں کیوں سو گئے ہیں حرام خور؟“ اس نے ان میں سے ایک کو جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کی۔ ”چل اوئے شیدے اٹھ۔“
لیکن شیدا تو بے ہوش تھا۔ چیف نے باری باری سب کو جگانے کی کوشش کی لیکن کوئی نہ اٹھا۔
وہ سمجھ گیا کہ ان کو بے ہوش کیا گیا ہے۔ اسے ان کی نااہلی پر شدید غصہ آیا۔ کسی نے پانچوں کو بے ہوش کر دیا اور یہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس نے گن اٹھائی اور پورے کا پورا برسٹ ان پر خالی کر دیا۔ بے ہوش آدمیوں کے جسم زمین سے اچھلے اور ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔ سکندر کو اشارہ کرتے ہوئے وہ کھنڈرات کی طرف چل پڑا۔ جب وہ کھنڈرات پر پہنچے تو خفیہ گیٹ کھلا دیکھ کر چیف اپنے بال نوچنے لگا۔ سکندر حیرت سے اس کھلے دہانے کو دیکھ رہا تھا جس کے نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ وہ اس جگہ پر کئی بار آیا تھا۔ لیکن چونکہ اسے چیف کی زیرِ زمین سرگرمیوں کا علم نہیں تھا اس لیے وہ کبھی متجسس بھی نہیں ہوا۔
چیف جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر نیچے راہداری میں پہنچا اور بچوں والے کمرے کی طرف گیا تو خالی کمرا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے شدید غصے کی حالت میں دیواروں پر مکے برسانے شروع کر دیے۔ ”سکندر سب برباد ہو گیا، کوئی میرے خوابوں کے آئینے کو چکنا چور کر گیا ہے۔“ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ آج کی پے در پے ناکامیوں نے اس کے حواس مختل کر دیے تھے۔ سکندر نے بڑی مشکل سے اسے پانی پلایا اور اس کے حواس بحال کیے۔ ”چیف اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب یہاں بیٹھ کر نقصان پر آنسو بہانے سے بہتر ہے باہر نکل کر اپنے دفاع کی کوئی تدبیر کریں۔“ اس نے کہا اور چیف کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے جانے لگا۔ وہ تہ خانے سے نکل کر جونہی آگے بڑھے اچانک، دو افراد ان کے سامنے آ گئے، ان کے ہاتھوں میں پسٹل اور چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔
”تمہارا کھیل ختم ہو گیا مسٹر چیف، ہم نے تہ خانے میں تم دونوں کی ساری گفتگو سن لی ہے، اپنے ہتھیار پھینک دو۔“ ان میں سے ایک ڈھاٹا بردار نے کہا۔ ”ورنہ تم دونوں کو مار کر لاشیں ویرانے میں پھینک دیں گے، اور تمہیں معلوم ہے کہ یہاں کے مردار خور گدھ جسم کی بوٹی بوٹی نوچ لیتے ہیں۔“
چیف نے آگے بڑھ کر مزاحمت کی مگر دوسرے ڈھاٹا بردار نے پسٹل کا بٹ اس کے ہاتھ پر مارا تو چیف کی گن اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ وہ دونوں ڈھاٹا بردار پاشا اور شاکر علی تھے۔
پاشا نے شاکر سے، سکندر خان اور چیف کو نشانے پر رکھنے کے لیے کہا اور کال کر کے اپنے سپاہیوں کو خفیہ گیٹ پر بُلانے لگا۔
چند منٹ بعد چار سپاہی ان کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ دو سپاہی مخالف گروپ کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔
جب چیف اور سکندر کو ہتھکڑیاں لگ گئیں تو وہ انہیں ہانکتے ہوئے گاڑیوں کی طرف لے جانے لگے۔

☆☆☆

چیف کے کیس سے متعلق آج سماعت کا آخری دن تھا۔ کمرائے عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اخبارات، نیوز چینلز کے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔
جج صاحب وکیلِ استغاثہ کے دلائل سننے سے پہلے اپنے چیمبر میں گئے اور پھر واپس آ گئے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کرسیِ انصاف پر بیٹھے جج نے ناک پر نظر کا چشمہ درست کیا اور وکیلِ استغاثہ سے زیرِ سماعت کیس کے آخری گواہ کو پیش کرنے کا حکم دیا۔

وکیلِ استغاثہ نے اس کیس کے آخری اور اہم گواہ کو وٹنس باکس میں بلایا اور اپنا بیان ریکارڈ کروانے کی درخواست کی۔

وٹنس باکس میں کھڑا ڈاکٹر سجاد رضوی وکیلِ استغاثہ کے سوالات کا منتظر تھا۔

جج نے وکیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''نیازی صاحب! آپ گواہ سے سوالات کریں۔''

وکیلِ استغاثہ آگے بڑھا اور وٹنس باکس کے قریب جا کر ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

ڈاکٹر نے متانت سے جواب دیا۔ ''میں اس شخص کو زیادہ نہیں جانتا بس اتنا جانتا ہوں کہ ایک بار یہ میرے پاس کسی کام سے آیا تھا۔''

وکیل نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ یہ شخص آپ کے پاس کس کام سے اور کب آیا تھا؟''

''جی ضرور کیوں نہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے نہایت ادب سے کہا۔ ''جج صاحب میری آپ سے گزارش ہے آپ ملزم کی شرٹ اتارنے کا حکم صادر فرمائیں۔'' جج نے ایک ذرا چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

''شرٹ اتروانا بہت ضروری ہے کیا؟'' جج نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''جی ہاں می لارڈ! شرٹ اتروانا بہت ضروری ہے۔'' صورتِ حال ڈرامائی اور دلچسپ ہوگئی۔ کورٹ روم میں درجنوں لوگوں کی موجودگی کے باوجود خاموشی دبیز تھی۔

جج نے ملزم کو شرٹ اتارنے کا حکم دیا۔ ملزم، چیف چند لمحے متامل رہا پھر شرٹ اتار دی۔

ڈاکٹر سکون سے ٹہلتا ہوا ملزم کے کٹہرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر وہ چیف کے بالوں سے بھرے سینے کو دیکھتا رہا پھر ایک ہاتھ ناف پر رکھ کر چٹکی بھری اور دوسرے ہاتھ سے پیٹھ کی جلد کو بھی چٹکی کے سے انداز میں پکڑا اور جلد کو جسم سے یوں الگ کرنے لگا جیسے کوئی بنیان اتارتا ہے۔

کورٹ روم میں موجود ہر شخص کی نظریں ملزم کے کٹہرے میں کھڑے دو آدمیوں پر تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے عدالت کے در و بام بھی حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہے ہوں۔

موت کا سا سناٹا تھا۔ ڈاکٹر اپنا کام کر کے ملزم کے کٹہرے سے باہر نکل آیا۔ چیف کے چہرے سے اُترنے والا ماسک جج کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''می لارڈ! میں ڈگری کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں لیکن میں پریکٹس نہیں کرتا نہ ہی میرا کوئی کلینک ہے، میں ذرا مختلف کام کرتا ہوں، میں پاکستانی، انڈین اور انگریزی ہارر فلموں کے لیے ماسک بناتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے لمحاتی توقف کیا پھر ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک سال قبل اس شخص نے اپنا تعارف فلم میکر کے طور پر کروایا اور مجھے ایک ایسا ماسک بنانے کا آرڈر دیتے ہوئے کہا کہ ایسا ماسک بنا دو کہ چہرے پر ماسک لگانے کے بعد پتا نہ چلے کہ اس نے ماسک چڑھایا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ماسک بن جائے گا بلکہ ایسا ماسک بن جائے گا کہ وہ چڑھانے سے گرمی بھی نہیں لگے گی، ہوا بھی لگتی رہے گی اور گرمی کے موسم میں چہرے سے پسینے کا اخراج بھی ہوتا رہے گا۔''

یہ شخص مجھے معقول رقم دے کر چلا گیا اور میں نے ماسک بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دو ہفتے کی محنت کے بعد میں ایک پتلی سی جھلی والا اسکن کلر کا ماسک بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ شخص آیا اور ماسک لے گیا۔''

ڈاکٹر تفصیل سے بتا کر خاموش ہوگیا۔

جج نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر! آپ کو مزید کچھ کہنا ہے؟''

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی نہیں می لارڈ! مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔'' ڈاکٹر گواہوں کے کٹہرے سے نکل کر سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

وکیلِ استغاثہ اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے جج کے سامنے جا کھڑا ہوا اور دلائل کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔

''پانچ سال قبل پنجاب کے ایک قصبے میں شفا خانہ کے نام سے ایک کلینک ہوا کرتا تھا جس میں مریضوں کا زیادہ ہجوم نہیں ہوتا تھا بس اِکّا دُکّا مریض علاج کی غرض سے آتے تھے لیکن وہ مطمئن تھا اور اپنی محدود آمدنی پر قانع اور شاکر تھا۔ ایک دن ایک شخص اس کے پاس آیا جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ ڈاکٹر اس وقت ایک زخمی کی پٹی کر رہا تھا۔ پٹی کرنے کے بعد اس نے مریض کو روانہ کیا اور اجنبی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''جی بھائی صاحب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

اجنبی کچھ دیر ڈاکٹر کے شفا خانے میں پڑی اشیا کو دیکھتا رہا پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب!

کیا آپ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہیں؟"

ڈاکٹر نے متعجب ہوکر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟" اسے اس اجنبی سے ایسے کسی سوال کی توقع نہیں تھی۔

اجنبی نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے آپ کلینک کی آمدنی سے اپنے اخراجات پورے کر لیتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "الحمدللہ زیادہ نہیں تو دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے۔"

اجنبی کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "دورِ حاضر میں ڈاکٹرز لاکھوں میں کھیل رہے ہیں لیکن آپ ڈاکٹر ہو کر کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

ڈاکٹر اس کی بات سن کر چراغ پا ہو گیا۔ "دیکھیے صاحب! میں کیسی زندگی جی رہا ہوں یہ میرا مسئلہ ہے، آپ کون ہوتے ہیں اس طرح کی باتیں کرنے والے۔"

اجنبی پر گویا اس کی بات کا اثر ہی نہیں ہوا، وہ بدستور دھیمے مگر ہموار لہجے میں بولا۔ "آپ مجھے خدائی فوجدار سمجھ سکتے ہیں،" وہ لمحہ بھر کو چپ ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھیں آپ میری باتوں سے خفا مت ہوں، میں ان لوگوں کی مدد کرتا ہوں جو ہنرمند ہوتے ہوئے بھی صحیح طرح سے اپنے ہنر سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔" بات مکمل کر کے اس نے اپنی جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور ڈاکٹر کو دے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ کاغذ آپ اس وقت پڑھیے گا جس دن آپ کا بیوی کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو۔" اجنبی شخص جلدی سے کاغذ اس کے ہاتھ میں دے کر باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر چند لمحے شفاخانے کے خارجی راستے کو دیکھتا رہا پھر کاغذ جیب میں ڈال کر شفاخانہ بند کیا اور گھر آ گیا۔ اس دن اتفاق سے اس کا بیوی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، دونوں نے ایک دوسرے کو خوب کھری کھری سنائیں، بچے ایک طرف سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ رات گئے جب گھر کا ماحول معمول پر آ گیا تو ڈاکٹر نے اپنے کمرے کی راہ لی بستر پر لیٹ کر اجنبی کا دیا ہوا کاغذ پڑھنے لگا۔ اس کی بیوی، بچوں کے کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ جوں جوں کاغذ کے مندرجات پڑھتا گیا اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔ نہ جانے اس کاغذ پر لکھے لفظوں میں کیا تاثیر تھی کہ ڈاکٹر نے صبح ہی صبح اس اجنبی سے ملنے کا ارادہ کرلیا۔

دوسرے دن اس اجنبی سے ملنے کے بعد وہ گھر گیا اور ضروری سامان سمیٹ کر بچوں کے ہمراہ شہر کی راہ لی۔"

وکیلِ استغاثہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ کمرۂ عدالت مکمل طور پر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں پر موجود لوگ بت بنے بیٹھے تھے۔ وکیل نے پانی کا ایک گھونٹ پیا اور بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر نے اس اجنبی سے مل کر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ اجنبی بچوں کو اغوا کر کے لاتا اور وہ ڈاکٹر جو اس وقت ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا ہے۔" اس نے انگلی سے کٹہرے میں کھڑے ہوئے چیف کی طرف اشارہ کیا۔ "بچوں کو بے ہوش کر کے ان کے اعضا نکالتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ جاری رہا۔ اس نے اپنے ضمیر کو مار ڈالا۔ ایک دن وہ اجنبی ایک ٹریفک حادثے میں مر گیا تو اس کی جگہ یہ شخص اکیلا کام کرنے لگا۔ کچھ عرصے بعد اس نے شہر کے جرائم پیشہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک گروپ بنا لیا۔

"اس نے اپنا ٹھکانا چولستان میں ایک محل کے کھنڈرات کے تہ خانوں میں بنایا ہوا تھا جہاں یہ اغوا شدہ بچوں کے اعضا نکال کر بھاری قیمت پر بیچتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ سرحد پار سے تربیت یافتہ خودکش حملہ آور وصول کرتا اور انہیں ملک کے دوسرے شہروں میں بھیج کر خودکش حملے کرواتا تھا۔

"ناصر یزدانی جو ایک اخبار کا سینئر صحافی اور کالم نگار تھا کچھ عرصہ سے اس کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔ ایک دن وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا صحرائی ٹیلوں میں پہنچ گیا اور اس نے وہ منظر دیکھ لیا جو اس کے قتل کا محرک بنا۔ اس شخص نے ناصر یزدانی کو ویڈیو ریکارڈ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ اس کے پیچھے بھاگا۔ اس نے اپنا موبائل جس میں اس کے کالے کرتوت ریکارڈ تھے بچا لیا لیکن خود کو نہ بچا سکا اور اس کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس کے علاوہ اس شخص نے ہمارے معزز گواہ اور مقتول ناصر کے دوست شاکر پر بھی قاتلانہ حملہ کروانے کی کوشش کی، جب شاکر علی قاتلانہ حملے سے بچ گیا تو اس نے شاکر علی کی ایک عزیزہ ثانیہ کو اغوا کروا لیا۔" وکیلِ استغاثہ ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا پھر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ شخص جو اس وقت ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا ہے۔ یہ کئی بچوں اور کئی دوسرے لوگوں سمیت ناصر یزدانی کا قاتل ہے، اس کا اصل نام چیف نہیں۔ یہ ناصر یزدانی کے اخبار کا ایڈیٹر عدنان زبیری ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے ایک دم انکشاف کیا۔ وہاں موجود ہر شخص آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ملزم عدنان زبیری کو دیکھ رہا تھا۔ میڈیا کے کیمرے حرکت میں آ گئے تھے۔ وکیلِ استغاثہ دلائل دے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ جج نے "آرڈر آرڈر" کی آواز لگائی اور تمام ثبوتوں اور گواہوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا فیصلہ سنانے لگا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM